پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

سرگزشت — 15 — **خواجہ خضر ثانی** — ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر مختصر ایک نادر روزگار کا تعارف

گفت و شنید — 16 — **شہر خیال** — مدیر اعلیٰ
آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت — 24 — **جہانِ حیرت** — ڈاکٹر ساجد امجد
اس سائنسدان کا احوال جو دو تہائی کے بے حس و حرکت پڑا ہے

جرم و سزا — 45 — **شاطر نواب** — سید احتشام
عیاری مکاری میں لندن کو ہلا دینے والے کا قصہ

جنگ عظیم — 61 — **عقوبت خانہ** — افسر آزاد
انسان درندگی پر اتر آئے تو یہی کچھ ہوتا ہے

فلم و صحافت — 85 — **فلمی الف لیلہ** — علی سفیان آفاقی
فلم و صحافت کی کہی ان کہی کہانیاں، معروف قلمکار کے حقیقی شب و روز

تحقیق — 109 — **شاہی سوتن** — مریم کے خان
پیار کی آگ میں جلتے رہنے والے شہزادے اور شہزادی کا تذکرہ

حالاتِ زندگی — 123 — **رجحان ساز** — ابن کبیر
اس نے قلم کی فسوں گری سے ایک جہان کو اسیر بنا لیا

تذکرہ — 141 — **اندھاپن** — ہوزے سارا ماگو
دنیائے ادب میں ایک انقلاب لا دینے والا ناول

سفر کہانی — 147 — **ترکی نمی دانم** — علی سفیان آفاقی
اچھے سفرنامے پڑھنے کے شوقینوں کے لیے شگفتہ پیرائے میں ایک دلچسپ سفر کہانی

تخلیق — 157 — **جاسوس ادارے** — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
بدنام زمانہ سی آئی اے اپنے ملک میں بھی بدنام ہے

معاشرت — 162 — **سراب** — کاشف زبیر
بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان

شعر و ادب — 203 — **بیت بازی** — قارئین
شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ

انعامی مقابلہ — 206 — **علمی آزمائش** — ادارہ
ذہین قارئین کے ذوق جستجو کی تسکین کے لیے منفرد انعامی سلسلہ

پہلی سچ بیانی — 208 — **خدارا** — ثوبیہ فہد
فیشن کے نام پر بچیوں کی حیا کا تیا پانچا کرنے کا شاخسانہ

دوسری سچ بیانی — 219 — **بٹوارا** — سعدیہ احمر
وہ شوہر کی محبت میں بٹوارا کی روداد سن تھی مگر....

تیسری سچ بیانی — 233 — **کباب** — صدف آصف
غریب ایک ایک بوٹی کو ترسے لوگ فریزر بھر کے رکھیں

چوتھی سچ بیانی — 239 — **گندے انکل** — س ح ا
ننھی سی بچی پر ظلم کا پہاڑ توڑنے والے درندے کا بیان

پانچویں سچ بیانی — 247 — **بے لگام جذبے** — اعظم
محبت کو پالینا آسان نہیں جب یہ شمع روشن ہوتی ہے تو...

چھٹی سچ بیانی — 261 — **محافظ** — صفدر شیرازی
اس بینک کے گارڈ نے اپنے ہی بیٹے کو گولی ماردی مگر کیوں

ساتویں سچ بیانی — 265 — **انہونی** — عمران قریشی
اس کی بیوی نے راز کھول دیا کہ وہ ہندو ہے

آٹھویں سچ بیانی — 275 — **جال** — ظہیر مرزا
دورِ حاضر کی ایک عکاس تحریر، قصہ دل پذیر

نویں سچ بیانی — 277 — **محبت کی خاطر** — نعمان نومی
والدین بھی مفاد کی خاطر بیٹی کو گھر بٹھائے رکھتے ہیں

سوغات — 000 — **پارچے** — قارئین / ادارہ
دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلومات انکشافاتی پارچے

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمہ دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 24 ❖ شمارہ 01 ❖ دسمبر 2013ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

مصور: شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد رمضان خان	0333-2168391
	رانا محمد حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	افراز علی تابش	0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS
CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

عالمی بازار میں جس تیزی سے پاکستانی کرنسی کی قیمت گر رہی ہے یہ سنگین اشارہ ہے کہ ہماری معیشت دن بہ دن روبہ زوال ہے۔ جس معاشرے میں ہوشربا گرانی کمر توڑ دے، لوگ بھوکے مرنے لگیں، اس کا ہلکا ہلکا عکس نظر آنے لگا ہے۔ سبزیوں کی خاص طور پر ٹماٹر کی قیمت کہاں پہنچی ہوئی ہے۔ عوام گیس بجلی کا بل ادا کرے۔ بسوں ٹرینوں کے بڑھتے ہوئے کرائے ادا کرے یا ضرورت زندگی کی اشیاء کی بڑھتی قیمتوں سے مقابلہ کرے یا ہار مان کر اپنے گلے میں پھندا ڈال لے۔ ذہن جواب دینے سے قاصر ہے۔ جواب تو ہمارے سیاستداں اور صحافی بھی دینے سے قاصر ہیں۔ سیاستدانوں کو صرف اپنا مفاد عزیز ہے۔ سوئس بینکوں میں جمع شدہ رقم سے مطلب ہے۔ صحافیوں کو نوکری عزیز ہے مالکان کی خوشنودی عزیز ہے اور مالکان کو اپنا بینک بیلنس عزیز ہے۔

اب نظر جا کر ٹھہرتی ہے علما کی طرف جن پر معاشرے کی سدھار کا ذمہ ہے۔ مگر وہ بھی معاشرے کی صفائی کو بھول کر دنیا کو عزیز رکھنے میں لگ چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کل تک جن کے پاس سائیکل خریدنے کے پیسے نہ تھے وہ آج پجیرو پر گھومتے ہیں۔ کوئی ان سے بھی پوچھنے والا نہیں کہ رحمت اللعالمین کی نیابت کا دعویٰ کرنے والے معاشرے میں نفرت کی آبیاری کیوں ہو رہی ہے۔

لیکن احتساب کا عمل نہ ہونے کی وجہ سے ملت کھائی کے دہانے پر پہنچ گئی ہے۔ جس سے نکلنے کی راہ صرف اور صرف اسلام کی اصل تعلیم ہے، عفو و درگزر اور نفس کی طہارت ہے۔ کیا ہم خود احتسابی کے اس عمل کو پورا نہیں کر سکتے کیوں کہ ہم صحیح ہوئے تو معاشرہ صحیح ہوا۔ معاشرہ سدھرا تو ملک سدھر گیا۔

معراج رسول

خواجہ خضر ثانی

سرگزشت

سال 1909ء اور مہینا جنوری۔ لیاری کے ایک معروف تاجر میر محمد سربازی کے گھر میں زندگی کی ایک نئی کونپل پھوٹی۔ اس بچے کی پیدائش پر قبائلی رسم کے مطابق خوب خوب خوشیاں منائی گئیں۔ اس علاقے میں زیادہ تر شیدی قبائل کے افراد مقیم تھے جو نسلاً افریقی تھے۔ دراصل حبشہ اور افریقا کے دیگر علاقوں سے سالوں قبل ان کے اجداد غلام بنا کر عرب کے مختلف ممالک میں فروخت کے لیے لائے گئے تھے پھر وہ اپنے آقا کے ساتھ سفر کرتے کرتے یہاں تک آ گئے۔ یہاں آ کر جو آزاد ہوئے انہوں نے اپنی الگ بستی بسائی۔ برصغیر میں ایسی بستیاں بہت سارے شہروں کے مضافات میں بسائی گئی تھیں۔ مالابار، کونکن، گجرات، کراچی وغیرہ میں یہ بستیاں یادہ بڑی تھیں۔ کراچی میں لیاری بھی ایک ایسی ہی بستی تھی۔ میر محمد سربازی کے اجداد نے سرباز ایران سے آ کر اسی بستی میں رہائش اختیار کی تھی اور تجارت کو بطور پیشہ اختیار کیا تھا۔ اسی علاقے میں اس بچے نے جنم لیا تھا۔ علاقے کے لوگ تعلیم کی اہمیت سے آگاہ نہ تھے مگر محمد سربازی کو شوق تھا کہ ان کا بچہ تعلیم کی دولت سے مالا مال ہو۔ انہوں نے وہاں سے کافی دور ایک مسجد میں قائم مدرسے میں اسے بھیجنا شروع کر دیا۔ چھوٹا سا بچہ، کئی گھنٹے پر محیط پیدل سفر، وہ تھکن سے چور ہو جاتا مگر تعلیم حاصل کرنے کا شوق اسے ہر روز اس مشقت پر مہمیز کرتا۔ پھر اسے مدرسۂ احرار الاسلام پرائمری اسکول میں داخل کرایا گیا۔ یہاں اسے مولانا محمد عثمان بلوچ جیسے باکمال استاد کی رہبری مل گئی جس نے اس کے ذہن کو صیقل کرنا شروع کر دیا۔ چھوٹی جماعتوں کو کامیابی سے پاس کرنے کے بعد وہ مدرسۂ مظہر العلوم جا پہنچا۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ یہاں اس نے عربی کا صرف و نحو اور احادیث و فقہ کے اسباق پڑھے۔ اب وہ تعلیم کے خزانے سے مالا مال ہو چکا تھا مگر علم کی پیاس ابھی باقی تھی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق اسے کشاں کشاں لکھنؤ کی جانب کھینچ لے گیا۔ لکھنؤ جو علم ادب کا گہوارہ تھا وہیں اس شہر میں برصغیر کی سب سے بڑی اسلامی درسگاہ دار العلوم ندوۃ العلما بھی تھی۔ اس نے اسی درسگاہ کو منتخب کیا تھا۔ کئی سال کی محنت کے بعد اس نے اعلیٰ سند حاصل کی اور 1933ء کے فروری میں وہ کراچی لوٹ آیا۔ اب اس نے دنیاوی تعلیم کی جانب توجہ دی اور اس نے میٹرک کا امتحان دیا۔ ان دنوں کراچی بمبئی بورڈ کے تحت آتا تھا۔ اس نے 1946ء میں بمبئی بورڈ کے تحت میٹرک پاس کر لیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد اس نے سرکاری اسکول میں پیشہ تدریس اختیار کیا۔ اسی دوران اس نے نوآزاد وطن کے دار الحکومت کراچی سے ریڈیو پر پہلا بلوچی پروگرام شروع کیا اس طرح برصغیر میں پہلا بلوچی گیت کراچی سے نشر کرانے کا اس نے اعزاز حاصل کیا۔ بحیثیت پروڈیوسر اس نے اپنا کام 1949ء میں شروع کیا تھا۔ اس نے لیاری کے علاقے میں اسکول کی کمی کو شدت سے محسوس کیا اور 1950 میں اسے محلہ دھوبی گھاٹ میں بلوچ سیکنڈری اسکول قائم کیا۔ یہ اس کی کوشش تھی کہ 1966ء میں انٹرمیڈیٹ کا درجہ بھی حاصل ہو گیا اور پھر 1972ء میں اسے قومی ادارے کا درجہ بھی حاصل ہو گیا۔ 1951ء میں اس بلند حوصلہ شخص نے بلوچی ادبی جریدہ ''اومن'' بھی جاری کیا جو دس سال تک بلوچی ادب کو پیش کرتا رہا۔ اس کے علاوہ بلوچی قاعدہ، چگول، اخلاق و گلدان، جیسی معرکتہ الآرا کتب تصنیف کی۔ اس کا سب سے اہم کام ہے قرآن کریم کا بلوچی زبان میں ترجمہ کرنا گو کہ ترجمے کی ابتدا قاضی عبدالصمد سربازی نے کی تھی مگر ایک دو پارے کے بعد انہوں نے کام روک دیا تھا جس کا اختتام اس نے کیا۔ 1969ء میں پیدا ہونے والے مولانا خیر محمد ندوی المعروف خواجہ خضر ثانی نے 26 نومبر 2000ء کو اس دنیا سے انتقال کیا اور لیاری کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کرنے والے کو لیاری قبرستان نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

شہرِ خیال

☆ عبدالخالق بھٹی صدر پریس کلب اللہ آباد رحیم یار خان سے لکھتے ہیں ''معروفیت نے اس طرح سے گھیر رکھا ہے کہ چاہ کر بھی تبصرہ بھیج نہیں پا رہا ہوں لیکن کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ سرگزشت سے بھی رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ جی نہیں، پڑھنے کا مرض گھٹی میں پڑا ہے اس لیے ہر رات مطالعہ ضروری ہے اور مطالعہ کے لیے سرگزشت سے بہتر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے کیونکہ ایک سرگزشت پچاس ضخیم کتابوں کے برابر ہوتا ہے۔ تلخیص کے ذریعے کوزے میں سمندر بند ہوتا ہے اور انواع واقسام کے مضامین ایک ساتھ پڑھنے کو ملتے ہیں۔ زیرِ نظر شمارہ میں تیز دماغ نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ ایک صفحہ میں مکمل سرگزشت کہ ذرا بھی تشنگی نہ رہی۔ پہلے اس صفحہ پر زیادہ تر یورپی اور یونانی شخصیتوں کا تعارف ہوتا تھا لیکن اب کئی سال سے دیکھ رہا ہوں کہ پاک وہند کی شخصیتوں کو اولیت دی جا رہی ہے جو ایک احسن قدم ہے (جی ہاں، ہم اپنے لوگوں کو ہی اولیت دیتے ہیں۔ برصغیر میں نابغہ روزگار شخصیتوں کی کمی نہیں اسی لیے یہ فیصلہ کیا ہے کہ برصغیر کی اہم شخصیتوں کو سامنے لایا جائے) زیرِلب، صوفی تبسم کی سوانح نے بہت مزہ دیا۔ اپنے دیار کے لوگوں کے حالاتِ زندگی پڑھنے کا الگ ہی مزہ ہوتا ہے۔ عقوبت خانہ، نے ہلا کر رکھ دیا۔ انسان اس حد تک درندہ بن سکتا ہے اس کا احساس تو تھا لیکن پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ چور نے بھی خوب کمال دکھایا۔ باہمت کی تعریف نہ کرنا سراسر ناانصافی ہوگی۔ بدحال قلعہ پڑھ کر سر پیٹنے کا دل کر رہا ہے۔ تف ہے ہر اس شخص پر جو اپنے ورثہ کو نظر انداز کرتا ہے۔ کس قدر حیرت کی بات ہے، غیر ممالک میں اس سے چھوٹے چھوٹے قلعوں کو سیاحوں کا مرکزِ نگاہ بنانے کے لیے لاکھوں روپے اشتہار بازی پر حکومت خرچ کرتی ہے اور ہمارے پاس دنیا کا سب سے بڑا قلعہ جو رقبے میں غیر معمولی ہے، میلوں پر پھیلا ہے اس کی حفاظت کے لیے کوئی کچھ نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ عام لوگ بھی آگاہ نہیں ہیں۔ خود مجھے بھی خبر نہ تھی کہ ہمارے وطنِ عزیز میں ایسا عجوبہ بھی ہے۔ اگر ہم کوشش کریں تو اسے بھی عجائباتِ دنیا کی فہرست میں شامل کرا سکتے ہیں اور تشہیری مہم چلا کر سیاحوں کو متوجہ کر کے زرمبادلہ کا راستہ کھول سکتے ہیں۔ قلمی الف لیلہ کے بارے میں زیادہ کیا لکھوں ہیرے کو ہیرا ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ قیمتی جو ہے۔ آدم خور پسند نہیں آیا۔ قوتِ ارادی جیسا کوئی واقعہ اپنے یہاں وقوع پذیر ہوتا تو ہم سوئم کی بریانی کھا رہے ہوتے۔ ترکی نمی وانم کا کیا کہنا۔ مردہ رسوم کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ماضی کو من وعن سامنے لا کر رکھ دینا محمد ایاز راہی کا کمال ہے۔ بہت عمدہ تحریر ہے۔ تحقیق کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ سراب نے تو گرویدہ کر رکھا ہے۔ ''انتظار'' اچھی سچ بیانی تھی لیکن اختتام پسند نہیں آیا۔ دونوں کو ایک جان ہو جانا چاہیے تھا۔ محبت زندہ باد، کل بھی زندہ باد تھی، آج بھی زندہ باد ہے۔ تین مسائل نفسیاتی گتھیوں میں الجھی تھی اور نفسیات سے میں الرجک ہوں۔ بے جا اعتماد خوب تھی، دورِ حاضر میں یہی تو ہو رہا ہے۔ لڑکیاں استاد کو بھی محبوب بنانے میں دلچسپی لے رہی ہیں جبکہ استاد باپ کا درجہ رکھتا ہے۔ چہرہ شناس بھی بہتر تھا۔ شرط لاحاصل رہی، ماں جیسی ایک لازوال سچ بیانی ہے۔ شیطان کے چیلے اور سیلاب کا سانپ سبق آموز رہی۔ اب آتے ہیں اپنے پسندیدہ صفحات پر۔ رانا محمد شاہد کیا حال ہے، اعجاز حسین سٹھار یاد کیسے ہو؟ بشریٰ افضل بہاولپور، محمد عمران جونانی، بشیر احمد بھٹی، مصری شاہ طاہر الدین صاحب، منظر علی خان، طاہرہ گلزار، احمد خان توحیدی کو سلام!''

☆ شیریں زادہ خدو خیل غور غشتو صوابی سے رقمطراز ہیں ''ایک کہانی ارسالِ خدمت ہے۔ امید ہے مزاج کے مطابق ہوگی۔ اگر کسی قریبی اشاعت میں جگہ دی تو مہربانی ہوگی (اگر سرگزشت کے معیار کی ہوئی تو لگ جائے گی)''

☆ اعجاز حسین سٹھار، نور پور تحصیل سے لکھتے ہیں ''وقت گزرتے دیر نہیں لگتی یا ہمیں احساس نہیں ہوتا۔ میں اللہ کے فضل وکرم سے اور

تمام دوستوں کی دعاؤں سے 23 اکتوبر کو حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد گھر پہنچ گیا ہوں۔ اس محفل کے دوستوں نے جن دعاؤں کا ذکر کیا ہے یہ سب میں نے خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر اور روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حاضری اور سلام ودرود کا تحفہ پیش کرتے ہوئے خلوصِ دل کے ساتھ مانگی ہیں۔ قبول کرنے والی ذات ربِ کریم کی ہے۔ جن دوستوں نے فریضہ کی ادائیگی پر مبارک باد پیش کی ہے۔ بندۂ ناچیز سب کا شکر گزار ہے۔ ''زیرِلب'' میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی زندگی اور شخصیت کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ ساجد امجد کی بہترین تخلیق ہے یہاں ان کے مشہور گیت اور قومی نغموں کا مختصر ذکر ہے۔ نور جہاں کی آواز میں ''اے پتر ہٹاں تے نہیں وکدے'' جب بھی ٹی وی پر چلتا ہے تو یقین کیجیے آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ یہ خیال صوفی صاحب کو کیسے آیا نغمہ کیسے تخلیق ہوا یہ تشنگی ہنوز باقی ہے۔ ''عقوبت خانہ'' پڑھنے کے باوجود دل یہ ماننے کو تیار نہیں کہ جسے اشرف المخلوق کہا گیا ہے اتنا ظالم اور جابر ہو سکتا ہے، اور صحت مند انسان کو تڑپا کر، بھوک پیاس دے کر اور اپنے ہاتھوں دہکتی آگ میں پھینک کر تماشا دیکھنا الگ بات ہے۔ ''بدحال قلعہ'' کا احوال اچھے مختصر پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ تجسس پیدا نہیں ہوا۔ ''قلمی الف لیلہ'' کا سلسلہ مجھے شروع سے پسند رہا ہے جس کی وجہ گاؤں میں رہنا اور شہری زندگی سے دوری ہے دورانِ تعلیم ہی مطالعہ کا چسکا پڑا تو تجسس کو ہوا ملی پھر اخباروں اور رسالوں میں قلموں سے متعلق معلومات سے یہ کمی پوری کرتے رہے اور معلومات بڑھاتے رہے اب بھائی علی سفیان آفاقی نے ساری تشنگی دور کر دی ہے ایک بات پر اکثر حیران ہو جاتا ہوں کہ جب کسی مشہور شخصیت کا قصہ چھیڑتے ہیں تو ساتھ یہ ضرور تحریر ہوتا ہے کہ میں انہیں اس وقت سے جانتا ہوں یوں ان کی عمر کا اندازہ لگایا جائے تو دل میں وسوسے جنم لینے لگتے ہیں کہ وہ طویل تر عمر پا چکے ہیں۔ دعا ہے کہ وہ طویل عمر پائیں تا کہ یہ محفلیں، رونقیں دیر تک آباد رہیں، آمین! سچ بیانیوں میں ''انتظار'' اولین تحریر ہے۔ جس نے بحث کے کئی در کھول دیے ہیں۔ یہاں بیٹوں کی بے حسی، غیر ذمہ داری اور خود غرضی کا رونا رویا جائے یا والدین کی بے بسی پر ہمدردی کریں۔ روبی تو محض لڑکی ہونے کی پاداش میں ہر طرف سے دباؤ کا شکار رہی اور سب کا رویہ دیکھ کر خواہشوں اور جذبات کو برف میں دفن کر دیا اور خوابوں کی تعبیر پانے تک اذیت ناک انتظار کرنا ہے۔ والدین کا اولاد کے لیے نرم گوشہ کیا ہوا۔ ایک ہاں سے بہاریں گھر کا دروازہ کھولنے کے لیے بے تاب ہیں بزرگوں کو یہ قربانی دے کر قبر کی منزل آسان بنا لینی چاہیے یوں دنیا میں بھی انہیں خوشیوں کی صورت صلہ مل جائے گا۔''

☆ قیصر عباس خان کی آمد بھکر سے ''ہمیشہ کی طرح معراج رسول صاحب نے اچھا مشورہ دیا اگر اجتماعی نہیں کر سکتے تو انفرادی طور پر کوشش کریں، ملک پاکستان میں انفرادی طور پر اپنا اپنا حصہ شامل کریں اور دعا کریں کہ ملک پاکستان میں سب تعصبی مسائل کا خاتمہ ہو، آمین! بہت اچھا کہا معراج صاحب نے، ہم بنگلہ دیش کھو چکے ہیں کوئی اور حصہ کھونے کی سکت نہیں، اللہ محفوظ رکھے دشمنوں سے ہمارے ملک کو۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری صاحبہ سے صرف یہ التجا تھی کہ ہم سب دعا گو ہیں اللہ پاک آپ کو اولاد دے آمین اور دوسرا آپ اس بات کو سمجھیں اللہ پاک اپنے پیاروں پر آزمائش ڈالتا ہے اور اس کی رضا پر ہم سب کو راضی رہنا چاہیے باقی بات معاشرہ یا لوگوں کی، آپ جانتی ہو ہمارا معاشرہ یا لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ باتیں اذیتیں تو ہمارے والی دو جہاں سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی کیں۔ آپ ہمت سے کام لیں جو کہ آپ پہلے لے رہی ہیں! دوسرا ضلع لیہ کی تحصیل چوک اعظم کے ڈھوری اڈا پر ایک اللہ کا ولی بابا ہے جس کا نام مصطفیٰ سائیں لیکن خان بابا کے نام سے مشہور ہے۔ آپ سے التجا ہے ایک بار جائیں، مایوسی اور ناامیدی گناہ ہے۔ نومبر کے پرچے میں سب کے سب تبصرے لاجواب تھے بہت پسند آئے۔ محمد عامر ساحل صاحب میرے پڑوسی ہیں اور ننھیال کے ضلع سے تعلق ہے ان کی آپ بیتی چھپی اور ہم پڑھ نہ سکے یا جان نہ سکے، بتا دیں میرے پاس شمارے محفوظ ہیں۔''

☆ احمد توحیدی کراچی سے رقمطراز ہیں ''برادر معراج رسول صاحب، اب باہر کے دشمنوں کی کیا ضرورت؟ ایک سے بڑھ کر ایک آستین کا سانپ ڈسنے کے لیے بے تاب ہے۔ آگ بجھا سکتے ہیں بشرطیکہ 1948، 1965 والا اتفاق ہو۔ تیز دماغ، خواجہ شہاب الدین کے بارے میں تاریخ میں بہت پڑھا جس تیز دماغ میں قائداعظم کا پاکستان ہو، وہ وطن توڑنے ولوٹنے والے لٹیروں کے ساتھ کیسے چلتا؟ شہرِ خیال میں سب سے پہلے اعجاز سٹھار صاحب کو حج بیت اللہ کی مبارک، رانا شاہد، پھر کرسی صدارت کا قبضہ مبارک ہو، بیٹی اللہ کی رحمت ہوتی ہے مگر آج بھی دورِ جہالت کی طرح بیٹی کو خوش آمدید نہیں کیا جاتا۔ عمران جونانی کراچی، بھائی میں نے ساری تاریخ لائبریری میں پڑھی۔ 40 سال مستقل ممبر رہا، کتاب وتعلیم تجارت بن گئی ہے مگر کیا کروں لائبریریاں ختم شد۔ طاہرہ گلزار پشاور، ہم سب کچھ کر سکتے ہیں بشرطیکہ اقبال والے مسلمان بن کر سوچیں۔ شاہد جہانگیر پشاور، ڈاکٹر ساجد عظیم رائٹر ہیں۔ برصغیر کے لیڈران کے نجی حالاتِ زندگی سے ہمارے ضمیر کو جھنجوڑتے ہیں، جب لیڈر ہی بے ضمیر ہو تو پھر کیا کریں؟ رانا سجاد مظفر گڑھ، تبصرہ جامع بیوٹی فل۔ واقعی جہادو دشمنانِ اسلام کے خلاف ہوتا ہے نہ کہ بے گناہ بے خبر معصوم عوام کو مارنا؟ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، آپ اپنے نام کی طرح نفیس ہیں۔ میرے دل کی بات چھین لی۔ مرد جو کچھ بھی کرے فرشتہ، عورت سو فیصد مظلوم ہو تو بھی مجرم، اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں۔ نحوست کا شوشہ جہالت ہے۔ محفل کے ساتھیوں کی اکثریت بشمول محسن علی موم، وحید ریاست بھٹی، سدرہ بانو ناگوری سب نے دہشت گردی اور مسلمانوں کی حالتِ زار کا تذکرہ کیا۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے بارے، بہت پڑھا، تفصیلاً حالات پر ڈاکٹر صاحب کا شکریہ۔ ایاز راہی صاحب نے دو صفحات پر مولانا غلام رسول مہر کے ساتھ برصغیر کے عظیم رہنماؤں کا تذکرہ کیا، وری گڈ تحریر۔ باہمت ہیریٹ جیسے لوگ اپنا وجود مجسم کر کے تاریخ میں زندہ وجاوید رہتے ہیں۔ بدحال قلعہ، پاکستان میں تاریخی عمارات کا یہی حال ہے، شاہی قلعہ لاہور کی حالتِ زار دیکھیں، ڈاکٹر وقار اچھی تحریر لائے۔ ہر ماہ لایا کریں۔ قلمی الف لیلہ کے آفاقی صاحب، 18 سال 5 ماہ سے صرف ایک ناغہ، مرزا غالب جیسے عظیم شاعر کا تذکرہ، واہ اگر قائداعظم علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان، مولانا حالی، سرسید احمد خان ودیگر برصغیر کے رہنماؤں سے آپ کی ملاقات ہوئی ہو تو ضرور لکھیں۔ ترکی نمی دانم دلچسپ

ومزاحیہ سٹری تحریر آپ جیسے عظیم رائٹر کا ہی کام ہے۔ آدم خور، خالد قریشی کی گڈ اسٹوری۔ سچ بیانیاں میں انتظار پسند آئی۔ حیرت کی بات ہے کہ بیٹیوں کی شادی پہلے کی جاتی ہے۔ روبی کے والدین اور بھائی خود ازدواجی زندگی سے لطف اندوز ہوئے۔ شادی سنتِ نبویؐ ہونے کے ساتھ مرد و عورت کی بنیادی ضرورت۔ روبی اور حسن کو فوراً شادی کرلینی چاہیے۔ خود غرض والدین اور بھائیوں کو ان کے حال پر چھوڑیں۔"

☆محسن علی موم کی بالاکوٹ سے تشریف آوری "معراج انکل کے خیالات ایک درددل رکھنے والے مسلمان اور پاکستانی کے دل کی آواز ہیں، آپ نے بجا فرمایا کہ ہمیں انفرادی طور پر کچھ کرنا چاہیے کہ بعد میں لوگ آتے جائیں گے اور کارواں بنتا چلا جائے گا۔ یک صفحی سرگزشت میں پاکستان کے ایک گمنام سیاست دان کے بارے میں پڑھا اور سراہا۔ ڈاکٹر ساجد امجد، ہمیشہ کی طرح ایک بہترین مضمون کے ساتھ آئے۔ صوفی غلام مصطفیٰ عرف صوفی تبسم کا زندگی نامہ پڑھا اور علم میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ عقوبت خانہ، پڑھ کر دل پر ایک بوجھ سا محسوس کیا انسان جب جانور بنتا ہے تو ایسی داستانیں جنم لیتی ہیں۔ بدحال قلعہ، زندہ قومیں اپنے تاریخی مقامات کی خود سے بھی زیادہ حفاظت کرتی ہیں لیکن وطنِ عزیز میں اس کے برعکس ہے۔ یہاں مقامات کیا زندہ اشخاص کی قدر و قیمت نہیں ہے اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے آمین! قلمی الف لیلہ، میں آفاقی صاحب نے درست فرمایا کہ اگر تعصب کی عینک اتار کے دیکھا جائے تو دلیپ کمار جیسا ایکٹر کوئی نہیں، مسٹر بچن کو ان کے برابر کا درجہ دینے والے سراسر تعصب برت رہے ہیں ورنہ اگر ایکٹر وہ ہیں تو دلیپ کمار جیسے نہیں۔ امتیابھ بچن سے تو موجودہ بالی وڈ ایکٹر شاہ رخ خان کی کمپیئرنگ نہیں کی جاسکتی۔ آدم خور، نہ جانے دنیا میں لوگ کیسے کیسے عقیدوں اور توہمات کے ساتھ رہتے ہیں۔ قوتِ ارادی، ایک دلچسپ تحریر تھی بے شک مضبوط قوتِ ارادی سے ناممکن کو ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ سراب، کی موجودہ قسط غیر متاثر کن رہی، ایک ہی انداز کی مسلسل تین قسطیں تھیں کاشف صاحب سے گزارش ہے کہ تھوڑا کہانی کو چینج کریں۔ سچ بیانیوں میں انتظار، خوبصورت نہیں بلکہ بہت خوبصورت تھی پتا نہیں لوگ بیٹیوں کے ساتھ ایسا رویہ کیوں رکھتے ہیں بیٹی تو خدا کی رحمت ہے لیکن لوگ اسے زبردستی زحمت بنانے پر تلے ہوئے ہیں پتا نہیں ان کی آنکھوں سے یہ پٹی کب اترے گی؟"

☆فقیر غلام حسین چنا، محلہ چاہ چینی بھکر سے لکھتے ہیں "اس بندۂ ناچیز نے ایک مضمون اسلام اور تصوف، آپ کو بھیجا مگر آپ نے کوئی جواب نہیں دیا آپ کے نومبر کے شمارہ میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں۔ اتنا ہی لکھ دیتے کہ مضمون ناقابلِ اشاعت ہے۔ (اندازِ تحریر اور معلومات سرگزشت کے معیار کی نہ تھیں مسترد کہانیوں کے بارے میں محفل میں جواب دینے سے گریز کرتے ہیں کہ تمام لوگ پڑھ لیتے ہیں۔ گر جوابی لفافہ ساتھ ہوتا تو جواب دے دیا جاتا)"

☆نجمی رحمٰن نے برملٹ، ایلوائس، یو ایس اے سے لکھا ہے "اللہ کرے آپ سب میرے اہلِ وطن کے ساتھ بخیریت ہوں سرگزشت اور سسپنس باقاعدہ مل رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اتنے اچھے معلوماتی دلچسپ رسالے شائع کرنے پر اجرِ عظیم اور لمبی عمر دے۔ اس دفعہ رانا حبیب الرحمٰن کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر تو پرچے کی جان ہے۔ بہت ہی عرق ریزی سے لکھتے ہیں۔ رحمت علی کے متعلق بہت ہی اچھا لکھا ہے۔ منت سے ملتا جلتا واقعہ میں نے پہلے بھی پڑھا ہے۔ بھوت جب کسی کو تاک لیتے ہیں تو وہ چھوڑتے نہیں آخر تک پیچھا کرتے ہیں۔ خوش قسمتی ہی تھی جو بانی کی جان چھوٹ گئی۔ ناکام ڈاکا اچھی مزاحیہ کہانی ہے، مجرم کون سبق آموز ہے۔ قرآن سے غفلت ہمیں کہاں لے جارہی ہے۔ اب تو پاکستان میں بغیر بازوؤں کے قمیصیں چل رہی ہیں۔ دوپٹا جو ہمارے مشرقی لباس کا حسن ہے غائب ہوتا جارہا ہے۔ یہ وہ پاکستان تو نہیں جس کی دو قومی نظریہ پر بنیاد رکھی گئی تھی۔ بو، جیسے کتنے بے گناہ مارے جاتے ہیں ہماری پولیس تو دنیا بھر میں بدنام ہے۔ بہت تھوڑے لوگ ایماندار رہ گئے۔ میرا بھائی آج کل کا تلخ ترین المیہ ہے۔ جو کہ بے اختیار رلا گیا۔ عمر خیام بھی متاثر کن ہے۔ موت سے فرار بہت لرزہ خیز کہانی ہے۔ علی سفیان آفاقی کی تحریر حسبِ معمول بے حد دلچسپی لیے ہوئے تھی۔ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ گیت گاتا چل بے حد متاثر کن ہے۔ واقعی اللہ تعالیٰ کا نادیدہ ہاتھ اپنے بندوں کو ہر قدم پر سہارا دیتا ہے۔ یہ زندگی ایک آزمائش ہی تو ہے۔ لطف اللہ کلیکشن کی داد دینی پڑتی ہے کہ اس نے زندگی سے صحیح لطف اٹھایا۔ اہلِ وطن کو سلام عقیدت!"

☆سیف علی اعوان نورپور اعواناں سے رقمطراز ہیں "خداوند تعالیٰ آپ کو حفظ و امان میں رکھے کہ آپ ادب کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ پہلے ہی ملک میں ہر وقت خانہ جنگی کی کیفیت ہے۔ ادب کون لکھے اور کون پڑھے۔ عرض ہے کہ پہلے بھی علی سفیان آفاقی صاحب سے گزارش کی تھی کہ کوئی مضمون "بھٹی برادران" کے متعلق لکھ دیں، شنوائی نہ ہوسکی بہرحال پھر عرض کررہے ہیں گر قبول افتد زہے عز و شرف۔"

☆عبداللہ نے مانسہرہ سے لکھا ہے "سرگزشت ایک معیاری رسالہ ہے اور پچھلے پانچ سال سے میں اس کا مستقل قاری ہوں۔ سراب اور قلمی الف لیلہ دونوں ہی میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ پچھلے دنوں میرا ایک جاننے والا کراچی سے آیا وہاں اس کے ساتھ دلچسپ واقعہ پیش آیا جو میں سرگزشت کے لیے بھیج رہا ہوں اس امید پر کہ ضرور شائع کیا جائے گا۔ گو کہ میری رائٹنگ کافی سے زیادہ ہی خراب ہے لیکن امید واثق ہے کہ واقعہ ضرور شائع کیا جائے گا۔ (واقعہ دلچسپ ہے لیکن تحریر نکھار کی ضرورت ہے۔ تھوڑا انتظار کریں)"

☆امیر مراد انصاری نیو کراچی سے لکھتے ہیں "طویل عرصہ کے بعد ماہنامہ سرگزشت کا مطالعہ کیا۔ دنیا بھر کے مسلم ممالک میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن پاکستان خصوصاً شہر کراچی میں ہونے والے مظالم کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ ایسا کیوں؟ ادارہ سرگزشت سے مودبانہ گزارش ہے کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لیجیے ہم بحیثیت صحافی اپنے گھر کو تو ٹھیک کر نہیں پارہے ہیں۔ اور عالمی مسائل میں الجھ رہے ہیں۔ اس شمارے میں عیدالاضحیٰ کے حوالے سے بھی کچھ نہیں لکھا گیا اور نہ ہی اپنے قارئین کو عید مبارک کہا گیا۔ شاید مبارک باد دینا بھول گئے۔ علاوہ ازیں خطوط کے اس

کالم میں تحریر بہت باریک ہوتی ہے۔ آیندہ ماہ سرگزشت شمارہ کے ساتھ ایک چشمہ بھی لینا پڑے گا۔ براہِ کرم الفاظ بڑے کیے جائیں خصوصاً قاری کا نام اور شہر کا نام بڑے لفظوں میں شائع ہونا چاہیے۔ سرگزشت میں کالم بہت کم ہیں کچھ نئے کالم بھی شروع کیے جائیں۔"

☆ملک جاوید محمد خان سرکانی نے بہرہ زئی جھنگ سے لکھا ہے "مگر تاخیر سے موصول ہوا" اداریہ مسلمان ممالک کے نثری مرثیہ کی حیثیت رکھتا ہے اس بدحالی کی سب سے بڑی وجہ مسلمانوں کا باہمی انتشار ہے۔ مولانا محمد علی جوہر نے کہا تھا ہندوستان میں انگریز کے دو دشمن ہیں ہندو اور مسلمان اور ہندو کے بھی دو دشمن ہیں انگریز اور مسلمان جبکہ مسلمانوں کے تین دشمن ہیں ہندو انگریز اور خود مسلمان۔ اب تو ساری مسلم دنیا آپس کی کھینچا تانی میں الجھی ہوئی ہے۔ پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کے خلاف سنی اور شیعہ بھی شانہ بشانہ لڑے تھے، احمد شاہ ابدالی کی افواج سنی عقیدہ تھیں مگر نواب اودھ شجاع الدولہ کو ساتھ رکھتے تھے 1761ء ابھی کل کی بات ہے ملکوں کی تاریخ میں ڈھائی تین سو سال اتنی بڑی مدت نہیں ہوتی 1857ء-1947 کی تحریک آزادی کو ماضی قریب کی بات ہے جب تمام مسلمان شانہ بہ شانہ لڑ رہے تھے علامہ اقبال کا شعر برمحل ہے۔ مرزا، سید، اور پٹھان کے ساتھ ساتھ بریلوی، دیو بندی، مسلکی اور علاقائیت، صوبائیت، لسانیت، وطنیت اور سیاسی وابستگی کے علاوہ ذاتی مفادات اور ترجیحات کے بعد ہم مسلمانوں کو مسلمان کہلوانا وارا کھاتا ہے؟ یک صفحی سرگزشت کی شخصیت نور الصباح بیگم صرف تحریک خلافت و آزادی کی مجاہدہ ہی نہ تھیں سیاست سے کنارہ کشی کے بعد ایک شاعرہ، افسانہ، ڈراما اور تنقید نگار کی حیثیت سے ایک نمایاں ادبی مقام بھی حاصل کیا۔ اب تک ان کی چھ کتابیں تحریک پاکستان اور خواتین، پاکستان کی مشہور شخصیتیں، گردشِ دوراں، گریزاں، نورِ مشرق اور صبح غزل شائع ہوچکی ہیں۔ اپنی جرأت مندی، مستقل مزاجی اور مضبوط قوتِ ارادی کے باعث بجا طور پر زنِ آہن کہلانے کی مستحق ہیں۔ رانا شاہد صاحب مسندِ صدارت حاصل کرنے پر مبارکباد، اعجاز سخار کو... حج مبارک ہو اللہ تعالیٰ آپ کی اس نیک سعی کو قبول فرمائے۔ رانا حبیب الرحمان مایوسانہ باتیں کرتے کرتے اچانک ہوش میں آگئے اور ڈاکٹر روبی کو تسلی دلاسا دینے لگے اچھی بات ہے عمران جونانی کی خاص تحاریر والی تجویز قابلِ غور ہے۔ جناب احمد خان توحیدی آپ کے تبصرے میں پہلی دفعہ ربط نظر آیا اس انداز کو برقرار رکھ کر مزید بہتری لائیے۔ طاہرہ گلزار صاحبہ گلہ اپنوں ہی سے ہوتا ہے آپ کی ناراضی بجا ہے درست لفظ ناراضی ہے نہ کہ ناراضگی کسی کی غیر حاضری کو اتنی شدت سے محسوس کرنا آپ کا خاصہ ہے ورنہ تو شہرِ خیال میں کسی کو کسی کا خیال نہیں۔ لیکن آپ سے شکوہ ہے کہ غیر حاضر ساتھیوں میں ہمارا نام شامل نہیں کیا یا پھر لغزشِ قلم ہو کہ جاوید سرکانی کی بجائے کاودانی لکھا گیا کیونکہ ایسے کسی نام سے اپنی واقفیت نہیں۔ واہ رے خوش فہمی، بہرحال طے ہے کہ طاہرہ گلزار جیسے اپنائیت پیشہ اور وفا سرشت نیک لوگ کم کم ہی ہیں۔ رانا شاہد اور رانا سجاد کو بھی زندگی کا نیا ہم سفر مبارک ہو۔ ابنِ کبیر، شکیل صدیقی، امیمہ سلیم، مریم کے خان، طارق عزیز خان، محمد ایاز راہی اور سید احتشام بہترین تحاریر لے کر آئے۔"

☆محمد عمران جونانی کراچی سے رقمطراز ہیں "سرگزشت ماہ نومبر کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل محترمہ امیمہ سلیم کے مضمون کے بارے میں بات کرنا چاہوں گا جو اکتوبر کے شمارہ کا حصہ تھا، اتنی عمدگی کے ساتھ گیت گاتا چل، لکھنے پر محترمہ کو دل سے مبارکباد دیتا ہوں، رونید رجبین کے نام اور کام سے متعارف ہوئے، مسلسل محنت اور کامیابیوں کی روداد پڑھی، ساتھ ہی ساتھ اس دور کی مشہور فلمی ہستیوں کا چیدہ تذکرہ بھی ملا غرضیکہ تحریر نے تادیر اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ نومبر کے اداریے کی یہ بات سیدھی دل کو لگی کہ ضروری نہیں کہ ہر کام اجتماعی انداز میں ہو، اگر آپ تبدیلی چاہتے ہیں تو بسم اللہ کرد چراغ سے چراغ جلے گا۔ افتخار عارف صاحب نے کیا خوب کہا ہے کہ وہ انسان بڑا خوش نصیب ہے جس کا شوق ہی اس کا پیشہ بن جائے، ایک ایسے ہی خوش نصیب صوفی صاحب سے ڈاکٹر ساجد نے ملاقات کروائی جن کے نام سے ہمارے عہد کا بچہ بچہ واقف تھا، ایک تو درسی کتب میں ان کی نظمیں اور رہی سہی حکیم صاحب کا ہمدرد نونہال پوری کردیتا تھا۔ امرتسر لاہور کی ادبی فضاؤں اور ادبی انجمنوں کے واقعات نے مزہ دوبالا کردیا۔ یہ پڑھ کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ نور جہاں کے بہت سے جنگی نغمات کے خالق بھی ہمارے صوفی صاحب تھے، حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ محمد ایاز راہی نے اپنے مختصر مضمون کے ذریعے سمجھایا کہ دریا کو کوزے میں بند کرنا کسے کہتے ہیں۔ یہ دو صفحات بھی معلوماتی اعتبار سے سرمایہ ٹھہرے۔ رانا محمد شاہد صاحب اللہ آپ کی بیٹی کو لمبی تندرست عمر عطا فرمائے اس کی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے، بہنوں اور بیٹیوں کی اہمیت دل میں ہونا بھی اللہ کی عطا ہے ورنہ ایسے پتھر دل بھی دیکھے اولاد جن کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ محمد عامر ساحل آپ کے دل میں قوم کا درد ہے اس کی حفاظت کیجیے گا کہ گئے گزرے دور میں یہ بھی اثاثہ ہے۔ قیصر عباس! وعلیکم السلام، لگتا ہے آپ سچ بیانیاں سب سے پہلے اور کافی دلچسپی سے پڑھتے ہیں، تبصرہ پسند آیا۔ میری بہن طاہرہ گلزار! سدا خوش رہو اللہ آپ کی ساری مشکلات آسان فرمائے جتنا ہوسکے روشن پہلو دیکھیں وقت کا کیا ہے گزرتا ہے گزر جائے گا، آپ نے سچ کہا خوشبو اور کتاب دو ایسے تحفے ہیں جو مجھے بہت عزیز ہیں، عالم اسلام کے بارے میں آپ کا ایک ایک لفظ دل میں اتر گیا، اللہ نہ کرے کہ ہمارا کیا آنے والی نسلیں بھگتیں۔ شاہد جہانگیر صاحب کے تبصرہ میں مختلف مختصر معلومات کا ایک جہاں آباد ہے آپ کے زیرِ تحریر مضمون کا انتظار رہے گا۔ رانا سجاد نے تبصرہ پسند کیا، شکریہ قبول کریں شہرِ خیال کے غیر حاضر دوستوں کو یاد کرنے کی روایت جاری رکھیے گا۔ محسن علی موم کا تبصرہ اچھا لگا الفاظ کا چناؤ خوب ہے۔ وحید ریاست صاحب ہر پاکستانی کی طرح حالات سے کچھ زیادہ ہی مایوس نظر آئے ہر جی! ویسے موجودہ حکومت سے مایوس ہونے میں آپ کچھ زیادہ جلدی نہیں کررہے؟ رانا سجاد نے ہماری ہم شہر سدرہ بانو کو یاد کیا اور وہ اگلے ہی صفحہ پر اپنے مخصوص طرزِ تحریر کے ساتھ نظر آگئیں۔ قلمی الف لیلہ میں ادیبوں کے انٹرویوز والا حصہ مجھے بھی بہت پسند آیا ایک تو وہ نام اتنے بڑے بڑے اس پر طرہ لطف اللہ صاحب کا اندازِ بیاں جسے آفاقی صاحب نے خوبی سے نقل کیا، عبدالقیوم صاحب آپ نے ابتدا میں کہا کہ آپ کی قلمی دنیا سے تعلق رہا ہے تو دلچسپی بڑھ گئی اندازِ تحریر منفرد ہے آتے جاتے رہیے گا۔ امیمہ سلیم کی قوتِ ارادی نے ایک لمحہ کے لیے نظریں ہٹانے کی اجازت نہیں دی۔ مجال ہے جو آخر تک ذرا سا دھیان بھٹکا ہو، منظر نگاری عمدہ ہے، ڈان کی بے بسی اس کی بیوی کا لڑکھڑا کر گرنا، امدادی کارکنوں کی محنت، آخر میں جب کرسٹوفر زندہ باہر آیا تو آنکھیں نم ہوگئیں۔ اسی ضمن میں اس بات کی نشاندہی

ضروری ہے کہ آج یہ جذبہ ہمارے ہاں بہت کم رہ گیا ہے اللہ نہ کرے کوئی مشکل میں ہو تو محض انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ساتھ دیتے ہوئے بہت کم لوگ نظر آتے ہیں اور نہ ہی ریسکیو کے منظم ادارے موجود ہیں، رہے نام اللہ کا۔ محمد ظفر حسین صاحب کی سچ بیانی، چہرہ شناس نے دل موہ لیا ان کے بیان کے مطابق سرگزشت میں ان کی یہ پہلی کہانی ہے دیکھیے مزید کہانیاں کب دماغ سے کاغذ کا سفر طے کرتی ہیں۔ ایک بظاہر عام سی کہانی کو آپ کے اندازِ بیان نے دلچسپ بنا دیا خاص کر پرانے اور آج کے کراچی کا تذکرہ، صدر کے علاقہ کا احوال آنکھوں میں گھوم گیا۔"

☆محمد عامر ساحل لکھتے ہیں "شاہد بورے والا نے پوچھا کہ عامر ساحل کی آپ بیتی کب سے چھپنے لگی تو میرے عزیز بھائی جان میں نے یہ تو نہیں کہا کہ میری آپ بیتی چھپ گئی ہے بلکہ 2 بار میں نے ادارہ کو بھیجی لیکن قابلِ اشاعت نہ تھی تو نہ چھپ سکی۔ آپ کو بیٹی کی بہت بہت مبارک ہو اللہ پاک کا خوبصورت اور انمول تحفہ انسان کو بیٹی کی شکل میں ملتا ہے۔ محسن علی موم، وحید ریاست بھٹی، سدرہ بانو ناگوری، عمران جونانی، ان سب دوستوں کے تبصرے بے حد پسند آئے۔ محرم الحرام کا مہینہ شروع ہو گیا ہے اور پورے پاکستان میں سیکورٹی کے انتظامات سخت کر دیے گئے ہیں لیکن ان سخت انتظامیہ کے باوجود دہشت گرد عناصر پھر بھی اپنا کام کر کے آسانی سے نکل جاتے ہیں پھر اتنی سیکورٹی اور کرفیو، موبائل سروس بند کرنے کا کیا فائدہ۔ احتیاط کے طور پر تو موبائل سروس بھی بند کرنا ٹھیک ہے لیکن اس سے مسئلے کا حل تو نہیں ہے نا۔ ہمارا شہر ڈیرہ اسماعیل خان پاکستان کے شہروں میں دہشت گردی کے حوالے سے محرم کے دنوں میں انتہائی حساس ترین شہر قرار پایا ہے اور ہر سال محرم میں کوئی نہ کوئی بلاسٹ ضرور ہوتا ہے۔ آخر اتنی سیکورٹی اور سخت انتظامات کی وجہ سے بھی ان کو روکا کیسے نہیں جا سکتا۔ پچھلے سال محرم میں نویں 9 محرم کو بھی ماتمی جلوس میں دھماکا ہوا اور اس کے بعد 10 ویں محرم کو بھی ڈیرہ شہر کے حسین بازار بھابیہ بازار میں چوگلیہ کے مقام پر جہاں سے سب سے بڑا ماتمی جلوس نکلتا ہے وہیں مین جگہ پر بم بلاسٹ ہوا تھا اور بلاسٹ کے بعد وہیں پر نصب CCTV کیمروں کی ویڈیو چیک کرنے لگے تو ان کیمروں کے آگے بلاسٹ سے پہلے ہی نامعلوم افراد نے بلیک پیپر چڑھا دیا تھا تو میرا سوال یہ ہے کہ آخر اتنی سخت چیکنگ اور کرفیو کے دوران اتنی آسانی سے بم رکھ کون گیا جو کہ ایک دکان کے ساتھ تھا۔ اور کیمروں کے آگے بلیک پیپر کس نے چڑھایا اور صبح سویرے جلوس سے بم ڈسپوزل اسکواڈ نے تمام راستوں اور چوگلیہ کے مقام کو کلیئر قرار دیا تھا۔ تو یہ ہے ان انتظامیہ کی کہانی کہ اتنے کیمرے اتنی بڑی سخت انتظامی سرگرمی اور سخت نگرانی کے باوجود پورے پاک وطن میں یہی سب کچھ ہو رہا ہے نہ جانے کب اس پاک وطن کے اندر امن و بھائی چارہ ہوگا۔ پاکستانی فلم Waar ریلیز ہوئی تو دنیا کے 25 ممالک میں نمائش ہوئی اور آتے ہی چھا گئی اور ریکارڈ بزنس کر رہی ہے اور انڈین میڈیا اس وار سے بہت ہی زیادہ جل رہا ہے۔ اگر اس طرح کی معیاری فلمیں ایک کے بعد ایک آتی رہیں تو لولی وڈ ایک بار پھر بولی وڈ کا پاکستان میں ضرور خاتمہ کر دے گا۔ عقوبت خانہ پڑھی تو جنگ عظیم کے واقعات سے پردہ اٹھا اور پڑھتے پڑھتے میرے تو رونگٹے ہی کھڑے ہو گئے کہ انسانیت کا اس طرح سے دل دہلا دینے والا سلوک کیا۔ واقعی اگر انسان درندگی پر آ جائے تو انسان سے بڑا درندہ کوئی نہیں ہے۔ اللہ پاک ان سب بھٹکے ہوئے انسانوں کو ہدایت دے اور ہمارے پاک سرزمین پاکستان کو تاقیامت ایسی آفتوں اور دہشت گردوں سے محفوظ رکھے اور یہ محرم الحرام بھی امن و سکون سے گزر جائے۔"

☆عبدالرؤف عدم کا خلوص نامہ راولپنڈی سے "موجودہ حکمرانوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں عوام کو چھٹی، ساتویں، آٹھویں کے سارے دودھ یاد کرا دیے ہیں۔ ابھی جانے اور کیا کیا یاد آئے گا ہم لوگوں کو، یقیناً ہماری غلطیوں کی سزا کے طور پر ایسے "نایاب" حکمران ہمارے سروں پر مسلط کیے گئے ہیں۔ لیکن ان کا تذکرہ کر کے اپنا ہی دل جلانے کا فائدہ...... اس لیے خاموشی سے شہر خیال میں داخل ہوتے ہیں۔ رانا محمد شاہد! اللہ کی رحمت آپ کے گھر میں آئی، بہت بہت مبارک ہو۔ میری بھی ایک ہی ننھی پری ہے، قاسیہ نام ہے اس کا۔ ماشاءاللہ 23 نومبر کو دو سال کی ہو جائے گی۔ طاہرہ گلزار بہنا، تبصرے کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ہم واقعی قدیم ہیں لیکن اتنے بھی نہیں کہ ہمارا اشمار آثار قدیمہ میں ہونے لگے۔ آپ کے اندازِ تحریر میں دلکشی بھی نظر آئی اور چاشنی بھی۔ رانا سجاد، ہم مصروفیت کے جال میں قید ہیں عرصہ دراز سے، اب اس جال سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں، یقیناً ہمارے تبصرے باقاعدگی سے نظر آئیں گے۔ سدرہ بانو ناگوری، بہنا بلیک لسٹ میں نام آنے کے باوجود آپ کا حوصلہ قابلِ داد ہے، اچھا لگا آپ کا یہ انداز، واقعی غم بھول کر مسکرانے والے، بڑے عظیم لوگ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، ہمیں دیکھ کر آپ کو خوشی ہوئی، اچھا لگا۔ آپ نے اولاد نہ ہونے کے باعث لوگوں کے جس رویے کا ذکر کیا، اس نے بہت دکھ پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد اولاد کی نعمت سے نوازے آمین! صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی سرگزشت نے شمارے کو چار چاند لگا دیے۔ ایسی نابغہ روزگار شخصیت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ صوفی صاحب کے دامن میں اگر اور کچھ بھی نہ ہوتا، تب بھی "اے پتر ہٹاں تے نہیں وکدے" ان کا نام زندہ جاوید رکھنے کے لیے کافی تھا۔ نسرین بٹ کی "چور" اور مریم کے خان کی "باہمت" متاثر کن تحریریں ہیں۔ آفاقی انکل اس بار غالب کا تذکرہ کرتے نظر آئے۔ آفاقی انکل اس آفاقی شاعر کا تذکرہ بے شمار مرتبہ کر چکے ہیں لیکن ہر مرتبہ یہ تذکرہ اچھا لگتا ہے، اب یہ کمال آفاقی انکل کا ہے یا غالب کا، یہ ایک مشکل سوال ہے۔ غالباً غالب امکان یہی ہے کہ یہ غالب کا ہی خاصہ ہے کہ جہاں اور جب تذکرہ کیا جائے غالب ہمیشہ غالب ہی رہتا ہے۔ سچ بیانیوں میں انتظار، بہترین رہی، روبی کے بھائیوں کے رویے نے دکھ پہنچایا۔ روبی کا شادی نہ کرنے اور انتظار کرنے کا فیصلہ یقیناً حیران کن ہے لیکن ایک بیٹی کے طور پر اس کے علاوہ کوئی فیصلہ کرنا اس کے لیے یقیناً بہت مشکل تھا۔ محبت زندہ باد، میں آدم خان کا کردار ضرورت سے زیادہ خود پسند ثابت ہوا۔ کہانی کچھ زیادہ متاثر نہ کر سکی۔ تین مسائل میں بڑی خوبصورتی سے تین اہم مسائل کی نشان دہی کی گئی لیکن مجموعی طور پر کہانی میں مبالغے کا عنصر زیادہ نمایاں نظر آیا۔ بے جا اعتماد، میں اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائی گئی کہ کچھ والدین بیٹیوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کر کے اپنے اور ان کے پاؤں پر خوب زور سے کلہاڑی مارتے ہیں۔ کہانی کچھ نامکمل نظر

آئی جسے جلدی میں ختم کیا گیا۔"

☆صوبیہ شاہ ہری پور ہزارہ سے لکھتی ہیں "نومبر کا سرگزشت 6 تاریخ کو ملا کہانی فی الحال کوئی نہیں پڑھی جس پر تبصرہ کروں مجھے صرف رانا محمد شاہد اور روبینہ نفیس انصاری کے خط نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ اللہ نے رانا محمد شاہد صاحب کو بیٹی جیسی نعمت اور رحمت سے نوازا۔ سن کر بہت خوشی ہوئی اور لوگوں کے تاثرات کے بارے میں پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ انسان انتہائی ناشکرا ہے۔ روبینہ نفیس کے یہاں اولاد نہیں، میں ان کی کیفیت بخوبی سمجھ رہی ہوں۔ روبینہ نفیس کی خواہش ہوگی کہ اللہ کم از کم ان کو ایک بیٹی ہی عطا کر دے۔ یعنی کہ یہ اللہ کی مرضی اور رضا ہے کہ جن کو اولاد دیتا ہے تو بیٹے بھی اور بیٹیاں بھی۔ اگر نہیں دیتا تو بیٹی بھی نہیں دیتا۔ رانا محمد شاہد صاحب آپ کا خط بہت اثر انگیز تھا۔ اور روبینہ سسٹر بہادر بنیں۔ اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہوں اور نہ لوگوں کی باتوں سے دکھی ہوں۔ سرگزشت کے تمام قارئین کی نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اور رانا بھائی میری صرف ایک بیٹی ہے۔ مگر وہ مجھے بیٹوں سے بھی بڑھ کر ہے۔"

☆ایس ایم یوسف کی پچوکی سے آمد "اگرچہ میں سرگزشت کا مسلسل قاری ہوں لیکن بعض اوقات کاہلی کی وجہ سے پرچہ مس ہو جاتا ہے۔ اور یہی کچھ اکتوبر کے شمارے کے ساتھ بھی ہوا۔ تاہم نومبر کے شمارے کے ساتھ ہی اکتوبر کا پرچہ ہاتھ لگ گیا۔ جہاں اس پرچے کے مضامین اہلِ قلم ہی سربند کرتے ہیں وہاں ان میں تنقید کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے اور اس ایک امر کی جانب توجہ مبذول کرا رہا ہوں۔ صفحہ 157 پر محمد ایاز راہی صاحب کا مضمون عمر خیام نظر سے گزرا۔ اگرچہ اس میں دو رباعیات درج ہیں لیکن ان کے الفاظ میں وہ درستگی نہیں ہے جو ہونا چاہیے تھی۔ لہٰذا یہ پیغام ایاز راہی صاحب تک پہنچا دیں تاکہ درستگی ہو سکے۔"

☆امین مراد انصاری نے نیو کراچی سے خط بھیجا ہے "شمارے میں اپنا خط نہ پا کر افسوس ہوا۔ میں گزشتہ چند ماہ سے سرگزشت کا مطالعہ کر رہا ہوں اور ہر ماہ شہرِ خیال میں اپنی رائے کا اظہار بھی کر رہا ہوں پہلا خط شامل نہیں ہوا اب یہ دوسرا خط ہے۔ پہلے خط میں، میں نے کچھ ڈائجسٹ پر تنقید کی تھی شاید اس لیے میرے خط کو شامل نہ کیا گیا ہو۔ (آپ کا خط پرچہ بازار میں پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد موصول ہوا تھا) آپ سے گزارش ہے کہ تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط کو اگلے شمارے میں شامل کیا جائے انہیں ضائع نہ کیا جائے۔ (پھر نئے خطوط کا کیا کیا جائے گا کیونکہ صفحات 8 ہی مختص ہیں) آپ سے ایک اور گزارش کروں گا کہ اداریہ میں عالمی مسائل کے بجائے ملکی مسائل کا ذکر ہو تو بہتر ہے۔ میں نے اپنے گزشتہ خط میں ذکر کیا تھا کہ نئے سال کے موقع پر کچھ نئے سلسلے شروع کیے جائیں امید ہے کہ غور فرمائیں گے۔ سرگزشت میں قلمی الف لیلہ معلوماتی سلسلہ ہے اسے جاری رکھا جائے اور کوئی ایک ایسا کالم بھی شروع کیا جائے جس میں تبصرہ نگار اپنا موبائل نمبر کے ساتھ شامل ہو سکے۔ (اس قسم کے کالم سے الجھنیں پیدا ہوتی ہیں اور مس کال سے لوگ پریشان ہو اٹھتے ہیں)"

☆انجم فاروق ساحلی کا مکتوب لاہور سے "قلمی الف لیلہ میں آفاقی صاحب نے غالب، دلیپ کمار اور امیتابھ بچن سے متعلق متاثر کن تبصرے قلم بند کیے۔ تصاویر کا اہتمام بھی اچھا تھا۔ آدم خور اچھی اور معیاری کاوش تھی۔ چور، باہمت اور قوتِ ارادی پر مضامین بھی جاندار تھے۔ رانا محمد شاہد اور رانا محمد سجاد صاحب تذکرہ قلم بند کرنے کا شکریہ۔ ڈاکٹر انور سدید کے علاوہ کچھ فاصلے پر جہانزیب بلاک میں ڈاکٹر سلیم اختر بھی موجود ہیں۔ معروف کیمرا مین نبی احمد، رائٹر بشیر نیاز اور نقاد آغا اشرف کو وقت نے چھین لیا۔ اب ماحول پھیکا لگتا ہے فلم کا۔ والد سعید ساحلی فلم رائٹر اور چچا ڈاکٹر وحید عشرت بھی گزر گئے۔ مدیر سرگزشت نے اس مرتبہ بڑی محنت اور عرق ریزی سے علمی اقتباسات کو پرچے کی زینت بنایا مرسلہ بھی اچھا معلوماتی تھا۔ عقوبت خانہ تحریر بھی خوب تھی۔ زیرِ لب ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ ترکی کا سفرنامہ اور سراب سلسلے اچھے انداز میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ آپ بیتیوں میں انتظار، محبت زندہ باد، سیلاب کا سانپ زیادہ بہتر معلوم ہوئیں۔"

☆ابن مقبول جاوید احمد صدیقی نے راولپنڈی سے لکھا ہے "معراج رسول کا اداریہ کہ لفظ بہ لفظ فکر میں ڈوبا کہ 1971ء کا سانحہ بھی پڑوسی ملک نے 1952ء سے شروع کر دیا تھا۔ اور اب حالات اس ڈگر پر چل رہے ہیں کہ ہمارے اربابِ اقتدار اور خود عوام نہ سنبھلی تو خوفناک حد تک خانہ جنگی کا خطرہ لاحق ہوگا۔ ان تمام سازشوں کے لیے یہ بنیا کیا کچھ نہیں کر رہا۔ ہم امن کی آشا کی صرف تمنا ہی کر سکتے ہیں ورنہ ہندو صرف لارے لپے ہی صدیوں تک لگاتا رہے گا۔ پانی کئی دریاؤں کا بند کیا گیا؟ یہ ہمارے ساتھ میل ملاپ والا رویہ ہے۔ چند ایک بڑے شہروں کو چھوڑ کر بھارت گندگی، تعفن اور بے روزگاری سے بھرا پڑا ہے۔ سڑکوں کی حالت انتہائی خراب اور مہنگائی کا جن عوام کو کھائے جا رہا ہے۔ عام آدمی کا تو جینا حرام ہے کہ مہنگائی اور بے روزگاری نے عوام کی جان لے لی ہے۔ وہاں پیاز دو سو کلو تک بک رہی ہے۔ اور دیہاتوں میں خودکشیاں عام ہیں۔ اور پاکستان میں عوام ان کے رئیلٹی شوز، ڈرامے، اور انعامات شوز پر مرمٹنے کو تیار ہیں۔ فیشن کے نام پر یہ لوگ اتنے بے شرم ہیں کہ انسانیت بھی شرما جائے۔ ادھر یہ تو اب واضح ہے کہ امریکا ہمارے ہر امن منصوبہ کو سبوتاژ کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ اور ہمارے اربابِ اختیار نے اب جا کر ڈرون حملوں کے خلاف ایکشن کا ارادہ کیا ہے۔ عمل ہوگا یا نہیں یہ کوئی نہیں جانتا۔ اب دیکھیے گیس کا منصوبہ ایران کے اصرار کے باوجود التوا میں ڈالا جا رہا ہے؟ حرام کا بے دریغ استعمال، رشوت اور ذخیرہ اندوزی انتہا سے بڑھ گئی ہے۔ انسان کی قدر انتہائی گھٹ گئی ہے۔ عذاب الٰہی کے جھٹکے بھی ہمیں سنوار نہیں سکتے کہ بے حسی اور لاابالی پن بھی آسمانوں کو چھو رہا ہے۔ بلوچستان کا زلزلہ، دہشت گردی سے انسانوں کا بے دریغ قتل، اور طوفانِ بادوباراں ان آفات کو ہی ذرا سوچ سمجھ لیں۔ کاش ہمارے بڑے بھی اپنی جان لڑا دیں کہ ملک کے حالات ٹھیک ہوں۔ نئی پود کیا صرف موبائل، فیس بک، OLX اور دوسرے پروگراموں میں الجھی رہے

گی؟ شہرِ خیال میں آیئے تاکہ چند لمحوں کے لیے خوشی بھی بانٹ سکیں۔ اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوسکیں۔ پہلے تو اعجاز حسین سخار کوجی کی دل کی گہرائیوں سے مبارکباد۔ اور رانا محمد شاہد کو بیٹی کی مبارک باد۔ شاہد جی آپ یقین کریں میرے منجھلے بیٹے کے ہاں پہلے بیٹی اور پھر بیٹی ہی ہوئی۔ یہ ایم فل ہے اور الیکٹرونکس کا بہترین کاروبار کررہا ہے۔ دونوں بیٹیوں کے بعد اس میں چار چاند لگ گئے اور آرڈرز یعنی رزق کی برسات ہوگئی۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے حساب سے کوئی مسلمان بیٹیوں کی رحمت سے انکار کرے گا؟ بحیثیت مسلمان یہ ہمارا ایمان ہے۔ شاہد کا تبصرہ بہت بہترین ہے اور صدارت بھی مبارک۔ ساحل کے لیے آپ نے شاندار جملہ لکھا ہے کہ کوئی اور رسالہ پڑھ کر تو تبصرہ نہیں کردیا۔ اور ریلوے والی تو قدرِ مشترک نکلی کہ ہم بھی ریلوے کے ہی اردگرد گھومتے رہے کہ والد صاحب انجینئر تھے۔ اب ریلوے کی تباہی دیکھ کر مجھے تو زیادہ ہی دکھ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اچھے دماغوں اور ذہین لوگوں کی ناقدری تو ہمیشہ سے رہی۔ انجم فاروق ساحلی مختصر ترین تبصرہ کیوں؟ اور ہاں یہ کون کسی کا منتظر ہے؟ محمد عامر، ساحل صاحب نے تو سمندر کنارے کھڑے ہوکر دنیا نامہ سنادیا اور درد دل کے لیے کئی کہانیاں، واقعات گوش گزار کردیے مگر سمندر کے اندر سے سیپ اور موتی جو تھے ان کی پرکھ نہ بتائی ذرا رسالے کے اندر بھی ڈوبکی لگائی تھی نا!! خیر جنرل اچھا خط تھا۔ قیصر عباس خان کا مختصر تبصرہ اچھا تھا۔ عمران جونانی کا طویل تبصرہ زبردست تھا۔ اور لائبریریوں کے متعلق اچھی معلومات تھیں، اس کے علاوہ انتہائی مہنگی ہونے کی وجہ سے عام قاری تو کیا خاص قاری کی بھی جیب اجازت نہیں دیتی۔ تین سو صفحے کی کتاب اب چار سو سے چھ سو کے درمیان ملتی ہے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس صاحبہ کو بہترین مشورہ دیا ہے۔ اور میں بھی یہی کہوں گا کہ یہ سب خالق مطلق ہی کے ہاتھ ہے۔ میرے اپنے ایک بھتیجے بھی اولاد کے لیے دس سال سے ترس رہے ہیں۔ اللہ سب کو نوازے آمین! باقی فرداً فرداً ساتھیوں سے گفتگو خوب تھی۔ اور تبصرہ بھی بامعنی اور جاندار، مبارکباد، طاہرہ گلزار آپ کی شتر مرغ والی مثال ہے سو فیصد متفق ہوں اور اسلام سے روگردانی ہی ہر برائی کی جڑ ہے۔ اور باقی بھی آپ نے بے حد مناسب لکھا ہے۔ ہاں ہر مرد ایسا نہیں ہوتا اور نہ ہر عورت ہی فرشتہ ہوتی ہے کیوں چند ایک واقعات کی وجہ سے ایک سوچ بنالی کہ سب خراب ہیں! اور ہاں شاہد صاحب کو کہانیوں پر تبصرہ نہ کرنے کا گلہ کرتے ہوئے اس دفعہ آپ بھی یکسر بھول گئیں نا! اور یہ شاہد جہانگیر بھی پرانی کامیڈی فلموں کا زمانہ یاد کرواکر ماضی میں کھوجانے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ آفاقی صاحب کے مضمون پر تبصرہ اور معلومات کے لیے بے حد شکریہ۔ دلیپ کمار کے سلسلے میں چونکنے والی معلومات کا شکریہ اور یہ سچ بھی ہے۔ رانا سجاد اور محسن علی سومرو کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ ہاں رانا سجاد یہ غالباً 2006 یا 2007 کی بات ہے کہ محترمہ بشریٰ افضل صاحبہ اور رعنا سچ نے خط لکھنے شروع کیے تھے۔ باقی سچ تو خود ہی بتاسکیں گی میرا پہلا ہی خط انعامی تھا اور جاسوسی میں مارچ 2006 میں شائع ہوا تھا۔ اور پھر یہ سلسلہ چل سو چل۔ وحید ریاست بھٹی آپ کا پُرخلوص تبصرہ زبردست مگر بے حد مختصر پایا گیا۔ لمبائی چوڑائی پر خاص توجہ دیں شکریہ۔ سدرہ بانو ناگوری صاف ستھرے رواں اور گہرے تبصرے کے ساتھ کراچی کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے تشریف فرما ہیں۔ کہانیوں پر بھی بڑی اچھی طرح تبصرہ کیا۔ مبارکباد۔ طاہر الدین بیگ نے بھرپور تبصرہ کیا۔ ساتھیوں کو سراہا اور لیٹ آنے کا گلہ بھی کیا۔ اور عصمت چغتائی کا قصہ بظاہر کیا نظر آتا ہے انتہائی افسوسناک اور دردناک بھی۔ پھر بھی معاملہ اللہ کے حضور ہے۔ ہمارے کتنے نامور مسلمان اداکار و لکھاری مسلمان ہونے کے باوجود ہندو بیویاں، غیر مسلم داماد، یا بہوؤں کو لے آتے ہیں اور بچوں کے نام تک غیر اسلامی ہوتے ہیں۔ یہ تو بھئی اللہ سے ڈرنا چاہیے کہ "جب وہ دلوں پر قفل لگادیتا ہے تو پھر ہر اچھائی اور ثواب سے انسان محروم ہوجاتا ہے۔ اللہ اس وقت سے سب کو اپنی امان میں رکھے آمین! ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری کا گلہ جائز ہے۔ انسان اپنی ذات میں فرعون بھی ہے۔ اپنے سے کمتر کو طعنہ دینا اور خود فخر محسوس کرنا ان کی فطرت بن جاتی ہے مگر مکافاتِ عمل اور پھر اللہ کا انتقام ان کو یاد نہیں ہوتا۔ ہزاروں کی اولاد بھی دنیا میں بڑے گہرے غم دیتی ہے کہ ماں باپ جیتے جی ختم ہوجاتے ہیں۔ آپ اللہ تعالیٰ کے ساتھ لو لگائیں۔ اس کے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ورد سے مانگیں ذکر الٰہی اور درود شریف کو چوبیس گھنٹے کا پڑھنے کا وتیرہ بنالیں۔ دل کو سکون، دماغ کو ٹھنڈک اور صبر و تحمل کے تحفے سے نوازے جائیں گے۔ آپ کی کہانیاں پڑھتا رہتا ہوں۔ زبردست ہوتی ہیں۔ یہ آخر میں تو میرا اپنا ہی زندگی کا مختصر ترین تبصرہ شائع ہوا ہے اور حسبِ وعدہ آپ لوگوں کی خدمت میں تفصیلی تبصرہ اور خط لے کر حاضر ہوں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی زیرِلب زبردست رہی۔ صوفی تبسم، جن کو ہم بچپن ہی سے جانتے ہیں ان کی زندگی کے ایسے ایسے گوشے عیاں ہوئے ہیں کہ اتنی قیمتی اور زبردست معلومات کے لیے ڈاکٹر صاحب کے ممنون و مشکور ہیں۔ آپ نے بالکل صحیح کہا کہ "شعر و نغمہ کا یہ سنجوگ پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ (بلکہ قیامت تک) یادگار رہے گا" انتہائی ذہین، متحرک اور نئی اختراعوں کا حامل یہ صوفی تبسم زندہ جاوید رہے گا کہ ایسے نابغہ روزگار دنیا میں کم کم ہی آتے ہیں۔ عقوبت خانہ واقعی دل ہلادینے والے واقعات سے بھرپور ہے مگر باقی دیکھ کر مزہ کرکرا ہوگیا۔ زبردست انکشافات ہیں اور اب اگلے ماہ کا انتظار ہے۔ چور انتہائی دلچسپ کہانی رہی۔ شروع سے آخر تک قاری اسی میں ڈوبا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اور آخری پیرا پڑھ کر تو مزہ دوبالا ہوگیا۔ باہمت تو سیاہ فام قوم کو شناخت دے گئی۔ اور امریکا میں یہ کام بڑے ہی دل گردہ والی ہستی کا تھا۔ ہیرٹ تو تاریخ امریکا کے ساتھ ہمیشہ ایک ہیرو اور نجات دہندہ بنی رہے گی۔ ایم کے خان ہمیشہ کی طرح منفرد چیز ہی لاتی ہیں۔ بدحال قلعہ کا افسوسناک حال پڑھا۔ بے حد دکھ ہوا۔ رانی کوٹ کے اس قلعہ کو تو عجوبہ ہونے کے ناتے زبردست دیکھ بھال کی پذیرائی ملنی چاہیے تھی۔ دیوارِ چین کے ساتھ مماثلت بھی کرنل راشد کے بعد کسی وقت ثابت ہوجائے گی اور انتہائی انوکھے انکشافات منظرِ عام پر آئیں گے۔ فلمی الف لیلیٰ میں غالب کی گائیکی کے حساب سے، دلیپ کمار کے حالات سے اور قدیر غوری کے متعلق انتہائی تفصیلی معلومات ملیں۔ آفاقی صاحب کا بھی جواب نہیں۔ اور ان کا سفر ترکی میں اس دفعہ جو ایک شادی کے حال کا منظر کھینچا ہے۔ کمال کی نثر اور کمال کا مشاہدہ۔ پڑھ کر زبردست مزہ آیا کہ بہت کم سفرناموں میں اس طرح کی معلومات ہوتی ہیں۔ پھر حضرت ایوب انصاری کا حال۔ اور ان کے مزار مبارک کے متعلق معلومات، سبحان اللہ۔ مسلمان کا تو ایمان ہی تازہ ہوجاتا ہے اور مزار مبارک پر حاضری کے لیے دل تڑپ اٹھا اور توپ کاپی محل کی سیر اور منظر نامہ، لاجواب رہا۔ اپنے ملک کی پسماندگی کا احساس تو دوگنا ہوجاتا ہے آخر یہ لوگ بھی تو مسلمان ہی ہیں نا اور ہمارے لیے ہمارے بڑوں نے انتہائی شکستہ حال ملک بنادیا ہے۔ سچ بیانیوں میں انتظار

تاب پر رہی۔ ماں باپ کے لیے ایسی قربانی لاکھوں کروڑوں میں سے ایک ہی دے گا۔ روبی کا فیصلہ بدبخت اور نافرمان بیٹوں کے لیے ایک تازیانے سے کم نہیں۔ کاش یہ لوگ اسی کہانی سے کوئی سبق لے سکیں۔ میں نے بھی ایک افسانہ نما کہانی مشہور رسالے کو بھیجی ہوئی ہے۔ شائع ہوئی تو ضرور بتاؤں گا۔ سیلاب کا سانپ دوسرے نمبر پر رہی۔ آخر اچھائی جیت گئی۔ ایسی کہانیاں بھی بڑی سبق آموز ہوا کرتی ہیں۔ محبت زندہ باد میں آدم خان جیسا کیریکٹر بالکل صحیح دکھایا ہے یہ لوگ انتہائی "انتہا پرست" ہوتے ہیں اور ان کی سائیکی بالکل مختلف۔ محمد ایاز راہی کا خاکہ مولانا غلام رسول مہر (44 ص) بھی ایک اچھا معلوماتی اور گہرائی لیے ہوئے تھا۔ ایاز صاحب ایسے مضامین ضرور لایا کریں۔ یہ سمجھیں ایکسٹرا معلومات کا ذخیرہ جمع ہورہا ہے۔ (پارچے) میں ہر ایک زبردست معلوماتی اور منفرد تھا۔ جی ہاں سسپنس میں محی الدین نواب کی آمد کے ہم منتظر ہیں۔ اور بے حد منتظر! علمی آزمائش زبردست جاری ہے۔ ہاں اور بھی ہمارے پرانے لکھنے والے کہاں ہیں؟ کبھی کبھی حاضری لگوایا کریں۔ دعاؤں کے ساتھ دعا کا طالب۔"

☆ وحید ریاست بھٹی کی کلر سیداں راولپنڈی سے آمد "حسبِ معمول سب سے پہلے آپ کا فکر انگیز اداریہ پڑھا دیر تک پریشان رہے کہ عالم کفر سر دھڑ کی بازی لگا کر عالم اسلام کے مقابلے پر اتر آیا ہے لیکن عالم اسلام تو لگتا ہے خوابِ خرگوش نہیں بلکہ ابدی نیند سویا ہوا ہے۔ معراج صاحب، ملک ظلم اور کفر کے سبب تو قائم رہ سکتے ہیں لیکن کرپشن کی وجہ سے وجودِ مملکت میں شکست و ریخت لوحِ تقدیر پہ لکھ دی جاتی ہے۔ کرپشن کی داستانیں تو ملک کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ لیکن انتہائی بے انصافی کا مظاہرہ آج 6 نومبر 2013 کو دیکھنے اور سننے کو ملا کہ ریٹائرڈ جنرل پرویز مشرف کو ہر ایک جرم کے بدلے ریلیف دیتے ہوئے ان کی ضمانتیں منظور ہوگئیں۔ ہائے انصاف وائے انصاف۔ کہاں گئے نواز شریف صاحب کے دعوے کہ ہم اقتدار میں آکر انصاف کی نہروں کو سیدھے رخ پہ بہنے پہ مجبور کردیں گے ہم نے عدلیہ کو آزاد کرایا ہے۔ محترم نواز شریف آپ کے نزدیک تو پرویز مشرف کا سب سے بڑا جرم تو 12 اکتوبر کو آپ کو اقتدار سے محروم کرنا ہے لیکن ہماری نظر میں اس کے اور کئی جرائم بھی ہیں مثلاً امریکا کو یہ عظیم مادرِ وطن ٹھیکے پہ دے دینا اور کہنا کہ جو چاہو کرو، جسے چاہے پکڑلو جس پر چاہو جہاں چاہو ڈرون حملہ کردو چیف جسٹس سمیت دیگر معزز ججز کو کئی ماہ نظر بند کرنا۔ نواب اکبر بگٹی کو قتل کراکر صوبہ بلوچستان میں احساسِ محرومی پیدا کرنا۔ ملک میں دو دفعہ آئین کو پامال کرکے اپنی خواہش اقتدار کو طول دینے کی ناکام کوشش کرنا۔ وائے افسوس کہ تمام تر قوانین و ضوابط بے گناہوں اور غریب عوام کے لیے ہیں۔ اشرافیہ جو چاہے کرے اس کے لیے کوئی آئین نہیں کوئی قانون نہیں حکومت چاہے زرداری کی ہو یا نواز شریف صاحب کی ہر آمر محفوظ ہے۔ اللہ پاک اس بے انصاف اور سخت دل معاشرے پر خصوصی نگاہِ لطف و کرم فرمائے۔ آمین! اس موسم میں خنکی آنے پر جب سرگزشت کو رضائی میں دبک کر پڑھنے بیٹھے تو تیز دماغ کے حوالے سے خواجہ شہاب الدین سے کافی سے زیادہ معلومات حاصل ہوئیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب اپنے ملی و نصابی شاعر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا زندگی نامہ لیے حاضر تھے ڈاکٹر صاحب آپ واقعی ڈاکٹر ہیں یعنی ہماری ادبی پیاس بجھانے میں آپ کا ثانی نہیں۔ صدا سلامت رہیں۔ شہرِ خیال میں کرسی صدارت رانا محمد شاہد صاحب کو مبارک ہو بہت جاندار تبصرہ فرمایا جناب نے۔ میرے سابقہ احساسات و جذبات کو جن احباب نے سراہا میں ان سب کا تہ دل سے ممنون احسان ہوں۔ معراج صاحب معروف شاعر ساحر لدھیانوی کے چند اشعار ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری کی نذر کرنا چاہوں گا۔ زندگی کے رنگ کئی رے، ساتھی رے۔ زندگی دلوں کو کبھی جوڑتی بھی ہے۔ زندگی دلوں کو کبھی توڑتی بھی ہے۔ زندگی کے رنگ کئی رے، ساتھی رے۔ میری دلی تمنا و خواہش ہے کہ اللہ پاک ان کا ہر مسئلہ ان کی خواہش کے مطابق حل فرمائے۔ آمین۔ مریم کے خان کی باہمت پڑھ کر حوصلوں میں نئی جہت مجتمع کرنے کا موقع ملا کہ ایک آنکھوں سے محروم خاتون کیا کچھ کرگئی، حیرت ہے۔ معراج صاحب بہتر ہوتا کہ آپ بینا نابینا نمبر کا دوسرا حصہ شائع کردیتے۔ ویسے آپ اعلان فرمائیں لکھنے والے اور بھی ہیں۔ فلمی الف لیلیٰ میں آفاقی صاحب چاچا غالب، کو پیش کرنے میں بہت حد تک کامیاب قرار دیے جاسکتے ہیں اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ امیمہ سلیم صاحبہ نے جب سے رویندر جین پر لکھا ہے ہم تو ان کی تحریر کے دیوانے ہوگئے ہیں اس بار قوتِ ارادی، کے حوالے سے ان کی تحریر نے دلوں کو مزید تقویت بخشی، انہیں مبارکباد عرض کردیجیے گا۔ باقی ابھی سرگزشت ڈھیرے ڈھیرے پڑھنے کا ارادہ ہے۔"

☆ طاہر الدین بیگ کا پیغام میرپور خاص سے "سردی کی آمد آمد ہے اور کراچی میں انسانیت ننگی ہوکر ناچ رہی ہے۔ 17 انسانی جانیں ضائع ہوگئیں پھر آٹھ جانیں رینجرز زبردست آپریشن کررہی ہے مگر کہاں! نومبر کا شمارہ اپنی روایت کے مطابق زبردست کہانیوں کے ساتھ حاضر ہے اور ساتھ میں آپ کی محفل میں بھی بڑی رونق ہے دعا ہے یہ رونق اسی طرح قائم اور دائم رہے آمین! آفاقی صاحب محترم اس دفعہ زبردست فارم میں نظر آئے، بہت خوب غالب اور غالب کی غزلوں کو بہتر انداز میں پیش کرنے پر آفاقی صاحب نے شاندار لکھا، اوپر سے سونے پر سہاگہ دلیپ صاحب کی سالگرہ کی روئداد سپر اسٹاروں کے جھمگٹے میں صاحب پڑھ کر اور دیکھ کر مزہ آگیا۔ زندہ اور پائندہ باد سرگزشت دلیپ صاحب کو دیکھ کر بہت بے حد خوشی ہوئی اللہ انہیں اپنی امان میں رکھے آمین۔ چلتے ہیں کہانیوں کی طرف آپ بیتیاں دلچسپ بھی اور سبق آموز بھی رہیں خاص طور پر انتظار (روبی لاہور) اور محبت زندہ باد (آدم خان) کی کہانی افشاں کی زبانی بہت ہی شاندار تھیں۔ مریم خان کی کہانی اور عقوبت خانہ افسر آذر کی زبانی زبردست کہانی رہی۔ ڈاکٹر ساجد امجد زبردست محنت کرکے زبردست معلوماتی خزانہ سرگزشت کے صفحات پر بکھیرتے ہیں اور خوب ہی بکھیرتے ہیں۔"

تاخیر سے موصول خطوط:

رانا محمد شاہد (بورے والا) انور اعجاز خان (یکہ توت پشاور) نجمہ انصاری، فہیم احمد، نگار مصطفیٰ (کراچی) احمد داد، محمد واصل بٹ، جاوید ملک (لاہور) شہاب الدین، زینب بانو (فیصل آباد) نیاز الدین (سکھر) احباب خان (جھنگ) نادر ملک (کاموکی) فیصل شہزاد (لندن) نصیب النساء (ملتان) عباس قزلباش (کوئٹہ) زاہد خٹک (شیخوپورہ)۔

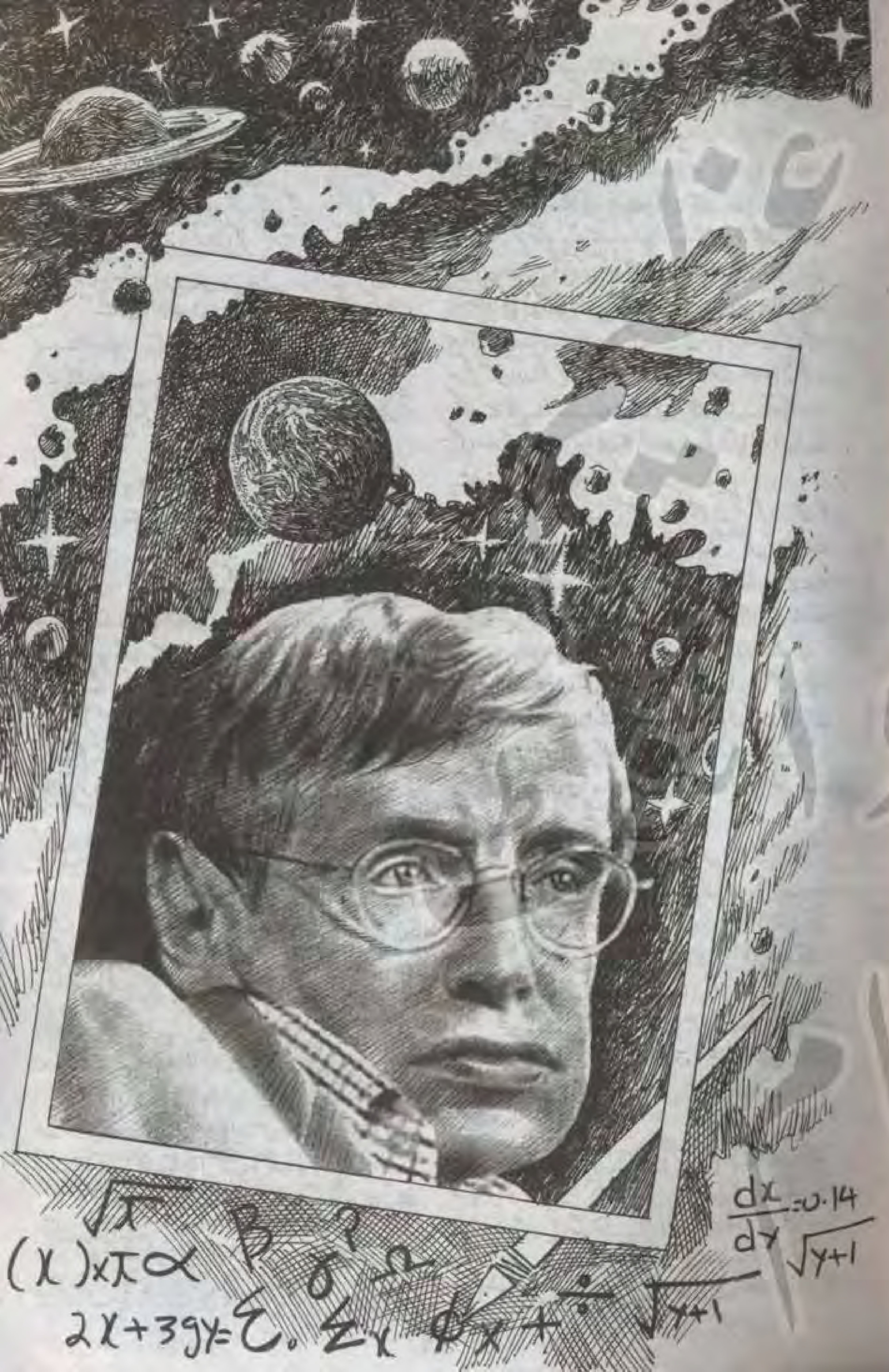

جہانِ حیرت

ڈاکٹر ساجد امجد

بعض لوگ اپنی بساط سے بڑھ کر کام کرجاتے ہیں۔ انہی میں سے ایک اسٹیفن ہاکنگ بھی ہیں جو عرصہ دراز سے ایک زندہ لاش کی مانند بستر پر پڑے ہیں۔ تمام اعضا ساکت ہیں لیکن سوچ کی راہیں بلندی پر ہیں۔ مسلسل نت نئے کلیے پیش کرتے جارہے ہیں، لاینحل مسئلوں کو سلجھاتے جارہے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ نہ وہ لکھ سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں پھر بھی کتابوں پر کتابیں تخلیق ہورہی ہیں۔ نئے نئے نظریوں کو... پیش کرنے کے لیے جدید مشین کا سہارا لے رہے ہیں۔ بلیک ہول جیسی گتھی اور ارتقائے انسانی پر جتنا کچھ انہوں نے پیش کیا کسی اور نے نہیں۔ سرگزشت میں سن دوہزار گیارہ میں ان پر ایک مختصر سا مضمون پیش کیاگیا تھا جس کی تشنگی کا تذکرہ قارئین کی جانب سے مسلسل ہوتا رہا ہے۔ تقاضوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اس بار ان کی زندگی پر ایک بھرپور تحریر شامل کی جارہی ہے۔اس سےقارئین یقیناسیراب ہوجائیں گے۔

اس سائنسداں کا تذکرہ جو مشینوں کے سہارے زندہ ہے

دوسری جنگِ عظیم اپنے عروج کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کررہی تھی۔ فرانک ہاکنگ اپنی بیوی ایزوبل کے ساتھ لندن کے جنوبی علاقے ہائی گیٹ میں رہا کرتا تھا۔ لندن کا یہ حصہ جرمن کے حملوں کا ہر رات نشانہ بنا کرتا تھا۔اس رات بھی شدید بمباری ہوئی تھی۔ کئی مکان منہدم ہوگئے تھے۔ یہ روز کا معمول تھالیکن اس رات ایزوبل اکیلی تھی اس لیے بہت زیادہ ڈرگئی۔ فرانک اپنی ملازمت کے سلسلے میں کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ وہ رات بھر اس تہ خانے میں بیٹھی رہی جو بمباری سے بچنے کے لیے عارضی طور پر بنالیا گیا تھا۔ اس نے رات بھر کی بیداری کے بعد طے کرلیا تھا کہ وہ اپنے شوہر سے ضد کرے گی کہ وہ اس علاقے کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ رہائش اختیار کرلے جہاں خطرات نسبتاً کم ہوں۔

جب اس نے محسوس کیا کہ صبح ہوگئی ہے، روشنی پھیلنے لگی ہے تو وہ ڈرتے ڈرتے تہ خانے سے باہر آگئی اور رات بھر کی تباہ کاری دیکھنے کے لیے گھر سے باہر نکلی۔ گھر کی دیواروں پر جگہ جگہ گولیوں کے نشانات تھے۔ اس نے شکر بھیجا کہ کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا۔ اس کے پڑوسی بھی بہت ڈرے ہوئے تھے۔ ہر جگہ یہی باتیں ہورہی تھیں کہ اب یہ علاقہ رہنے کے لائق نہیں رہا۔ اس کے ارادوں کو مزید تقویت ملی۔

فرانک ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ اسے اپنے شوہر پر سخت غصہ آرہا تھا۔ یہ سوچ کر فکر مند بھی ہورہی تھی کہ اگر وہ آج بھی نہیں آیا تو یہ رات بھی اسی جہنم میں بسر کرنی ہوگی۔ وہ وقت گزاری کے لیے گھر کی صفائی ستھرائی میں لگ گئی۔ پھر اس کی آرزو پوری ہوگئی۔ فرانک دروازے پر تھا۔

فرانک نے اندر آکر بیوی کی طرف ہمیشہ کی طرح ایک مسکراہٹ اچھالی۔ وہ جب گھر میں آتا تھا یہی اس کی عادت تھی۔ جواب میں ایزوبل بھی یہی کرتی تھی لیکن آج وہ خاموش رہی تھی۔ فرانک نے ابھی ایک ہی جوتا اتارا تھا۔ دوسرا جوتا پہنے پہنے وہ اس کے قریب آگیا۔

''کیابات ہے تم مجھ سے خفا ہو؟''

''تم سخت بے پروا آدمی ہو۔ تمہیں معلوم بھی ہے یہاں رات بھر کیا ہوتا رہا ہے۔''

''مجھے کیسے معلوم ہوتا۔ میں یہاں تھا ہی نہیں بلکہ لندن ہی میں نہیں تھا۔ پھر بھی مجھے معلوم تو ہو یہاں کیا ہوا۔''

''رات بھر جرمن جہاز بم برساتے رہے ہیں۔''

''بس اتنی سی بات۔'' فرانک نے قہقہہ لگایا اور اپنا

دوسرا جوتا اتارنے لگا۔ ”جنگوں میں تو یہ ہوتا ہے۔ کون سا علاقہ محفوظ ہے۔ سب جگہ یہی ہو رہا ہے۔“

”ہائی گیٹ خاص طور پر نشانے پر ہے۔ ہمسائے یہ علاقہ چھوڑنے کی بات کر رہے ہیں۔“

”فکر مت کرو۔ اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ ہر رات تمہارے ساتھ رہا کروں گا۔ اگر مریں گے تو دونوں ساتھ مریں گے۔“

”مجھے اپنی موت کی پروا نہیں۔ میری زچگی کے دن پورے ہونے والے ہیں۔ کیا میں اپنے بچے کو دنیا میں آنے سے پہلے مار دوں۔“

یہ بات ایسی تھی کہ فرانک کو سنجیدہ ہونا پڑا۔ ”ایزوبل تم کیا چاہتی ہو۔“

”ہم یہ علاقہ چھوڑ دیں۔ کم از کم بچے کی پیدائش تک، ہوسکتا ہے اس وقت تک جنگ بھی کسی نتیجے پر پہنچ جائے۔“

”ایسا کرنا اتنا آسان بھی تو نہیں۔ ہمیں کہاں جانا چاہیے یہ ہمیں سوچنا ہوگا۔“

”یہ میں پہلے ہی سوچ چکی ہوں۔ ہم آکسفورڈ جائیں گے کیونکہ حکومت نے اعلان کر رکھا ہے کہ جرمنوں نے اگر آکسفورڈ یا کیمبرج پر حملہ کیا تو اس کا بھرپور دفاع کیا جائے گا۔ یوں بھی ہٹلر آکسفورڈ کو اپنی راجدھانی بنانے کا اعلان کر چکا ہے۔“

”ہمیں سامان باندھنے میں چند روز تو لگ ہی جائیں گے۔“

”ہمیں کچھ لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہے ہیں۔ واپس آنا ہے۔ بس ضروری سامان ساتھ لینا ہوگا۔“

وہ اتنی ڈر گئی تھی کہ دن بھر ضروری سامان پیک کرتی رہی اور رات کو اپنے ایک قریبی عزیز کے گھر چلی گئی۔ دوسرے دن یہ چھوٹا سا خاندان آکسفورڈ چلا گیا۔

8 جنوری 1942ء کو ایزوبل نے ایک توانا، صحت مند اور تندرست بچے کو جنم دیا اور اس کا نام اسٹیفن ہاکنگ رکھا۔ فرانک ہاکنگ کا بیٹا اسٹیفن ہاکنگ۔

اسٹیفن صرف دو ہفتے کا تھا کہ اس کے والدین اسے لندن لے آئے۔

جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ فرانک ہاکنگ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل ریسرچ کا ڈویژنل افسر مقرر ہو گیا تھا۔

فرانک ہاکنگ 1950ء تک ہائی گیٹ میں مقیم رہا۔ اس کی آمدنی بڑھنے لگی تھی لہٰذا یہ گھر اسے چھوٹا معلوم ہو رہا تھا۔ اسٹیفن آٹھ سال کا ہو چکا تھا۔ اب اسے اسکول میں بھی داخل کرانا تھا۔ فرانک نے یہ گھر چھوڑ دیا اور ایک چھوٹے سے شہر کے ایک بڑے مکان میں منتقل ہو گیا۔ یہ شہر سینٹ البانز تھا۔ یہ شہر سینٹ البانز کے نام پر 303 قبل مسیح میں اس مقام پر آباد کیا گیا تھا جہاں سینٹ البانز کی آخری رسوم ادا کی گئی تھیں۔ اس شہر میں اب بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ آبادی بڑھ گئی تھی۔ چرچ اور عمارتیں بھی تعمیر ہو گئی تھیں اور انگریزوں کا متوسط شہر کہلاتا تھا۔ کھلا علاقہ تھا۔ گھومنے پھرنے کے لیے بہت سی جگہیں تھیں۔ آب و ہوا بھی سازگار تھی لہٰذا فرانک کا دل یہاں لگ گیا اور اس نے طے کر لیا کہ وہ یہ شہر چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔

فرانک کو اب اسٹیفن کی تعلیم کی فکر تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ پرائیویٹ اسکول طالب علم کے مستقبل کو چمکانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ خود اس نے پرائیویٹ اسکول میں تعلیم پائی تھی۔ بڑے بڑے افسران جو بڑے اداروں سے وابستہ تھے انہی اسکولوں میں پروردہ تھے۔

ان اسکولوں میں ویسٹ منسٹر اسکول نہایت اعلیٰ معیار کا سمجھا جاتا تھا لیکن داخلے کی شرائط ایسی کڑی تھیں کہ ذہین ترین طلبہ ہی اس درس گاہ کا حصہ بن سکتے تھے۔ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ فرانک کی آمدنی اتنی نہیں تھی کہ وہ اس اسکول کے مصارف برداشت کر سکتا۔

وہ چاہتا ضرور تھا کہ اسٹیفن کو اس اسکول میں داخل کرائے لیکن اس کی آمدنی آڑے آ رہی تھی۔ اس نے اسکول کی انتظامیہ سے بات کرنا ضروری سمجھا کہ شاید کوئی صورت نکل آئے۔ اس کی ذاتی حیثیت کسی کام آ جائے۔ کوئی رعایت مل جائے اور یہ رعایت اس طرح مل گئی۔

”آپ اپنے بچے کو امتحان میں بٹھا دیں۔ اگر وہ اتنے نمبر لے آیا کہ اسکالرشپ کا حقدار ٹھہرا تو اس کی فیس اسکول ادا کرے گا۔ آپ کو اس فیس کا معمولی سا حصہ ادا کرنا ہوگا۔“

ترکیب یا پیش کش تو اچھی تھی لیکن اتنے لڑکوں میں ضروری تو نہیں کہ اسٹیفن کو اسکالرشپ مل جائے۔ یہ سوال پھر بھی اپنی جگہ تھا۔ یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ بڑی سے بڑی سفارش سے کام نہیں چلے گا۔ فرانک نے یہی بہتر سمجھا کہ اسٹیفن کو اسکالرشپ کے امتحان میں بٹھا دیں۔ اگر اسکالرشپ مل گئی تو ٹھیک ورنہ کوئی اور اسکول دیکھا جائے گا۔

انہوں نے معمولی سی فیس دے کر اسٹیفن کا داخلہ اس اسکول میں کرا دیا۔ جو طلبہ اسکالرشپ کے امتحان میں بیٹھنے کے خواہش مند تھے ان کی تیاری کرائی جانے لگی۔ اصل امتحان سے پہلے چھوٹے چھوٹے ٹیسٹ تھے۔ اسٹیفن نے نہایت اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور اس کا نام فائنل فہرست میں شامل ہو گیا لیکن جب فائنل امتحان کا دن آیا تو وہ اچانک بیمار ہو گیا اور لندن کے اس بہترین اسکول کا امتیازی مقام حاصل نہ کر سکا۔

جب وہ بیماری سے اٹھا تو امتحان کے دن گزر چکے تھے۔ اس کے والد نے مایوس ہو کر اسے لندن کے ایک عام پرائیویٹ اسکول میں داخل کرا دیا۔ اس اسکول کا نام سینٹ البانز تھا اور نہایت اچھی شہرت رکھتا تھا۔ فرانک کو اس اسکول میں اس لیے بھی دلچسپی ہوئی کہ وہ عیسائی... کیتھولک فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور اس اسکول کا مسلک بھی کیتھولک تھا۔

اسٹیفن بیماری سے اٹھنے کے بعد لاغر ہو گیا تھا (پھر ہمیشہ ایسا ہی رہا) پستہ قد تھا اوپر سے نہایت دبلا پتلا۔ وہ جب پہلے دن یونیفارم کے سرمئی سوٹ میں اسکول گیا تو نہایت بھونڈا بچہ نظر آ رہا تھا اور سب کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ پُرکشش تھا بلکہ اس لیے کہ عجیب الخلقت سا نظر آ رہا تھا۔ سر بڑا دھڑ چھوٹا۔ پتلے پتلے ہاتھ پاؤں، ہاتھوں میں قدرے لرزش۔ کوٹ یوں اس پر منڈھا تھا جیسے کسی اور کا پہن کر آ گیا ہے۔

جب اس اسکول میں دو چار دن گزرے اور کچھ لڑکے اس کے قریب آئے تو ان پر ایک اور انکشاف ہوا۔ لڑکوں نے محسوس کیا کہ وہ بعد میں بات کرتا ہے پہلے سوچتا ہے۔ بولتے بولتے اچانک رک جاتا ہے اور ایک وقفے کے بعد پھر بولنا شروع کرتا ہے۔ اس کی اس عادت سے اس کے ساتھیوں کو بڑی الجھن ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس پر فقرے چست کیے جاتے تھے۔ اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ اسٹیفن کو اذیت محسوس ہوتی تھی لیکن خاموش رہتا تھا۔ یہ زیادہ پرانی بات نہیں 1952ء کا زمانہ تھا۔

اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے اس کے دوستوں نے شرط لگائی تھی کہ اسٹیفن زندگی میں کچھ نہیں بن سکے گا۔ بعد میں اسٹیفن نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا۔

جب اسکول میں تقریر اور مباحثوں کا دور شروع ہوا تو پہلی مرتبہ اس کے ساتھیوں کو اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑا لیکن پھر بھی یہ کہا جاتا رہا کہ وہ صرف تقریریں کر سکتا ہے کوئی عملی کام اس کے بس میں نہیں۔

تھرڈ ایئر میں پہنچتے پہنچتے خاموش طبع اسٹیفن نے سب کو اپنی ذہانت کے سحر میں جکڑ لیا۔ استادوں کی دوربین نگاہوں نے بھی اس کی ذہانت کو بھانپ لیا اور اسے محترم بچہ کہہ کر مخاطب کرنے لگے۔

اس سال اس نے روشن خیال لڑکوں کا ایک گروپ بنایا۔ سب مل کر بی بی سی سنا کرتے۔ ریڈیو کا وہ چینل گھنٹوں سنا کرتے جس پر کلاسیکل میوزک سنایا جاتا تھا۔ ایک دن کتابیں پڑھنے کے لیے مخصوص تھا۔ ایک لڑکا پڑھتا باقی لڑکے سنا کرتے تھے۔ پھر ذہنوں میں رکھنے والے سوالوں پر گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں۔ اسٹیفن اس میں پیش پیش رہتا تھا البتہ موسیقی کے آلات سے کام لینے میں وہ پیچھے تھا۔ اس کے ہاتھوں کی کمزوری موسیقی کے آلات سے کام لینے میں مانع تھی۔ برٹنڈ رسل اس کا ہیرو تھا جس کے بارے میں وہ گھنٹوں باتیں کر سکتا تھا۔ اپنے اسی مخصوص انداز میں تھوڑا بولتا پھر سوچتا اور پھر بولتا۔

آہستہ آہستہ اس کی صلاحیتیں ایسی اجاگر ہوئیں کہ اسکول کو اس پر ناز ہونے لگا۔ اس کی ایسی پذیرائی ہوئی کہ ویسٹ منسٹر اسکول میں داخلے کی محرومی کا احساس تک ذہن سے نکل گیا۔ اس اسکول کا ماحول اس کے تخلیقی ذہن کے لیے نہایت سازگار ثابت ہوا۔

اس اسکول میں تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ کی تفریح کا بھی پورا خیال رکھا جاتا تھا تاکہ طلبہ کی زندگی میں حسن و جمال اور مہارت پیدا ہو۔ اسکول کے لڑکے لڑکیاں سائیکل چلانے کے مقابلوں میں طویل مسافت کے لیے ہارٹ فورڈ شائر جایا کرتے تھے۔ بورڈ گیم اور دوسرے گیموں میں شریک ہوتے تھے۔

جب تعطیلات ہوتی تھیں تو طلبہ کا یہ گروپ اسٹیفن کے گھر جمع ہوتا تھا۔

اسٹیفن کا کمرا دوسرے کمروں سے مختلف تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی جادوئی ماحول استقبال کرتا تھا۔ لیبارٹری اور مطالعے کی جگہ سب کچھ ایک ہی جگہ تھا۔ گھریلو سامان، اسکول کی کتابیں، ہوائی جہازوں کے ماڈل، بجلی کے نظام کا بورڈ، تاروں کے ٹکڑے، مختلف اقسام کی دھاتیں۔ یہ

دراصل اس کی تجربہ گاہ بھی تھی جس میں وہ اپنی عمر کے مطابق چیزوں کو توڑتا جوڑتا رہتا تھا۔

تعطیل کے دنوں میں یہ کمرا اس کے گروپ کے لڑکوں سے بھر جاتا تھا، فرش پر، قالینوں پر جس کو جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتا۔ اسٹیفن نے کئی گیم ایجاد کرلیے تھے۔ ان کے قواعد بھی اس نے مقرر کرلیے تھے۔ وہ ایک ننھا سائنس داں تھا جس کی ہدایات پر سب عمل کرتے تھے۔

کھیل کود کے ان تجربوں کے بعد جب اس کی عمر چودہ سال ہوئی تو وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ میں اپنا ایک مقام بنانا چاہتا ہوں جو ریاضی کے مطالعے کے علاوہ ہو۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اس کے شعور نے اسے سائنس کی طرف راغب کیا۔ ریاضی میں اس کا دماغ خوب چلتا تھا۔ وہ اس مضمون کو بہت تھوڑا وقت دے کر بھی پورے نمبر لیتا تھا۔ لیکن وہ یہ سوچتا تھا کہ ریاضی کی پیچیدگیوں سے کسی مسئلے کا حل تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ سوال اپنی جگہ رہتا ہے۔ مسائل کے حل کی تلاش کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔

اس سوال کا جواب اسے فزکس کے سبق کے دوران مل گیا۔ استاد نے بچوں سے سوال کیا۔

”اگر آپ کے پاس چائے کا ایک کپ ہے اور آپ چاہتے ہیں اس میں دودھ بھی ہو۔ اگر چائے بہت گرم ہے اور آپ چاہیں کہ جلد سے جلد پینے کے قابل ہوجائے تو اس میں دودھ بھی شامل کردو گے یا پہلے چائے کو ٹھنڈا کرو گے؟“

تمام بچے خاموش بیٹھے جواب تلاش کررہے تھے کہ اسٹیفن بول پڑا۔ ”دودھ آخر میں۔“

اس صحیح جواب پر اس نے منصوبہ بنالیا کہ وہ یونیورسٹی کی تیاری کے لیے ریاضی اور فزکس کو اہمیت دے گا لیکن اس کے والد نے اس کی مخالفت کی۔ وہ چونکہ دوا ساز تھے اس لیے چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بھی ان کی اتباع کرے۔ اس کے لیے اسے کیمسٹری پڑھنا پڑی۔

کئی روز تک گھر کی فضا مکدر رہی۔ اس کا باپ اپنے دلائل دے رہا تھا اور وہ اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا بالآخر وہ ریاضی لینے پر رضامند ہوگیا۔ فزکس اور کیمسٹری کے لیے یہ طے ہوا کہ جب اس کی ضرورت پیش آئے گی اس وقت دیکھا جائے گا۔

تعلیم کا چھٹا سال اس کے لیے خوشیاں لے کر آیا۔ خوشی یہ تھی کہ اب طلبہ دو گروپوں میں تقسیم ہورہے تھے۔ سائنس اور آرٹ کے طلبہ۔ اسے سائنس کے طلبہ کے گروپ میں رکھا گیا تھا۔ ایک نیا گروپ جو سب سائنس داں تھے۔ ان کی دلچسپیاں ان کے مضامین سب ایک تھے۔ اب وہ زیادہ آزادی اور زیادہ مددگاروں کے ساتھ کوئی بڑا کام کرسکتا تھا۔

اس نے اپنے دوساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک ”کمپیوٹر“ بنایا جس کا نام LUCE رکھا گیا۔ اب تک محکمۂ دفاع کے پاس کمپیوٹر تھے۔ اب اس میں نئے خیالات کے اعتبار سے کچھ تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ اس لیے کچھ اضافے کے ساتھ انہوں نے نہایت قابلِ قدر اور قابلِ استعمال مشین تیار کرلی۔ اب سب سے بڑی دشواری یہ معلوم ہوتی تھی کہ اس کا کوئی ڈیزائن نہیں تھا اور پروجیکٹ کی تھیوری کا کوئی حصہ نہیں تھا۔

اس مشین کی تیاری کے دوران اسٹیفن اور اس کے دوستوں کا انٹرویو شائع ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس کے خیالات کسی اخبار کی زینت بن رہے تھے۔

”ہم نے ایک مشین بنائی ہے جو بالکل جدید وضع کی ہے اور سائنسی اصولوں پر مبنی ہے۔ ہم اس میں مزید اضافہ کریں گے اور جو بے تکی خامیاں رہ گئی ہیں اسے دور کریں گے۔“

اس وعدے کے ایفا کی نوبت نہ آئی۔ چند سالوں بعد اسکول کے نئے سربراہ نے یہ مشین جو تاروں اور دھات کے ٹکڑوں کے طور پر تھی بے کار سمجھ کر کچرا کنڈی پر پھنکوادی۔

☆☆☆

1959ء کا سال ہنگامہ خیز سیاسی تبدیلیوں کا سال تھا۔ یہی وہ سال تھا جب کیوبا میں فیڈرل کاسترو نے اقتدار حاصل کیا۔

یہی وہ سال تھا جب 17 سالہ اسٹیفن ہاکنگ آکسفورڈ میں داخلے کے لیے امتحان کی تیاری کررہا تھا۔ اس وقت سائنس کی دنیا یہ سوچ بھی نہیں سکتی ہوگی کہ سائنس دانوں میں ایک بڑے سائنس داں کا اضافہ ہونے والا ہے۔ شاید اسٹیفن بھی نہیں۔

آکسفورڈ میں امتحان دینا اور کوئی مقام حاصل کرنا آسان نہ تھا۔

سینٹ البانز اسکول کی مسلسل کامیابیوں نے اسے پُراعتماد بنادیا تھا۔ وہ سخت محنت کررہا تھا۔ وہ صرف محنت نہیں

کررہا تھا بلکہ اسکالرشپ کی تیاری کررہا تھا۔ اسکالرشپ یونیورسٹی کی طرف سے بڑا ایوارڈ تھا۔ کامیاب طلبہ کو نہ صرف پُرکشش رعایتیں دی جاتی تھیں بلکہ دیگر طلبہ کے مقابلے میں ان کی اہمیت بھی زیادہ تھی۔

ایک مرتبہ پھر فزکس اور کیمسٹری کی بحث چھڑ گئی۔ اس کے والد چاہتے تھے وہ کیمسٹری پڑھے۔ ان کے خیال میں ریاضی اور فزکس پڑھنے کے بعد اچھی ملازمت کا حصول مشکل ہوگا۔ اسٹیفن کو دوا سازی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ کائنات کے مسائل حل کرنے کے درپے تھا۔ دونوں طرف سے دلیلوں کا بازار گرم رہا۔ اس موقع پر اس کی والدہ نے اس کی مدد کی۔

”اسٹیفن کو جن مضامین میں دلچسپی ہے اس کو وہی مضامین لینے دو۔“

اس کے والد کو اس کی بات ماننی پڑی۔

اپنی پسند کے مضمون کے لیے اسے کئی بار انٹرویو دینے پڑے۔ ساڑھے بارہ گھنٹے تک تھیوری کے سلسلے میں امتحان ہوا اور فزکس کا پریکٹیکل پیپر ہوا۔ سوالات اتنے سخت تھے جیسے وہ داخلے کے لیے نہیں کسی جاب کے لیے انٹرویو دینے آیا ہو۔

انٹرویو اور امتحانات کا سلسلہ مکمل ہوگیا تھا۔ اب اس کے دھڑکتے دل کو رزلٹ کا انتظار تھا۔ اسے ابتدا ہی سے ”علمِ کائنات“ سے دلچسپی تھی۔ اس علم کو بڑے سائنسی موضوع کا درجہ حاصل تھا۔ یہ ایسا موضوع تھا جو بہت کم لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔

”علمِ کائنات ایک ایسا عظیم ٹیلی اسکوپ ہے جس کے مشاہدے سے انسان کو فطرت کے رازوں اور موجودہ کائنات کے بارے میں علم و مشاہدہ کی خبر حاصل ہوتی ہے اور انسان پر خلا کے اسرار پوشیدہ کھل جاتے ہیں۔ ریاضی کی مدد سے علمِ کائنات کے بارے میں جو خیالات ہوتے ہیں انہیں ظاہر کرنا ممکن ہوسکتا ہے۔

اپنے اس شوق کو مجتمع کرنے کے لیے اس نے اپنے سے پہلے کے سائنس دانوں کے اس بارے میں خیالات سے استفادہ کرنا شروع کیا۔

سب سے پہلے اس کی نظر نیوٹن پر گئی۔ نیوٹن نے کائنات کے بارے میں ایک منطقی انداز کا تصور قائم کیا تھا جو کائنات کے بارے میں بہت سی باتیں بتاتا تھا۔ اس نے علمِ کائنات ارضی و سماوی کے بارے میں بنیادی اصول بھی وضع کیے تھے۔ علمِ کائنات اور کششِ ثقل کے بارے میں اس کے خیالات کو بڑی شہرت ملی تھی۔

اسی طرح نیوٹن کی طرح آئن اسٹائن بھی بڑا سائنس داں تھا۔ اس نے کششِ ثقل کی تھیوری پیش کی۔ روشنی کی رفتار کے بارے میں بھی اس نے نظریات پیش کیے۔

وہ ان کتابوں کے مطالعے میں غرق رہا اور نئے نئے خیالات سے اس کا ذہن آباد ہوتا رہا۔ اس نے یہ مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ خلا کے بارے میں معلومات حاصل کرے گا۔

اسٹیفن کا رزلٹ آیا تو وہ امیدواروں کی فہرست میں سب سے ٹاپ پر تھا۔ یہ اتنی بڑی کامیابی تھی کہ اسے اپنا مستقبل تابناک نظر آنے لگا۔

کچھ داخلے اور اسکالرشپ کی خوشی تھی۔ کچھ نئے سال کی آمد کا استقبال۔ اس نے اپنے مکان پر ایک پارٹی کا اہتمام کیا۔ اس نے تمام نئے پرانے دوستوں کو مدعو کیا۔ اس نے اسکول کے زمانے کے دوستوں کو بھی بلایا تھا۔ اس کے بہت سے دوست عرصے بعد اسے دیکھ رہے تھے اور اس کی صحت کی جانب سے فکرمند ہورہے تھے۔ اس کی بیماری کے بارے میں کسی کو علم نہیں تھا مگر کوئی ایسی بات اندرونی طور پر اس کے جسم میں موجود تھی جس کی وجہ سے اس کی صحت پر برے اثرات پڑ رہے تھے۔

”تم اسٹیفن کو دیکھ رہے ہو۔ یہ کچھ بیمار نہیں لگ رہا؟“

”ہاں بہت کمزور معلوم ہورہا ہے۔“

”کمزور تو وہ سدا کا تھا مگر اب تو اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ وہ جب گلاس میں شراب انڈیل رہا تھا تو تم نے دیکھا شراب گلاس سے باہر گر گئی تھی۔ اس کے کپڑے بھی خراب ہوئے۔“

”ارے نہیں۔ خوشی سے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔“

”شرط لگالو وہ علیل ہے۔ اپنی بیماری چھپا رہا ہے۔“

”اس سے پوچھ کر نہ دیکھ لیں؟“

”تم اس کے مزاج کو جانتے ہو، وہ الٹا ہم پر برس پڑے گا اور محفل خراب ہوجائے گی۔“

”چلو پھر کسی وقت پوچھ لیں گے لیکن یہ طے ہے کہ آثار اچھے معلوم نہیں ہوتے۔“

اسی وقت محفل میں ایک روشنی سی ہوئی۔ پندرہ سولہ سال کی ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ بعد میں معلوم

ہوا اس لڑکی کا نام جینی وائلڈ ہے۔ ایک دوست کے توسط سے اسٹیفن کا تعارف اس سے ہوا تھا اور اب اس نے اسے دعوت میں مدعو کرلیا تھا۔

وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی اسٹیفن کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ وہ خود اٹھ کر گیا اور اسے لے کر آیا۔ سب دوستوں سے اس کا تعارف کرایا اور اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"میں نے تمہیں مدعو تو کرلیا تھا لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ تم آؤ گی۔"

"تم نے بلایا تھا تو کیسے نہ آتی۔ دوستوں کا دل تو رکھنا پڑتا ہے۔"

"تم مجھے اپنا دوست سمجھتی ہو؟"

"یہی تو مصیبت ہے کہ سمجھنے لگی ہوں ورنہ کیوں چلی آتی۔"

"ہم تو ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے بھی نہیں ہیں۔"

"ابھی ملے ہی کتنے ہیں۔"

"تم سے ملنے کے لیے ہر روز ایک دعوت کیا کروں گا۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے۔ ہم ویسے بھی تو مل سکتے ہیں۔"

ان کی ملاقاتوں کا آغاز ہوگیا۔ جینی بجا طور پر کہہ سکتی تھی کہ اسٹیفن اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ جینی میں کچھ ایسی کشش تھی کہ اسٹیفن مسحور ہوگیا۔

ان ملاقاتوں نے ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد دی۔

وہ ان دنوں ریسرچ کررہا تھا۔ یہ ریسرچ کائنات کے علم سے متعلق تھی۔ کوئی ستارہ جب تین مرتبہ اپنے سورج کے لیے زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ اپنے طور پر مدار میں اندرونی طور پر ہوتا ہے تو اس کو "بلیک ہول" (سیاہ دھبا) کہا جاتا ہے۔ اسٹیفن اسی بلیک ہول پر ریسرچ کررہا تھا۔

وہ ریسرچ مکمل کرچکا تھا۔ ٹیسٹ دے دیا تھا اور رزلٹ کا انتظار کررہا تھا۔ ایک دن یونیورسٹی گیا ہوا تھا۔ اسے ڈھونڈتی ہوئی جینی بھی یونیورسٹی پہنچ گئی۔ وہ اس وقت سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ جینی پر اس کی نظر پڑی۔ اسے غیر متوقع طور پر اپنے سامنے دیکھ کر وہ بوکھلا گیا اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے کی کوشش میں سیڑھیوں سے لڑھک گیا۔ سیڑھیاں زیادہ نہیں تھیں لیکن وہ بے ہوش ہوگیا۔ اسے فوراً اسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کیا تو ایک خوفناک انکشاف ہوا۔ ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق وہ ALS نامی بیماری میں مبتلا تھا۔ اس مرض کے اثرات ریڑھ کی ہڈی پر اثر انداز ی کے ساتھ اعصاب پر ہوتے تھے۔ لندن والے اس مرض کو عام طور پر "موٹر نیورون" کہا کرتے تھے۔ اس بیماری کی وجہ سے دماغی عضلات رضاکارانہ طور پر موٹر کے پرزوں کی طرح کام کرنے لگتے تھے۔

نئے دور کی ایٹمی ذرات سے پیدا ہونے والی اس مہلک بیماری کا توڑ ڈاکٹروں کے بس میں نہ تھا۔ تعجب خیز بات یہ تھی کہ اس بیماری کے اثرات پورے جسم پر بڑے شدید ہوتے تھے اس کے باوجود اسٹیفن کے ذہن پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کا ذہن نہایت ہی اعلیٰ پیمانے پر کام کررہا تھا۔ اس کا حافظہ اسی طرح چاق و چوبند تھا۔ ڈاکٹروں نے صاف طور پر بتا دیا تھا کہ جب مریض کے اعصاب پوری طرح اس بیماری کی گرفت میں آجاتے ہیں تو مریض کسی وقت بھی اچانک موت سے ہم کنار ہوجاتا ہے۔

اس کی ساری محنت اکارت جانے والی تھی۔ موت اس کا انتظار کررہی تھی۔ وہ کسی وقت بھی مرسکتا تھا۔ کم از کم ڈاکٹروں نے یہی کہا تھا۔ وہ زبردست ڈپریشن کا شکار ہوگیا۔ اس نے اپنے تمام معمولات ترک کیے اور ایک کمرے میں بند ہوکر بیٹھ گیا۔ رات آئی تو روشنی کی ضرورت کو بھی پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ تاریک کمرے میں تاریک سوچیں۔ کیا میں مرنے والا ہوں؟ ہاں میں مرنے والا ہوں۔ اور جینی؟ مرنے والے کے ساتھ کون مرتا ہے۔ وہ کوئی اور دوست ڈھونڈ لے گی۔ کہیں شادی کرلے گی۔ کتنا تکلیف دہ ہے یہ عمل مگر مجھے کیا۔ میں تو مرچکا ہوں گا۔ صرف اکیس سال کی عمر میں یہی میری قسمت تھی۔ وہ اندھیرے کو ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا اور بجلی کا سوئچ آن کردیا۔ تقریباً لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا اور الماری سے اسکاچ کی بوتل نکال لایا۔ پھر گلاس پر گلاس خالی کرتا گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو روشنی کھڑکیوں سے چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔ شکر ہے میں زندہ ہوں۔ شاید اگلی رات میں مرجاؤں۔ اسے زبردست بھوک کا احساس ہوا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلا اور کھانے کا سامان لے کر پھر کمرے میں بند ہوگیا۔ ریکارڈ پلیئر پر اس کی پسندیدہ موسیقی کا ریکارڈ تانیں بکھیر رہا تھا۔

اگلے کئی دن تک خلوت گزینی، مے نوشی اور موسیقی سننے میں گزر گئے۔ اس دوران جینی کئی مرتبہ اس سے ملنے آئی لیکن اسٹیفن نے اس سے بھی ملنے سے انکار کردیا۔ اسے مجبوراً اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔

وہ اسپتال میں داخل تھا۔ اس کے بیڈ کے سامنے دوسرے بیڈ پر ایک لڑکا تھا۔ وہ کسی ایسی بیماری میں مبتلا تھا کہ کسی بھی وقت موت سے ہمکنار ہوسکتا تھا۔ اسٹیفن اسے دیکھ کر اپنی حالت کو بھول گیا۔ کبھی اپنی بیماری کا خیال آتا بھی تھا تو اس لڑکے کو دیکھ کر اپنا غم بھول جاتا تھا۔

ایک روز وہ اس لڑکے کے پاس بیٹھا تھا۔ اس لڑکے نے اسٹیفن کو اپنا ایک خواب سنایا۔ "میں نے خواب دیکھا کہ مجھے پھانسی پر چڑھانے کے لیے پھانسی گھاٹ پر لے جارہے ہیں۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ اگر مجھے زندگی مل جائے تو میں اسے دوسروں کے لیے وقف کردوں۔ میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ اگر مر بھی جاؤں تو اس خیال اور اس ارادے کا ثواب مجھے ملتا رہے گا۔ اور پھر حیرت انگیز طور پر مجھے پھانسی سے نجات مل گئی، مجھے زندگی مل گئی۔ آنکھ کھلی تو میں زندہ تھا اور اب میں نے طے کرلیا ہے کہ میں اپنی زندگی دوسروں کے لیے وقف کردوں گا۔"

اس خواب نے لڑکے پر تو جو اثرات مرتب کیے ہوں وہ کیے لیکن اسٹیفن نے طے کرلیا کہ اس طرح گوشہ نشین ہوجانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے زندہ رہنا چاہیے اس عزم کے ساتھ کہ میں سائنس کی دنیا میں ایسے تصورات پیش کروں گا کہ جس سے مخلوق کو فائدہ ہو۔

اس دن کے بعد سے وہ ڈپریشن سے باہر آتا گیا۔ اس کی تیزی سے بدلتی ہوئی حالت دیکھ کر ڈاکٹر بھی حیران تھے۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اسٹیفن زبردست قوتِ ارادی کا مالک ہے۔

اسے اسپتال سے ڈسچارج کردیا گیا۔ وہ پھر اپنی مصروفیات میں لگ گیا۔ جینی اس سے ملنے آئی تو اس کو اس طرح ہشاش بشاش دیکھا جیسا کہ وہ تھا البتہ دوائیں جاری تھیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ایک اسپیشلسٹ کے پاس اسے معائنے کے لیے جانا ہے۔

کچھ دنوں بعد وہ وقت بھی آگیا جب اسے اسپیشلسٹ کے پاس جانا تھا۔ وہ بظاہر اچھا بھلا معلوم ہورہا تھا اس لیے اس کے والد کو امید تھی کہ رپورٹ مثبت آئے گی۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کیا اور کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا لیکن معائنے کے بعد جب وہ اس کے والد کو ایک طرف لے جا کر کچھ سمجھانے لگا تو اسٹیفن کو کچھ شک ہوا۔ اس کے والد جب واپس آئے تو ان کے چہرے سے بھی معلوم ہوتا تھا کہ کوئی تشویشناک بات ہے۔ گھر پہنچنے کے بعد اس نے والد سے پوچھا۔

"ایسی کون سی بات تھی جو ڈاکٹر میرے سامنے نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے آپ کو اکیلے میں کیوں بلایا تھا۔"

"کچھ نہیں۔ وہ کہہ رہا تھا تم جلد ٹھیک ہوجاؤ گے۔"

"اگر یہی بات تھی تو میرے سامنے بتانا زیادہ سودمند ہوتا۔ یقیناً کوئی ایسی بات ہوگی جو وہ میرے سامنے کہنا نہیں چاہتا ہوگا۔" "آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ اگر وہ بات میری ذات سے متعلق ہے تو مجھے ضرور بتایئے تاکہ میں آیندہ زندگی اسی پروگرام کے تحت گزاروں۔ مجھے کچھ بھی بتانے سے مت ہچکچایئے۔ میں بہت مضبوط آدمی ہوں۔"

"ڈاکٹروں نے کوئی اچھی بات نہیں کہی لیکن یہ بھی طے ہے کہ ڈاکٹر خدا نہیں ہوتے۔"

"مجھے بتایئے تو سہی، اس نے کیا کہا ہے۔"

"ان کا خیال ہے تم زیادہ سے زیادہ تین سال زندہ رہ سکو گے۔"

"بس اتنی سی بات تھی جس کے لیے آپ اتنا ڈپریسڈ ہورہے تھے کہ مجھے بھی ڈرا دیا۔"

"تم اسے اتنی سی بات کہہ رہے ہو۔"

"ہاں میرے لیے ذرا مشکل ہوجائے گی۔ مجھے تمام کام جلدی جلدی نمٹانے ہوں گے۔"

فرانک ہاکنگ اپنے بیٹے کو بڑی عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹروں نے واقعی صحیح کہا ہے۔ وہ زبردست قوتِ ارادی کا مالک ہے۔ ہوسکتا ہے وہ موت کو بھی شکست دے دے۔

"میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہوں۔" اسٹیفن نے کسی قدر توقف کے بعد کہا۔

"کیا تمہارے پاس اتنا وقت ہے۔"

"کسی سے رعایت طلب کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اگر آپ یونیورسٹی والوں سے بات کرلیں کہ وہ مجھے تین سال سے کم مدت میں کام مکمل کرنے کی اجازت دے دیں۔"

اس کے والد نے یونیورسٹی والوں سے اجازت لینی چاہی۔

"کیا میرا بیٹا عمومی مدت تین سال سے کم وقت میں پی ایچ۔ڈی کرسکتا ہے کیونکہ میرا بیٹا زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"یہ بات تو ایک طالب علم ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا واقعی وہ اس کا اہل ہوسکتا ہے۔ ویسے تین سال کی جو مدت یونیورسٹی نے رکھی ہے اس سے کم مدت میں امتحان نہیں دیا جاسکتا۔ آپ کا بیٹا یونیورسٹی کے قواعد سے آگاہ ہے اس لیے وہ خود بھی ان قواعد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔"

اس کے والد یہ اجازت حاصل نہ کرسکے لیکن اسٹیفن نے کام شروع کردیا۔

"اگر میں امتحان نہ بھی دے سکا تو میرے خیالات تو دنیا کے سامنے آجائیں گے۔"

اس نے خلا میں موجود پُراسرار بلیک ہول سے خارج ہونے والی شعاؤں کے حوالے سے اپنی ریسرچ کو شروع کیا اور کئی تھیوریاں پیش کیں جن میں سے بیشتر کو درست مان لیا گیا۔ اس نے ایک ایک کرکے ان تمام بنیادی قوانین کا کھوج لگانا شروع کیا جو تمام کائنات کو چلانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا۔ "پوری کائنات کو سائنس کے اصول ہی چلاتے ہیں اور میں یہ اخذ کرسکتا ہوں کہ اگر خدا نے یہ اصول بنائے ہیں تو وہ ان میں مداخلت نہیں کرتا۔"

اس موقع پر اس کی دوست جینی نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ وہ اس سے زیادہ سے زیادہ ملنے لگی اور ایسے پُرجوش طریقے سے کہ اسٹیفن میں جینے کی امنگ پیدا ہونے لگی۔ وہ اکثر شام کے وقت آجاتی اور وہ اس کے ساتھ سیر کو نکل جاتا۔ مشروب نوشی کے وقت اس کی بیماری کے سوا دنیا بھر کی باتیں ہوتیں۔ جینی جان بوجھ کر اس کی بیماری کا تذکرہ نہیں چھیڑتی تھی۔

اس کا کام بیماری کی وجہ سے بہت متاثر ہورہا تھا۔ ختم تو نہیں ہوا تھا لیکن سست رفتاری کا شکار تھا۔ اب تک وہ چھڑی کے سہارے سے بہ آسانی چل پھر سکتا تھا لیکن بیماری نے اس کے ہاتھ پاؤں اتنے کمزور کردیے کہ وہ چھڑی کی بجائے بیساکھی استعمال کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اب وہ اپنے مکان کے زینے پر اترنے چڑھنے میں سخت مشکلات محسوس کرنے لگا۔ ایک مرتبہ اسے بیڈ روم تک پہنچنے میں پندرہ منٹ لگ گئے۔ اس نے کسی کا سہارا نہیں ڈھونڈا اور دروازہ خود عبور کیا لیکن یہ کوئی ایک دن کا قصہ تو تھا نہیں۔ اسے تو نشست والے کمرے تک پہنچنے میں بھی دشواری پیش آتی تھی۔ اس کے والد کو تشویش لاحق ہوئی۔ انہوں نے اسٹیفن کو طبی بورڈ کے سامنے پیش کیا۔ اس کا علاج پھر شروع ہوگیا۔ طبی طور پر چھان بین کے بعد نئی دوائیں تجویز ہوئیں جنہیں وہ عرصہ دراز تک استعمال کرتا رہا۔

دواؤں سے زیادہ خوشگوار سہارے انسان کو بیماری سے باہر لے آتے ہیں۔ جینی وائلڈ نے بھی یہی سوچا اور اسٹیفن کے ساتھ کیمبرج میں رہنے لگی۔ وہ ان دنوں ویسٹ فیلڈ کالج میں ماڈرن لینگویجز کی تعلیم حاصل کررہی تھی۔ گھر سے دور تھی اس لیے اسٹیفن کے ساتھ رہنے میں اسے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

بعض دوستوں کو اس رفاقت پر اعتراض ہوا تھا۔ اس کے جواب میں جینی نے یہ دلیل پیش کی تھی۔

"میں اپنی زندگی کے نصب العین کی تلاش میں تھی تاکہ کوئی اچھا راستہ اپنا سکوں اور اب میں اس مفروضے کی قائل ہوگئی ہوں کہ یہ راستہ مجھے اسٹیفن کی خدمت اور دیکھ بھال سے حاصل ہوتا ہے۔"

"تمہارے نزدیک کیا یہ کوئی اچھا طریقہ ہے۔" ایک دوست نے پوچھا تھا۔

"میں طے کرچکی ہوں مجھے کیا کرنا ہے۔ اسے میری مدد کی ضرورت ہے۔ میں اس کی مددگار رہوں۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ وہ جسمانی طور پر مناسب شخص ہے یا نہیں۔"

"تم اس سے شادی کیوں نہیں کرلیتیں۔"

"مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا بشرطیکہ وہ مجھ سے کہے۔ یہ واحد بات ہے جو میں اس سے نہیں کہہ سکتی۔"

وہ دونوں اس وقت کمرے کے آتش دان کے پاس بیٹھے تھے کہ اسٹیفن نے شادی کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ اب یہ نہیں معلوم کہ دوستوں نے اس سے کہا تھا یا اس کا خود یہ خیال تھا۔

"جینی، تم مجھ سے شادی کروگی؟"

"یہ سوال کس نے تمہارے منہ میں ڈالا ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے میں وہ کہتا ہوں جو خود سوچتا ہوں۔ میں نے ڈاکٹروں کو غلط ثابت کردیا ہے۔ موت کو شکست دے دی ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا میں دو سال زندہ رہ سکوں گا۔ میں وہ مدت گزار چکا۔ میری ریسرچ مکمل ہوگئی ہے بس لکھنا باقی رہ گیا ہے۔ پھر مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل جائے گی۔ اب ہمیں شادی کرلینی چاہیے۔"

"میری تمنا ہے تمہارے ساتھ ازدواجی زندگی گزاروں لیکن گھرداری کے لیے کچھ کمانا بھی ضروری ہوتا

ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم آمدنی کا کوئی ذریعہ تلاش کرسکو گے۔"

"میں فوراً شادی کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ تمہارا عندیہ معلوم کررہا ہوں۔"

"میں تیار ہوں۔"

جب اسٹیفن اپنے خیالات کے مطابق ریاضی والی تھیوری سے مطمئن ہوگیا تو اس نے ڈاکٹریٹ کے لیے اپنا مقالہ لکھنا شروع کردیا۔ اس کو مکمل کرنے میں اسے بہت سے سہارے ملے۔ سب سے بڑا سہارا تو جینی ہی کا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے دوست اور اساتذہ اس کی مدد کررہے تھے۔

اس مقالے کا آخری باب ایسا اچھوتا تھا جو اسے ڈگری کا حقدار بناتا تھا۔

اسے ڈگری دے دی گئی۔ اب وہ خود کو ڈاکٹر اسٹیفن ہاکنگ کہہ سکتا تھا۔

ڈگری کے حصول سے کچھ پہلے ہی اسے کسی "جاب" کی ضرورت تھی کیونکہ وہ جینی سے شادی کا ارادہ کرچکا تھا۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اسے کہیں دور جانا نہیں پڑا۔ یونیورسٹی سے ملحق ایک کالج میں فیلوشپ کی جگہ خالی تھی۔

اس وقت اسٹیفن کی بیماری کا عالم یہ تھا کہ وہ درخواست لکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے جینی کی مدد لی۔ وہ ڈکٹیٹ کراتا گیا اور جینی لکھتی گئی۔ اس درخواست کو ٹائپ کرایا گیا اور ارسال کردی گئی۔

درخواست بھیجنے کے بعد بھی یہ معاملہ اتنا آسان نہیں تھا۔ کالج کے قواعد و ضوابط اتنے سخت تھے کہ ان کی پاسداری سخت مشکل تھی۔ اسٹیفن کی معذوری بھی حائل ہورہی تھی لیکن یونیورسٹی کی جانب سے کی جانے والی سفارشات نے اس کام کو آسان بنادیا اور اسے فیلوشپ مل گئی۔

فیلوز کی ڈیوٹی بہت کم اور معمولی تھی تاکہ وہ اپنی ریسرچ کے کام میں آسانی سے معروف رہیں۔ ان کے ذمے چند طلبہ کی نگرانی تھی اور یہ بھی بس برائے نام۔ معاوضہ بھی بس برائے نام تھا البتہ احترام بہت تھا۔

فیلوشپ ملنے کے بعد اسٹیفن کو شادی کی جلدی تھی۔ جینی کے والدین اسٹیفن سے مل چکے تھے۔ اس کی شرافت اور قابلیت کے قائل تھے لیکن اس کی صحت کی طرف سے فکر مند تھے مگر جینی کی پسند کو ٹال نہیں سکتے تھے۔ انہیں البتہ یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کے معالج اس کی زندگی سے مایوس ہیں۔ اس کی زندگی کی ڈور کسی وقت بھی کٹ سکتی ہے۔ جینی کو ابتدا ہی سے سب کچھ معلوم تھا لیکن اس کے چہرے سے کسی خدشے کا اظہار نہیں ہورہا تھا۔ جینی کی آنکھیں چشمے کی اوٹ میں مسکرا رہی تھیں۔ جینی دلہن کے سفید لباس میں تھی جو اس وقت کے فیشن کے مطابق نہایت مختصر تھا۔ ہاتھوں میں پھولوں کی ٹوکری تھی۔ اسٹیفن ڈارک سوٹ میں بہت دبلا لگ رہا تھا۔ اس کی ٹائی سفید تھی۔ آنکھوں پر تاریک لینز کا چشمہ تھا۔

یہ شادی جولائی 1965ء میں ہوئی۔

اسٹیفن مالی طور پر اتنا مستحکم نہیں تھا کہ ہنی مون منانے کے لیے کہیں باہر جاسکتا۔ جینی نے قطعی برا نہیں منایا اور اس کے ساتھ قریبی تفریحی شہر "سفولک" چلی گئی۔ جہاں انہوں نے ایک ہفتہ گزارہ کیونکہ اسٹیفن کو فوراً کام پر واپس آنا تھا۔

واپس آتے ہی بے شمار گھریلو مسائل اس کے سامنے آگئے۔ پہلا مسئلہ تو یہی تھا کہ کہاں رہائش اختیار کی جائے۔ اس نے کالج کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔ جواب انکار میں ملا۔

"کالج کی پالیسی فیلوز کے رہائشی معاملات کی مدد کرنے کے خلاف ہے۔"

وہ سائیکل استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ بیساکھیوں کے سہارے چل سکتا تھا وہ بھی چند قدم۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ کیمبرج کے مرکزی حصے میں رہے اور اپنے شعبے سے قریب ہو۔

کالج کے اربابِ اختیار سر جوڑ کر بیٹھے کہ اس نابغہ روزگار کے لیے کچھ کیا جائے بالآخر یہ طے پایا کہ فیلیٹس کا ایک نیا بلاک تعمیر کردیا جائے جو اس کے شعبے سے قریب ہو اور اس میں اسے ایک اپارٹمنٹ دے دیا جائے۔ اسے یہ نوید مل گئی لیکن نئے بلاک کی تعمیر میں کچھ نہ کچھ وقت تو لگنا تھا۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے اسے طلبہ کے ہوسٹل میں چند کمروں کی اقامت دے دی گئی جہاں وہ جینی کے ساتھ رہ سکتا تھا۔

وہ اس فلیٹ میں صرف تین راتیں گزار سکا۔ چوتھے پانچویں دن وہ ایک چھوٹا مکان دیکھ آیا جو اس کے شعبے سے سو گز سے بھی کم فاصلے پر تھا۔ اس نے یہ مکان خرید لیا۔ طے یہ ہوا کہ تین ماہ بعد اس کی لیز اسے مل جائے گی۔

اسی دوران ایک عمر رسیدہ پڑوسی اس سے ملنے آئے اور اس کے مکان کو دیکھ کر سخت مایوس ہوئے۔

"آپ جیسا عظیم انسان اس چھوٹے سے ڈربے

میں رہ رہا ہے۔"

"میرے دوست بھی اس میں نہیں سما سکتے مگر کیا کروں مجبوری ہے۔"

"جب میں ہوں تو مجبوری کیسی۔ اسی گلی میں ایک مکان ہے جو آپ کو مل سکتا ہے۔ آپ کے شایانِ شان ہے اور اتنا وسیع کہ آپ سکون سے کام کر سکتے ہیں۔ دوستوں کو مدعو کر سکتے ہیں۔"

"اگر آپ کے توسط سے مکان مجھے مل سکتا ہے تو میں تیار ہوں۔"

ان صاحب نے نہایت مناسب کرائے پر اس کے لیے مکان کا بندوبست کر دیا۔

اسٹیفن چھڑی کی مدد سے اس گھر میں پہنچا۔ یہ گھر بھی اتنا کشادہ نہیں تھا جتنا وہ بزرگ فرما رہے تھے۔ بس اتنا تھا کہ اوپر بھی دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ کرایہ بہت معمولی تھا۔

اسٹیفن کے دوستوں اور طلبہ نے اس کا سامان اس نئے گھر میں پہنچا دیا۔

جلد ہی اس چھوٹے سے گھر میں میلہ سا لگنے لگا۔ اس کا حلقہ احباب وسیع تھا۔ چھٹی کے موقع پر یا ویسے ہی عام دنوں میں کبھی لنچ پر کبھی ڈنر پر دوستوں کا مجمع لگ جاتا۔

اس دوران وہ اپنے بلیک ہول والے فارمولے پر برابر کام کرتا رہا۔ اس کام کو کتنی شہرت مل رہی ہے اس کا اندازہ اسے اس وقت ہوا جب دسمبر 1965ء میں اسے میامی میں ہونے والے ایک مذاکرے میں مدعو کیا گیا جو اس کے شعبے سے ہی متعلق تھا۔

جینی ویسٹ فیلڈ کالج میں فائنل ایئر کے امتحان میں مصروف تھی۔ جینی یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ اسے امریکا جانے سے روک دے اور یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا یہ معذور آدمی اس کے بغیر امریکا جائے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شوہر کے ساتھ امریکا جائے گی۔

میامی میں فاؤنٹین بلیو ہوٹل ان کا منتظر تھا۔ یہ ایک پرائیویٹ ساحل پر عالی شان ہوٹل تھا۔ جینی بہت خوش تھی کہ اسٹیفن اب بین الاقوامی شہرت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے یہ بھی طے کر لیا کہ اب وہ اس ترقی کے سفر میں اسٹیفن کے ساتھ اس کے سیکریٹری کی طرح رہے گی۔

جب میامی میں اجلاس ہوا اور اسٹیفن نے اپنے نظریے کی وضاحت کی تو اسے سخت مایوسی ہوئی۔ لوگ اس کی بات سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس کا نظریہ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ جینی کو بھی سخت مایوسی ہوئی تھی۔

اجلاس ختم ہوا اور وہ دونوں اپنے کمرے میں واپس آئے تو اسٹیفن خلافِ معمول خاموش تھا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"آخر یہ لوگ کیوں نہیں مانتے کہ خلائی وقت ایک واحدیت کے ساتھ بلیک ہول کے مرکز میں ہوتا ہے۔"

جینی نے اسے تسلی دی۔

"سب کے ساتھ یہی ہوتا ہے اسٹیفن، جو لوگ آج آپ کی بات نہیں سمجھ رہے ہیں کل ضرور سمجھیں گے۔"

ڈور بیل نے کسی کے آنے کی نوید سنائی۔ جینی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

"میرا نام جارج ایلز ہے۔ شاید تم مجھے نہ جانتی ہو، ہاکنگ کو بتاؤ، وہ ضرور مجھے پہچان لے گا۔"

"اندر تشریف لائیے۔" جینی نے راستہ چھوڑ دیا۔

جارج ایلز نے آسٹین کی یونیورسٹی آف ٹیکساس میں ایک سال گزارا تھا۔ اس نے اسٹیفن سے بات چیت کی۔ وہ اجلاس میں شریک تھا اور لوگوں کی سرد مہری دیکھ چکا تھا مگر وہ اسٹیفن سے متفق تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے حق میں آواز بلند کرے گا اور اس کے نظریے کا پرچار کرے گا جس سے وہ پوری طرح متفق ہے۔

اگلے اجلاس میں جارج ایلز نے واقعی حق ادا کیا اور اسٹیفن کے حق میں بات کی اور اس کی تھیوری کے حق میں دلائل دیے۔

جب وہ امریکا سے کیمبرج واپس آیا تو اس کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ اب اس کے لیے بیساکھی کے سہارے بھی چلنا دوبھر تھا۔

میامی کے مذاکرے کے بعد اس کی شہرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے دنیائے طبیعیات کے لیے نیا اور عظیم نام دیا جا رہا تھا۔ جینی کی خدمات اور اس شہرت نے اسے بڑا سہارا دیا۔ خود اعتمادی کی ایک لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی جس نے اس کی معذوری کو شکست دے دی۔

"اپنی معذوری اور بے بسی کے خیالات پر وقت ضائع کرنے کی بجائے میں اپنے کام پر توجہ دینا زیادہ ضروری سمجھتا ہوں۔"

جینی بھی کچھ کم باہمت نہیں تھی۔ اس نے جانتے بوجھتے ایک معذور شخص سے شادی کی تھی۔ وہ دونوں محاذوں پر پامردی سے لڑتی رہی۔ ایک طرف اس کی تعلیم تھی دوسری طرف اسٹیفن کا معاملہ۔ وہ ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑ سکتی

تھی۔ اگر اسٹیفن جسمانی کمزوریوں کے باوجود ہمت نہیں ہار رہا تھا تو دوسری جانب جینی تھی جو اس کے ساتھ سائے کی طرح لگی ہوئی تھی۔ اسے احساس نہیں ہونے دیتی تھی کہ وہ اکیلا ہے۔ پھر ایک موقع وہ آیا کہ جینی نے تعلیم کا سلسلہ ادھورا چھوڑ دیا اور اپنے شوہر کے ساتھ رہنے لگی۔

یہ جینی کی کوششیں ہی تھیں کہ وہ ایک مکان خریدنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ مکان چھوٹا تھا لیکن اپنا تھا۔ جینی کو اپنی ان قربانیوں پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔

''میں ان باتوں کا تصور کرسکتی تھی جو معذور سائنس دانوں کی بیویوں کو پیش آسکتے ہیں۔ ہمارے سامنے بھی کچھ ایسے ہی خیالات تھے اور یہ سب کچھ بعید از قیاس نہیں تھا۔ اس لیے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔''

اب اسٹیفن سائنسی غور و فکر اور مشاہدات میں پہلے سے زیادہ محنت کررہا تھا۔ اس نے ''خلائی وقت کی جیومیٹری'' بنائی تو اسے ''آدم پرائز'' سے نوازا گیا۔

اس کی ریسرچ کا بیشتر وقت ان ہی کاموں میں گزار رہا تھا۔

اس دوران اس کی گرتی ہوئی صحت بھی اس کے ساتھ سفر کرتی رہی۔ جینی اور اس کے دوستوں نے طے کیا کہ اب وہ بیساکھیوں کو ترک کرکے وہیل چیئر استعمال کرے گا۔ ابتدا میں وہ وہیل چیئر پر بیٹھنے کو تیار نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ بالکل ہی معذور بن کر رہ جائے گا لیکن پھر اسے دوستوں کی بات ماننی پڑی۔

1968 میں اسے ''تھیوریٹکل آسٹرالوجی'' ادارے میں مدعو کیا گیا۔ اسے اس انسٹی ٹیوٹ میں ہفتے میں تین دن جانا ہوتا تھا۔ یہ ادارہ اس کے گھر سے وہیل چیئر میں بیٹھ کر جانے کے لیے بہت دور تھا۔ اس نے تھری وہیل بے کار سی کار خرید لی۔

اب اسٹیفن کے پاس اپنا دفتر تھا۔ گزشتہ سالوں میں اس کی عزت میں اضافہ ہوا تھا۔ فزکس میں اس کی تھیوری کو ادارے نے سراہا تھا اور اس کی تصدیق کی تھی۔ اس کی اہمیت کا یہ عالم تھا کہ ادارے کے سربراہ نے جو خود بھی ہیئت داں تھا اسے مقناطیسی انسان کا نام دیا تھا۔ پروفیشنل سائنس داں اس سے بے حد متاثر تھے۔

ان کامیابیوں کے پیچھے اس کی سخت محنت تھی۔ وہ تمام معاملات کو گزشتہ روز ہی میں مکمل دیکھنا چاہتا تھا۔ ادارے کے اکثر لوگ اسے روکتے تھے کہ وہ اپنی طاقت سے زیادہ کام نہ کرے۔ اس صورتِ حال نے بہت سے لوگوں خصوصاً اس کے ماتحتوں کو اس کا مخالف بھی بنا دیا تھا۔ اس لیے کہ وہ ہر کسی سے یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ بھی اس کی طرح یکساں انرجی اور قوتِ عمل رکھتے ہیں۔

1970ء میں وہ دو بچوں کا باپ بن گیا تھا۔ ایک بیٹا ایک بیٹی۔

فزکس میں بلیک ہول کے بارے میں ان دنوں ساری دنیا میں بے شمار لوگ کام کررہے تھے۔ جتنے منہ اتنی آوازیں تھیں۔ آوازوں کے شور میں ضروری نہیں تھا کہ اس کی آواز الگ سنائی دیتی یا ہر شخص اس کی رائے سے متفق ہوتا مگر بعد میں تمام لوگ اسی راہ چل پڑے جو اسٹیفن کی تھی۔

خلا کی معلومات کے سلسلے میں اسٹیفن مجسم درس گاہ بن گیا تھا۔ اس کا کام فلکیات اور کائنات کے سلسلے میں زور شور سے جاری تھا۔ اس کے کام پر دستاویزی تحریریں اور پروگرام پیش کیے جارہے تھے۔ سائنسی ادارے اس کی کامیابیوں کے گن گارہے تھے اور بالآخر اس کی دریافت ''تابانی'' کے بارے میں اعلان کردیا گیا۔

اسٹیفن کو سائنس کی دنیا میں ایسا زبردست اعزاز حاصل ہوا جو کسی دوسرے سائنس داں کو نہ مل سکا تھا۔

اس وقت اس کی کامیابی و شہرت نقطہ عروج پر پہنچ گئی جب رائل سوسائٹی لندن نے اپنے ہیڈ کوارٹر میں اسٹیفن کے اعزاز میں خصوصی اجلاس منعقد کیا۔ یہ اجلاس مروجہ طور پر کسی نئے فیلو کی منظوری اور سربراہ کے دستخط و اجازت نامہ کے طور پر ہوا کرتا تھا۔ موجودہ اجلاس کو ''اسٹیفن کے اعزاز میں'' کا نام دیا گیا تھا۔ اس کو اب دنیا سے متعارف کرایا جارہا تھا اور وہ اعزاز دیا تھا جو اس کا حق تھا۔

رائل سوسائٹی کا صدر ماہر طبعیات ایلین ہاکنگ تھا جس نے بجا طور پر اسٹیفن کی اہمیت کو سمجھا تھا اور اب وہ چاہتا تھا ساری دنیا اسے سمجھے۔

ممبر شپ والی کتاب سامنے لائی گئی۔ اسٹیفن کے نام کے ساتھ اس کی عمر اور دستخط بھی کرائے گئے اس وقت اس کی عمر صرف اٹھائیس سال تھی۔

جب وہ خانہ پری کرچکا تو پورا کمرا تالیوں سے گونجنے لگا۔

تقریب کے اختتام پر اس کے اعزاز میں عصرانہ بھی دیا گیا۔ اسٹیفن کے دیرینہ دوستوں کے رقص نے اس پارٹی کے لطف کو دوبالا کردیا تھا۔ اسٹیفن اس محفلِ نشاط سے لطف

اندوز ضرور ہورہا تھا لیکن اپنی سوچوں میں گم تھا۔ اگر کوئی اس کے ذہن کو پڑھ سکتا تو یہ تحریر صاف نظر آتی۔

''یہ تو محض ابتدا ہے۔ اصل کام تو اب شروع ہوگا۔''

اس تقریب کے بعد وہ دنیا بھر کے سائنس دانوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس توجہ کا سبب ''بلیک ہول'' کی دریافت تھی۔

اسٹیفن اس معاملے میں بہت سرگرمی دکھا رہا تھا۔ اس نے ثابت کیا کہ ''بلیک ہول'' کی سطح ہمیشہ ترقی پذیر رہے گی۔ اور اگر مواد یا ''تابانی'' ''بلیک ہول'' پر گرے گی اور اس صورت میں بھی کہ اگر وہ بلیک ہول ایک دوسرے میں مدغم ہوکر شامل ہوجائیں گے تو نئے بلیک ہول کا علاقہ ہمیشہ بڑا ہوگا۔

اس دریافت سے اسٹیفن اور زیادہ پُرجوش ہوگیا۔

ایک شام اسے یقین ہوگیا کہ قانونِ فطرت بتاتا ہے کہ بلیک ہول کا علاقہ یا تو یکساں طور پر ٹھہر سکتا ہے یا پھر قانون کے مطابق مساوی طور پر بڑھ سکتا ہے۔

یہ ایسی بے چیدہ باتیں تھیں جنہیں نہ عام آدمی آسانی سے سمجھ سکتا تھا نہ سمجھا سکتا تھا لیکن جو لوگ کائنات پر تحقیق کررہے تھے وہ اسٹیفن کی اہمیت کو سمجھ رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ جو تھیوریاں وہ پیش کررہا ہے، خلائی معلومات کے لیے بہت ضروری ہیں اور خلا میں جانے والوں کے لیے مفید ثابت ہوں گی۔ وہ ایک ایسا فولادی شخص ہے جو زمین پر بیٹھ کر خلا کو تسخیر کررہا ہے۔

رائل سوسائٹی کا فیلو منتخب ہونے کے بعد اسے ایک سال کے لیے کیمبرج یونیورسٹی میں مدعو کیا گیا۔ ریسرچ کا یہ ایک سال فیئر چائلڈ سرجن کے خرچ پر تھا جو اسکالر شپ کا طلب گار تھا۔

اس کی شہرت کی دھوم ایسی تھی کہ ناز اٹھانے والے خود بخود میسر آتے تھے۔ کیمبرج یونیورسٹی نے اس کی ناز برداری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس کا دفتر بہت خوبصورت بنایا گیا تھا اور جس قسم کی مدد درکار تھی وہ سب مہیا کی گئی تھی۔

کیمبرج میں اس قسم کا انتظام بھی کیا گیا جو لکڑی کے تختوں سے بنایا گیا تھا۔ اس کے ذریعے وہ اپنی وہیل چیئر کو بہ آسانی دفتر تک لے جاسکتا تھا۔ اسے ایسی ٹیم دی گئی تھی جو اس کی ریسرچ میں مدد دے رہی تھی۔ اس کے بچے یہاں کے موسم سے لطف اندوز ہورہے تھے۔

جب وہ برطانیہ واپس آیا تو چھوٹا سا گھر اس کا منتظر تھا۔ اس کا زینہ چڑھنا بھی اب اس کے لیے دشوار تھا۔ اس نے کالج سے درخواست کی جس کا وہ فیلو تھا کہ کہیں اور اس کی ضرورت کے مطابق اسے مکان دیا جائے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب ایسی ہی ایک درخواست کے جواب میں کالج نے یہ کہا تھا کہ یہ فیلوشپ کی پالیسی کے خلاف ہے کہ مکان دیا جائے لیکن اتھارٹیز کو اس کی مدد کی ضرورت تھی۔ اس کی حوصلہ افزائی کے لیے انہوں نے کالج کی ملکیت والا ایک مکان جو گراؤنڈ فلور پر تھا اس کے نام الاٹ کردیا۔ یہ مکان بڑا بھی تھا اور اس میں ایک باغیچہ بھی تھا۔ اس کے بچے یہاں اسے ڈسٹرب کیے بغیر شور مچا سکتے تھے۔

اب اسٹیفن بھی کشادہ ڈوروے کی وجہ سے بیڈ روم تک اپنی وہیل چیئر کو بہ آسانی لے جاسکتا تھا۔ وہ خوش تھا کہ اس کی مشکلیں حل ہوگئیں لیکن بیماریاں اس کی مشکلیں بڑھاتی رہیں۔ اسے کشادہ ڈوروے کے باوجود بیڈ روم تک اپنی کرسی لے جانے میں دقت پیش آنے لگی تھی۔ جینی ٹیچنگ کورس کرنے کی وجہ سے گھر سے باہر رہنے لگی تھی۔ جینی نے اپنی غیر حاضری کی کمی دور کرنے کے لیے اس کے لیے ایک نرس کا انتظام کردیا۔ یہ نرس چوبیس گھنٹے کے لیے تھی، جسے ہر وقت اسٹیفن کا سایہ بن کر اس کے ساتھ رہنا تھا۔ صرف چھٹی کے دن اپنے گھر جاتی تھی۔ یہ نرس شادی شدہ تھی اس لیے جینی کے نزدیک کوئی خطرے کی بات نہیں تھی۔

جینی نے اپنی مدد کے لیے اسٹیفن کے شعبہ ریسرچ کے طلبہ کو بھی اپنے فلیٹ میں رہنے کی دعوت دی۔ یہ مکان کافی بڑا تھا۔ اس میں اور لوگ بھی رہ سکتے تھے۔ طلبہ کو یہ آسانی تھی کہ یہاں رہنے کے لیے کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا تھا۔ ان کا کام بس یہ تھا کہ یا معاوضہ کہہ لو کہ جینی اور اسٹیفن کی مدد کرتے رہیں۔ یہ عجیب دن تھے۔ جینی کچن میں ہوتی اور طلبہ اس کا ہاتھ بٹاتے رہتے۔ ہنسی مذاق ہوتا تو قہقہے گونجتے۔ طلبہ کو یہ آسانی بھی تھی کہ اپنی تدریسی مشکلات اسٹیفن کے سامنے رکھ سکتے تھے۔

اسے ہفتے میں تین دن انسٹی ٹیوٹ آف آسٹرالوجی کے دفتر جانا پڑتا تھا سڑک بہت خطرناک تھی۔ اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ تین پہیوں والی وہیل چیئر کو وہ زیادہ دن استعمال نہیں کرسکتا۔ برقی وہیل چیئر خریدنے کی استطاعات نہیں تھی حالانکہ اس سے بڑی آسانی ہوسکتی تھی۔

وہیل چیئر چلانے میں اسے مہارت ہوگئی تھی۔ نہایت

تیزی سے گلیوں کو عبور کرتا تھا۔ خطرے کے وقت اس طرح اچانک رک جاتا تھا جیسے بس اپنے اسٹاپ پر رکتی ہے۔

75ء اور 76ء کے سال اس کے لیے خوش قسمتی کے سال تھے۔ دو سال کے اندر اندر اس نے چھ بڑے ایوارڈ حاصل کیے۔ پہلا ایوارڈ ایڈنگٹن ایوارڈ تھا۔ یہ رائل آسٹرالوجیکل سوسائٹی لندن نے دیا تھا۔ اس کے بعد گیارہواں پیوز میڈل ملا۔ 76ء میں اسے ہوپ کن پرائز ملا۔ اسی طرح کئی اور تمغے ملے اور تصدیق کی گئی کہ ”اس نے بلیک ہول کے بارے میں قابلِ قدر کام کیے۔“

ان ایوارڈز نے اس کی حیثیت میں قابلِ فخر اضافے کیے۔ اس سے اسے مالی فوائد بھی پہنچے لہٰذا جینی بھی آسودہ نظر آنے لگی تھی۔

اسٹیفن کو ملنے والے ان اعزازات نے جینی کے خیالات میں عجیب طرح کی تبدیلی پیدا کردی۔ اسے اپنی عزتِ نفس کا خیال آتا تھا جسے نادانستگی میں اسٹیفن نے زخمی کردیا تھا۔

”میں کرب میں ہوں اور خود کو بے حد زخمی محسوس کرتی ہوں۔ میں نے خود کو ”یک دتی“ بنایا ہے اور اسٹیفن کے لیے ہر بات کو خود اپنے عمل سے ممکن بنایا ہے۔ اسٹیفن کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ دو کمسن بچوں کی پرورش بھی کی لیکن میری تمام تر خدمات کا انعام اور اعزاز اسٹیفن کے حق میں گیا۔“

وہ جب اسٹیفن کے ساتھ کسی سرکاری تقریب میں جاتی تو اس کا یہ احساس اور بھی بڑھ جاتا کیونکہ ظاہر ہے اس کا تعارف برابری کی بنیاد پر نہیں کیا جاتا۔ اسٹیفن مداحوں میں گھر جاتا اور جینی خود کو اضافی چیز سمجھنے لگتی۔

اس نے اس احساس کو مٹانے کے لیے سخت محنت کی۔ یہ ثابت کرنا چاہا کہ میں بھی کچھ ہوں۔ اس نے قرونِ وسطیٰ کی زبانوں میں پی ایچ ڈی کیا۔ اسپینی زبان میں ایک کورس کیا۔ شاعر بن گئی لیکن اس احساس نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا کہ وہ اضافی چیز ہے۔ اس میں یہ جذبات پیدا ہونے لگے کہ اسے نظر انداز کیا جارہا ہے۔ وہ بات بات پر اسٹیفن سے الجھنے لگی تھی حالانکہ اسٹیفن کا برتاؤ اس کے ساتھ بہت صاف ستھرا تھا۔ یہ البتہ تھا کہ وہ اپنے وقت کا زیادہ حصہ اپنے کام کو دیا کرتا تھا۔ جینی کو اس کی یہ مجبوری پیشِ نظر رکھنی چاہیے تھی۔

ان اختلافات میں ایک وجہ ”مذہب“ بھی تھا۔ جینی مذہبی جذبات میں شدت پسند تھی جبکہ اسٹیفن کا کہنا تھا۔

”ہم ایک چھوٹے سیارے پر خصوصی مگر کمزور قسم کی تخلیق ہیں جہاں بہت بڑی شرح ستاروں کی ہے اور وہ ہزاروں لاکھوں ملین کہکشاؤں سے بھی زیادہ ہیں اس لیے خدا کی ذات میں یقین کرنا مشکل ہے کہ وہ ایک ہے اور ہمارے اعمال کا محاسب ہے۔“

ایک مرتبہ اس نے کہا تھا۔

”یہ بحث کرنا مشکل ہے کہ کائنات کی ابتدا کب ہوئی جب تک کہ اس میں خدا کے تصور کو شامل نہ کیا جائے۔ میرا کام کائنات کے اصل حقائق تلاش کرنے سے ہے اور یہ دراصل سائنس اور مذہب کے درمیان ایک سرحد کے طور پر ہے۔ میں سرحد کے سائنسی حصے کی طرف ٹھہرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

اس کا یہ بھی کہنا تھا۔

”پوری کائنات کو سائنس کے اصول ہی چلاتے ہیں اور میں یہ اخذ کرسکتا ہوں کہ اگر خدا نے یہ اصول بنائے ہیں تو وہ ان میں مداخلت نہیں کرتا۔“

آہستہ آہستہ جینی کے لیے یہ بات مسئلہ بن گئی کہ اس کا شوہر یہ کوشش کررہا ہے کہ نظریہ کائنات میں خدا کے تصور کا قلع قمع کردیا جائے۔ اسٹیفن کی شہرت اتنی بڑھ رہی ہے کہ لوگ اس کی بات پر یقین کرلیں گے لہٰذا خطرہ ہی خطرہ ہے۔

جینی سائنس داں نہیں تھی۔ وہ مذہب کو اس طرح نہیں دیکھ سکتی تھی جس طرح اسٹیفن دیکھ رہا تھا۔

جینی اب اپنے خیالات کا اظہار برملا کررہی تھی جو اعتراضات کی صورت میں تھے۔ مختلف انٹرویوز اور اخباری بیانات میں وہ اس کے مذہبی خیالات پر تنقید کررہی تھی۔

ان اعتراضات کے باوجود اسٹیفن ہاکنگ کے حق میں اعزازات کی بارش ہورہی تھی۔ یورپ کے علاوہ امریکا میں بھی اسے پذیرائی ملی۔ اس کے نظریہ بلیک ہول کو بے حد سراہا جارہا تھا۔ اسے اس سلسلے میں ماہرین اور طالب علموں سے خطاب کرنے کے لیے امریکا بلایا گیا جہاں اس نے مشی گن اور شکاگو کے بڑے بڑے سیمیناروں میں خطاب کیا۔

اس کا جسم معذوری کا شکار تھا لیکن اس کا دماغ عام لوگوں سے کہیں زیادہ بہتر سوچ سکتا تھا۔ اس نے اپنے تجربات کو کتابوں کی صورت میں پیش کیا تھا لیکن اس کی عظمت کے مقابلے میں یہ تعداد بہت کم تھی۔ اس کا سبب یقینی طور پر اس کی معذوری تھی۔ وہ زیادہ دیر تک لکھ نہیں سکتا تھا۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے مشہور سپروائزر رابرٹ برمن نے ایک بار کہا تھا ”میں نہیں سمجھتا کہ کالج نے کبھی ایسا کوئی دوسرا سائنس داں پیدا کیا ہو جو اس قدر محترم ہو۔ وہ ہماری رفاقت میں رہا اور اس نے شاندار کیریئر پیش کیا جس کی وجہ سے وہ دنیا میں اور کیمبرج کی اپنی پوری تاریخ میں سب سے زیادہ منفرد نظر آتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس بات کا انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ دیکھیں اسے کب حقیقی معنوں میں نوبل پرائز دیا جاتا ہے۔

مینڈک کی طرح اچھل کر اپنی وہیل چیئر میں بیٹھنے والے اس فولادی سائنس دان کی عمر ابھی صرف چھتیس سال تھی کہ 1978ء میں اسے ”البرٹ آئن اسٹائن“ ایوارڈ سے نوازا گیا اور یہ اعلان کیا گیا کہ اسٹیفن ہاکنگ کا کام فیلڈ تھیوری کی رہنمائی کرسکتا ہے اور اس میں دوسرے سائنس دانوں کے لیے بہت سے اشارے ہیں۔

یہ حقیقتاً بڑا ایوارڈ تھا۔ اخبارات نے اسے نوبل پرائز کے مساوی قرار دیا۔

اب تک نوبل پرائز نہ ملنے کی کئی وجوہات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ امیدوار انعام کا مستحق سمجھا جائے گا جب اس کے کام کی مشاہداتی اشتہارات موجود ہو۔ اسٹیفن کا کام ”غیر ثبوت“ تھا۔ ریاضی کے اعتبار سے اس کی تھیوریاں قابلِ اعتبار تھیں لیکن سائنس اب تک اس قابل نہیں ہوئی تھی کہ بلیک ہول کے راستے کو ثابت کرسکے۔

☆☆☆

البرٹ آئن اسٹائن ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد اس کی دوسری کتاب سامنے آئی۔ اس کا نام اس نے ”جنرل ریلیٹوٹی“ رکھا۔

جب یہ کتاب سیل کانفرنس کے سامنے رکھی گئی جس کا کام اسے بیچنا تھا تو اس کا نام دیکھتے ہی سب متفق ہوگئے۔

”ہاکنگ کا نام تو حیران کن ہے۔ ہمیں اس کتاب کو بیچنے میں ذرا دقت نہیں ہوگی۔“

یہی ہوا بھی تھا۔ اعلیٰ بک شاپس پر کتاب رکھی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے بک گئی۔ کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور غائب ہوگئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب اس کے نظریات کو عوامی مقبولیت بھی حاصل ہورہی تھی۔

اس کی شہرت نے اس کے لیے راستے کھول دیے تھے۔ کیمبرج نے اسے پروفیسر ہونے کی پیش کش کی جو اس نے قبول کرلی۔ یہ وہی عہدہ تھا جو تین صدی پہلے ”نیوٹن“ کو نصیب ہوا تھا اور اب اسٹیفن کو اس قابل سمجھا گیا تھا۔ ایسی پُروقار یونیورسٹی میں پروفیسر ہونا بہت بڑا اعزاز تھا۔ جبکہ اس کی عمر صرف 37 سال تھی۔ بے شک نیوٹن کی تقرری کے وقت نیوٹن کی عمر ستائیس سال تھی لیکن اسٹیفن کو جس مقابلے کا سامنا تھا وہ تین سو سال پہلے نیوٹن کو نہیں تھا۔

1979ء کا سال اس کے لیے کئی خوش خبریاں لے کر آیا ۔۔۔۔ جینی نے اس کے لیے تیسرے بچے کو جنم دیا۔ جینی نے پی ایچ ڈی مکمل کرلی تھی اب وہ تدریس کی جاب کے لیے ڈگری تلاش کررہی تھی۔ اسٹیفن کو لوگ ”نیو آئن اسٹائن“ (آئن اسٹائن ثانی) کہنے لگے تھے۔ دوسرے لفظوں میں اسے آئن اسٹائن کا ہم پلہ مان لیا گیا تھا۔ جہاں اس کا مکان تھا اس پر ہاکنگ ویسٹ روڈ کی تختی لگ گئی تھی۔

یہ تمام کامیابیاں اس نے پچھلے دس سال میں حاصل کی تھیں۔

وہ اب بھی موٹر سائز کی وہیل چیئر پر سفر کررہا تھا۔ تلاشِ معاش سے بے فکری ہوگئی تھی۔ اب اس کا سارا وقت سائنس کی خدمت میں گزر رہا تھا۔

آمدنی میں بے حد اضافہ ہوگیا تھا۔ ایوارڈوں اور اعزازات کی آمدنی بھی تھی اور بھاری تنخواہ بھی اور جینی کی ملازمت کی تنخواہ بھی۔ آمدنی کے ساتھ ساتھ عزت و توقیر میں اب اس کے برابر کوئی نہیں تھا۔ یہ جوڑا مثالی جوڑا بن کر سامنے آرہا تھا۔ ایک ساتھ سنیما جاتے تھے، باہر کھانا کھاتے تھے، ایک معقول وقت سیر و تفریح میں گزارتے تھے۔ اسٹیفن یہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ معذور شخص ہے۔

وہ ایک ہوٹل میں جینی کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ ایک صحافی نے اس سے سوال کیا۔

”آپ کب اپنی معذوری کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں؟“

”کبھی نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”نارمل طریقے سے میں صرف اس بات پر غور کرتا ہوں جو مجھے کرنی ہوتی ہے۔ معذوری پر میں توجہ ہی نہیں دیتا۔ صرف اتنا ہے کہ میں اپنے بچوں کے ساتھ جسمانی طور پر کھیل میں شریک نہیں ہوسکتا۔ یہ بہت بڑا دکھ ہے۔“

ایک اور انٹرویو میں اس سے پوچھا گیا۔ ”کیا آپ کو اپنی ذہنی قوت کو اپنی بیماری کے علاج پر نہیں لگانا چاہیے؟“

اس نے جواب دیا ”میں اس طرح بہت مشکلات محسوس کروں گا۔ میں فزکس کا آدمی ہوں میڈیکل کا نہیں۔

اپنے موضوع کے بارے میں تو میں جانتا ہوں لیکن دوسرے موضوع کے لیے میری کوشش بے کار ہوگی۔"

وہ اس بات پر تو خوش تھا کہ بہت سے لوگ اس کی بیماری کی دوا دریافت کرنے کے لیے کوشاں ہیں لیکن اس میں یہ تجسس نہیں تھا کہ دوا کب تک دریافت کر لی جائے گی یا ریسرچ کس منزل پر ہے۔

اس نے ایک مرحلے پر معذوروں کی مدد کے لیے ایک مہم بھی چلائی، ایسی تقریریں کیں کہ سماجی اور سیاسی حلقوں تک بات پھیل گئی اور حکومت رفاہی کاموں کی طرف توجہ دینے لگی۔

☆☆☆

اسٹیفن اور مٹن آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ دونوں دوست تھے اور اکثر بحث مباحثے کے لیے ملاقاتیں کیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی اسٹیفن کی ایک کتاب زیرِ بحث تھی کہ اچانک اسٹیفن نے کسی اور منصوبے کا ذکر چھیڑ دیا۔

"میں لوسی (بیٹی) کی تعلیم کے سلسلے میں ایک مستقل آمدنی کا خواہاں ہوں جو کافی اور اچھی خاصی ہو اور بعد میں اس کی نرسنگ کے اخراجات بھی پورے کر سکے۔ میں اپنی فیملی کو کسی اور ذریعے سے مالی امداد نہیں پہنچا سکتا۔ میں اپنی ریسرچ سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں تا کہ ایک پسندیدہ کتاب لکھ سکوں جس سے مجھے مناسب انعام مل سکے۔"

"تو کیا تم کسی نئی کتاب پر کام کر رہے ہو۔"

"تقریباً مکمل ہے۔"

"میں وہ کتاب دیکھ لوں تو تمہیں کوئی مشورہ دے سکتا ہوں یا کسی ایسے پبلشر کے حوالے کر سکتا ہوں جو تمہیں بھاری معاوضہ دے سکے۔"

مٹن مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ کو جانتا تھا اور بہت سے پبلشروں سے واقف تھا کیونکہ وہ بھی کئی سائنسی کتابوں کا مصنف رہا تھا۔

ایک شام اسٹیفن نے کتاب کا مسودہ ساتھ لیا اور مٹن کے پاس پہنچ گیا۔ مٹن نے مسودے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کچھ شروع سے دیکھا کچھ سطریں آخر کی پڑھیں۔ اس کے تجربے نے اسے بتا دیا کہ لوگ ایسی ہی کتاب چاہتے ہیں۔ اگر یہ کتاب سلیقے سے شائع ہو کر بازار میں آ جائے تو اسٹیفن کو مطلوبہ رقم حاصل ہو سکتی ہے۔

یہ کام اسٹیفن نہیں کر سکتا تھا لیکن مٹن کر سکتا تھا۔

مٹن اور اسٹیفن کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مٹن نے اس مسودے میں کچھ تبدیلی چاہی جو اسٹیفن نے کر دی۔ پھر یہ مسودہ فائنل ٹائپ ہو کر آ گیا۔ اس کتاب کا نام تھا "اے بریف ہسٹری آف ٹائم۔"

اس کتاب کے پبلشر کے لیے مٹن کے مشورے سے باقاعدہ نیلامی ہوئی اور نہایت بھاری رقم لے کر اسٹیفن نے یہ مسودہ پبلشر کے حوالے کر دیا۔

☆☆☆

جولائی 1985ء میں اسٹیفن جنیوا میں تھا۔ پبلشر کے کہنے کے مطابق اسٹیفن کو اپنی کتاب کے ڈرافٹ میں کچھ تبدیلیاں کرنی تھیں۔ اس کی فل ٹائم نرس، اس کی بیوی جینی اور اس کا ایک اسسٹنٹ بھی اس کے ساتھ تھے۔ کتاب کا ڈرافٹ بھی اس کے ساتھ تھا جسے وہ فرصت کے اوقات میں دیکھ لیتا تھا اور پھر دوستوں سے گپ شپ میں وقت گزارتا تھا۔ اسی دوران جرمنی کے دورے کا فیصلہ ہوا۔ اب کتاب کو دوبارہ لکھنے کا کام جلد سے جلد پورا کرنا تھا۔ وہ سخت محنت کر رہا تھا۔

وہ اس رات دیر تک کام کرتا رہا تھا۔ اس نے مسودے کی تمام غلطیاں ٹھیک کر دی تھیں۔ وہ رات گئے بستر پر گیا۔ نرس کی مدد سے آرام سے بستر پر لیٹ گیا۔

نرس نے اپنے معمول کے مطابق مریض کو ہر آدھے گھنٹے بعد چیک کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ وہ بالکل نارمل نیند سو رہا تھا لیکن جب تین بجے کے قریب وہ اس کے کمرے میں گئی تو وہ جاگ رہا تھا۔ اس کے گلے سے "خرخر" کی آوازیں آ رہی تھیں جیسے اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہو۔ نرس نے فوراً ایمبولینس بلوائی۔

ایمبولینس خالی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی جس میں دنیا کا عظیم سائنس داں مصنوعی سانسیں لے رہا تھا۔ اسپتال تک خبر پہنچا دی گئی تھی کہ مریض کس نوعیت کا ہے اور کون ہے۔ ٹی وی پر اس کی نازک حالت کی خبریں نشر ہونے لگی تھیں۔ اسپتال میں ڈاکٹروں کو الرٹ کر دیا گیا تھا۔

ایمبولینس شور مچاتی کنٹونلی اسپتال جنیوا میں داخل ہوئی۔ اسے فوراً داخل کر لیا گیا۔ ڈاکٹروں کی بروقت کوشش سے اس کی جان بچ گئی۔

اس پر اس کی دائمی بیماری کا شدید حملہ ہوا تھا۔

جینی اسپتال پہنچی تو اسٹیفن سیلف سپورٹ والی مشین پر تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق اس کی زندگی کو اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔

خطرے کی بات اگر کوئی تھی تو وہ یہ کہ اس کا فوری آپریشن ہونا تھا تا کہ وہ منہ اور ناک سے سانس لینے کے قابل ہو جائے۔ وہ ہمیشہ تو مشین پر نہیں رہ سکتا تھا۔

جینی کو اسی وقت ایک ڈاکٹر کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ ہو سکتا ہے آپریشن کے بعد مریض کی جان تو بچ جائے لیکن وہ بولنے کے قابل نہ رہے۔

یہ اطلاع یقیناً جینی کے لیے پریشان کن تھی۔ کئی سال سے اسٹیفن کی آواز دھیمی ہو گئی تھی اور وہ بہ مشکل تقریر کرنے کے قابل رہا تھا مگر اب تو یہ کہا جا رہا تھا کہ اس کی آواز بالکل ہی ختم ہو جائے گی۔ اب کیا ہوگا۔ معذوری میں ایک اور معذوری۔ پھر اچانک جینی نے ایک فیصلہ کر لیا۔

"اگر آپریشن میرے شوہر کی زندگی بچانے کے لیے ضروری ہے تو ضرور کیا جائے۔ زندگی ضروری ہے آواز نہیں۔"

جینی کی اجازت کے بعد آپریشن کر دیا گیا۔

آپریشن سے اس کی زندگی تو بچ گئی لیکن مسئلہ پھر وہی آواز کا تھا۔ اس کی آواز اس قدر دھیمی ہو چکی تھی کہ کوئی نہیں سن سکتا تھا۔

اسے سوئٹزرلینڈ لے جایا گیا جہاں ایک خصوصی آپریشن کے ذریعے گلے میں ایک مشین لگا دی گئی لیکن اس اندیشے کے ساتھ کہ اسٹیفن صرف ضروری باتیں کرے گا۔ اگر یہ مشین زیادہ استعمال کی گئی تو ہو سکتا ہے بار بار آپریشن کی نوبت آئے۔

بہت بعد میں جب اسٹیفن کی آواز بالکل ہی دم توڑ گئی تو اس کا دوست ڈاکٹر ولیم آگے بڑھا جس نے ایک آلہ ایجاد کیا جو اس کے خیالات کو الفاظ کی صورت کمپیوٹر اسکرین پر لے آتا تھا۔ اسی آلے کی مدد سے وہ یونیورسٹیوں میں لیکچر دیتا اور پریس کانفرنس سے خطاب کرتا تھا۔

وہ اسپتال سے باہر آیا تو اس قابل ہو چکا تھا کہ کتاب کے مسودے پر دوبارہ کام کر سکے۔ وہ پبلشر کی رائے کے مطابق مسودے میں کمی بیشی کرتا رہا۔

☆☆☆

1985ء میں اسٹیفن نے ایک لیکچر ٹور کا آغاز کیا۔ اسے شکاگو میں قیام کرنا تھا۔ اس کے پہنچنے کے دوسرے دن اس نے ایک پبلک لیکچر دیا۔ وہ اب بے حد مشہور ہو چکا تھا۔ اس کا نام سن کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کون اسٹیفن لہٰذا جب اس کے لیکچر کا اعلان ہوا تو جگہ کم پڑ گئی اور بہت سے لوگ مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔

اس کی آمد لوگوں کے لیے بالکل انوکھا تجربہ تھا۔ وہ اسٹیج پر ایک ماتحت کی مدد سے آیا پھر اس کی وہیل چیئر کو اسٹیج پر لایا گیا کیونکہ اس وہیل چیئر پر کمپیوٹر فٹ تھا۔ وہ اس مشینی کرسی پر بیٹھ کر ہی خطاب کر سکتا تھا۔ اس کی نظریں حاضرین پر تھیں اور انگلیاں کمپیوٹر پر حرکت کر رہی تھیں۔ اس کا سر سینے کی طرف ڈھلکا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے ایک طرف دو نرسیں اس کی مدد کے لیے تیار کھڑی تھیں دوسری جانب ریسرچ والے طلبہ موجود تھے۔

خطاب کرنے کے بعد حاضرین کو سوال کرنے کی اجازت دی گئی لیکن لوگوں کو بتا دیا گیا کہ جواب کے لیے انہیں کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا جو انہیں کمپیوٹر کے ذریعے ملے گا چنانچہ یہی ہوا۔ ایک طرف سے سوال آیا۔ دس منٹ بعد اس کا جواب کمپیوٹر والی اسکرین پر آیا۔

یہ سلسلہ زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا لہٰذا اسے ختم کرنا پڑا۔

☆☆☆

اس کی کتاب "اے بریف ہسٹری آف ٹائم" شائع ہوئی تو اخبارات کے صفحات اسٹیفن کے انٹرویوز سے بھر گئے۔ ٹیلی ویژن کے لیے دستاویزی پروگرام بھی تیار کیا گیا اور اسے دنیا کا عظیم سائنس داں قرار دیا گیا۔ یہ دستاویزی فلم اس کی زندگی کے بارے میں تیار کی گئی تھی۔ یہ فلمیں کئی زبانوں میں بنائی گئیں۔ ان فلموں کے ذریعے اسٹیفن کی شہرت پھیل گئی۔ اسے "ماسٹر آف دی یونیورس" کا خطاب دیا گیا۔

اس کی ان فلموں نے نوجوانوں میں ایک نیا جوش پیدا کر دیا۔ ریاضی میں داخلہ لینے والوں کی تعداد حیرت انگیز طور پر بڑھ گئی۔

ملکہ برطانیہ نے ..... ایک اعزاز دینے کے لیے اسے شاہی محل میں مدعو کیا اور اسی ہفتے کیمبرج یونیورسٹی نے اس کو اعزازی ڈگری ڈاکٹر آف سائنس دینے کا اعلان کیا۔ یہ ڈگری اسے شہزادہ فلپ کو اپنے ہاتھوں سے عطا کرنی تھی۔

گلی میں سیکڑوں افراد قطار میں کھڑے تھے۔ اسٹیفن کی وہیل چیئر ایک جلوس کی شکل میں محل کی طرف بڑھی اور کیمبرج یونیورسٹی کی طرف گئی۔

اس کی زندگی حادثوں اور حیرتوں سے بھری ہوئی تھی لیکن ایک حادثہ ایسا ہوا جسے ملک کے تمام چھوٹے بڑے اخباروں نے شائع کیا اور خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

"اسٹیفن اور جینی .... شادی کے 25 سال بعد ایک دوسرے سے الگ ہوگئے ہیں۔"

"جینی، اسٹیفن کو چھوڑ کر چلی گئی۔"

"جینی اور اسٹیفن کی شادی ٹوٹ گئی۔"

"جینی غائب۔ اسٹیفن اپنی نرس ایلائن کے ساتھ رہ رہا ہے۔"

"کیا ایلائن اور اسٹیفن شادی کرلیں گے۔"

"ایلائن کی موجودگی آخر رنگ لائی۔"

اس قسم کی متضاد خبریں اخبارات میں شائع ہوئیں تو جگہ جگہ یہی چرچے ہوئے۔ تصدیق کے لیے صحافی دوڑ پڑے کہ اصل وجہ تلاش کی جائے۔

خبر تو اب آئی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ دونوں کئی سال سے ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے نظر آرہے تھے۔ اب لوگوں کو یاد آیا کہ باہر کے دوروں میں جینی اکثر اس کے ساتھ نہیں تھی۔

اسٹیفن جب شہرت کی بلندیوں کو چھو رہا تھا اور تمغوں سے نوازا جارہا تھا، ان دنوں جینی کے دل میں اس کی طرف سے مغایرت کے جذبات پیدا ہورہے تھے۔ اسٹیفن کے ساتھ اس نے باہر کے دوروں میں جانا کم کردیا تھا اور آہستہ آہستہ بالکل ہی ختم۔ اس نے اسٹیفن کی طرف توجہ مبذول رکھنے کی بجائے اپنی ذاتی دلچسپیوں پر زیادہ توجہ دینی شروع کردی تھی۔

اس خبر کے شائع ہوتے ہی لوگوں کو یقین آگیا۔ اخباری رپورٹروں نے اسٹیفن کے گھر کے گرد منڈلانا شروع کردیا۔ کہیں سے کوئی خبر مل جاتی تو اخباروں کی سیل میں اچانک اضافہ ہوجاتا حالانکہ وہ لوگ جو اس علیحدگی کی وجوہات جانتے تھے وہ بے حد احتیاط سے کام لے رہے تھے تاکہ پریس میں گندگی نہ اچھالی جاسکے۔ اصل معاملہ دفن ہی رہا صرف مذہبی اختلاف سامنے آئے۔

جینی نے ایک صحافی کے سوال کے جواب میں کہا تھا "میرا کردار اس سے کچھ زیادہ نہیں کہ میں نے ایک معذور آدمی کی دیکھ بھال کی تھی مگر صاف طور پر یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ خدا نہیں ہے۔"

اس کے باوجود (یعنی مذہبی اختلاف کے باوجود) جینی اس کے ساتھ رہتی رہی تھی۔ پھر علیحدگی کی کیا وجہ ہوئی؟ جب شہرت اور عالمی پیمانے پر اسٹیفن کو کامیابیاں ملنے لگیں تو جینی نے اپنی زندگی کو نئے زاویوں کے ساتھ استوار کرنا شروع کردیا اور ان کے راستے بدلنے لگے۔ اب اسٹیفن کا انحصار اس کی نرس ایلائن پر زیادہ ہوگیا۔ اسی لیے اس علیحدگی میں ایلائن کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اس قصے میں بحث و مباحث کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلا۔ لوگوں نے یہ تک کہہ دیا۔

"اسٹیفن کو عورتوں کے ساتھ کمپنی میں لطف آتا ہے۔ وہ عورتوں سے فلرٹ کرکے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کا ایلائن کے ساتھ جو رشتہ تھا وہ کسی رحم دلی پر موقوف نہیں تھا۔ وہ اس کے ساتھ زیادہ تر وقت گزارتی تھی اور ان کے درمیان حقیقی محبت موجود تھی۔"

اخبارات میں خبر شائع ہوئی۔

اسٹیفن نے جینی کو چھوڑ دیا اور ایک دوسرے فلیٹ میں چلا گیا۔ یہاں وہ ایک نرس کے ساتھ رہتا ہے۔ یہ وہی نرس ہے جو کئی سال سے اس کی خدمت کررہی تھی۔

دراصل اسٹیفن کے ساتھ نرسوں کا ایک گروپ تھا۔ اس کی ایک رکن ایلائن حسین بھی تھی۔ عرصے تک اسٹیفن کے حامیوں اور مخالفوں کے خیالات اخبارات میں جلوہ گر ہوتے رہے۔ کچھ لوگ جینی کو قصوروار ٹھہرا رہے تھے کچھ کا خیال تھا کہ اسٹیفن کو بیوی سے علیحدگی پر کوئی الزام نہیں دینا چاہیے کیونکہ اس نے بیوی کے لیے بہت کچھ کیا تھا۔ جینی نے بعض ایسے بیانات دیے تھے جن سے اسٹیفن کی توہین ہوئی تھی۔

ان سب کے برعکس یہ خاص طور پر دیکھا جارہا تھا کہ اسٹیفن اب بہت خوش نظر آنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔

اس کے حامی یہ کہہ کر اس کا دفاع کرتے تھے کہ وہ الجھنوں میں گرفتار ہے اپنا غم چھپانے کے لیے خود کو خوش و خرم رکھنے کی کوشش کرتا ہے یا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ خوش ہے۔ یہ احتیاط وہ ہمیشہ کرتا رہا کہ اس معاملے میں خاموشی اختیار کیے رہے۔ جینی بھی مہر بہ لب تھی۔

اسٹیفن کو یہ ایڈوانٹیج البتہ تھا کہ لوگوں کی اکثریت اسے چاہتی تھی۔ شادی والے حادثے کے بعد بھی چاہتی تھی۔ یہ وہ سہارا تھا جو اس کے لیے نئے نئے راستے نکالتا تھا۔

وہ ایلائن کے ساتھ اکیلے فلیٹ میں اسی طرح رہ رہا تھا جیسے کبھی شادی سے پہلے جینی کے ساتھ رہ رہا تھا اور بعد میں اس سے شادی کرلی تھی۔ وہ اب بھی یہی سوچ رہا ہوگا لیکن ایلائن کے سلسلے میں رکاوٹ یہ تھی کہ وہ شادی شدہ تھی۔ اس کے بچے تھے۔ شوہر تھا۔

اسٹیفن کو اسی لیے انتظار کرنا پڑرہا تھا۔ ایک سال گزر جانے کے باوجود لوگ جینی کو نہیں بھولے تھے۔ اسٹیفن شاید اس قصے کے دب جانے کا انتظار کررہا تھا۔

اس نے سب کچھ بھول جانے کے لیے اپنی کتاب کی اشاعت بڑھانے پر توجہ دی اور ایلائن کو لے کر سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ کئی تجارتی سفر کیے۔ اس دوران طلبہ اور شہرۂ آفاق لوگوں کی طرف سے بے شمار درخواستیں آئیں کہ وہ اس کا لیکچر سننا چاہتے ہیں۔ کسی کو رد کرنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کا یہ تجارتی سفر علمی سفر بھی بن گیا۔ جگہ جگہ خطاب کرتا ہوا تمام قابلِ ذکر مقامات کی سیر کرلی۔

اس کی کتاب "اے بریف ہسٹری آف ٹائم" برطانیہ میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب بن گئی تھی۔ اس کی تعداد فروخت ملین سے بھی زیادہ تھی۔ اس کتاب کے ٹیپ بھی تیار ہوئے۔ اسٹیفن کو دنیا کے مختلف ممالک سے خطوط آتے تھے۔ ان خطوط میں اسے کتاب کی اشاعت پر مبارکباد دی جارہی تھی اور مختلف سوالات کیے جارہے تھے۔ بعض خطوط ایسے تھے جن میں اس کتاب کو اپنے ملک میں شائع کرنے کے حقوق حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی گئی تھی۔

اس کی پرائیویٹ زندگی زبردست الجھنوں میں گزر رہی تھی جس سے نبرد آزما ہونے کے لیے اسے کچھ وقت درکار تھا۔ وہ اپنے آپ کو تجارتی سرگرمیوں اور مے نوشی تک محدود کیے ہوئے تھا۔ لوگ یہ خطرہ محسوس کرنے لگے تھے کہ شاید اس کی سائنسی زندگی متاثر ہوجائے گی لیکن وہ خوب جانتا تھا کہ سائنس ہی ہے جو اسے آفات سے محفوظ رکھے گی۔ اس نے اکیڈمی سے وابستگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے دفتر میں بیٹھنا شروع کردیا۔

اس مرتبہ دفتر جانے والے راستے میں اسے پیش آنے والے حادثوں میں ایک حادثے کا اور اضافہ ہوگیا۔

وہ شہر کی بڑی جانی پہچانی شخصیت تھی اور اکثر اس کے قریب سے گزرنے والے اس کے پاس آکر رک جاتے تھے اور اس سے باتیں کیا کرتے تھے۔ ایسا ہی اس روز ہوا تھا۔ مخالف سمت سے آنے والی گاڑی کا ڈرائیور اسے دیکھنے کی کوشش میں اپنی گاڑی پر کنٹرول نہ رکھ سکا اور اس کی چیئر سے ٹکرا گیا۔ اسٹیفن کا نحیف جسم چیئر سے نکل کر سڑک پر آگیا۔ کوئی اور گاڑی قریب سے نہیں گزر رہی تھی ورنہ خطرناک حادثہ بھی ہوسکتا تھا مگر قسمت سے معمولی چوٹیں آئیں۔ چہرہ زخمی ہوا اور شانوں پر چوٹ آئی۔

حادثہ ہوتے ہی اس کی اطلاع امریکی ٹی وی نے ساری دنیا میں پھیلادی۔ ٹی وی پر خبر نشر ہوتے ہی جینی جہاں کہیں بھی تھی دوڑی چلی آئی حالانکہ اب اس سے اسٹیفن کا رشتہ باقی نہیں رہا تھا۔ ایلائن نے اسے دیکھ کر کمرا خالی کردیا تھا۔

"جینی، تم کیسی ہو۔"

"اس وقت مجھے آپ کی فکر ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ زیادہ چوٹیں نہیں آئیں۔"

"ڈاکٹر کہتے ہیں پندرہ دن آرام کرنا ہوگا۔"

"وہ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔"

"اس طرح سائنس کا کتنا نقصان ہوگا۔ جانتی ہو؟"

"تم نے ہمیشہ سائنس کے نقصان کی پروا کی ہے۔"

اسٹیفن نے نہ جانے کیوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ جینی نے یہی سمجھا کہ اب وہ اس سے مزید بات کرنا نہیں چاہتا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

اسٹیفن واقعی عجیب مٹی کا بنا ہوا تھا۔ وہ صرف 48 گھنٹے بعد دفتر پہنچ گیا حالانکہ ڈاکٹروں نے اسے کام سے منع کردیا تھا۔

"یہ حادثے کتنے دلکش ہوتے ہیں۔ کچھ نہیں تو ایک سال بعد جینی مجھ سے ملنے آگئی۔" اس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔ ظاہر ہے یہ بات وہ کسی اور سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

اس سے ایک سال پہلے وہ ایسے ہی ایک اور حادثے سے گزر چکا تھا اور اس نے وہاں بھی ایسی ہی استقامت دکھائی تھی۔

یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب وہ ایک لیکچر دینے کے لیے آکسفورڈ گیا تھا۔ ایک نوجوان فزکس پروفیسر جس نے اسٹیفن کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے دیکھنے کے شوق میں نہایت تیزی سے اس کی طرف دوڑا۔ اس وقت اسٹیفن نے اپنی چیئر کوریڈور میں دوڑادی۔ لفٹ کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ پروفیسر جانتا تھا کہ دروازے تنگ ہیں اس کی چیئر اس میں داخل نہیں ہوسکے گی۔ یہی ہوا۔ اس کی چیئر لفٹ میں پھنس گئی۔ پروفیسر اس کے تعاقب میں تھا اسے روکتا رہا لیکن اسٹیفن نے اس کی آواز نہیں سنی۔ کئی لوگ اور بھی مدد کو دوڑ پڑے۔ دراصل یہ سب اس لیے ہوا تھا کہ اسٹیفن کو پہنچنے میں دیر ہوگئی تھی اور وہ معذرت سے بچنے کے لیے جلد سے جلد لفٹ کا سہارا لے کر لیکچر ہال میں پہنچنا چاہتا

تھا جہاں وائس چانسلر اور ہزاروں طلبہ اس کے انتظار میں تھے۔ یہ سب جلد بازی کی وجہ سے ہوا تھا۔

جب تک لوگ اسے پکڑتے، اسٹیفن اپنی چیئر کو لفٹ کے دروازوں میں لے گیا لیکن ہوا یہ کہ جیسے ہی وہ لفٹ میں داخل ہوا اس کی کرسی گھوم کر ایک کونے میں ہوگئی اور تنگ راستے میں پھنس گئی اور اس کے عقب میں خود کار دروازہ بند ہوگیا اور اس کا ایک بازو دروازے میں پھنس گیا۔ اسٹیفن .... کمپیوٹر کے بٹن دبانے میں مصروف تھا کہ کسی طرح چیئر کو ریورس کرے اور لفٹ کے بٹن تک پہنچ جائے لیکن چیئر لفٹ کی دیواروں میں اس طرح پھنس گئی تھی کہ جنبش نہیں ہو رہی تھی۔ پروفیسر کچھ اور لوگوں کی مدد سے اس کے بازو کو دروازے سے نکالنے میں کامیاب ہوگیا اور اس طرح وہ لفٹ کے بٹن تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

کوئی اور ہوتا تو اس حادثے کے بعد اسے اپنے حواس درست کرنے میں گھنٹوں لگ جاتے لیکن اسٹیفن کے چہرے پر وہی ازلی مسکراہٹ تھی۔ لیکچر ہال میں پہنچا تو اس کے چہرے سے یہ ظاہر ہی نہیں ہو رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ کسی مصیبت سے گزرا ہے۔ مہمانوں میں گھل مل گیا۔ پُرسکون انداز میں کمپیوٹر کی مدد سے خطاب بھی کیا اور سوالوں کے جواب بھی دیے اور استقبالیے میں شریک بھی ہوا۔

☆☆☆

اسٹیفن نے اپنے بچوں کی تصویریں اب بھی اپنے دفتر میں لگا رکھی تھیں لیکن اب ان کی علیحدگی مکمل ہو چکی تھی۔ اس علیحدگی کے بعد اسٹیفن ایک مرتبہ پھر ذاتی حیثیت میں خبروں کا موضوع بن گیا۔ اس نے اپنی نرس سے شادی کرلی تھی۔ مخالفوں کی زبانیں پھر کھل گئیں۔ جینی نے جن رازوں سے پردہ نہیں اٹھایا تھا اور قالین کے نیچے دفن کردیے تھے اس شادی نے ان رازوں سے پردہ اٹھا دیا لیکن اب اپنے کام کے اعتبار سے اسٹیفن کی اہمیت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اب یہ نجی اسکینڈل اس کی مقبولیت پر اثرانداز نہیں ہوسکتے تھے۔ اس کی کتاب نے سائنس کی دنیا میں ہلچل مچا دی تھی اور اپنے آپ کو دنیا کا بے حد اہم سائنس داں ثابت کرچکا تھا۔ وہ فزکس کی بہت سی تھیوریوں میں اس وقت کامیاب ہوچکا تھا جب دنیا کو ان کے بارے میں علم نہیں تھا۔ کائنات کے علوم کے سلسلے میں اس نے وہ زبردست معلومات فراہم کیں جو اسی کا حصہ ہیں۔ اس کے بے پناہ کام نے بیسویں صدی کو سائنس کی صدی بنا دیا۔

اس کی کتاب نے (اے بریف ہسٹری آف ٹائم ...) یہ اہتمام کیا تھا کہ لوگ گھر بیٹھے خلا کے بارے میں معلومات حاصل کرسکتے تھے۔ بلیک ہول کے بارے میں اس کی پیش رفت کے سلسلے میں اس سائنس داں کی قابلِ قدر معلومات اس علم میں شاندار اضافہ ہے۔ اس سلسلے میں اس کی کتاب ''بلیک ہولز اینڈ بے بی یونیورس'' معرکۃ الآرا کتاب ہے۔

خلا میں جانے والوں کے لیے اس کی تھیوریاں ہمیشہ مشعلِ راہ بنی رہیں۔

اس نے اپنی نرس سے شادی کرلی تھی لیکن یہ شادی تین برس سے زیادہ نہیں چل سکی۔ یہ دوسری بیوی بھی اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ پھر اکیلا رہ گیا۔

وہ شاید دنیا کو حیران کرنے کے لیے ہی دنیا میں آیا تھا۔ 2007ء میں دنیا کو اس وقت انگشت بدنداں کردیا جب اس نے خلا کا مختصر سا سفر اختیار کیا اور قوتِ ثقل کو ناپنے کا ایک تجربہ بھی کیا۔

کیا یہ حیرت انگیز امر نہیں کہ وہ مکمل طور پر مفلوج ہے۔ چلنے پھرنے اور بولنے سے معذور۔ دنیا کے ساتھ اس کے رابطے کا ذریعہ ایک برقی آلہ ہے جو اس کی سوچ کو الفاظ میں ڈھال کر اسکرین پر لے آتا ہے۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اسی برقی آلے کے ذریعے کہتا ہے۔

اس اعصابی بیماری کے باوجود اس نے پی ایچ ڈی مکمل کی۔ کتب لکھیں۔ اس کی خدمات کے صلے میں اس کو بارہ اعزازی ڈگریوں سے نوازا گیا۔ گزشتہ دنوں صدر بارک اوباما نے امریکا کا اعلیٰ ترین سول ایوارڈ اسے اپنے ہاتھوں سے عطا کیا۔

21 سال کی عمر میں اعصابی بیماری کا شکار ہونے والا یہ معذور سائنس داں، جس کے بارے میں ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ وہ دو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا اس کے فولادی عزم نے موت کو شکست دی وہ آج بھی انسانیت کی خدمت کے لیے عظیم تحقیقی کاوشوں میں مشغول ہے۔ خلا کے بارے میں اس نے اتنی معلومات فراہم کی ہیں اور کر رہا ہے کہ امریکی قوم بلکہ پوری انسانیت اس کی خدمات کا قرض چکا نہیں سکتی۔ اس کی کوششوں کو بڑے پیمانے پر شکرگزاری کی ضرورت ہے۔

ماخذ: اسٹیفن ہاکن
ترجمہ: شاکر عثمانی

شاطر نواب

سید احتشام

لندن کی مضافات میں ایک بساط بچھائی گئی جس کی چالیں پوری سلطنتِ انگلیشیہ پر اثرانداز ہونے لگیں۔ اس نے اپنے چہرے پر ایک کائونٹ (نواب) کا ملمع چڑھایا تھا اور لوگ اس کے جال میں پھنستے چلے گئے۔ انگلستان کی تاریخ پھندے بازوں سے بھری ہوئی ہے مگر یہ ایک ایسا نوسرباز ثابت ہوا جس کی نظیر نہیں ملتی۔

موسیقی کی رسیلی دھنوں نے فضا پر ایک سحر سا طاری کر رکھا تھا۔ لوگ بے خودی کے عالم میں اپنی اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی دوران نہایت عمدہ تراش کے بیش قیمت سوٹ اور سفید ٹائی میں ملبوس صاحبِ خانہ، جی

ونسینٹ کولویل نے اپنے انتہائی اعلیٰ فرنیچر سے آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم کا سرسری جائزہ لیا اور غیر حاضر دماغی سے موسیقی کی مدھر دھنوں کو سننے لگا۔

ڈرائنگ روم مہمانوں سے تقریباً بھرا ہوا تھا۔ وہ ان

کا جائزہ لیتے ہوئے، اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے طمانیت بھرے انداز میں اپنی کلین شیو ٹھوڑی کو دھیرے دھیرے سہلانے لگا۔ مہمانوں کی کل تعداد پچاس کے لگ بھگ ہوگی لیکن سب کے سب نیویارک کے طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ شامِ موسیقی اکثر و بیشتر اسی عمدہ، نوجوان انگریز جوڑے، یعنی مسٹر اور مسز کولویل کے ہاں منعقد ہوتی تھی۔ یہ جوڑا حال ہی میں نیویارک کے اس فیشن ایبل علاقے گریمری پارک منتقل ہوا تھا اور ان کی شامِ موسیقی نے طبقۂ اشرافیہ میں دھوم مچا رکھی تھی اور یہ شام تو خاص طور سے بہت ہی کامیاب ثابت ہوئی تھی۔

موسیقی کے آخری سُروں کے معدوم ہوتے ہی فضا تحسین و آفرین کی آوازوں سے مرتعش ہوگئی۔ پھر مسز ہیڈلے اپنی جگہ سے اٹھ کر کویول کی طرف بڑھیں اور انہوں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

"بہت شاندار پارٹی رہی، مسٹر کولویل...... بہت ہی شاندار۔" انہوں نے کولویل کا ہاتھ خلوص سے تھپ تھپایا اور چلی گئیں۔ دیگر مہمان بھی باری باری کولویل سے مصافحہ کرنے اور پارٹی کی تعریفیں کرنے لگے۔ کولویل ہر ایک سے نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتا رہا۔ پھر وہ اپنی بیوی کی تلاش میں ہال میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ اسی اثنا میں ایک ضعیف عورت مسز وین گیڈین نے کولویل کا بازو نرمی اور شفقت سے تھام لیا۔

"میرے عزیز مسٹر کولیول" وہ اپنی کانپتی ہوئی آواز میں مخاطب ہوئی۔ "مجھے آنا تو نہیں چاہیے تھا کیونکہ آج صبح سے میری طبیعت ناساز ہے لیکن تم نے اتنے خلوص سے بلایا کہ میں خود کو روک نہ سکی۔ اور پھر یہ کہ تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے وہ مخصوص راگنی سنواؤ گے۔ یہ تمہاری نوازش ہے کہ تم نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ یقین مانو، میں بے حد محظوظ ہوئی۔"

"وہ راگنی بطور خاص آپ ہی کے لیے تھی، مسز وین" کولویل نے انگریزی لب و لہجے میں کہا جس کی اس نے بے حد مشق کی تھی۔

"راگنی بہت پیاری تھی۔ اب میں مسز کولویل کو ڈھونڈ کر شب بخیر کہوں گی۔ یہ پارٹی بہت شاندار رہی۔"

وہ دونوں قدم اٹھاتے ہوئے مسز کولویل کے پاس پہنچ گئے جو مہمانوں کو رخصت کررہی تھی۔ وہ بھی انگریزی لب و لہجے کی نقل کرنے کی کوشش کرتی تھی اور کسی حد تک کامیاب بھی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بڑے تپاک سے مسز وین سے مصافحہ کیا۔ "آپ کی بڑی نوازش مسز وین کہ آپ نے تشریف لا کر ہمیں عزت بخشی...... اوہ! خدایا...... کتنا خوش نما ہار ہے...... معاف کیجیے گا، آپ نے میری تعریف کا برا تو نہیں مانا؟"

مسز وین نے ویدے مٹکائے اور رازداری سے اس کی طرف جھکی۔ "میں یہ ہار آج رات تمہاری خاطر پہن کر آئی ہوں...... صرف تمہاری خاطر......!" اس نے ہار کو انگلیوں سے چھوا۔ "یہ میری شادی کی پچیسویں سالگرہ کی یادگار ہے۔" اس نے سرگوشی کی۔ "ہے نا پیارا؟ یہ خاص موقعوں پر پہننے کے لیے ہے۔"

"ہاں، سچ مچ بہت پیارا ہے۔" مسز کولویل نے اتفاق کیا۔

کولویل، ضعیفہ کو لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا اور پھر اس کی ایک بانہہ تھام کر سیڑھیاں اترنے میں مدد کرنے لگا۔ پھر جب وہ داخلی ہال میں پہنچے تو کولویل اپنی ملازمہ ایلین سے مخاطب ہوا۔ "ایلین، مسز وین کا کوٹ لاؤ۔" اس نے مسز وین پر زور دے کر کہا۔ ایسے میں اس کی مکار آنکھوں میں ایک خاص چمک عود کر آئی تھی۔

ایلین فوراً غائب ہوگئی اور چند ہی سیکنڈ کے بعد مسز وین کے کوٹ کے ساتھ دوبارہ نمودار ہوئی۔ مسز وین بدستور شامِ موسیقی کی تعریفیں کررہی تھی۔ ایلین کوٹ پہننے میں اس کی مدد کرنے لگی۔ ریشمی مفلر لپیٹنے میں ایلین کو تھوڑی دشواری ضرور ہوئی لیکن اس نے نہایت چابکدستی سے وہ مفلر مسز وین کے گلے میں لپیٹ دیا۔

مسز وین کا شوفر دروازے پر انتظار کررہا تھا۔ اس نے اس کا دایاں بازو اور کولویل نے بایاں بازو تھام لیا اور دونوں باہر کھڑی ہوئی لمبی سی شاندار کار کی طرف بڑھ گئے۔ مسز وین کار کے اسٹارٹ ہونے پر بھی رطب اللسان تھی۔ پھر کار تیزی سے روانہ ہوگئی۔ کولویل، مسز وین کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا، پھر تیزی سے مڑا اور اپنے گھر میں داخل ہوگیا۔ گریمری پارک کی اس کوٹھی نمبر 12 سے جب آخری مہمان رخصت ہوا تو آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی اور اب صرف جارج اینڈرسن نامی شخص وہاں رہ گیا تھا جو مہمانوں سے مستثنیٰ تھا۔ وہ کولویل کا جگری دوست تھا...... کم گو اور کم آمیز جارج اینڈرسن۔

مسٹر اور مسز کولویل، جارج اینڈرسن اپنے اپنے ہاتھ میں کانچ کا گلاس تھامے، تھکے تھکے سے انداز میں کرسیوں

میں دھنسے ہوئے تھے اور اسکاچ کی چسکیاں لے رہے تھے۔

"ایلین واپس آگئی؟" تھوڑی دیر کے بعد کولویل نے پوچھا۔

"ابھی نہیں آئی۔" مسز کولویل نے جواب دیا۔

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ......!"

اچانک ٹیلی فون کی سمع خراش گھنٹی کی آواز نے کولویل کا جملہ کاٹ دیا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر اپنے پہلو میں رکھے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھالیا۔ جوزیفائن کولویل اور جارج اسے غور سے دیکھنے لگے۔ "اوہ، ہاں، مسز وین گیڈین...... ہاں، میں بول رہا ہوں...... نہیں!" اچانک اس کے لہجے میں حیرت کا عنصر شامل ہوگیا۔ "مجھے یقین نہیں آرہا...... یہ تو بڑی افسوس ناک خبر ہے۔" اس نے اپنا ہاتھ بلند کرکے انگلی اور انگوٹھے کو ملایا اور تیزی سے جھٹکا دیا، پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے، ماؤتھ پیس میں بولا۔ "نہیں، نہیں ہم نے نہیں دیکھا...... آپ کی کار میں؟...... یا ممکن ہے سڑک پر؟...... اوہ، ہاں...... ضرور ضرور...... ہم گھر کا کونا کونا چھان ماریں گے...... مسز جوزیفائن کولویل یہ سن کر حواس باختہ ہوجائیں گی...... مجھے بے حد افسوس ہے...... مجھے یقین ہے کہ مل جائے گا...... ہاں، ہاں ضرور...... اچھا شب بخیر......!"

اس نے ریسیور رکھ دیا اور فون کو تکنے لگا۔ اچانک ایلین کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے گلے میں موتیوں کا وہی ہار لٹک رہا تھا جو اس شب مسز وین گیڈین کے گلے کی زینت بنا ہوا تھا۔ ہار خاصا لمبا تھا اور ملازمہ ایلین کی کمر تک پہنچ رہا تھا۔ "ہے نا خوبصورت؟" اس نے موتیوں کو پیار سے انگلیوں سے چھوا اور پھر اتار کر جارج کے حوالے کردیا۔

جارج نے اپنی عینک اتاری اور جیب سے ایک محدب عدسہ نکال لیا۔ سب لوگ مسکراتی نظروں سے اسے تکنے لگے۔ جارج محدب عدسے کی مدد سے موتیوں کا بغور معائنہ کرنے لگا۔

"سچے موتی ہیں۔" وہ تھوڑی دیر بعد گویا ہوا۔

"ڈچ، جلدی سے بتاؤ اس کی کیا قیمت ہوگی؟" کولویل جلدی سے بول پڑا۔ "محتاط اندازے سے بتاؤ۔"

وہ جارج کو ڈچ کہتا تھا۔ جارج نے موتیوں کو توصیفی انداز سے انگلیوں سے رگڑا۔ "پچاس، ساٹھ ہزار ڈالر تو مل ہی جائیں گے۔" وہ بولا۔ "لیکن ہم طویل عرصے تک اسے فروخت نہیں کرسکیں گے۔ تمہیں ایک ایک موتی نکال کر فروخت کرنے پڑیں گے۔ زیادہ سے زیادہ دو موتی۔"

"اور اگر مسز وین نے صرف بیمہ والوں کو طلب کرنے کے بجائے پولیس طلب کرلی، پھر کیا ہوگا؟" جوزیفائن پوچھ بیٹھی۔

"اس کا شوہر جیری، اتنے چھوٹے معاملات میں پولیس کو ملوث کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔" ایلین بول پڑی۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" جوزیفائن نے کہا۔

"خدا کے لیے پُرسکون ہوجاؤ۔ سمجھ گئیں۔" کولویل نے برہمی سے اپنی بیوی کو ڈانٹا۔ "پولیس کو بھی اس کے بارے میں معلوم نہیں ہوسکے گا۔ یہ ایک سیدھی سادی بات ہے۔ بڑھیا ایک چھوٹی سی پارٹی میں شریک ہونے آئی تھی۔ ایک چھوٹی سی پارٹی میں...... جس میں صرف چند احباب شریک تھے اور وہ سب کو جانتی تھی...... کیا وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ یہاں ٹن کے حساب سے ہیرے جواہرات تھے۔ لیکن کسی کی کوئی بھی شے گم نہیں ہوئی۔ صرف اس کا ہار گم ہوگیا۔ اس نے وہ ہار گم کردیا اور یہ توقع کیے بیٹھی ہے کہ ہار اسے مل جائے گا۔ نہ بھی ملا تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟ ہار بیمہ شدہ ہے۔ رقم گویا اس کے پرس میں ہے۔" وہ بہت پُرجوش لہجے میں، بہت تیزی سے بول رہا تھا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" جارج نے کہا۔ "لیکن جو پولیس اس ہار کو ڈھونڈنے یہاں آئے گی وہ بیمہ شدہ نہیں ہوگی۔"

"میرے پاس اس کا حل موجود ہے۔" اس نے ایک عیارانہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنی جیب سے ایک دبیز کاغذ نکال دیا۔ "میں تم لوگوں کو ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔ "یہ ایک خط ہے، جو میں نے ڈنر سے پہلے ہی مسز وین کے نام لکھا تھا۔

مائی ڈیئر مسز وین گیڈین۔

میں اور مسز کولویل آپ کے سچے موتیوں کی گم شدگی پر اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنے سے قاصر ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتی ہیں ہم نے اس بیش قیمت ہار کی تلاش میں پورے گھر کو تہ و بالا کردیا ہے۔ اب صرف یہی فرض کیا جاسکتا ہے کہ آپ کا وہ ہار یقیناً سڑک پر یا آپ کی کار کے پائدان پر گرا ہوگا اور کسی کے ہاتھ لگ گیا ہوگا۔ میں اس خط کے ساتھ ہی ایک ننھا سا حقیر تحفہ بھیج رہا ہوں۔ اس سے اس عظیم نقصان کی تلافی تو نہیں ہوسکتی، پھر بھی ہمیں امید

ہے کہ اس سے اشک شوئی ہو سکے گی۔
خلوص آگیں
جی، ونسینٹ کولویل اور اہلیہ۔

☆☆☆

کولویل بلاشبہ نہایت شاطر اور عیار تھا۔ خوش قسمت بھی تھا۔ وہ اگلی صبح مسز وین کے گھر پہنچ گیا اور اس نے ایک لفافہ جس میں اس خط کے ساتھ چند نیلم اور یاقوت ملفوف تھے، اس کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ساتھ ہی اس قیمتی ہار کو ڈھونڈنے کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ مسز وین اس کے اس رویّے اور اس کی لچھے دار باتوں سے بے حد متاثر ہوئی اور اس سے ویسے ہی اخلاق سے پیش آئی جس کی کولویل کو توقع تھی۔ اس نے مسز وین جیسی سادہ لوح بڑھیا کو بالکل بے بس کر دیا تھا، لہٰذا جب وہ وہاں سے رخصت ہوا تو بے حد مطمئن تھا۔ مسز وین کے ہونٹوں پر اس کی تعریف کے سوا کچھ نہ تھا۔

☆☆☆

انشورنس کمپنی اس چوری کی اطلاع پا کر بے حد چوکنا ہو گئی تھی۔ اس نے اخبارات میں اس گمشدہ ہار کے متعلق اشتہارات شائع کرائے اور اس کی بازیابی پر انعام مقرر کیا۔ ساتھ ہی اس کا ایک تفتیش کار جوزیفائن سے ملنے پہنچ گیا۔ اس نے کوٹھی نمبر 12 گریمری پارک کے احاطے کا خوب اچھی طرح معائنہ کیا اور چپا چپا چھان مارا لیکن ہار وہاں ہوتا تو ملتا...... کولویل اور جوزیفائن نے ہر طرح سے اس سے تعاون کیا۔ دونوں بظاہر خاصے ملول اور فکر مند نظر آ رہے تھے۔ پولیس اس معاملے میں نہیں پڑی۔ مسز وین پہلے ہی سے کولویل کی ممنون نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

جی، ونسینٹ کولویل کا اصلی نام جیرالڈ چیپ مین تھا۔ وہ تیس سال پہلے نیویارک کے مقام بروکلین میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا مزاج تحکمانہ تھا اور وہ بچپن ہی سے ایڈونچر اور سنسنی خیزی کا جویا تھا۔ اسے قانون سے خاصا بغض تھا اور وہ قانون شکنی میں سنسنی محسوس کرتا تھا۔ اس نے کچھ حاصل کر کے فرار ہو جانے کو اپنے کیریئر کی بنیاد بنا لیا تھا۔ شروع شروع میں قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ 1907ء میں وہ ڈکیتی کے جرم میں گرفتار ہوا، اور اسے دس سال کی سزا ہو گئی لیکن وہ ایک سال کے بعد ضمانت پر رہا ہو گیا۔ ایک سال کے بعد وہ نقب زنی کے جرم میں گرفتار ہوا اور اسے تین سال کی سزا ہوئی۔ 1911ء میں وہ ایک بار پھر مسلح ڈکیتی کے جرم میں گرفتار ہوا اور اسے ”اوبرن جیل“ بھیج دیا گیا جہاں اس نے 1919ء تک سزا کاٹی۔

اس کے جیل کے شب و روز رائیگاں نہیں گئے۔ وہ جیل کی لائبریری میں گھنٹوں بیٹھا کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ ساتھ ہی انگریزی لب و لہجہ کی مشق کرتا رہا۔ اپنے ماضی کی غلطیوں اور حماقتوں کا جائزہ لیتا رہا اور ایسی عیاری اور چالاکی کو پروان چڑھاتا رہا جو دوسرے مجرموں میں مفقود تھی۔ اس اسیری کے دوران وہ اور ڈچ گہرے دوست بن گئے۔ ڈچ اس کی ظالمانہ اور جوشیلی فطرت کے برعکس کم گو اور کم آمیز تھا۔ گویا ایک آگ تھا تو دوسرا پانی اور یہ ایک عمدہ توازن تھا۔ جارج اینڈرسن عرف ڈچ ایک اچھی فیملی سے تعلق رکھتا تھا اور اسے ساری آسائشیں حاصل تھیں۔ وہ گریجویٹ تھا اور اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ اس کے تعلقات بھی سوسائٹی کے عمدہ لوگوں سے تھے لیکن وہ قانون کی حدود میں رہ کر جینا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ کولویل کی طرح سنسنی کا دلدادہ تھا اور سنسنی قانون سے ٹکرا کر ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے قیمتی ماہ و سال قیمتی پتھروں، کاغذ سازی اور ان پر نقش کندہ کرنے کی مہارت حاصل کرنے میں صرف کیے تھے۔ اس کی ذہانت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا چنانچہ چیپ مین عرف کولویل، مشوروں کے لیے اس پر تکیہ کرنے لگا۔

☆☆☆

اوبرن جیل میں اسیری کے دوران کولویل اپنے کیریئر کے نئے ماسٹر پلان کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔ وہ ڈکیتی کی ایک بہت بڑی واردات کرنا چاہتا تھا اور اسی واردات کے بعد نیویارک کے مشرق میں فیشن ایبل علاقے میں نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ اس نے جیل ہی میں رہ کر یہ بھی سوچ لیا کہ واردات کی نوعیت کیا ہوگی اور اس پر ہر پہلو سے غور و خوض کر لیا۔ اس کا ارادہ جیل سے رہا ہونے کے بعد مزید منصوبہ بندی کا تھا۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ اس منصوبہ بندی کی مزید تفصیلات طے کرنے لگا۔ اس کا ارادہ وال اسٹریٹ کے میل ٹرک کو لوٹنا تھا۔ وہ میل ٹرک مقررہ وقت پر نکلتا تھا۔ کولویل روزانہ اسے روانہ ہوتے دیکھتا رہا اور اطمینانِ قلب حاصل کرتا رہا۔ اس نے غور کیا تھا کہ میل ٹرک میں صرف ڈرائیور ہوتا تھا۔ پھر وہ ڈچ اور ایک سزا یافتہ ساتھی چارلی

کے ساتھ اس واردات کی ریہرسل کرنے لگا۔ وہ تینوں اس میل ٹرک کا تعاقب کرتے اور اس کی نقل و حرکت کا بغور مشاہدہ کرتے۔ پھر 24 اکتوبر 1921ء کو تعاقب کے دوران جب میل ٹرک کا ڈرائیور سگریٹ سلگانے کو رکا تو کولویل نہایت پھرتی سے اپنی کار سے نکل کر اس کے پہلو میں جا بیٹھا اور اس نے اپنے اعشاریہ تین آٹھ کے ریوالور کی نال اس کی پسلی سے لگا دی۔

”بغلی سڑک پر موڑ کر روک دو۔“ اس کا لہجہ بے حد سرد اور سفاک تھا۔ ”کوئی مزاحمت مت کرنا۔“

اس دن موسم ان کے حق میں تھا۔ پورا شہر گہری دھند میں ملفوف تھا۔ وہ کسی کی نگاہ میں نہیں آ سکتے تھے۔ ڈرائیور نے بے چون و چرا ٹرک کو لیونارڈ اسٹریٹ پر موڑ کر روک دیا۔ ڈچ اور چارلی ٹرک کے تھیلوں کو جلدی جلدی ٹرک سے کولویل کی کار میں منتقل کرنے لگے۔ کولویل نے غصے سے کانپتے ہوئے ٹرک ڈرائیور کی مشکیں کس دیں اور ایک خالی بوری اس کے سر پر منڈھ کر بوری کو باندھ دیا۔ ایکشن سے بھرپور ان چند لمحات کے بعد وہ تینوں طوفانی رفتار سے مشرق کی سمت واقع دریا کی طرف اُڑے جا رہے تھے۔ وہ دریا کا پل عبور کر کے ایک نیم تاریک سڑک پر رکے اور کار کی نمبر پلیٹ بدل دی۔

اس کے ایک گھنٹے کے بعد وہ ایک اجڑے ہوئے ویران فارم کے ٹوٹے پھوٹے کھلیان میں پہنچ گئے جو اُن کی منزل اور پناہ گاہ تھی۔ اندر ایک گرد آلود اور سیلن زدہ کوٹھری میں لالٹین روشن تھی۔ وہ وزنی تھیلوں کو اٹھا کر اندر لے گئے۔ تھیلوں کی کل تعداد آٹھ تھی۔ کولویل کے حکم پر ایک تھیلا باقی تھیلوں سے الگ کر دیا گیا۔ پھر پہلے تھیلے کی ڈاک فرش پر الٹ دی گئی۔ تینوں اس ڈھیر کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے اور ایک ایک لفافہ چاک کر کے اس کی حاصل اشیا اپنے سامنے ڈالتے چلے گئے۔ ان لفافوں میں کیش، ٹریولرز چیک، بانڈز اور سیکورٹیز تھے۔ جب ان چیزوں کا ڈھیر لگ گیا تو انہیں الگ الگ چھانٹ لیا گیا۔ یوں تین مختلف ڈھیریاں بن گئیں۔ کیش کی ڈھیری، ٹریولرز چیک کی ڈھیری اور بانڈز کی ڈھیری۔ کولویل ایک نوٹ پیڈ پر رقم درج کرتا رہا تھا۔ اب جو اس نے حساب لگایا تو بے اختیار اس کے ہونٹوں سے سیٹی نکل گئی۔

”یہاں دو لاکھ پچاسی ہزار چار سو باسٹھ ڈالر ہیں۔“ وہ بولا۔ ”اب دیکھتے ہیں دوسرے تھیلوں سے کتنی رقم نکلتی ہے۔“

دیگر سات تھیلوں میں اس سے زیادہ رقم نکلی۔ اب آخری لفافہ چیک کیا گیا اور رقم کا حساب لگایا گیا تو کولویل کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ مجموعی رقم چھبیس لاکھ تینتالیس ہزار سات سو بیس ڈالر تھی جس میں سے تین لاکھ پچھتر ہزار کیش تھا۔

”اب اس رقم کو ہم مساوی حصوں میں تقسیم کریں گے۔“ کولویل نے اعلان کیا۔ ”یوں سب کو کیش اور بانڈز وغیرہ برابر برابر مل جائیں گے۔ راضی؟“

دونوں ساتھیوں نے رضامندی سے سر ہلا دیا۔ پھر ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ تینوں اپنی اپنی جگہ بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد کولویل نے اپنا پیڈ رکھ دیا اور دستی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ”میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ پورے شہر میں اس واقعے سے زبردست سنسنی پھیل گئی ہوگی۔“ وہ بولا۔ ”میں شہر جا کر کوئی اخبار لے آتا لیکن میرے خیال میں بہتر یہی ہوگا کہ ہم دو دن تک یہیں پڑے رہیں جیسا کہ ہم نے طے کیا تھا۔“

☆☆☆

اب جیرالڈ چیپ مین...... جی ونسینٹ کولویل کی حیثیت سے نیویارک کے فیشن ایبل علاقے گریمری پارک کی کوٹھی نمبر 12 میں منتقل ہو گیا تھا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ میل ٹرک ڈرائیور نے جیرالڈ چیپ مین اور جارج اینڈرسن کو مجرموں کی تصاویر دیکھ کر شناخت کر لیا تھا لیکن دیگر ایجنسیاں انہیں اعلیٰ سوسائٹی کی پناہ گاہوں میں تلاش کرنے میں ناکام رہیں۔ اس کی گرفتاری پر پچیس ہزار ڈالر کا انعام مقرر کیا گیا تھا جس کا اشتہار شہر میں جا بہ جا چسپاں نظر آتا تھا۔ سارے اخبارات نے اس واردات کو امریکا کی تاریخ کی سب سے بڑی واردات قرار دیتے ہوئے، اس کی روداد شائع کی تھی۔ جیرالڈ چیپ مین کو جسے اب اس کے بعض احباب گریمری پارک کا نواب کہنے لگے تھے، یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ ملک کے گوشے گوشے میں مطلوب تھا۔ پولیس شکاری کتوں کی طرح اس کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس امر میں کتنی سنسنی تھی، کتنا خطرہ تھا، وہ اس امر سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور نیویارک کے طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والوں کو اپنے یہاں شامِ موسیقی میں مدعو کر رہا تھا۔ اس نے اور جارج اینڈرسن نے اس واردات میں لوٹی جانے والی رقم کے کچھ حصے سے شراب کے کاروبار میں

سرمایہ کاری کرلی تھی۔ اس واردات سے پہلے دونوں سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتے تھے لیکن اب بہت بڑے سرمایہ کار کی حیثیت سے پسِ پردہ رہ کر سرمایہ کاری کررہے تھے۔

☆☆☆

3 جولائی 1922ء کی وہ دوپہر خاصی گرم اور مرطوب تھی۔ نمبر 12 گریمری پارک کی کھڑکیوں کی چلمنیں گری ہوئی تھیں۔ ایسے میں کولویل ایک ٹیکسی سے اترا اور اپنی کوٹھی میں داخل ہوگیا۔ اندر مرگ آسا خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ چند لمحوں تک پُرسکوت اور نیم تاریک ہال میں کھڑا، وہاں کی آرام دہ فضا سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر باتھ روم میں گھس گیا اور اپنے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ اس نے اپنی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور زینہ طے کرکے اوپری منزل پر پہنچ گیا۔ پھر لائبریری کے دروازے پر رکا اور اس نے آہستہ سے پکارا۔ ”جوزیفائن۔“

دفعتاً ہال کی تاریکی میں ایک سایہ نمودار ہوا اور چشم زدن میں اس نے ریوالور کی نال کولویل کی پسلی سے لگادی۔ کولویل کا ہاتھ تیزی سے اپنی جیب میں موجود ریوالور پر پہنچ گیا لیکن اسے دیر ہوچکی تھی۔ دوسرا سایہ لائبریری کے اندر سے نمودار ہوا اور اس نے کولویل کا ہاتھ پکڑ کر مروڑ دیا۔

”ٹھیک ہے، چیپ مین...... ہم تم سے بات کرنا چاہیں گے۔“ ایک سادہ لباس والے نے اس کا ریوالور اچک لیا اور پلک جھپکتے اسے ہتھکڑی پہنادی۔ لائبریری میں داخل ہوتے ہی کولویل کی نظر جوزیفائن پر پڑی۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ایک سراغ رساں نے اسے ڈانٹ کر خاموش کردیا۔ پھر وہ سب خاموشی سے نیچے آگئے اور وہاں موجود پولیس کاروں میں بیٹھ کر فیڈرل بلڈنگ پہنچ گئے۔ وہاں تمام سہ پہر... ان سے پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ جیرالڈ چیپ مین نہایت صفائی سے سراغ رسانوں کے چبھتے ہوئے سوالوں کا گول مول جواب دیتا رہا اور اس نے خود پر عائد الزامات کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ حالانکہ اس پر یہ بہت اچھی طرح واضح ہوچکا تھا کہ اس کے سامنے براجمان دو سراغ رساں بہت کچھ جانتے تھے۔ ان کے پاس کئی ٹریولرز چیک تھے جو اس نے کیش کرائے تھے۔ پوچھ گچھ کے دوران چارلی کا ذکر بھی آیا اور سوالات بار بار دہرائے گئے لیکن چیپ مین ان کے قابو میں نہیں آیا۔

اچانک ایک محافظ اندر آیا اور اس نے آگاہ کیا کہ جوزیفائن بے ہوش ہوگئی ہے۔ ایک سراغ رساں یہ سن کر اٹھا اس محافظ کے ساتھ چلا گیا۔ چیپ مین دوسرے سراغ رساں کے ساتھ وہیں بیٹھا رہا۔ وہ سراغ رساں اسے کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔ اچانک چیپ مین کے دیدے الٹ گئے۔ اس کا منہ کھل گیا، اس نے ایک الجھی الجھی سی سانس لی اور اپنی کرسی پر سامنے کی طرف ڈھیر ہوگیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

”پانی...... ایک گلاس پانی......“ اس کے منہ سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

دوسرا سراغ رساں غیر شعوری طور پر باہر ہال کی طرف بھاگا جہاں واٹر کولر رکھا ہوا تھا۔ جونہی دروازہ اس کے پیچھے بند ہوا، چیپ مین اپنی کرسی سے اچھل کر کھڑکی پر پہنچ گیا۔ آٹھ منزل نیچے، سڑک دوپہر کی دھوپ سے تپ رہی تھی۔ چیپ مین نے اپنے پھیپھڑوں میں پوری سانس بھری اور دیکھا کہ کھڑکی سے صرف دو فٹ نیچے عمارت کا آرائشی کگر تھا۔ وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر کھڑکی کی چوکھٹ سے اس تنگ کگر پر اتر گیا اور چکرا دینے والی بلندی کی پروا کیے بغیر دیوار سے چپک گیا۔ پھر اپنے ہتھکڑی پڑے ہوئے ہاتھوں کی مدد سے دھیرے دھیرے بڑھتا ہوا پہلی کھڑکی تک پہنچ گیا اور پھر اس نے احتیاط سے اندر جھانکا۔ کمرا خالی تھا۔ وہ اچھل کر کمرے میں داخل ہوگیا اور ہانپتے ہوئے سن گن لینے کی کوشش کرنے لگا۔

ہال سے چیخ و پکار کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے ایک کرسی اٹھالی اور اس پر چڑھ کر آٹھ فٹ اونچے ایک وارڈروب کے اوپر جا بیٹھا اور اپنے جسم کو ایک گیند کی مانند سمیٹ کر انتظار کرنے لگا۔

اچانک کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ کولویل ان کے چلنے پھرنے کی آواز سننے لگا۔ دونوں سراغ رساں اسے میزوں اور فائلوں کے پیچھے ڈھونڈ رہے تھے۔ پھر انہوں نے وارڈروب کا درواز ایک جھٹکے سے کھولا اور بند کردیا۔

”وہ ایسی جگہوں پر نہیں چھپ سکتا جہاں دیکھ لیے جانے کا خطرہ ہو۔“ ان میں سے ایک نے خیال آرائی کی اور پھر دونوں دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ چیپ مین نے دھیرے سے اپنی سانس خارج کی اور...... اسی وقت وہ دونوں اپنی جگہ ساکت ہوگئے۔

”اوکے، چیپ مین، تم نیچے آسکتے ہو۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔

چیپ مین چپ چاپ نیچے آگیا۔ دونوں سراغ رساں اسے بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے اس کمرے میں لے گئے جہاں اس سے پوچھ گچھ ہورہی تھی...... اور یوں لیونارڈ اسٹریٹ میں ڈکیتی کی واردات کا اختتام ہوا۔

وفاقی حکومت کا کیس بہت مضبوط تھا۔ انہوں نے بہت تیزی سے کارروائی کی۔ دو ماہ کے اندر چیپ مین اور جارج اینڈرسن کو پچیس پچیس سال کی سزا سنادی جو انہیں اٹلانٹا کے وفاقی اصلاحی خانے میں کاٹنی تھی۔ جب کہ جوزیفائن کو رہا کردیا گیا کیونکہ یہ ثابت نہیں کیا جاسکا کہ وہ ڈکیتی کی اس واردات میں ملوث تھی۔ نمبر 12 گریمری پارک خالی کرالیا گیا اور جوزیفائن کہیں اور چلی گئی۔

☆☆☆

اٹلانٹا کی اصلاحی جیل کا بیرونی دروازہ ابھی بند بھی نہیں ہوا تھا کہ چیپ مین وہاں سے فرار ہونے کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔ اگرچہ اس کا عمل سست تھا لیکن یہ اس کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا اور اس میں زبردست سنسنی تھی۔ اس جیل کے کئی عوامل ایسے تھے جنہیں بروئے کار لاکر وہ اپنے منصوبے کی تکمیل کرسکتا تھا۔ جیل کا اسپتال اس کی بیرونی دیوار سے زیادہ دور نہیں تھا اور بیرونی دیوار اور اسپتال کے درمیان چھوٹے چھوٹے باغات تھے جہاں قیدی پھل اور پھول اگاتے تھے۔

اپنے منصوبے پر عمل درآمد کرنے کے لیے چیپ مین نے سب سے پہلے رسیوں کے ٹکڑوں کو بانٹنا شروع کردیا جو اس نے ورکشاپ سے چرائی تھیں۔ پھر اس نے رسی کا ایک ہک بنایا اور یہ چیزیں اسپتال کے قریب ایک باغ میں دفن کردیں۔ وہ اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے بالکل تیار ہوگیا تھا۔

اس کے چوبیس گھنٹے کے بعد چیپ مین اٹلانٹا سے پچاس میل دور دھان کے ایک سرد اور بھیگے ہوئے کھیت میں پڑا تھا۔ اس کے کانوں سے کسی شکاری کتے کے بھونکنے کی آواز ٹکرا رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کا تعاقب کرنے والے پہنچ گئے تھے۔ کتے کے بھونکنے کی آواز لحظہ بہ لحظہ قریب آتی جارہی تھی۔ پھر اسی کھیت کے دوسری طرف ایک روشنی نظر آئی۔ پھر دوسری روشنی دکھائی دی۔ چیپ مین کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی اور جسم سے ٹھنڈا پسینا پھوٹ پڑا۔

اس نے ایک منٹ انتظار کیا اور دیکھا کہ وہ روشنیاں قریب آتی جارہی تھیں۔ وہ یکبارگی اٹھا اور بھاگنے لگا۔ رات کے سناٹے میں اچانک کوئی رائفل گرج اٹھی۔ پھر دوسری اور تیسری گولی چلی۔ ایک گولی چیپ مین کی ران میں دھنس گئی۔ دوسری گولی اس کے کولہے میں لگی۔ وہ منہ کے بل کیچڑ میں گرا اور ہانپنے اور کراہنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ زخموں سے خون بہہ کر کیچڑ میں مل رہا تھا۔ جب اس کا تعاقب کرنے والے اس کے نزدیک پہنچے تو وہ بے ہوش ہوچکا تھا۔

☆☆☆

آنکھ کھلی تو اس نے خود کو جارجیا کے ایک مقام ایتھنز کے ایک اسپتال میں پڑا ہوا پایا۔ اس نے جونہی کروٹ لینا چاہا، کولہے کے زخم سے ایک شدید ٹیس اٹھی اور وہ کراہ کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک نرس کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے نرس کو باتوں میں لگالیا۔ نرس نے اسے بتایا کہ اس کی حالت تشویشناک ہے اور یہ کہ باہر دو پہرے دار پہرا دے رہے ہیں۔ باتوں کے دوران چیپ مین نے نرس کے لہجے میں اپنے لیے ہمدردی کا عنصر محسوس کیا، لہٰذا عام سے لہجے میں مخاطب ہوا۔ ”کیا میری بیوی کو مطلع کردیا گیا ہے؟“

”میں ایسا نہیں سمجھتی۔“ نرس نے جواب دیا۔ ”کیونکہ تمہارا کیس ایک اسپیشل کیس ہے۔“

”لگتا ہے، اب میں کبھی اپنے بیوی بچوں کی شکل نہیں دیکھ سکوں گا۔“ وہ اپنے لہجے میں درد بھر کر بولا۔ ”شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ مجھے اپنی پیاری بیوی اور پیارے پیارے بچوں سے کتنا پیار ہے۔“ اس کی نظریں نرس پر مرکوز تھیں اور وہ اس کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے غور کیا کہ نرس کے تاثرات میں نرمی غالب تھی۔ ”کیا تم میری خاطر ایک چھوٹا سا کام کرسکتی ہو؟“ اس نے لوہا گرم دیکھ کر ضرب لگائی۔

”وہ کیا؟“ نرس نے پوچھا۔

”میری بیوی کو نیویارک میں اس کے نمبر پر یہ پیغام دے دو کہ میں یہاں اس کا منتظر ہوں۔“ وہ ملتجی لہجے میں بولا۔ ”میں اس سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔“

”بہتر ہے۔ میں اسے فون پر تمہارا پیغام دے دوں گی۔“ نرس نے ہامی بھری اور چیپ مین کا بتایا ہوا نمبر نوٹ کرلیا۔

☆☆☆

دو دن بیت گئے۔ جوزیفائن کا کوئی پتا نہ تھا۔ چیپ مین اپنی بیوی کے انتظار میں تڑپتا اور سلگتا رہا لیکن اسے پورا یقین تھا کہ جوزیفائن آئے گی، ضرور آئے گی اور یہ سوچ کر آئے گی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ نرس اسے دیکھ کر جونہی باہر نکلتی، وہ کمرے میں بے تابی سے ٹہلنے لگتا اور ورزش کرنے کی کوشش کرتا۔ اگرچہ اس کوشش میں اس کے زخم تکلیف دینے لگتے تھے۔ اس کی حالت اب بھی تشویش ناک تھی، پھر بھی وہ اپنی خفیہ چہل قدمی اور ورزش جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس طرح اس کے ٹمپریچر میں خوفناک حد تک اضافہ ہوجاتا اور یہ اضافہ برقرار رہتا۔ وہ چاہتا بھی یہی تھا۔ کیونکہ اس صورت میں اس سے نرمی کا رویّہ اختیار کرتے ہوئے کمرے کے باہر موجود گارڈز کو ہٹالیا جاتا اور حکام اس کی بیوی کو اس سے ملنے کی اجازت دے دیتے اور ہوا بھی یہی۔

اس پر سے پہرا ہٹالیا گیا اور اس طرح مزید پانچ دن بیت گئے۔ چھٹے دن نرس جوزیفائن کو لے کر اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ”تمہاری بیوی کے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں۔“ وہ بولی۔ ”ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تمہاری صحت کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“

اس کے ساتھ ہی وہ دونوں کو کمرے میں چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کے نکلتے ہی جوزیفائن نے اپنے کوٹ کی جیب سے آٹومیٹک پستول نکال لیا۔ جیرالڈ نے جلدی سے وہ پستول لے لیا۔ ”ہمیں بہت تیزی سے حرکت کرنی ہے۔“ جوزیفائن نے تیز سرگوشی کی۔ ”نیچے صدر دروازے کے پاس ہی کار کھڑی ہے۔“

”میں پہلے ہی ساری منصوبہ بندی کرچکا ہوں۔“ جیرالڈ چیپ مین نے سکون سے کہا اور بیڈ کے سرہانے نصب بزر کا بٹن دبا دیا، پھر جلدی سے ایک چادر اپنے سینے تک تان کر لیٹ گیا۔

چند ہی لمحوں میں ایک نوجوان اردلی نمودار ہوا۔ ”تم نے گھنٹی بجائی تھی؟“ اس نے پوچھا۔

چیپ مین نے چادر کے نیچے سے ریوالور نکال کر اس پر تان لیا۔ ”اپنا منہ بند رکھو اور جیسا میں کہتا ہوں، ویسا ہی کرو ورنہ تمہاری کھوپڑی سے بھیجا باہر نکال دوں گا۔“ وہ پھنکارا۔ ”اپنے کپڑے اتار دو...... جلدی کرو۔“

اردلی نے گھبرا کر جوزیفائن کی طرف دیکھا۔ جوزیفائن کا چہرہ تاثرات سے یکسر عاری تھا۔ اردلی ہچکچایا۔

”تم میری بیوی کی فکر مت کرو۔“ چیپ مین نے پستول کی نال اردلی کے پیٹ سے لگا دی۔

اردلی خاموشی سے اپنے کپڑے اتارنے لگا۔ پھر جوزیفائن نے ریوالور جیرالڈ سے لے کر اردلی پر تان لیا اور جیرالڈ نے اردلی کی اسپتال کی اتاری ہوئی وردی پہن لی۔ پھر بستر کے چادر کی دھجیاں کر کے ان دھجیوں سے اردلی کے ہاتھ پیر باندھ دیے اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ ”اور تم کوئی حماقت مت کرنا۔“ اس نے اردلی کو خبردار کیا۔ ”یہ گولی پہلے مارتی ہے، سوال بعد میں کرتی ہے۔“

اس کے ساتھ ہی وہ خاموشی سے اردلی کے بھیس میں کمرے سے نکل گیا اور لفٹ کے پاس پہنچ کر اس نے بے تابی سے بزر دبا دیا۔ لفٹ آگئی۔ وہ اس میں سوار ہو کر گراؤنڈ فلور پر آگیا اور پھر لفٹ سے نکل کر عام انداز میں چلتا ہوا، سیڑھیاں اتر کر کسی کے نوٹس میں آئے بغیر اپنی منتظر کار تک پہنچ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اس کا پرانا دوست چارلی براجمان تھا۔ جیرالڈ پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور اس نے ایک کمبل اوڑھ لیا۔ اس وقت جوزیفائن نمودار ہوئی اور تیزی سے کار تک آئی۔ ”ٹھیک ہے، اب نکل چلو۔“ اس نے تیز سرگوشی کی اور کار میں سوار ہوگئی۔

چارلی نے کار اسٹارٹ کردی۔

☆☆☆

ان کی کار آندھی کی رفتار سے انڈیانا کی سمت اُڑی جارہی تھی۔ کئی گھنٹے کے سفر کے بعد چارلی نے کار ایک گھر کے سامنے روک دی۔ یہ چیپ مین کے ایک پرانے دوست ڈاکٹر ہیری کا گھر اور دفتر تھا۔ ڈاکٹر ہیری منشیات فروشی کے جرم میں اٹلانٹا کی جیل میں دو سال کی سزا کاٹ چکا تھا۔ ان ہی دنوں چیپ مین بھی اسی جیل میں سزا کاٹ رہا تھا۔ وہیں ان کی دوستی ہوگئی تھی۔ اس وقت سے اب تک وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے آرہے تھے۔

”کیسے ہو، ہیری؟“ چیپ مین نے زبردستی مسکرا کر پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”اُدھر۔“ اس نے معائنہ کی میز کی طرف اشارہ کیا۔

چارلی اور ڈاکٹر نے چیپ مین کو سہارا دے کر معائنے کی میز پر لٹا دیا اور ڈاکٹر جلدی جلدی اس کے زخموں کی پٹیاں کاٹنے لگا۔ ”تھوڑا انفیکشن ہوگیا ہے۔“ وہ زخموں کا معائنہ کر کے بولا۔

”لیکن مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔“ جوزیفائن بول پڑی۔ ”اس نے زخموں کو ہرا کردیا ہے۔“

ڈاکٹر ہیری ایک ننھی سی ٹارچ کی روشنی زخموں پر مرکز کر کے ان کا باریک بینی سے معائنہ کرنے لگا۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ جوزیفائن کی طرف مڑا۔ ”میرے خیال میں اس کا یہاں کچھ عرصہ قیام کرنا بہتر ہوگا۔“ اس نے کہا۔

”میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں۔“ جوزیفائن نے اتفاق کیا۔ ”اس سے زیادہ محفوظ جگہ کوئی اور نہیں ہوسکتی۔“

☆☆☆

جیرالڈ چیپ مین، ہیری کے یہاں تین ہفتے رہا۔ شروع شروع میں وہ بیڈ تک محدود رہا، پھر وہ کمرے میں ٹہلنے کے قابل ہوگیا اور پھر جیسے جیسے زخم مندمل ہوتے گئے ویسے ویسے وہ آزادی سے چلنے پھرنے لگا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ بڑی دلیری سے شہر آنے جانے لگا۔ یہی دلیری اس کا طرۂ امتیاز تھی۔ اس نے مونچھیں رکھ لی تھیں اور تاریک شیشے کی عینک پہننے لگا تھا۔ یوں اس نے بھیس بدلنے کا اہتمام کرلیا تھا جو اس کے لیے بہت ضروری تھا۔

پریس میں اب بھی اس کے فرار کی بازگشت پھیلی ہوئی تھی۔ اٹلانٹا جیل سے اس کا ڈرامائی فرار اور اگلے روز اس کی گرفتاری نے زبردست سنسنی پھیلا دی تھی۔ اخبارات کی فروخت میں ریکارڈ اضافہ ہوگیا تھا۔ پھر اسپتال سے اس کے فرار نے تو کمال ہی کردیا تھا۔ وہ اخبارات میں اپنے فرار کی داستان بار بار پڑھتا اور خوش ہوتا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ وہ اس سے کہیں زیادہ چالاک اور مکار ثابت ہوا تھا جتنا قانون نے اس کے بارے میں اندازہ لگایا تھا۔ وہ اپنے شب و روز ان کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرنے لگا جو جرائم کے علم میں اضافے کا سبب بن سکتی۔ ایسی کتابیں منسی کے قریبی شہروں میں ایک پبلک لائبریری میں مل جاتی تھیں۔ وہ یہ کتابیں اپنے کارڈ پر حاصل کرسکتا تھا یا پھر بڑی آسانی سے اپنے کوٹ کی جیب میں چھپا سکتا تھا لیکن اسے یہ طریقہ پسند نہیں تھا کیونکہ اس میں کوئی سنسنی خیزی نہیں تھی۔ چنانچہ وہ رات میں لائبریری کا تالا توڑ کر اندر گھس جاتا اور کتابیں چرا لیتا۔ اس میں زیادہ سنسنی تھی۔ باقی وقت وہ یا تو گولف کھیلنے یا اپنی کار میں مضافات کی سیر کرنے میں گزارتا۔

☆☆☆

اس روز وہ ایٹن نامی قصبے کی ایک عقبی سڑک سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک فارم ہاؤس پر پڑی۔ یہ فارم ہاؤس سڑک سے خاصے فاصلے پر زرعی زمینوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ اس کے جی میں نہ جانے کیا آیا کہ اس نے اپنی کار کچی سڑک پر موڑ دی اور اس فارم ہاؤس کے نزدیک پہنچ کر رک گیا۔ ایک دبلے پتلے کسان نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”شام بخیر! میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں۔“

چیپ مین نے اپنی کار کا انجن بند کردیا۔ ”سرِدست کچھ کہنا مشکل ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ شائستہ تھا۔ ”میرا نام ٹام ہے۔ ویلڈ وٹر۔“ اس نے مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ ”لیکن لوگ مجھے ٹام کہتے ہیں۔“

”مسٹر ٹام، تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“ کسان نے دودھ کی بالٹی نیچے رکھ دی۔ ”میرا نام ہینز ہے۔ بین ہینز۔“

چیپ مین نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے کسان کا جائزہ لیا۔ اسے کسی ایسے ہی سادہ لوح دیہاتی کی ضرورت تھی جس کی وہ آڑ لے سکتا۔

”مسٹر ہینز۔“ وہ بولا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش ہے جہاں میں کچھ عرصہ قیام کرسکوں۔ ایک ایسی جگہ جو خاموش اور پُرسکون ہو اور جہاں مجھے ڈھیر ساری تازہ ہوا اور اچھی غذا مل سکے۔ حال ہی میں میرا آپریشن ہوا ہے اور میرا ڈاکٹر چاہتا ہے کہ میں چند دن آرام کروں۔“

جواب میں ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر کے بعد کسان ہینز نے دوبارہ لب کھولے۔ ”اچھا، آؤ میں دیکھتا ہوں، میری بیوی کیا کہتی ہے، وہی گھر کی مالک ہے۔“

ہینز اسے لے کر گھر آگیا۔ کچن میں پرانے طرز کے چولہے پر کھانا پک رہا تھا اور فضا میں تازہ سبزی کی اشتہا انگیز بُو رچی ہوئی تھی۔ ہینز کی بیوی نے ان دونوں کے اندر داخل ہونے پر ان کی طرف دیکھا۔ پھر جلدی سے اپنے ہاتھ ایپرن سے صاف کیے اور ہاتھ کی پشت سے اپنی زلفوں کو موزوں کرنے لگی۔

”میری، یہ معزز شخص یہاں کرائے پر رہنا چاہتا ہے۔“ ہینز اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔ ”بیمار تھا، ڈاکٹر نے کچھ عرصے کے لیے کسی پُرفضا مقام پر رہنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس نے ادھر سے گزرتے ہوئے یہ فارم ہاؤس دیکھا اور ادھر چلا آیا، یہ سوچ کر کہ کیا ہم اسے کرایہ دار کی حیثیت سے رکھ سکتے ہیں۔“

”کہہ نہیں سکتی۔“ میری نے جواب دیا۔ ”ہم نے کبھی کوئی کرائے دار نہیں رکھا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ کرائے

دار کا کس طرح خیال رکھا جاتا ہے۔ ہم لوگ بہت سیدھی سادی زندگی گزارتے ہیں۔"

"اور یہی وہ شے ہے جس کا میں متلاشی ہوں۔" چیپ مین جلدی سے بول پڑا۔ "سیدھی سادی زندگی کا......!"

"لیکن میں نہیں جانتی...... میں کرائے کے بارے میں کچھ نہیں......!"

"کیا پچیس ڈالر فی ہفتہ مناسب نہیں رہے گا؟" چیپ مین بیچ ہی میں بول پڑا۔ "کھانے اور کمرے کے ساتھ۔"

وہ جانتا تھا کہ اس کا کیا ردِعمل ہوگا۔ دونوں میاں بیوی کے چہرے سے حیرت برسنے لگی۔ یہ ایک باقاعدہ آمدنی تھی اور وہ بھی کیش کی صورت میں۔ انہوں نے خواب میں بھی اتنی رقم کا نہیں سوچا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ہامی بھرلی اور چیپ مین، ویلڈ وعرف ٹام ان کے ہاں منتقل ہوگیا۔

وہ ایک ایسا کرایہ دار تھا جو دل میں گھر کرتا جاتا تھا۔ وہ گھر کے چھوٹے موٹے کام میں اور کھیتوں میں ہینز کا ہاتھ بٹانے لگا۔ وہ مرغیوں کو دانے بھی ڈالتا اور گملوں میں بیج بھی بوتا۔ باورچی خانے میں برتن دھونے اور سبزیاں کاٹنے میں بھی میری کا ہاتھ بٹاتا اور کبھی کبھی کھانا بھی پکا دیتا۔ باقی وقت وہ مطالعہ کرتا۔ وہ ان کے ساتھ پورے چھ ہفتے رہا۔ پھر وہ غائب رہنے لگا۔ اس نے ان دونوں کو بتایا کہ وہ چیزیں فروخت کرنے جاتا تھا۔ وہ ایک سیلز مین تھا۔ شروع شروع میں اس کا دورہ مختصر ہوتا تھا۔ وہ صرف ایک یا دو رات فارم سے غائب رہتا، پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے دورے طویل ہونے لگے یہاں تک کہ وہ اکٹھے تین چار ہفتے تک غائب رہنے لگا۔

☆☆☆

وہ جنوری 1924ء کا آخری ہفتہ تھا۔ میری سلائی میں مصروف تھی۔ اسی اثنا میں اسے باہر کسی کار کے رکنے کی آواز سنائی دی اور وہ چونک اٹھی۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا اور جیرالڈ چیپ مین سرد ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ کمرے میں در آیا۔

"ہیلو، میری...... ہینز، کیسے ہو؟" وہ نہایت گرمجوشی سے مخاطب ہوا۔ "میں تمہارے لیے ایک سرپرائز لایا ہوں۔ یہ میرا پارٹنر آئیو ڈیلر ہے...... سویڈش ہے۔ ایک احمق سویڈش......!" وہ ہنسا۔ "ہم لوگ اسے ڈچ کہہ کر پکارتے ہیں۔"

"جو بھی ٹام کا دوست ہے، ہمارا دوست ہے۔" ہینز نے بڑے اخلاق سے کہا۔

"مگر یہ ہمارے ساتھ یہاں رہنا چاہتا ہے۔" چیپ مین بولا۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں، ٹام...... تمہیں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟" میری مسکرائی۔

ڈچ نے جلدی سے چیپ مین کی طرف دیکھا، ہولے سے مسکرایا اور اپنی عینک کے پیچھے سے ایک آنکھ دبائی۔ وہ ابھی اٹلانٹا کی جیل سے فرار ہوا تھا اور فرار ہونے کے لیے اسے ساٹھ فٹ طویل سرنگ کھودنی پڑی تھی اور پھر اس نے چیپ مین کو ڈھونڈ نکالا تھا۔

دونوں اس فارم پر رہنے لگے اور انہوں نے کاغذ سازی میں خود کو مصروف کرلیا۔ اینڈرسن کے ذہن میں جعلی نوٹ چھاپنے کی سپر اسکیم تھی۔ یہ اس کا دیرینہ خواب تھا۔ اس نے پتا چلایا تھا کہ امریکی ڈالر میساچوسٹس کے مقام ڈیلٹن کس فیکٹری میں چھپتے تھے۔ پھر کیوں نہ وہ فیکٹری سے نوٹ کا کاغذ حاصل کرنے کا انتظام کرے اور خود نوٹ چھاپے۔ چیپ مین بھی اس معاملے میں بے حد پرجوش تھا۔ کیونکہ اس قسم کے منصوبوں میں بڑی سنسنی تھی، جرأت آموزی تھی، بڑے خطرات تھے اور بڑی تفریح تھی اور وہ انہی چیزوں کا دلدادہ تھا۔ یہ کام بڑی عیاری اور مکاری سے کیے جانے کا متقاضی تھا۔ ان دونوں نے فیصلہ کیا کہ فیکٹری سے تھوڑا تھوڑا کاغذ چرانے کا سلسلہ شروع کیا جائے تاکہ کسی کو چوری کا شبہ نہ ہو۔

☆☆☆

اپریل میں انہوں نے ڈیلٹن کے گردونواح کے دو چکر لگا کر علاقے کا اچھی طرح جائزہ لیا اور میساچوسٹس کے مقام اسپرنگ فیلڈ منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ اسپرنگ فیلڈ، ڈیلٹن سے اتنی دور تھا کہ وہ محفوظ رہتے اور اتنے نزدیک تھا کہ سہولت ہوتی مگر انہیں دوسری کار کی ضرورت پڑتی۔ ان کے پاس لیونارڈ اسٹریٹ کی ڈکیتی سے لوٹی ہوئی کافی رقم تھی اور وہ ایک کار بہ آسانی خرید سکتے تھے لیکن چیپ مین نے یہ مسئلہ اپنی سوچ کے مطابق حل کرنے کی ٹھان لی اور ایک شام اوہایو کے مقام اسٹیوبین ویل Steuben Ville میں واقع اسٹینٹن Stanton موٹر کمپنی سے ایک

اسٹینٹن کار اُڑالی۔ اور اس کے چند ہی لمحوں کے بعد وہ اپنے سارے ضروری آلات اور ریوالور کے ساتھ ہائی وے پر مشرق کی سمت اُڑے جارہے تھے۔

انہوں نے ہینز اور میری کو اپنی روانگی کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ چند مہینوں کے لیے موٹر ٹرپ پر جارہے تھے۔ چنانچہ وہ اطمینان سے اِدھر اُدھر کی سیر کرتے رہے اور بہترین ہوٹلوں میں قیام کرکے وقت گزارتے رہے۔ پھر جون 1924ء میں چیپ مین نے ویلڈ وطر اور ڈچ اینڈرسن نے جارج لارنس شیلبوزی کی حیثیت سے اسپرنگ فیلڈ کے ایک ہوٹل میں کمرا بک کرالیا۔ اٹلانٹا کی جیل سے فرار کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے ہینز کی محفوظ جگہ اتنے عرصے کے لیے چھوڑی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جعلی نوٹ چھاپنے کے لیے انہیں بہت زیادہ ابتدائی کام کرنا تھا۔ اس کے لیے انہیں کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جسے وہ اپنا مرکز بناسکتے اور جہاں سے اپنی کارروائی کا آغاز کرسکتے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اس شہر میں کسی سے ان کی شناسائی ہوجائے۔ وہ کسی بزنس مین کو ترجیح دیتے جو اثر ورسوخ کا مالک ہوتا۔ اس کے تعاون کے بغیر چیپ مین خود کو غیر محفوظ تصور کرتا۔ ایسا شخص انہیں واٹرشین کے روپ میں مل گیا۔

وہ شین ایڈورٹائزنگ کمپنی کا مالک تھا۔ یہ کاروبار خاصا منافع بخش تھا اور شین کے کاروباری تعلقات بہت وسیع تھے لیکن وہ ایک کمزور آدمی تھا۔ حد سے زیادہ دولت نے اسے بگاڑ دیا تھا۔ وہ اعلیٰ رہائش، پارٹیوں اور شرابیوں کی صحبت پسند کرتا تھا۔ فطرتاً خوشامدی تھا اور اپنی صلاحیت کو بروئے کار لاکر عمدہ سے عمدہ چیزیں حاصل کرلیتا تھا اور قانون کی پروا نہیں کرتا تھا۔

☆☆☆

ایک دن چیپ مین ایک چھوٹا سا ڈیامنس انڈیانا پارسل کرنے کے لیے شین کے ہمراہ ریلوے ایکسپریس آفس پہنچا۔ جب تک چیپ مین مصروف رہا، شین وہاں لگے ہوئے پوسٹرز کا جائزہ لینے لگا۔ ان میں سے ایک پوسٹر پر جلی حروف میں "وانٹیڈ" Wanted تحریر تھا اور دو اشتہاریوں کی تصویریں تھیں۔ شین کو دونوں چہرے مانوس لگے۔ اس وقت جیرالڈ چیپ مین کاؤنٹر پر جھکا ہوا تھا اور اس کے چہرے کا ایک رخ شین کی طرف تھا۔ شین نے اس پر نگاہ ڈالی اور دیکھا کہ ان دو اشتہاری ملزموں میں سے ایک کی تصویر چیپ مین سے مشابہ تھی۔ اس نے پلٹ کر تصویر کی طرف دیکھا اور اشتہار کا متن پڑھنے لگا۔ یہ چیپ مین کا مجرمانہ ریکارڈ تھا۔ جس میں موٹی موٹی باتیں تحریر تھیں۔ اب واٹرشین وہ باتیں جان گیا جو کوئی اور نہیں جانتا تھا۔ اسے چیپ مین اور ڈچ اینڈرسن کے ٹھکانے کا بھی علم تھا۔ اسے اپنے رگ و پے میں ایک زبردست سنسنی دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اس کیفیت میں ایک عجیب سی طمانیت کا احساس بھی شامل تھا۔

☆☆☆

موسم گرما گزرنے کے ساتھ ساتھ شین اور ان دونوں کی دوستی گہری ہوتی چلی گئی۔ شین کو ان کی صحبت میں زندگی کا ایک نیا لطف حاصل ہورہا تھا۔ اس کی ایجنسی چیپ مین اور ڈچ اینڈرسن کے مصرف میں تھی۔ ستمبر شروع ہونے تک واٹرشین ان دونوں کے لیے ایک مکان ڈھونڈ چکا تھا۔ وہاں وہ دونوں جعلی نوٹ چھاپنے کا کام شروع کرسکتے تھے۔ چیپ مین اور اینڈرسن نے اس مکان کے لیے پانچ ہزار ڈالر ایڈوانس دیے لیکن وہ کبھی اس مکان کو استعمال نہ کرسکے۔

وہ 11 اکتوبر 1924ء ہفتہ کی ایک روشن سہ پہر تھی جب چیپ مین اور شین کنکٹی کٹ کے مقام نیو برٹین پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا سا صنعتی شہر تھا لیکن اتنا بڑا ضرور تھا کہ وہ وہاں واردات کرسکتا تھا۔ چیپ مین یہ کہہ کر شین کو اپنے ہمراہ لایا تھا کہ وہ ویک اینڈ سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ لیکن اب اس نے شین کو آگاہ کیا کہ وہ ایک تجوری توڑنا چاہتا تھا۔ اس نے پہلے شہر کے دو چکر لگائے اور پھر کار ایک جگہ پارک کردی۔

"تم یہیں رکو۔" اس نے شین سے کہا اور کار سے اتر گیا۔

شین کار میں بیٹھا رہا۔ چیپ مین مرکزی سڑک پر اطمینان سے ٹہلتا ہوا ایک چھوٹے سے محکمہ جاتی اسٹور میں پہنچا اور خریداروں کے ہجوم میں شامل ہوگیا۔ پھر وہ ٹہلنے کے سے انداز میں چلتا ہوا اسٹور کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔ وہاں ایک زینہ تھا۔ وہ زینہ طے کرکے دوسرے فلور پر چلا گیا اور وہاں رک کر اس نے پورے اسٹور کا خوب اچھی طرح جائزہ لیا، پھر پلٹا اور واپس نیچے آکر اسٹور سے نکل کر مرکزی سڑک پر آگیا اور اسی طرح ٹہلتا ہوا کار تک پہنچ گیا۔

"تم نے کیا معلوم کیا؟" شین نے جلدی سے پوچھا۔

"سب کچھ سیٹ ہے۔ کام نہایت آسان ہے۔" وہ

کار میں بیٹھتا ہوا بولا۔ ”ہم کل علی الصباح یہاں پھر آئیں گے۔“

انہوں نے وہ رات قریبی شہر میریڈن میں بسر کی اور اگلی صبح پانچ بجے بستر چھوڑ دیا۔ تیار ہو کر کار میں سوار ہوئے اور کچھ ہی دیر میں نیوبریٹین پہنچ گئے۔ انہوں نے کار چرچ اسٹریٹ پر اسٹور کے قریب ہی واقع ایک گلی میں پارک کی۔

”تم یہیں رکو، میں چند منٹ میں آتا ہوں۔“ چیپ مین نے کہا اور اپنا چھوٹا سا بیگ اٹھا کر اتر گیا۔

پہلے اس نے بلاک کا ایک چکر لگایا اور پھر نہایت جرأت سے کام لیتے ہوئے اسٹور کے صدر دروازے پر جا رکا۔ چہار سو گہرا سناٹا تھا۔ وہ تقریباً ایک منٹ تک اپنی سانس بحال کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس دوران اس نے اسٹور کے اندر جھانک کر سن گن لینے کی بھی کوشش کی۔ پھر مطمئن ہو کر اپنے ہینڈ بیگ سے نہایت پھرتی سے ایک ننھا سا اسکرو ڈرائیور نکالا اور دروازے کے قفل پر طبع آزمائی کرنے لگا۔ اس کی مشاق انگلیاں نہایت چابکدستی سے دھات اور اسپرنگ سے کھیل رہی تھیں۔ چند ہی سیکنڈ کے بعد ایک ہلکی سی کلک کی آواز ہوئی۔ اسپرنگ نے جواب دے دیا تھا۔

چیپ مین اسٹور میں داخل ہو گیا۔ اوپری منزل پر تین تجوریاں تھیں۔ وہ بلا تاخیر پہلی تجوری پر طبع آزمائی کرنے لگا۔ پُرجوش کیفیت کے تحت اس کا پورا جسم لرز رہا تھا اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کسی غیر مرئی قوت نے اس میں ایک نئی روح پھونک دی ہو۔ اس نے اپنے بیگ میں سے ایک ننھی سی برقی ڈرل مشین برآمد کی۔ کمرے میں صرف ایک بلب روشن تھا۔ اس نے بلب کو ساکٹ سے نکال لیا اور برقی ڈرل مشین کے تار کو اس ساکٹ میں لگا دیا۔ چند ہی سیکنڈ میں تجوری میں ایک سوراخ نظر آنے لگا۔ اس نے پھر اپنے بیگ کو ٹٹولا اور نہایت احتیاط سے نائٹرو گلیسرین کی ایک ننھی سی نیلی شیشی برآمد کی اور ایک ڈراپر کی مدد سے اس سوراخ میں تین قطرے ٹپکائے، پھر روئی کی ایک گدی کو جراحی کے ایک ننھے سے چمٹے کی مدد سے فلیتے کے گرد لپیٹا اور اسے بھی اس سوراخ میں ٹھونس دیا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے احتیاط سے سڑک کا جائزہ لیا اور فلیتے کو شعلہ دکھا کر نچلی منزل پر آ گیا۔ اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا۔ وہ واپس کمرے میں گیا۔ تجوری اس کا ہاتھ لگتے ہی کھل گئی۔ وہ نہایت بے دردی سے تجوری کے اندر موجود مختلف کاغذات کے ڈھیر کو کھنگالنے لگا۔ ان میں ایک بڑا سا لفافہ بھی موجود تھا۔ دھڑکتے دل سے لفافہ کھول لیا اور اگلے ہی لمحے اس پر مایوسی کا شدید غلبہ ہوا۔ اس میں صرف چھوٹے نوٹ اور چند سکے تھے۔ اس نے دانت کچکچاتے ہوئے وہ لفافہ اپنی جیب میں ٹھونس لیا اور صدر دروازے سے نکل کر کار تک پہنچ گیا۔ واٹر شین فرنٹ سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ چیپ مین نے لفافہ پچھلی سیٹ پر پھینک دیا اور شین کو جھنجوڑا۔

”آؤ، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

دونوں تیزی سے چلتے ہوئے اسٹور میں داخل ہوئے۔ چیپ مین دوسری تجوری پر طبع آزمائی کرنے لگا۔ شین ایک طرف خاموشی سے کھڑا اس کی کارگزاری دیکھتا رہا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمکنے لگی تھیں اور وہ سر سے پیر تک کانپ رہا تھا۔

چند ثانیے کے بعد دوسرا دھماکا ہوا۔ دونوں واپس اوپر گئے۔ چیپ مین نے تجوری کے اندر ہاتھ ڈال کر ٹٹولا اور ایک چھوٹا سا لفافہ شین کے حوالے کر دیا۔ شین لفافہ لے کر صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

گلی کے اس پار تقریباً چالیس فٹ پرے کسی اصطبل کے وسیع و عریض پھاٹک کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے اور ایک سائیس ایک گھوڑے کو پانی پلانے کے لیے باہر نکل رہا تھا۔ چیپ مین کا چہرہ فق ہو گیا۔ سائیس نے حیرت پاش نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ چیپ مین نے فوراً اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور سائیس کو چکر دینے کی کوشش کی۔

”تم کیا سمجھتے ہو، میں تمہیں کس بات کی تنخواہ دیتا ہوں؟“ وہ بلند آواز میں شین سے مخاطب ہوا۔ ”یہ کاغذات جلد سے جلد مکمل ہونے چاہئیں۔ سمجھ گئے؟“ اس کے ساتھ ہی اس نے شین کو دروازے سے باہر دھکیل دیا۔ ”اطمینان سے جاؤ اور میرا انتظار کرو۔“ اس نے سرگوشی کی۔ پھر بلند آواز میں بولا۔ ”اگر یہ کاغذات مکمل نہ ہوئے تو میں تمہاری چھٹی کر دوں گا اور کسی اور کو رکھ لوں گا۔“

واٹر شین خراماں خراماں آگے بڑھنے لگا۔ چیپ مین نے دروازہ سختی سے بند کر دیا اور یہ فرض کر لیا کہ اس نے سائیس کو بے وقوف بنا دیا ہے۔ لیکن یہ اس کی بہت بڑی بھول تھی۔ سائیس اس کے دھوکے میں نہیں آیا تھا۔ اس نے فوراً فون پر پولیس کو ڈاکا زنی کی اطلاع دے دی۔

چیپ مین اب تیسری تجوری کو اڑانے میں مصروف تھا اور گاہے گاہے سڑک کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے اعصاب

تنے ہوئے تھے۔ اب اجالا پھیلنے لگا تھا۔ اچانک اس کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ دو باوردی پولیس آفیسر تاریکی میں ڈوبے ہوئے اسٹور میں داخل ہو چکے تھے۔ چیپ مین نے ان کی آہٹ سن لی تھی۔

”ایک قدم بھی آگے مت بڑھانا ورنہ میں تمہیں ڈھیر کر دوں گا۔“ چیپ مین کی آواز تاریکی اور سناٹے میں کسی تیز دھار خنجر کی مانند لہرائی۔

قدموں کی آہٹ تھم گئی...... پھر دونوں پولیس آفیسر ریوالور بدست اس کی طرف بڑھنے لگے۔ چیپ مین کو بخوبی اس کا اندازہ ہو گیا۔ اس کے ریوالور نے دفعتاً یکے بعد دیگرے تین شعلے اگلے۔ ایک کربناک چیخ نے سناٹے کو چیر دیا۔ ساتھ ہی کوئی چیخا اور آفیسر جیمز زخمی ہو کر گر پڑا۔ چیپ مین برق رفتاری سے زینہ طے کر کے نیچے آیا اور بھاگنے لگا۔ گولیوں نے اس کا تعاقب کیا لیکن اگلے ہی لمحے وہ اسٹور کے باہر تھا۔ اس نے بگٹٹ بھاگ کر ایک گلی عبور کی اور پھر ایک نیچا جنگلا پھلانگ کر دوسری گلی میں بھاگنے لگا۔ پھر ایک جگہ رک کر اپنا ریوالور کوٹ کے نیچے ہولسٹر میں رکھا اور تنفس بحال کرنے لگا۔

چند لمحوں کے بعد اس نے جیب سے اپنی عینک نکال لا کر لگائی، ٹائی کی گرہ درست کی۔ کوٹ کو موزوں کیا اور گلی عبور کر کے سڑک پر آ گیا۔ اس وقت کچھ لوگ عبادت کر کے چرچ سے واپس گھر جا رہے تھے۔ اور کچھ لوگ عبادت کے لیے چرچ جا رہے تھے۔ چیپ مین پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر ان میں شامل ہو گیا اور چرچ کی سیڑھیاں طے کر کے اندر داخل ہو گیا۔

اسی دوران پولیس نے گلی میں کھڑی ہوئی کار میں موجود شین کو گرفتار کر لیا اور کنکٹی کٹ اسٹیٹ اٹارنی کے دفتر کو اس واقعے سے مطلع کر دیا۔ اٹارنی کے دفتر نے شین سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے اپنے سب سے تجربہ کار اور ذہین سراغ رساں ایڈورڈ جے ہیکی کو وہاں بھیج دیا۔

☆☆☆

ہیکی کو واٹر شین کا جھوٹ پکڑنے اور اس کے منہ سے یہ اگلوانے میں کہ اصلی قاتل جیرالڈ چیپ مین ہے، صرف چند گھنٹے لگے۔ یہ ایک دلچسپ انکشاف تھا۔ جیرالڈ چیپ مین 1923ء کے اوائل میں اٹلانٹا جیل میں تھا اور اٹلانٹا اسپتال سے فرار ہوا تھا اور پولیس بہت شدت سے اسے تلاش کر رہی تھی۔ لیکن اب اکتوبر 1924ء میں نیوبریٹین کنکٹی کٹ میں پولیس آفیسر جیمز کو ہلاک کرنے پر پولیس کو

فتاویٰ غیاثیہ

سلطان غیاث الدین بلبن سے منسوب مخطوطہ۔ اس کو فقہی اعتبار سے اس لیے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ غیاث الدین بلبن کو فقہی مسائل سے بہت دلچسپی تھی۔ یہ عربی زبان میں ہے اور فقہ حنفی کے نقطہ نظر سے مرتب کیا گیا ہے اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔

فتاویٰ قاضی خان

فقہ حنفی میں نہایت مستند فتاویٰ ہے۔ مصنفہ فخر الدین حسن بن منصور اور جیدی فرغانی جو 592ھ میں فوت ہوئے۔ اس فتاویٰ میں اکثر ایسے مسائل بیان کیے گئے ہیں جو اکثر دفعہ وقوع میں آتے رہتے ہیں۔ یہ فتاویٰ چار جلدوں میں ختم ہوا ہے۔ پہلی دو جلدوں میں عبادات اور آخری دو جلدوں میں معاملات کا بیان ہے۔

اس کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے ایک واضح سراغ مل گیا تھا۔

شین ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا اسٹور روم اس سلسلے میں مزید مددگار ثابت ہوا۔ اس میں لوٹ کا سامان لبالب بھرا ہوا تھا، جس میں نہایت بیش قیمت مشرقی کمبل، فرکوٹ، ریشمی جرابوں کے دو ہزار جوڑے، چاندی کے ظروف کے بکس، جواہرات، تراشیدہ ہیرے، آتشی اسلحہ، برقی ڈرل مشین، ریتی، نائٹرو گلیسرین اور دیگر بے شمار چیزیں شامل تھیں۔ لیکن ان تمام چیزوں کو بار بار کھنگالنے کے باوجود ہیکی کو کوئی ایسی شے نہیں ملی جو چیپ مین کا سراغ لگانے میں مددگار ثابت ہوتی۔ چیپ مین یوں غائب ہو گیا تھا گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ رہا ہو۔ ہیکی مایوس ہو چلا تھا۔ اور تب ایک روز تاریکی میں امید کی ایک کرن نمودار ہوئی۔ اسٹور روم میں ایک مڑا تڑا سال خوردہ خالی بیگ پڑا ہوا تھا۔ یہ بیگ ناکارہ سمجھ کر ایک طرف پھینک دیا گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ کچھ عرصے تک سامان کے نیچے دبا رہا تھا۔ اس پر چند پرانے ٹریولر چپکے ہوئے لیبل تھے۔ ہیکی پہلے بھی کئی بار لیبل کا معائنہ کر چکا تھا اور اسے ناکارہ تصور کر چکا تھا۔ اس لیے کہ یہ کب چپکائے گئے تاریخ واضح نہ تھی۔ وہ پریشانی کے عالم میں ایک بار پھر اس بیگ کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس پر لگے ہوئے لیبل کی عبارت کو پڑھنے کی کوشش کرنے

لگا۔ بیگ اس کے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا اور وہ سوچ وفکر میں غلطاں اس لیبل پر اپنی انگلیاں پھیر رہا تھا۔ اچانک لیبل کا ایک گوشہ اس کے انگوٹھے کی رگڑ سے اکھڑ گیا اور اس کے نیچے ایک اور لیبل نمایاں ہوگیا۔ ہیسکی یکبارگی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ تیزی سے اپنے آفس کے پہلو میں واقع لیبارٹری میں داخل ہوگیا۔ اس نے بھاپ کی مدد سے اوپر والے لیبل کو بڑی نرمی اور آہستگی سے اکھاڑ لیا۔ اس کے نیچے ایک امریکی ریلوے ایکسپریس کا صاف ستھرا لیبل تھا جس پر تحریر تھا۔ ''ڈاکٹر ہیری اسپیکر مون...... 123 ملبری اسٹریٹ، منسی، انڈیانا......!''

اس سنسنی خیز دریافت کے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر سراغ رساں ہیسکی نے اپنے ماتحتوں کو ڈاکٹر ہیری کے دفتر کے عین سامنے واقع براؤن ہوٹل میں بٹھا دیا تھا۔ ان اہلکاروں کو دن رات چوبیس گھنٹے ڈاکٹر ہیری کے گھر اور دفتر کی نگرانی کرنی تھی۔ جیرالڈ چیپ مین کبھی نہ کبھی تو وہاں لوٹتا۔

☆☆☆

اس طرح تین مہینے گزر گئے۔ چیپ مین وہاں نہیں لوٹا لیکن تین ماہ کے بعد 17 جنوری 1925ء کو سراغ رسانوں کی محنت رنگ لائی۔ ایک سراغ رساں شام کے وقت اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہوکر ہوٹل سے نکلا اور ٹہلتا ہوا، شام کا اخبار خریدنے کی غرض سے قریبی نیوز اسٹینڈ پہنچ گیا۔ وہ اخبار خرید کر ریزگاری لینے کے انتظار میں کھڑا تھا کہ اچانک اسے اپنے عقب سے ایک آواز سنائی دی۔ ''نیویارک ٹائمز پلیز۔''

لب ولہجہ تقریباً انگریزی تھا اور محتاط بھی۔ سراغ رساں نے دزدیدہ نظروں سے اس اجنبی کی طرف دیکھا۔ وہ نہایت خوش پوش اور نفیس تھا۔ سر پر قیمتی ہیٹ، ڈبل بریسٹ کا اوور کوٹ، بھورے رنگ کا سوٹ، ہاتھوں میں دستانے، گلے میں نہایت خوش نما ٹائی، آنکھوں پر روپہلی فریم کی عینک جس سے سیاہ ریشمی ربن لٹک رہی تھی۔ چہرے پر سیاہ تراشیدہ مونچھیں جن میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ وہ سراغ رساں ہفتوں سے جیرالڈ چیپ مین کے ہر اس روپ کا مطالعہ کرتا رہا تھا جس میں وہ نظر آتا رہا تھا چنانچہ وہ فوراً چیپ مین کو پہچان گیا لیکن اس نے اسے گرفتار نہیں کیا کیونکہ ان لوگوں کو سختی سے وارننگ دی گئی تھی کہ وہ تنہا کبھی اسے گرفتار کرنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ وہ ایک سفاک قاتل تھا۔ لہٰذا وہ سراغ رساں خاموشی سے چیپ مین کو اخبار خرید کر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ چیپ مین نے سڑک عبور کی اور ڈاکٹر ہیری کے گھر میں داخل ہوگیا۔

☆☆☆

اس کے فوراً بعد اسپیشل پولیس اسکواڈ کو وہاں طلب کرلیا گیا۔ وہ لوگ ساری رات اس مکان پر نظریں جمائے ہوئے نگرانی کرتے رہے۔ اگلی صبح دس بج کر پینتالیس منٹ پر ڈاکٹر ہیری کے گھر کا صدر دروازہ کھلا اور جیرالڈ چیپ مین ایک بریف کیس اٹھائے ہوئے برآمد ہوا۔ اس نے رک کر اپنے اوور کوٹ کو درست کیا اور سڑک پر آگیا۔ اس کے پیچھے اس سے تقریباً نصف بلاک کے فاصلے پر راہ گیروں کے ہجوم میں دو افراد کہیں سے نمودار ہوئے اور اس کا تعاقب کرنے لگے۔ کچھ دور تک چلتے رہنے کے بعد چیپ مین ایک کراس اسٹریٹ پر ٹریفک کے لیے رکا اور ان دونوں سراغ رسانوں نے اس فاصلے کو کم کردیا۔ اب وہ اس سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر رہ گئے تھے۔ وہ چیپ مین کے قریب پہنچے ہی تھے کہ اچانک ایک کار آکر چیپ مین کے قریب رک گئی۔

''اوکے، چیپ مین۔'' کار کے اندر سے ایک آواز ابھری۔ ''ہم نے تمہیں گھیر لیا ہے۔''

چیپ مین فوراً اپنا ریوالور نکال کر نہایت پھرتی سے گھوما لیکن اس کا تعاقب کرنے والوں نے اس سے زیادہ پھرتی دکھائی۔ ایک نے بڑھ کر پوری قوت سے چیپ مین کو ایک ٹکر ماری .... ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ زمین پر گر پڑا۔ تعاقب کرنے والے ایک سراغ رساں نے اس پر چھلانگ لگائی اور دونوں آپس میں گتھم گتھا ہوگئے۔ چیپ مین اسے نہایت بے دردی سے نوچنے کھسوٹنے لگا۔ وہ لاتیں اور مکے بھی چلا رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے پر حاوی ہونے کی کوشش میں فٹ پاتھ پر ایک دوسرے کو بری طرح رگڑ رہے تھے۔ مکوں کا آزادانہ استعمال ہو رہا تھا۔ چیپ مین کی گرفت سراغ رساں پر خاصی مضبوط تھی۔ یکایک سراغ رساں نے خود کو ایک جھٹکے سے اس کی گرفت سے آزاد کرالیا۔ اگلے ہی لمحے اس کا آہنی مکا پوری قوت سے چیپ مین کے جبڑے پر پڑا۔ چیپ مین کو اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ سراغ رساں اس پر تابڑ توڑ مکے برسانے لگا۔ یہاں تک کہ چیپ مین ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگیا۔

☆☆☆

منسی، انڈیانا میں جیرالڈ چیپ مین کی گرفتاری نے فوری ایک قانونی پیچیدگی پیدا کردی۔ چونکہ وہ اٹلانٹا کے

وفاقی جیل سے فرار ہوا تھا، لہٰذا وفاقی حکومت چاہتی تھی کہ اسے ان کے حوالے کیا جائے۔ دوسری طرف کنکٹی کٹ کی ریاست، پولیس آفیسر جیمز کے قتل کے سلسلے میں اس پر قتل کا مقدمہ چلانے میں دلچسپی رکھتی تھی۔ اسے انڈیانا ریاست کے پولیس آفیسروں نے گرفتار کیا تھا۔ اس صورت میں اسے کس کے حوالے کیا جاتا؟ بالآخر وفاقی حکومت پہلا راؤنڈ جیت گئی۔ جیسے ہی اس کی گرفتاری کا اعلان ہوا، پوسٹل انسپکٹروں نے اسے پکڑ کر واپس اٹلانٹا بھیج دیا۔ وہاں سارے ثبوت وشواہد اکٹھا کرنے کے بعد یو ایس اٹارنی جنرل نے اعلان کیا کہ وفاقی حکومت چیپ مین کو ریاست کنکٹی کٹ بھیجنے پر آمادہ ہے۔ اس کے دو ہفتے کے بعد چیپ مین کو کنکٹی کٹ کے مقام ''ویدرس فیلڈ'' بھیج دیا گیا، جہاں اس پر قتل کا مقدمہ چلایا جانا تھا۔

مقدمۂ قتل کے لیے جیوری کے انتخاب سے پہلے ہی چیپ مین کے انتہائی مہنگے وکلائے صفائی نے پیچیدہ قانونی نکتے اٹھانا شروع کردیے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے یہ نکتہ اٹھایا کہ یہ مقدمہ ہارٹ فورٹ کاؤنٹی میں چلائے جانے کے بجائے کہیں اور چلایا جائے کیونکہ قتل کا ارتکاب ہارٹ فورٹ میں ہوا تھا اور وہاں اس کی اتنی پبلسٹی ہوچکی ہے کہ انصاف کا حصول قطعی ناممکن ہے۔ لیکن عدالت نے اس موقف کو رد کردیا اور مقدمہ 24 مارچ 1925ء کو ہارٹ فورٹ میں شروع ہوگیا۔

☆☆☆

چیپ مین کمرۂ عدالت میں ڈرامائی بے پروائی سے اپنی کرسی پر براجمان تھا۔ اس کے انداز واطوار سے ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے یہ مقدمہ اس کے طبع نازک پر بے حد گراں گزر رہا ہو۔

بالآخر جیوری کا انتخاب عمل میں آیا اور مقدمے کی کارروائی شروع ہوگئی۔ ریاست کے اٹارنی جنرل نے واضح ثبوت وشواہد پیش کیے۔ اس نے اسٹینفن موٹر کمپنی کی کلرک مس کیتھرین، سادہ لوح کسان ہینز، واٹر شین اور اسلحہ کے ماہرین کو بطور گواہ پیش کیا۔ جیرالڈ چیپ مین نے .... قبول کیا کہ کار چرائی تھی اور شین ایڈور ٹائزنگ اسٹور سے برآمد ہونے والا لوٹ کا مال بھی اس کا تھا لیکن اس نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا کہ وہ آفیسر جیمز کے قتل کے موقع پر نیو برٹین میں موجود تھا۔ اس کے وکلا صفائی نے ایسے ماہرین اسلحہ بطور گواہ طلب کرلیا جنہوں نے گواہی دی کہ چیپ مین کے ریوالور کے علاوہ کسی اور ریوالور سے چلنے والی گولی پر بھی ویسا ہی نشان پایا جانا ممکن ہے جو آلہ قتل کی گولی پر پایا گیا تھا۔

لیکن جیوری کے ارکان اس سے متاثر نہیں ہوئے۔ 14 اپریل 1925ء کو صبح دس بج کر انتیس منٹ پر جیوری کے فورمین نے اٹھ کر اپنا فیصلہ ایک لفظ میں سنادیا۔ ''مجرم۔''

اس کے بعد جب چیپ مین سزا سننے کے لیے جج کے سامنے پیش ہوا۔ جج نے نہایت متانت سے فیصلہ سناتے ہوئے اسے سزائے موت دے دی اور پھانسی کے لیے 25 جون 1925ء کی تاریخ مقرر کردی۔

لیکن جیرالڈ چیپ مین کو مقررہ تاریخ 25 جون 1925ء کو پھانسی نہیں دی جاسکی۔ سزائے موت سنائے جانے کے فوراً بعد چیپ مین کے وکلا نے گورنر کو اپیل دائر کردی کہ پھانسی کی تاریخ 25 جون سے بڑھا کر 3 دسمبر 1925ء کردی جائے۔ انہوں نے قانون میں ہر ممکن سقم ڈھونڈتے ہوئے، یہ قانونی نکتہ اٹھایا کہ کیا کنکٹی کٹ کی ریاست کو چیپ مین کو پھانسی پر لٹکانے کا اختیار ہے؟ کیونکہ اسے اب بھی وفاق کی جانب سے دی جانے والی سزا پوری کرنے میں 24 سال سے اوپر ہیں۔ یہ ایک عمدہ قانونی نکتہ تھا۔ وہ جب تک اپنی پہلی سزا نہ کاٹ لیتا، اسے کیسے پھانسی دی جاسکتی تھی؟ یہ قانونی نکتہ ریاست کے اٹارنی کے لیے ایک چیلنج بن گیا۔ وہ واشنگٹن پہنچا اور ایک ایسی دستاویز حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا جسے سپریم کورٹ میں بھی چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس دستاویز کی رُو سے ریاستہائے متحدہ کے صدر کولج نے چیپ مین کی پہلی سزا کو کالعدم قرار دے دیا تھا اور پھانسی کی سزا برقرار رکھی تھی۔ اس دستاویز کے ذیل میں خود صدر محترم کے دستخط تھے۔ اب پھانسی کا پھندا چیپ مین کے مزید قریب ہوگیا تھا۔

جہاں چیپ مین کے وکلا اسے پھانسی کے پھندے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے وہاں اس کا پرانا رفیق ڈچ اینڈرسن قانون کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کرنے کے علاوہ انتقام لینے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ مقدمے کے آغاز سے اختتام تک اس پورے عرصے کے دوران وہ سارے گواہان کو، اسٹیٹ اٹارنی کو، جج کو، حتیٰ کہ گورنر کو درجنوں دھمکی آمیز خط لکھتا رہا۔ خاص طور سے اس نے مورخہ 4 اپریل 1925ء کو شکاگو سے اسٹیٹ

اٹارنی کو ایک نہایت دھمکی آمیز خط بھیجا۔ یہ وہی تاریخ تھی جب چیپ مین کو عدالت نے سزائے موت سنائی تھی۔ اس خط میں اس نے لکھا تھا۔ "تم نے چیپ مین کو پکڑ لیا ہے۔ اب دیکھنا کہ ہم کیا کرتے ہیں...... نمبر 1۔ اسٹیو بن ویل سے تمام چوہوں کا صفایا کر دیں گے۔ نمبر 2۔ ہم بین ہینز کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ نمبر 3۔ ہم تمہیں جان سے مار ڈالیں گے۔"

اس کے چند دنوں کے بعد چیپ مین کے رفقا نے اپنی دھمکی نمبر 1 کو عملی جامہ پہنا دیا۔ انہوں نے اسٹینٹن موٹر کمپنی کے گیراج کو جہاں سے انہوں نے لنکن کار چرائی تھی اور جس کی کلرک کیتھرائن نے عدالت میں چیپ مین کے خلاف تباہ کن گواہی دی تھی، جلا کر راکھ کر ڈالا اس کے نقصان کا تخمینہ دو لاکھ ڈالر لگایا گیا۔

اس کے چار ماہ کے بعد 14 اگست کو ڈچ نے اپنی دوسری دھمکی کو عملی جامہ پہنایا یعنی بین ہینز کو اپنے انتقام کا نشانہ بنایا جس کی سادہ طبیعت نے اسے سرکاری گواہ بنا دیا تھا۔ ڈچ اینڈرسن اور اس کا ایک شریک جرم انڈیانا پہنچے اور ایک عورت کی مدد سے بین اور اس کی بیوی کو ٹیلی فون کے ذریعے ان کے گھر سے باہر بلوایا۔ اور جب وہ باہر نکل کر ان کی کار کے قریب آئے تو انہوں نے ان دونوں کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ میری تو وہیں ڈھیر ہو گئی لیکن بین ہینز اتنی دیر زندہ رہا کہ ادھر سے گزرنے والے ایک شخص کو قاتلوں کے بارے میں بتا دیا۔ قتل کی اتنی بہیمانہ واردات اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ پولیس نے بہت تیزی سے حرکت کی اور رات گئے تک ڈچ اینڈرسن کے شریک جرم وولف کو پکڑ لیا لیکن ڈچ اینڈرسن غائب ہو چکا تھا۔

لیکن ڈچ اینڈرسن اپنی تیسری دھمکی کو کبھی عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ یعنی اسٹیٹ اٹارنی کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکی...... وہ عارضی طور پر مشی گن کے ایک مقام مسکی گن میں جا چھپا تھا اور بین ہینز اور میری کی ہلاکت سے پیدا ہونے والے ہنگامے کے سرد ہونے کا انتظار کر رہا تھا کہ اس کی تقدیر نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

31 اکتوبر کی رات کو وہ چاکلیٹ خریدنے کے لیے اپنی پناہ گاہ سے نکل کر ایک اسٹور میں پہنچا۔ اسٹور کے کیشیئر نے اسے پہچان لیا اور چپکے سے ایک پولیس مین کو خبر کر دی۔ وہ پولیس مین، ڈچ کا تعاقب کرنے لگا اور اس نے ڈچ کو ایک نیم تاریک گلی میں پہنچ کر للکارا۔ دونوں طرف سے گولیوں کا تبادلہ ہونے لگا اور اس خونی جھڑپ میں ڈچ اور وہ پولیس مین دونوں ہی ہلاک ہو گئے۔

جب یہ خبر چیپ مین تک پہنچی تو وہ واضح طور پر ہل گیا۔ ڈچ کی موت نے اس سے آزادی کی آخری آس بھی چھین لی۔ لیکن اس نے قانونی جنگ جاری رکھی۔ تاخیری حربے، سماعت در سماعت، عذر در عذر کا ایک لامتناہی سلسلہ چلتا رہا۔ بالآخر وہ مقدمہ سپریم کورٹ میں پہنچ گیا۔ یہاں چیپ مین کے وکلاء نے یہ بحث شروع کر دی کہ ریاستہائے متحدہ کے صدر کو قیدی کی مرضی کے خلاف اس کی سزا کو کالعدم قرار دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ لیکن سپریم کورٹ نے صدر کے اس حکم کو جائز قرار دیا۔

سزائے موت سنائے جانے کے ایک سال بعد مورخہ 5 اپریل 1926ء کو پھانسی پر عمل درآمد کیے جانے سے چودہ گھنٹے پہلے ایک بورڈ بیٹھا۔ چیپ مین کو اس بورڈ میں پیش کیا گیا تاکہ وہ آخری بار اپنی صفائی میں کچھ کہہ سکے۔ اس موقع پر چیپ مین نے نہایت اختصار کے ساتھ اپنا کیس بیان کیا، ہینز اور میری کی ہلاکت سے اپنی لاتعلقی ظاہر کی۔ بورڈ نے بڑے صبر و تحمل سے سارے بحث و مباحثے سنے اور پھر اپنا فیصلہ سنا دیا...... چیپ مین کو اب آدھی رات کو پھانسی دی جانی تھی۔

ویدرس فیلڈ کے چرچ نے رات کے بارہ بجنے کی منادی کی۔ اس وقت فضا ہلکی ہلکی کہر آلود تھی۔ قیدی چیپ مین کو کچھ ہی دیر پہلے جیل کے پادری کے پاس لے جایا گیا تھا تاکہ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر لے لیکن اسے اپنے کیے پر نادم یا پشیمان نہ پا کر واپس اس کی پھانسی کی کوٹھری میں پہنچا دیا گیا۔

اب وہ، وارڈن اور چار پہرے داروں کی معیت میں پھانسی کے چبوترے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے لب سلے ہوئے تھے۔ وہ ایک لفظ ادا کیے بغیر چبوترے پر جا چڑھا اور جب اس کی مشکیں کس دی گئیں اور سیاہ نقاب سے اس کا چہرہ چھپا دیا گیا تو وہ گالیاں بکنے لگا۔ پہرے دار نے پھانسی کا پھندا احتیاط سے اس کے گلے میں ڈال کر کس دیا۔ پھر اشارہ پا کر وارڈن نے فرش پر بنے ہوئے چھوٹے سے تختے کو لات مار کر ہٹا دیا۔ اس کے چند ہی سیکنڈ کے بعد گریمری پارک کے نواب جیرالڈ چیپ مین کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

عقوبت خانہ

افسر آذر

انسان اشرف المخلوقات قرار پایا ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے مرتبے کا لحاظ نہیں کرتا۔ اپنے مفاد کی خاطر وہ کتنا گر سکتا ہے۔ ظلم پر اتر آئے تو کس طرح حیوانوں سے بدترین جاتا ہے اسی کا ایک نمونہ پیش کر رہا ہوں۔ گوکہ ان واقعات کو گزرے عرصہ ہو گیا ہے لیکن اب بھی ان میں سے کچھ لوگ زندہ ہیں جو ان ایام کو یاد کرکے لرز اٹھتے ہیں

دل کو دہلا دینے والے واقعات کا ذکر خاص دوسری اور آخری کڑی

میری تلاش تیسری بیرک میں بار آور ثابت ہوئی۔ باقی بیرکوں کی طرح اس بیرک میں بھی دیواروں کے ساتھ تلے اوپر لکڑی کے تختوں سے قیدیوں کے لیٹنے کے لیے برتھیں بنائی گئی تھیں۔ اس بیرک کی نگراں نے میری درخواست پر دو چھوٹی بچیوں کو دو مختلف سمتوں میں روانہ کیا' وہ بچیاں برتھوں کے ہر سلسلے کے پاس ٹھہر کر میری بیوی اور بیٹی کے نام پکارتیں اور آگے بڑھ جاتیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ میری بیوی اور بیٹی کو لے کر واپس آگئیں۔

وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے آ رہی تھیں۔ خوف اور دہشت سے ان کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ایک ان جانے سے خوف میں مبتلا تھیں کہ نہ معلوم اب ان کا کیا حشر ہونے والا ہے جو انہیں نام لے کر طلب کیا جا رہا

ہے۔ پھر جب انہوں نے مجھے دیکھا' مجھے پہچانا تو زمین نے جیسے ان کے پیر پکڑ لیے۔ مجھے زندہ اور صحیح سلامت دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھیں۔ انہیں شاید اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میں نے بڑھ کر ان دونوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ شدتِ جذبات سے ان کے لیے کچھ کہنا مشکل تھا' ان کی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئی تھیں۔ بس وہ مجھ سے لپٹی آہستہ آہستہ سسکتی اور بلکتی رہیں۔ میں نے انہیں تسلی اور دلاسا دینے کی کوشش کی لیکن جواب میں ان کی سسکیاں اور زیادہ بلند ہو گئیں۔ اس دوران میں کئی عورتیں ہمارے گرد جمع ہو گئی تھیں۔ اس ماحول میں میرے لیے اپنی بیوی اور بیٹی سے گفتگو کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے بیرک کی اور سیئر سے درخواست کی کہ وہ کچھ دیر کے لیے ہمیں اپنا چھوٹا سا کمرا دے دے تاکہ میں اپنی بیوی اور بیٹی سے تنہائی میں کچھ باتیں کر سکوں۔ نگراں نے میری درخواست قبول کر لی۔ ہم تینوں اس کے کمرے میں آ گئے۔

انہوں نے پچھلے تین ماہ کی بپتا مجھے سنائی۔ ان کے جسم پر چیتھڑے جھول رہے تھے۔ بھوک اور سردی نے ان کی زندگی کو عذاب بنا دیا تھا۔ ان کی بیرک بری طرح ٹپکتی تھی جس کی بنا پر ان کے کپڑے کبھی خشک نہیں ہو پاتے تھے۔ خوراک کے نام پر جو کچھ بھی انہیں دیا جاتا تھا' اسے حلق سے اتارنا مشکل تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ کبھی پوری نیند نہ سو پاتی تھیں۔ بیرک کے جس گوشے میں انہیں جگہ ملی تھی وہ صرف سات افراد کے لیے تھی لیکن وہاں ۱۲ افراد کو ٹھونس دیا گیا تھا۔ جو عورتیں بڑے اور امیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں وہ یہاں بھی اپنی سابقہ حیثیت کا رعب جمانے کی کوشش کرتی تھیں۔ سوتے وقت وہ ایک دوسرے کو دھکے دیا کرتی تھیں تاکہ انہیں تھوڑی سی زیادہ جگہ مل جائے اور وہ قدرے بہتر طریقے سے سو سکیں۔ یہاں ہر عورت اپنی اصل شخصیت کھو چکی تھی۔ ایک نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ہر ایک کو بس اپنی ہی فکر تھی' دوسرے کے لیے کوئی بھی معمولی سا ایثار کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ میری بیٹی نے مجھے بتایا کہ وہ زمین پر سویا کرتی تھی۔ میں نے اپنی بیوی اور بیٹی کو اپنے اور اپنے کام کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں خصوصی کمانڈوز میں شامل ہوں تو وہ پریشان اور خوف زدہ ہو گئیں۔ کیمپ میں تین ماہ کی زندگی کے دوران انہیں بھی معلوم ہو گیا تھا کہ خصوصی کمانڈوز چلتی پھرتی لاشیں ہی ہوتی ہیں۔ ان کی زندگی کے دن گنے ہوئے ہوتے ہیں اور ایک مقررہ وقت پر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

اس کے باوجود میں نے انہیں تسلی اور دلاسے دیے اور اگلے روز آنے کا وعدہ کر کے ان سے رخصت ہو کر واپس آ گیا۔

میرے ساتھیوں کو جب یہ علم ہوا کہ میں نے اپنی بیوی اور بیٹی کو کیمپ میں تلاش کر لیا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے ان میں ایک عجیب جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا۔ اگلے روز میں نے اسٹور سے گرم کپڑے' چادریں' موزے اور ضرورت کی دیگر اشیاء حاصل کیں جن میں ٹوتھ برش' نیل کٹر اور کنگھے بھی شامل تھے۔ دوا خانے سے میں نے وٹامن کی گولیاں' مرہم پٹی کا سامان اور مختلف دیگر ضروری دوائیں حاصل کیں۔ شکر' جام' مکھن اور ڈبل روٹیاں بھی بڑی تعداد میں حاصل کیں اور ایک بھاری' پھولا ہوا تھیلا لے کر اس کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا۔

تین ہفتے تک میرا روزانہ یہی معمول رہا لیکن میں ہر روز اس خوف سے دہشت زدہ رہتا تھا کہ نہ معلوم کس دن یہ سلسلہ بند ہو جائے۔ کس دن ہماری موت کے پروانے جاری کر دیے جائیں۔ ایک روز میں حسبِ معمول چیر پھاڑ میں مصروف تھا۔ اس کمرے میں ڈاکٹر مینگلے اور ڈاکٹر تھیلو بھی وہاں موجود تھے۔ وہ دونوں میری موجودگی سے لاتعلق ہو کر آش وٹز کے عقوبتی کیمپ کے انتظام کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ اچانک ڈاکٹر مینگلے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا' اس نے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ جب وہ کوئی فیصلہ کر لیتا تھا اور اس فیصلے سے وہ کسی کو آگاہ کرنا چاہتا تھا تو یہ اس کا مخصوص انداز ہوا کرتا تھا۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی تھا۔ اس نے ڈاکٹر تھیلو کو اپنا فیصلہ سنا دیا "سی کیمپ کی قیدی بیمار اور کمزور عورتوں کو خوراک فراہم کرنا اب میرے بس میں نہیں ہے۔ اگلے دو ہفتوں کے دوران میں مجھے ان عورتوں سے نجات حاصل کرنا ہی ہوگی۔"

ڈاکٹر مینگلے نے سی کیمپ کی قیدی عورتوں کے لیے موت کی سزا کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ میرا دل ڈوب کر رہ گیا۔ جونہی ڈاکٹر مینگلے اور ڈاکٹر تھیلو وہاں سے گئے' میں بھی پاس لے کر لاش بھٹی کے احاطے سے نکل کر ڈی کیمپ پہنچ گیا۔ اس کیمپ میں ایس ایس گروپ نے اپنا عارضی دفتر قائم کر رکھا تھا۔ یہ گروپ غیر ملکی قیدیوں کو جرمنی کے مختلف علاقوں میں بکھری ہوئی مختلف فیکٹریوں میں بیگار کے لیے بھیجا کرتا تھا۔ میں اس گروپ کے انچارج کے پاس پہنچا اور اس کو ڈاکٹر مینگلے کا پاس دکھا کر اپنا تعارف کرایا۔ میں نے اس کو بتایا کہ میری بیوی اور بیٹی سی کیمپ میں قیدی ہیں۔ ڈاکٹر مینگلے کی مدد سے میں نے انہیں تلاش کر لیا ہے اور ان کی حتی الامکان مدد

کر رہا ہوں۔ اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ سی کیمپ کے تمام قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتارا جانے والا ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ وہ میری بیوی اور بیٹی کو بیگار کے لیے یہاں سے کہیں اور بھیج دے۔ اس نے میری مدد کرنے کا وعدہ کر لیا۔

اس ہفتے سی کیمپ سے تین ہزار قیدیوں کو جرمنی کی جنگی فیکٹریوں میں بھیجا جانے والا تھا۔ ایس ایس گروپ کے انچارج نے مجھے بتایا "یہ فیکٹریاں جرمنی میں بیگار قیدیوں کے لیے بہترین ہیں کیونکہ وہاں قیدیوں کو مارنے کے لیے نہیں بلکہ صحت مند اور زندہ رکھنے کے لیے خوراک دی جاتی ہے اور رہائش فراہم کی جاتی ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ کام کر سکیں اور فیکٹریوں سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جا سکے۔"

میں اس کی میز پر سو سگریٹوں کے پیکٹ رکھ کر وہاں سے چلا آیا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میری بیوی اور بیٹی نے قیدیوں کے سلیکشن کے دوران میں اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر پیش کیں تو وہ انہیں بیگار کے لیے جرمنی کی کسی فیکٹری میں بھیج دے گا۔

میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ ڈی کیمپ سے میں سیدھا سی کیمپ گیا۔ اپنی بیوی اور بیٹی سے ملاقات کی لیکن انہیں اس بات پر راضی کرنے میں بڑی مشکل پیش آئی کہ وہ جرمنی کی کسی فیکٹری میں بیگار کے لیے اپنی خدمت رضاکارانہ طور پر پیش کر دیں۔ ظاہر ہے میں انہیں اصل بات تو بتا ہی نہیں سکتا تھا۔ میں اصل بات بتا دیتا تو وہ رونا دھونا شروع کر دیتیں اور پھر اگر اصلیت کا علم جرمنوں کو ہو جاتا تو ہم میں سے کسی کی خیر نہیں تھی۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح میں نے انہیں راضی بھی کر لیا۔ دو دن بعد وہ دونوں سی کیمپ سے نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئیں۔ میں نے انہیں خدا حافظ کہا تھا۔

ان کے جانے کے بعد مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں خوش بھی تھا اور غمگین بھی۔ خوش اس لیے کہ میری بیوی اور بیٹی فوری موت کے شکنجے سے دور چلی گئی تھیں' غم زدہ اس لیے کہ اب میرے لیے زندگی میں کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی زندگی کیا تھی' ہر وقت موت کا خوف تھا۔ کسی وقت بھی ہم سے ہماری زندگی چھینی جا سکتی تھی ہرچند کہ ان دنوں ایسے آثار پیدا ہو چکے تھے کہ جنگ کسی وقت بھی ختم ہو سکتی تھی۔ جرمنی کی تیسری جمہوریہ کی قبر کھودی جا چکی تھی اور میرا اندازہ تھا کہ اس وقت جو قیدی بھی آش وٹز جیسے عقوبت خانوں سے جس قدر دور تھا اس کے زندہ رہنے کے امکانات اتنے ہی زیادہ تھے۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ میرے زندہ بچ رہنے کے امکانات دن بدن کم ہوتے جا رہے تھے۔ میرا تعلق خصوصی کمانڈوز کے ۱۲ ویں گروپ سے تھا۔ ہم سے پہلے خصوصی کمانڈوز کے گیارہ گروپ لاش بھٹیوں کے ان کارخانوں میں فرائض انجام دینے کے بعد ہلاک کر دیے گئے تھے۔ ہر گروپ کی عمر صرف چار ماہ ہوتی تھی۔ غالباً جرمنوں کا نہایت محتاط اندازہ یہی تھا کہ خصوصی کمانڈوز سے جو کام لیا جاتا ہے' انسانی اعصاب اس کا بوجھ اور تناؤ چار ماہ سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتے۔ خصوصی کمانڈوز کے ۱۲ ویں یعنی ہمارے گروپ کے کام کی مدت بھی کم و بیش پوری ہو چکی تھی۔ صرف چند دن باقی تھے۔ ایک یا دو ہفتے کی ہماری زندگی اور تھی۔ پھر ہمیں بھی لاش بھٹیوں میں جل کر راکھ ہو جانا تھا۔

سی کیمپ میں مقید عورتوں کو ہلاک کرنے کے منصوبے پر کام شروع ہو چکا تھا۔ ہر روز اس کیمپ سے ۵۰ ٹرکوں میں بھر کر چار ہزار قیدی عورتوں کو لاش بھٹیوں کے کارخانے لایا جاتا تھا۔ ہر ٹرک میں ۸۰ کے قریب عورتیں سوار ہوتی تھیں۔ کچھ عورتیں موت کے خوف سے چیخیں مار رہی ہوتیں' کچھ بالکل گم صم۔ خوف سے ان کے اعضا اور زبانیں جیسے مفلوج ہو جاتی تھیں۔ دس دن کے اندر سی کیمپ کے تمام قیدیوں کو زندگی سے نجات دے دی گئی۔ ۴۵ ہزار عورتیں چار ماہ کی انتہائی اذیت ناک زندگی گزار کر' نہایت ذلیل و رسوا ہو کر زندگی کے اس جہنم سے چھٹکارا حاصل کر گئیں۔ سی کیمپ پر گمبھیر اداسی طاری ہو گئی۔

میرا خیال تھا کہ خصوصی کمانڈوز کے ۱۲ ویں گروپ کا یہ آخری کام تھا اور اس کے بعد اب خود انہیں ختم ہو جانا تھا۔ موت کس قدر قریب آ گئی تھی' اس کا ہم سب کو احساس تھا اس لیے ہر کوئی ہی خالی الذہنی کی کیفیت سے دوچار تھا۔ اس لیے اب کسی سے بات کرنا بھی دوبھر تھا۔ ہمیں ہر وقت ایس ایس کے ان جلادوں کا انتظار تھا جو ہمیں قتل کرنے کے لیے آنے والے تھے۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۴۴ء کو علی الصباح واچ ٹاور سے گولی چلنے کی زوردار آواز آئی۔ کسی محافظ نے ایک قیدی کو گولی سے اڑا دیا تھا جو نیوٹرل زون سے باہر چلا گیا تھا۔ مرنے والا ایک روسی افسر تھا۔ وہ جنگی قیدیوں کے ایک کیمپ سے فرار کی کوشش میں ناکام ہو گیا تھا اور اسے خطرناک قرار دے کر آش وٹز کے عقوبت خانے میں بھیج دیا گیا تھا۔ خیال یہی تھا کہ

اس نے آش وٹز سے بھی فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور گارڈ کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔

مرنے والا اگر آش وٹز کا عام قیدی ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ معاملہ وہیں رفع دفع ہو جاتا مگر وہ ایک جنگی قیدی تھا۔ اس کا نام، اس کے کوائف اور تفصیلات کیونکہ کیمپ کے ریکارڈ میں موجود تھے اس لیے جنگی قیدیوں کے عالمی چارٹر کے مطابق اس کی موت کے اسباب سے متعلق رپورٹ کی تیاری ضروری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر مینگلے کی سربراہی میں ایک پولیٹکل کمیشن قائم کر دیا گیا تھا اور مجھے روسی افسر کی لاش کا پوسٹ مارٹم کر کے اپنی رپورٹ ڈھائی بجے تک مینگلے کو فراہم کرنی تھی۔

ڈاکٹر مینگلے، روسی افسر کی لاش میرے حوالے کر کے ۹ بجے چلا گیا تھا۔ اگر وہ اکتوبر کی ۶ تاریخ نہ ہوتی تو میں لاش کا پوسٹ مارٹم تیس، چالیس منٹ میں مکمل کر لیتا مگر وہ ۶ اکتوبر کا دن تھا۔ خصوصی کمانڈوز کے چار ماہ کی مدت کا آخری دن۔ اگلے روز ہمیں مار کر بھٹیوں میں جلا دیا جانا تھا اس لیے ہم کو کسی بات کی پروا نہ تھی۔ ہم صرف موت کے منتظر تھے۔ میرے احساسات کیا تھے، میں بیان نہیں کر سکتا۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ بھوک اور پیاس کا احساس تک اپنی معنویت کھو چکا تھا۔ میں روسی افسر کی لاش کو چیر پھاڑ کی میز پر چھوڑ کر وہاں سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

میں سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔ میرے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ کسی پل قرار ہی نہیں آ رہا تھا اس لیے میں اپنے کمرے سے اٹھ کر اس کمرے میں آ گیا جہاں لاشوں کو بھٹیوں میں جھونکا جاتا تھا۔ کمرے میں سیکڑوں لاشیں پڑی تھیں لیکن انہیں بھٹیوں میں جھونکنے والے خصوصی کمانڈوز بہت بے دلی سے کام کر رہے تھے بلکہ بیشتر کمانڈوز، دو دو، تین تین کی ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ میں وہاں سے چلا آیا اور پہلی منزل پر پہنچا جہاں خصوصی کمانڈوز رہا کرتے تھے لیکن اس دن وہاں کا منظر بھی بدلا ہوا تھا۔ عام طور پر صبح کو حاضری اور ناشتے کے بعد نائٹ شفٹ میں کام کرنے والے کمانڈوز واپس آ کر سو جاتے تھے یا آرام کرتے تھے لیکن اس روز وہاں کوئی بھی نہیں تھا حالانکہ اس وقت دن کے دس بج رہے تھے۔ میں ایک کمرے سے گزر کر عقبی برآمدے کی طرف گیا تو دیکھا، سب کے سب اسپورٹس کے کپڑے، بوٹ اور سوئٹر پہنے چھوٹے چھوٹے گروپوں میں کھڑے باتوں میں مصروف ہیں۔ ایک کمرے میں، میں نے دیکھا کہ بعض ساتھی اپنے کپڑے اور سامان سوٹ کیسوں میں بھر رہے ہیں۔ لگتا تھا کہ سب کام کسی منصوبے کے تحت ہو رہے ہیں لیکن منصوبہ کیا تھا، مجھے اس کا علم نہیں تھا۔

میں خصوصی کمانڈوز کے سربراہ کے کمرے میں پہنچا تو وہاں نائٹ شفٹ کے مختلف انچارجوں کو موجود پایا۔ ان میں انجینئر، مکینک، ہیڈ شوفر اور گیس کمانڈوز کا انچارج شامل تھے۔ میں ایک کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ کمانڈوز کے سربراہ نے میز سے ایک بوتل نکال کر ایک گلاس میں برانڈی انڈیلی اور گلاس میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ایک ہی سانس میں تمام برانڈی پی ڈالی۔ برانڈی نشے اور سرور سے زیادہ موت کے خوف کو کم کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوتی تھی۔

ساتھیوں نے مجھے بتایا کہ خصوصی کمانڈوز کے ۱۲ویں گروپ یعنی ہم لوگوں کو کم از کم دو روز تک قتل کرنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے اس کے باوجود ۸۴۰ خصوصی کمانڈوز کے اس گروپ نے بہت سوچ بچار کے بعد اسی روز رات کو کیمپ سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا ہے۔ منصوبہ یہ تھا کہ کیمپ سے نکلنے کے بعد ہم سب یہاں سے دریائے وچولا کے موڑ کا رخ کریں گے۔ اس موسم میں کیونکہ دریا میں پانی بہت کم تھا اس لیے ہم آسانی سے اس کو پار کر سکتے تھے۔ دوسرے کنارے پر پہنچنے کے بعد ہم سب اس جنگل کا رخ کرتے جو وہاں سے ۸ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ یہ جنگل پولینڈ کی سرحد تک پھیلا ہوا تھا اور ہم اس جنگل میں مہینوں بحفاظت رہ سکتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ہماری ملاقات ان مزاحمتی گروپوں میں سے کسی گروپ سے ہو جاتی جو نازیوں کے خلاف سرگرم تھے۔

اس پلان پر عمل درآمد کے لیے ہمارے پاس مناسب تعداد اور مقدار میں اسلحہ اور گولہ بارود بھی موجود تھا جو گزشتہ چند روز کے اندر آش وٹز کے اسلحہ ساز کارخانوں سے کیمپ کو بھیجا گیا تھا۔ اس میں انتہائی دھماکا خیز مادے کے سو بکس بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس پانچ مشین گنیں اور ۲۰ دستی بم بھی تھے۔

اس گفتگو میں شامل ایک شخص نے کہا تھا "ہماری کارروائی کیونکہ اچانک اور غیر متوقع ہوگی اس لیے ہم صرف ریوالوروں کے ذریعے ہی محافظوں پر قابو پا کر انہیں غیر مسلح کر دیں گے۔ اس کے بعد ہم ایس ایس فوجیوں کو بھی اسی طرح اچانک قابو میں کر لیں گے اور انہیں اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیں گے پھر جب ہمیں ان کی ضرورت نہیں رہے گی تو ان کا قصہ تمام کر دیں گے۔"

طے یہ ہوا کہ حملے کے لیے اشارہ ٹارچ کے ذریعے لاش بھٹی کارخانہ نمبر ایک سے دیا جائے گا اور کارخانہ نمبر ۲ یہ سگنل کارخانہ نمبر ۳ کو اور وہ نمبر چار کو تیار رہنے کا سگنل دے گا۔ مجھے یہ منصوبہ قطعی قابلِ عمل معلوم ہوا کیونکہ ان دنوں صرف لاش بھٹی کے کارخانہ نمبر ایک ہی میں کام ہوا کرتا تھا اور اگر اس کارخانے میں کام شام چھ بجے بھی بند ہوا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ نائٹ شفٹ میں کام کرنے والے خصوصی کمانڈوز کو کام پر نہیں جانا ہوگا۔ جب کبھی اس قسم کی صورتِ حال پیش آتی تھی تو ایس ایس کے گارڈز بھی اپنی نگرانی میں کمی کر دیتے تھے۔ ہر لاش بھٹی کارخانے میں تین تین ایس ایس گارڈ ہوتے تھے۔

ہمارا یہ اجلاس شام تک کے لیے ملتوی ہو گیا۔ ہدایت یہ تھی کہ جب تک سگنل نہ دیا جائے، ہر شخص معمول کے مطابق اپنا کام انجام دے تاکہ کسی کو کسی قسم کا شک نہ ہونے پائے۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے میں پھر بھٹیوں والے کمرے کے سامنے سے گزرا۔ وہاں موجود کمانڈوز پہلے سے بھی زیادہ سست انداز میں کام کر رہے تھے۔ وقت سست روی سے گزرتا رہا۔ لنچ ٹائم ہو گیا، ہم آہستہ آہستہ اپنی خوراک زہر مار کرتے رہے۔ کھانے کے بعد ہم صحن میں آ گئے۔ زرد اور پھیکی پھیکی دھوپ کی نرم نرم گرمی نہ معلوم کیوں مجھے اس وقت بہت بھلی لگی تھی۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ہماری نگرانی پر مامور تینوں میں سے کوئی بھی ایس ایس گارڈ آس پاس کہیں دکھائی نہ دیتا تھا لیکن یہ کوئی خلافِ معمول بات نہیں تھی۔ پہلے بھی اکثر ایسا ہو چکا تھا۔ وہ یقیناً اپنے کمرے میں موجود تھے، احاطے کا دروازہ بند تھا۔ باہر ایس ایس گارڈ ہمیشہ کی طرح اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ میں نے اطمینان سے ایک سگریٹ پی۔ یہ خیال ہی بہت فرحت بخش تھا کہ چند گھنٹوں بعد ہم موت کے اس کارخانے کے احاطے سے باہر ہوں گے۔ اس احساس نے میرے ذہن پر پڑے ہوئے اس سیاہ پردے کو بھی غائب کر دیا تھا جس نے میرے ذہن کو اس عقوبت خانے میں آنے کے پہلے روز سے ملفوف کر رکھا تھا۔ پھر ایک اور احساس بھی اطمینان بخش تھا کہ اگر میں فرار کی اس کوشش میں ناکام بھی ہو گیا، مارا بھی گیا، تب بھی میں کسی گھاٹے میں نہیں رہوں گا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ ڈیڑھ بج چکا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو بھی ساتھ لیا۔ ہمیں اب جلد از جلد روسی جنگی قیدی کی لاش کا پوسٹ مارٹم کر کے ڈاکٹر مینگلے کے آنے سے قبل اپنی رپورٹ تیار کرنا تھی۔ کمرے میں پہنچتے ہی میں نے لاش کا پوسٹ مارٹم شروع کر دیا۔ ہمیں اپنا کام کرتے ہوئے بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک زبردست دھماکے سے درودیوار لرز اٹھے۔ اس کے بعد بازگشت کی خاموشی میں مشین گن سے فائرنگ کی آوازیں آئیں۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ لاش بھٹی کے کارخانے نمبر تین کی سرخ ٹائلوں والی چھت اور اس کو سہارا دینے والے شہتیر دھماکے سے اڑ گئے تھے اور اب وہاں سے آگ کے شعلے اور دھواں ابھر رہا تھا۔ ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ پوسٹ مارٹم کے کمرے کے عین سامنے مشین گنوں سے فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر اچانک یہ سب کچھ کیا ہونے لگا ہے۔ ہمارے منصوبے پر تو رات کو عمل درآمد ہونا تھا۔ اس وقت اس قسم کا کوئی ہنگامہ ہمارے پلان کا حصہ نہیں تھا۔ ایسی صورت میں دو ہی باتیں ممکن تھیں۔ یا تو ہم میں سے کسی نے غداری کی تھی اور ہمارے منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے ایس ایس گارڈز نے جوابی کارروائی کی تھی، دوسری صورت یہ تھی کہ کسی مزاحمتی گروپ نے کیمپ پر حملہ کر دیا تھا۔

دھماکے اور فائرنگ کے فوراً بعد آش وٹز نمبر ایک اور آش وٹز نمبر ۲ سے سائرن بجنے لگے۔ پے در پے چند اور دھماکے ہوئے جو پہلے دھماکے سے زیادہ شدید اور ہولناک تھے۔ اس کے ساتھ ہی مشین گنوں سے بھی مسلسل فائرنگ شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد فیلڈ مشین گن کی فائرنگ کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے اس لیے میں نے یہی بہتر سمجھا کہ میں اپنے ساتھیوں سمیت یہیں پوسٹ مارٹم کے کمرے میں موجود رہوں اور اس بات کا انتظار کروں کہ اس ہنگامے کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ ان حالات میں کمرے سے باہر جانا کسی طور بھی مناسب نہیں تھا۔ میں نے کھڑکی سے ۸۰ سے ۱۰۰ جنگی ٹرکوں کو آتے دیکھا۔ پہلا ٹرک ہمارے لاش بھٹی کے کارخانے کے سامنے آ کر رکا اور اس میں سے آدھی کمپنی چھلانگیں لگا کر باہر آئی جس نے خاردار تاروں کی باڑھ کے سامنے جنگی انداز میں پوزیشن سنبھال لی۔

معاملہ کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگا تھا۔ خصوصی کمانڈوز نے لاش بھٹی کے کارخانۂ اول پر قبضہ کر لیا تھا اور وہ ہر کھڑکی اور دروازے سے ایس ایس کے جوانوں پر فائرنگ کر رہے تھے اور دستی بم مار رہے تھے۔ ان کا دفاع خاصا موثر معلوم ہو رہا تھا کیونکہ میں نے کئی جرمن فوجیوں کو زخمی ہو کر یا مر کر گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر جرمنوں نے ایک نئی چال چلی۔ وہ پچاس تربیت یافتہ شکاری

کتوں کو لے آئے اور انھیں خصوصی کمانڈوز پر حملہ کرنے کے لیے ہشکارا مگر اس دن میں نے ایک عجیب اور ناقابل یقین منظر دیکھا۔ ان تربیت یافتہ کتوں نے جو اشارہ پاتے ہی شکار کو چیر پھاڑنے کے لیے لپک پڑتے تھے، حملہ کرنے سے انکار کردیا۔ وہ اپنی جگہ ہی خوف زدہ انداز میں غراتے رہے، ان کے کان پیچھے کی طرف چپک گئے تھے اور انہوں نے اپنی دُمیں ٹانگوں میں دبالی تھیں اور وہ خوفزدہ ہوکر اپنے آقاؤں کے پیچھے دبک گئے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کتوں کو ایسے قیدیوں پر حملے کی تربیت دی گئی تھی جو دھاری دار، ڈھیلا ڈھالا لباس پہنتے تھے جبکہ خصوصی کمانڈوز اس قسم کا لباس نہیں پہنتے تھے۔ ممکن ہے ان خونخوار شکاری کتوں کے خوف زدہ ہونے کا سبب یہ رہا ہو کہ وہ اب تک کمزور اور غیر مسلح قیدیوں کو شکار کرتے رہے تھے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس جنگی ماحول سے خوف زدہ ہوگئے ہوں جس میں ہر طرف بارود اور انسانی خون کی بو بسی ہوئی تھی اور زبردست دھماکے ہو رہے تھے۔

حالات پر قابو پانے کے لیے مزید کمک طلب کرلی گئی۔ خصوصی کمانڈوز کے لیے زیادہ دیر تک جرمنوں کا مقابلہ کرنا ممکن نہ تھا۔ جرمنوں کو ہر اعتبار سے ان پر برتری حاصل تھی۔ وہ زیادہ دیر تک لاش بھٹی کے کارخانے میں بند ہوکر مقابلہ نہیں کرسکتے تھے اس لیے انہوں نے وہاں سے بھاگ نکلنے کا فیصلہ کیا۔ چیختے چلاتے، نعرے لگاتے ہوئے وہ لاش بھٹی کے کارخانے کے عقبی دروازے سے نکلے، فائرنگ کرتے ہوئے انہوں نے خاردار تاروں کی باڑھ پار کی جسے پہلے ہی کاٹا جاچکا تھا اور وہاں سے نکل کر وہ دریائے وسچولا کی طرف بڑھ گئے۔

دس منٹ تک دونوں طرف سے لڑائی کا خوب زور رہا۔ زبردست فائرنگ جاری رہی۔ اور پھر اچانک جیسے یہ ہنگامہ شروع ہوا تھا اسی قدر غیر متوقع طور پر...... ختم بھی ہوگیا۔ ماحول پر گہرا سناٹا طاری ہوگیا۔ لاش بھٹی کے کارخانے کے سامنے پوزیشنیں سنبھالے ہوئے جرمن فوجیوں نے پیش قدمی شروع کردی۔ انہوں نے عمارت کے چاروں طرف سے حملہ کردیا۔ جرمن فوجیوں کا ایک گروپ پوسٹ مارٹم کے کمرے میں داخل ہوا، انہوں نے ہم پر بندوقیں تان کر ہم پر مکوں، گھونسوں اور لاتوں کی بارش کردی۔ وہ ہمیں صحن میں لے آئے اور ہمیں زمین پر اوندھے منہ ہوکر پیٹ کے بل لیٹ جانے کا حکم دیا۔ ہم نے حکم کی تعمیل کی اور اس کے بعد بلند آواز میں ہمیں خبردار کیا گیا "جس شخص نے حرکت کی، جس کسی نے سر اٹھایا اس کی گردن میں گولی ماردی جائے گی" چند منٹ بعد قدموں کی آوازوں اور دیگر سرگرمیوں کے شور سے میں نے اندازہ لگایا کہ جرمن فوج کئی اور خصوصی کمانڈوز کو گھیر کر واپس لے آئے ہیں۔ انہیں بھی ہمارے پہلو بہ پہلو زمین پر پیٹ کے بل لیٹ جانے کے لیے کہا گیا۔ تین چار منٹ بعد ایک اور گروپ کو لایا گیا اور انہیں بھی زمین پر لٹادیا گیا۔ اسی حالت میں جرمن فوجی ہمارے سروں، شانوں اور پیٹھ پر ڈنڈے برساتے رہے۔ میں نے اپنے چہرے پر گرم گرم خون کی لکیریں بہتے آتی محسوس کیں پھر خون کی یہ لکیریں میرے ہونٹوں کی باچھوں میں جذب ہوکر میری زبان کو نمکین بنانے لگا۔ عجیب بات یہ تھی کہ بس پہلے ڈنڈے کی ضرب سے مجھے تکلیف محسوس ہوئی تھی اس کے بعد مجھے کسی ضرب کی کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ میرے کانوں میں گھنٹیاں سی بج رہی تھیں، سر چکرا رہا تھا، ذہن بالکل ماؤف ہوچکا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے میں موت سے قبل...... طاری ہونے والی غشی میں ڈوبتا چلا جارہا ہوں۔

اچانک میں نے کار کے آنے کی آواز سنی۔ میں نے سوچا کہ یہ ڈاکٹر مینگلے ہی ہوگا۔ جرمن فوجی اس کی آمد کے منتظر تھے۔ میں نے پھر بھی سر اٹھانے کی جرأت نہیں کی۔ پھر میں نے اس کی آواز پہچان لی۔ تھوڑی دیر بعد کسی فوجی نے بلند آواز میں کہا "ڈاکٹر، کھڑے ہوجائیں" ہم چاروں اٹھے اور اٹینشن حالت میں کھڑے ہوکر اپنی قسمت کے بارے میں فیصلہ سننے کا انتظار کرنے لگے۔ ڈاکٹر مینگلے نے ہم چاروں کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ میرا چہرہ اور لباس خون اور کیچڑ سے لت پت تھا۔ اسی حالت میں، میں ڈاکٹر مینگلے کے سامنے گیا۔ اس کے پہلو میں تین فوجی بھی کھڑے تھے۔ ڈاکٹر مینگلے نے سوال کیا "اس ہنگامے میں تم لوگوں نے کیا کردار ادا کیا تھا؟"

"ہم اس ہنگامے میں شامل نہیں تھے۔" میں نے جواب دیا "ہم روسی افسر کی لاش کا پوسٹ مارٹم کررہے تھے کہ یہ ہنگامہ شروع ہوگیا۔ دھماکے کی وجہ سے پوسٹ مارٹم میں خلل پڑگیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی نامکمل حالت میں ابھی تک ٹائپ رائٹر میں موجود ہے۔ ہم اس تمام ہنگامے کے دوران پوسٹ مارٹم کے کمرے میں ہی موجود رہے تھے، پھر یہ حضرات ہمیں پکڑ کر یہاں لے آئے۔"

جرمن فوجی کمانڈر نے میرے بیان کی تصدیق کی اور ڈاکٹر مینگلے نے گہری نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا "جاؤ، منہ ہاتھ دھوکر اپنے کام میں لگ جاؤ۔"

میں اپنے تینوں ساتھیوں کے ہمراہ وہاں سے چل پڑا۔ ابھی ہم بیس قدم ہی گئے ہوں گے کہ ہم نے مشین گنوں سے فائرنگ کی آوازیں سنیں۔ باقی تمام خصوصی کمانڈوز زندگی کی قید سے آزاد کردیے گئے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھنے کے بجائے اپنے قدموں کی رفتار تیز کردی اور اپنے کمرے میں پہنچ کر دم لیا اور بستر پر گر پڑا۔ اس وقت اپنے تمام جسم سے ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوتی تھیں۔

اس قدر کچھ ہوگیا تھا لیکن ابھی تک صرف تین ہی بجے تھے۔ میں زندہ تھا لیکن اپنے زندہ بچ جانے پر نہ مجھے خوشی تھی نہ افسوس۔ میں جانتا تھا کہ مجھے زندگی کی جو مہلت ملی ہے وہ عارضی ہے، کسی وقت بھی ختم ہوسکتی ہے۔ مجھے ڈاکٹر مینگلے اور ایس ایس گارڈز کی ذہنیت کا بخوبی اندازہ تھا۔ میں اگر زندہ تھا تو محض اس لیے کہ ڈاکٹر مینگلے کو اپنے کام کے لیے میری ضرورت تھی۔ میں اس کیمپ میں واحد ایسا ڈاکٹر تھا جو ڈاکٹر مینگلے کی ضروریات پوری کرسکتا تھا۔

جب میرے اعصاب قدرے پُرسکون ہوگئے تو میں نے بستر چھوڑ دیا۔ میں اپنے ایک خاص مشن پر نکل کھڑا ہوا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ آخر کیمپ میں یہ ہنگامہ کیسے شروع ہوا تھا، کیا ہم سے کسی نے غداری کی تھی اور کیا جرمن فوجیوں نے خصوصی کمانڈوز کی اس بغاوت کو مکمل طور پر کچل دیا تھا۔ میں بھٹیوں کے کمرے میں پہنچا۔ وہاں میرے ساتھیوں، خصوصی کمانڈوز کی برہنہ لاشیں پڑی تھیں۔ وہ سب اس عقوبتی کیمپ کی جہنمی آزمائشوں سے چھٹکارا پاگئے تھے۔ ان کی لاشوں کو ٹھیلوں پر لاد کر یہاں لایا گیا تھا۔ ان میں اُن لوگوں کی بھی لاشیں تھیں جو لاش بھٹی کے کارخانے کے احاطے میں گولیوں سے موت کے گھاٹ اتارے گئے تھے اور وہ بھی جو اس کیمپ سے فرار ہوتے ہوئے باہر کہیں نہ کہیں مارے گئے تھے۔ بہرحال اس بغاوت کو پوری طرح کچل دیا گیا تھا اور لاش بھٹیوں کے کارخانہ دوم، سوم اور چہارم سے لاشیں جمع کرکے یہاں لائی گئی تھیں۔ اب یہاں ان لاشوں کو بھٹیوں میں جھونکنے کے کام میں تیس نئے خصوصی کمانڈوز کام کررہے تھے، جنہیں نہایت عجلت میں فوری طور پر بھرتی کیا گیا تھا۔

میں ایک ایس ایس افسر کے پاس کھڑا تھا۔ وہ لاشوں کے ہاتھوں پر گدے ہوئے نمبروں کو ریکارڈ کررہا تھا۔ میرے پوچھے بغیر اس نے بتایا کہ ۱۲ خصوصی کمانڈوز لاپتا ہیں۔ ان کے علاوہ سات کے سوا باقی تمام خصوصی کمانڈوز مارے جاچکے ہیں۔ زندہ بچنے والے سات خصوصی کمانڈوز میں ہم چار ڈاکٹر بھی شامل تھے۔ ہمارے علاوہ ڈانسو اور ہوا دانوں کا انچارج، ہیڈ شوفر اور ہر فن مولا قسم کا شخص چیپل زندہ بچنے والوں میں سے تھے۔ اسی چیپل نے مجھے تمام واقعات جس طرح وہ پیش آئے، بتائے تھے۔ چیپل نے جو کہانی سنائی وہ کچھ یوں ہے۔

"دو بجے کے قریب، لاش بھٹی کے کارخانہ سوم میں ایس ایس فوجیوں کا ایک ٹرک آیا تھا۔ اس دستے کے کمانڈر نے خصوصی کمانڈوز کو احاطے میں جمع ہونے کا حکم دیا لیکن کوئی بھی شخص اپنی جگہ سے حرکت کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ شاید ایس ایس کمانڈر کو ہمارے منصوبے کی بھنک مل گئی تھی۔ بہرحال اس نے یہی بہتر سمجھا کہ اگر وہ خصوصی کمانڈوز کے سامنے کوئی جھوٹی کہانی گھڑ کر ان کا اعتماد حاصل کرلے تو اچھے نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ اس لیے اس نے احاطے کے وسط میں کھڑے ہوکر ایک مختصر سی تقریر کی۔ ایسی تقریر جو صرف کوئی ایس ایس کمانڈر ہی کرسکتا تھا" اس نے کہا۔

"لوگو! تم نے یہاں بہت دنوں کام کیا ہے۔ اب اعلیٰ حکام کی ہدایت پر تمہیں ایک قافلے کی شکل میں یہاں سے ریسٹ کیمپ بھیجا جارہا ہے۔ وہاں تم لوگوں کو اچھا لباس ملے گا اور کھانے کو بھی خوب ہوگا۔ تمہاری زندگی بہت آرام سے گزرے گی۔ اب میں جن لوگوں کے نمبر پکار رہا ہوں وہ آگے بڑھ کر قطار میں کھڑے ہوتے چلے جائیں۔"

اتنا کہنے کے بعد اس نے قیدیوں کے نمبر پکارنا شروع کردیے۔ سب سے پہلے اس نے ہنگری سے تعلق رکھنے والے خصوصی کمانڈوز کے نام پکارے۔ ان کی تعداد ایک سو تھی۔ یہ لوگ آشوٹز کیمپ میں نئے نئے آئے تھے اس لیے وہ کچھ کہے بغیر آگے بڑھ کر قطار میں کھڑے ہوگئے۔ ان کی آنکھوں سے جرأت اور ہمت کے بجائے خوف جھانک رہا تھا۔ ایس ایس گارڈز کے ایک دستے نے آگے بڑھ کر انہیں اپنی تحویل میں لیا اور ڈی کیمپ کی بیرک نمبر ۱۳ میں لے جاکر بند کردیا۔

دوسری طرف لاش بھٹی کے کارخانہ سوم میں قیدیوں کے نمبر پکارے جاتے رہے۔ اب یونانی قیدیوں کی باری تھی لیکن ان میں سے کوئی بھی آگے بڑھ کر قطار میں کھڑے ہونے کے لیے تیار نہ تھا، کافی ردوکد کے بعد وہ بہرحال قطار میں لگ گئے۔ اس کے بعد پولینڈ کے قیدیوں کی باری آئی۔ وہ بھی قطار بنانے کے لیے تیار نہ تھے، ساتھ ہی انہوں نے دبی دبی زبان سے احتجاج کرنا اور گالیاں دینی شروع کردیں۔ جرمن فوجی نمبر پکارتا رہا لیکن کوئی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔

اچانک منل وانڑ کی ایک بوتل اس جرمن افسر کے قدموں میں جاگری اور ایک دھماکے سے پھٹ گئی۔ دھماکے سے سات ایس ایس جرمن فوجی اڑ گئے۔ وہ یا تو مر گئے تھے یا شدید زخمی تھے۔ مرنے والوں میں ایس ایس جرمن فوجیوں کے گروپ کا کمانڈر بھی شامل تھا۔ وہ دھماکا خیز بوتل پولینڈ کے ایک قیدی نے پھینکی تھی۔ باقی ایس ایس فوجیوں نے باغیوں پر اندھا دھند فائرنگ کردی۔ قیدیوں نے پسپا ہو کر لاش بھٹی کی عمارت میں پوزیشنیں سنبھال لیں اور وہاں سے انہوں نے دھماکا خیز مادے سے بھری ہوئی بوتلیں ایس ایس جرمن فوجیوں پر پھینکنا شروع کردیں۔ جواباً ایس ایس فوجیوں نے احاطے میں قطار بنائے ہوئے یونانی قیدیوں کو بھون ڈالا۔ وہ سب کے سب وہیں مارے گئے۔ انہیں جان بچا کر بھاگنے کا موقع تک نہ مل سکا۔

ایس ایس جرمن فوجی فائرنگ کرتے، گولیاں برساتے ہوئے لاش بھٹی کے داخلی دروازے کی طرف بڑھے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا کیونکہ پولینڈ کے قیدی مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس کے سوا اب ان کے سامنے کوئی اور راہ بھی نہیں تھی۔ موت بہرحال ان کا مقدر تھی اس لیے وہ اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ جرمن فوجیوں کو لے کر مرنا چاہتے تھے۔ وہ دھماکا خیز بوتلوں سے حملے کر رہے تھے جس کی بنا پر جرمنوں کے لیے آگے بڑھنا محال تھا۔ اسی وقت ایک زبردست دھماکا ہوا۔ تمام علاقہ اس دھماکے سے لرز اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تمام حملہ آور جرمن فوجی کھیت ہوگئے جو لاش بھٹی کی دیواروں کے قریب پہنچ گئے تھے۔ لاش بھٹی کی چھت اس دھماکے سے اڑ گئی، چھت کو سہارا دینے والے شہتیر، اینٹیں اور پتھر اڑ کر چاروں سمت دور دور تک جاگرے، دھوئیں اور شعلوں کے مرغولے آسمان کی طرف بلند ہونے لگے۔

گیسولین سے بھرے ہوئے چار ڈرم پھٹنے سے یہ دھماکا ہوا تھا جس سے لاش بھٹی کے کارخانۂ سوم کی عمارت ملبے کا ڈھیر بن گئی تھی اور اس کے اندر پناہ لیے ہوئے خصوصی کمانڈوز اس ملبے کے ڈھیر میں دب کر مر گئے تھے۔ جو دو چار کمانڈوز باقی بچے تھے انہوں نے خود کو جرمن فوجیوں کے حوالے کرنے کے بجائے اپنی لڑائی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن جرمن فوجیوں نے مشین گن سے فائرنگ کرکے اس جنگ کو جلد ہی ختم کردیا۔ اسی دوران ہنگری کے تقریباً ایک سو قیدی احاطے میں جا کھڑے ہوئے اور انہیں وہیں پر گولیوں سے اڑا دیا گیا۔

غرض لاش بھٹی کے کارخانۂ سوم میں اس طرح قیدیوں کی بغاوت کا آغاز ہوا جبکہ کارخانۂ اول میں معمول کے مطابق کام ہوتا رہا تا آنکہ کارخانۂ سوم دھماکے سے نہ اڑ گیا۔ دھماکے کی آواز سے کارخانۂ اول میں سراسیمگی پھیل گئی۔ یہاں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ ہنگامہ کیسا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟ گھبرا کر بھٹیوں پر کام کرنے والے کمانڈوز نے کام چھوڑ دیا اور کمرے کے ایک کونے میں جمع ہوگئے اور مشورہ کرنے لگے کہ اس صورت حال میں انہیں کیا کرنا چاہیے۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کرپائے تھے کہ ایک ایس ایس گارڈ وہاں پہنچا اور اس نے نہایت سخت لہجے میں کمانڈوز سے دریافت کیا کہ کس کی اجازت سے انہوں نے کام چھوڑا ہے۔ کمانڈوز کے انچارج نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن ایس ایس گارڈ اس جواب سے مطمئن نہ ہوا، اس نے اپنی چھڑی کے مڑے ہوئے سرے سے انچارج کے سر پر زوردار ضرب لگائی۔ اس قسم کی بھاری اور موٹی چھڑی ہر ایس ایس گارڈ کے پاس ہوتی تھی۔ خصوصی کمانڈوز میں یہ بات پہلے سے پھیلی ہوئی تھی کہ اسی ایس ایس گارڈ نے، اسی چھڑی سے پہلے بھی ایک کمانڈو کے سر پر اس قدر زور سے ضرب لگائی تھی کہ اس کمانڈو کا سر پھٹ گیا تھا اور اس نے موقعے پر ہی گر کر دم توڑ دیا تھا۔ تاہم کمانڈوز کا موجودہ انچارج بہت صحت مند اور طاقت ور تھا، وہ اس ضرب سے لڑکھڑا کر رہ گیا۔ اس کا چہرہ خون سے تر بہ تر تھا لیکن وہ اب بھی اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ اس نے اپنے بوٹ میں اڑسا ہوا چاقو نکالا اور پلک جھپکتے میں یہ چاقو اس جرمن گارڈ کے سینے میں پیوست ہوگیا۔ جرمن گارڈ لڑکھڑا کر گرا۔ دو دیگر کمانڈوز نے اس گارڈ کو اٹھایا اور ایک بھٹی کا منہ کھول کر گارڈ کو بھٹی میں پھینک دیا۔

اگرچہ یہ واقعہ چند سیکنڈ میں پیش آیا تھا لیکن شوروغل سن کر ایک اور ایس ایس گارڈ وہاں آگیا اور اس نے اپنے ساتھی کو دہکتی ہوئی بھٹی میں گرتے دیکھ لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے واپس ہوتا، خصوصی کمانڈوز نے اس کو بھی گرالیا اور قابو میں کرکے بھٹی میں جھونک دیا۔ اس کے بعد خصوصی کمانڈوز نے مشین گنیں، دستی بم اور ڈائنامائٹ کے بکس نکال لئے۔ ایس ایس گارڈز اور خصوصی کمانڈوز کے درمیان فائرنگ شروع ہوگئی۔ کسی کمانڈو نے ایس ایس گارڈ کی طرف ایک دستی بم پھینکا۔ سات جرمن ہلاک یا زخمی ہوئے۔ دوسری طرف کئی کمانڈوز بھی ہلاک ہوچکے تھے۔ لیکن اگلے ہلے میں جب چند ایس ایس گارڈز اور کام آگئے تو سارے گارڈز جن کی تعداد ۲۰ تھی، بھاگ کھڑے ہوئے۔ جب وہ گیٹ پر پہنچے تو ایس ایس گارڈز کی کمک آگئی۔ ان سب نے پلٹ کر حملہ کیا اور پانسا پلٹ گیا۔

اب اس لاش بھٹی کے کارخانے میں ہم صرف سات خصوصی کمانڈوز باقی بچے تھے۔ ۲ وہ خصوصی کمانڈوز بھی رات کو پکڑ لیے گئے جو فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ وہ دریائے وسچولا پار کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے اور بے حد تھک گئے تھے اس لیے انہوں نے ایک گھر میں پناہ لے لی تھی لیکن گھر کے مالک نے علاقے کو چھاننے والی ایس ایس فوجیوں کی ایک کمپنی کو اطلاع دے دی اور انہیں گرفتار کرلیا گیا۔

میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا، ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ مشین گن کے فائر سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ چند منٹ بعد دو ایس ایس گارڈ لڑکھڑاتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئے، ان کے چہرے خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہوا یہ تھا کہ جو ایس ایس گارڈ، مفرور قیدیوں کو گرفتار کرکے لائے تھے، انہوں نے لاش بھٹی کے کارخانۂ اول کے احاطے میں پہنچتے ہی ان گارڈز پر حملہ کردیا تھا۔ انہوں نے گارڈز کا اسلحہ چھیننے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش میں وہ سب اگرچہ مارے گئے تھے لیکن مرنے سے پہلے وہ تمام گارڈز کے چہرے بگاڑ گئے تھے۔ میں نے خاموشی سے آنے والے گارڈز کے زخمی چہروں کی مرہم پٹی کردی۔

مجھے سب سے زیادہ دکھ اپنے ان آخری مفرور ساتھیوں کی گرفتاری اور موت پر ہوا تھا۔ اس قدر کوشش کے باوجود، اتنی جانوں کے ضائع ہونے کے باوجود ہم میں سے ایک بھی شخص وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ ایک بھی شخص اگر وہاں سے فرار ہوجاتا تو دنیا کو کم از کم اس جہنم زار قید خانے کے حقائق کے بارے میں علم تو ہوجاتا۔

بہرحال قیدیوں کی یہ بغاوت آش وٹز کے اس عقوبت خانے کے قیام کے بعد سے اس وقت تک ایک تاریخی واقعہ تھا۔ اس بغاوت میں ۸۵۳ قیدی اور ۷۰ ایس ایس جرمن گارڈز ہلاک ہوئے تھے۔ لاش بھٹی کا کارخانۂ سوم پورے طور پر جل کر ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہوچکا تھا اور کارخانۂ چہارم کا ساز و سامان اور اس کا تمام نظام اس بری طرح متاثر ہوا تھا کہ وہاں مظلوموں کو گیس سے ہلاک کرکے ان کی لاشوں کو بھٹیوں میں جلانے کا کام نہیں ہوسکتا تھا۔

○☆○

چند دن بعد ہی لاش بھٹیوں کے دونوں کارخانوں میں زندگی پھر معمول پر آگئی۔ خصوصی کمانڈوز کے بارہویں گروپ کے خاتمے کے بعد نئے گروپ نے جگہ لے لی تھی۔ بارہویں گروپ کے ہم سات افراد ابھی تک زندہ تھے اور موت کا انتظار کر رہے تھے۔ روسی جنگی قیدی کے پوسٹ مارٹم کے بعد ہمارے پاس کوئی لاش نہیں بھیجی گئی تھی اس لئے میں نے اپنے نائبین کو مصروف رکھنے کے لئے آلاتِ جراحی کی صفائی اور پوسٹ مارٹم کے کمرے کو درست کرنے اور صاف کرنے پر مامور کردیا تھا لیکن یہ کام بھی جلد ہی ختم ہوگیا۔ ہم ہر روز مقررہ وقت پر وہاں جاتے اور مقررہ وقت پر وہاں سے واپس آجاتے۔ عجیب بات یہ تھی کہ ڈاکٹر مینگلے بھی اس دن کے بعد سے پلٹ کر نہیں آیا تھا۔ روسی جنگی قیدی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی لینے کے لئے نہیں آیا تھا۔

ان خالی دنوں میں ہم سب اپنی اپنی جگہ بیٹھے بس سوچتے رہتے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنا بھی ناگوار گزرتا تھا۔ میرے ساتھی کیا سوچتے تھے، مجھے معلوم نہیں تھا۔ اپنے بارے میں اتنا جانتا ہوں کہ میرے خیالات منتشر تھے۔ ایک لمحے میں ماضی کا کوئی واقعہ یاد آجاتا، پھر مجھے اپنی بیوی اور بیٹی کا خیال آتا کہ نہ معلوم وہ کس حالت میں ہوں گی، اس کے بعد اچانک اپنی موجودہ حالت کا احساس ہوتا، ۲ ویں گروپ کے مرنے والے ان کمانڈوز کی یاد آتی جن سے میرے گہرے مراسم پیدا ہوگئے تھے اور وہ اس دنیا میں نہیں تھے۔ کبھی لاش بھٹیوں کے کارخانے کے نظام کے بارے میں، میں سوچا کرتا۔ غرض خیالات کی رو تھی جو پل پل اور لمحہ لمحہ ایک یاد سے دوسری یاد کی طرف، ایک واقعے سے دوسرے واقعے کی طرف بھٹکتی رہتی تھی۔

کبھی کبھی مجھے اپنے اوپر بھی غصہ آتا تھا کہ میں نے کیوں اپنے آپ کو اور اپنی صلاحیتوں کو آش وٹز کے اس شیطان ڈاکٹر کے حوالے کردیا تھا، جس میں انسانیت کی کوئی رمق نہیں تھی۔ جو انسان کی کوئی توقیر نہیں کرتا تھا، جو تازہ تازہ قتل کیے جانے والے انسانوں کی لاشوں کی چیر پھاڑ مجھ سے کراتا تھا اور جن کا گوشت کھاد کے طور پر کھیتی باڑی کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا اور جن کے گوشت کو بجلی کے انکوبیٹرز میں رکھ کر بیکٹیریا کی افزائش کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر مینگلے اس بات پر فخر کرتا تھا کہ جرمن حکومت نے اسے اس کیمپ کی خونی دیواروں کے اندر بیک وقت دو، تین اور تین سے زائد بچوں کی پیدائش کے اسباب کی تحقیق پر مامور کیا تھا اور وہ اسی تحقیق کے لیے گھنٹوں خوردبین سے آنکھ لگائے بیٹھا رہتا تھا۔ نسلی برتری کے فلسفے کے سحر میں گرفتار جرمن حکومت اس تحقیق کو بہت اہمیت دیتی تھی۔ وہ ایک سے زائد بچوں کی پیدائش کا راز معلوم کرکے کوئی ایسا طبی

فارمولا ایجاد کرنا چاہتے تھے جس کو استعمال کرکے خالص جرمن آریائی نسل میں تیزی سے اضافہ کیا جاسکے۔ ڈاکٹر مینگلے اس راز کو دریافت کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے آش وٹز کا یہ عقوبتی کیمپ نہایت مناسب جگہ تھی جہاں اسے اپنے شیطانی تجربات اور ابلیسی تحقیق کے لیے ضروری انسانی نمونے مطلوبہ تعداد میں دستیاب تھے اور انھیں ان انسانوں کو اپنے تجربات کے لیے قتل کرنے کے مکمل اختیارات بھی حاصل تھے۔

قیدیوں کی بغاوت کے بعد اس دن جب ڈاکٹر مینگلے پہلی مرتبہ پوسٹ مارٹم کے کمرے میں آیا تو وہ بہت تھکا ماندہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ اسٹیشن سے سیدھا وہاں آیا تھا۔ اس روز بھی یہودی قیدیوں سے بھری ہوئی ایک ٹرین اسٹیشن پہنچی تھی۔ یہ قیدی ریگا کے یہودی باڑے سے لائے گئے تھے۔ یہ قیدی ٹرین سے اترے اور چھٹائی کے لیے قطاروں میں کھڑے کروائے گئے۔ اس دن ڈاکٹر مینگلے نے ہر ہر قیدی کو بائیں ہاتھ کی طرف جانے کا اشارہ کیا تھا۔ یہ اشارہ ان کے لیے سزائے موت کا حکم تھا۔ اس کام کی تکمیل کے لیے وہ پلیٹ فارم پر کئی گھنٹے بارش میں کھڑا رہا تھا۔ ان دنوں لاش بھٹیوں کے دونوں کارخانے اپنی پوری گنجائش کے مطابق صبح سے شام تک کام کررہے تھے۔ اب بھٹیوں میں جلانے کے لیے زندہ انسانوں کی نئی کھیپ آگئی تھی اس لیے کام کو تیزی سے مکمل کرنے کے لیے خصوصی کمانڈوز کی تعداد بڑھا کر ۴۰۰ کردی گئی تھی۔

ڈاکٹر مینگلے اپنا کوٹ اور ٹوپی اتارے بغیر ہی پوسٹ مارٹم کی ٹیبل کے پاس آکھڑا ہوا جو بارش سے بُری طرح بھیگ گئے تھے۔ لیکن ڈاکٹر مینگلے کو جیسے اس کا احساس ہی نہیں تھا۔ میں نے کہا "کیپٹن اپنی ٹوپی اور کوٹ مجھے دے دیجیے، میں بھٹیوں کے کمرے میں لے جاکر انھیں خشک کرکے لے آتا ہوں۔ وہاں یہ پانچ منٹ میں بالکل سوکھ جائیں گے۔"

ڈاکٹر مینگلے نے جواب دیا "فکر نہ کرو، پانی میری جلد کے نیچے تو نہیں جاسکتا۔" اس کے بعد اس نے روسی جنگی قیدی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ طلب کی۔ میں نے وہ رپورٹ ڈاکٹر مینگلے کے حوالے کردی اور اس نے رپورٹ پڑھنا شروع کردی۔ شاید تین چار سطر پڑھنے کے بعد ہی اس نے رپورٹ واپس مجھے دے کر کہا "میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ تم یہ رپورٹ پڑھ کر سناؤ۔"

میں نے چند لائنیں ہی پڑھی تھیں کہ اس نے مجھے خاموش کردیا "چھوڑو، اسے جانے دو۔ اب شاید اس کی ضرورت نہ ہو" یہ کہہ کر وہ کھڑکی کے پار خالی نظروں سے خلا میں گھورنے لگا۔

میں سوچنے لگا کہ آخر اس شخص کو کیا ہوگیا ہے۔ کیا یہ بھی آش وٹز کی ہولناکیوں سے متاثر ہوگیا تھا لیکن یہ شخص ایسا نہیں تھا۔ اسے تو انسانوں کو بہیمانہ انداز میں قتل کرنے اور ان کی لاشوں کو اپنے تجربے کی بنیاد بنا کر لطف آتا تھا۔ وہ تو آدم خور تھا۔ اس وقت موقع مناسب جان کر میں نے آخر اس سے کہہ ہی دیا۔

"کیپٹن، آخر اس تمام تباہی کا سلسلہ کب ختم ہوگا؟"

اس نے غور سے مجھے دیکھا اور بڑے عجیب سے انداز اور لہجے میں کہا "میرے دوست، یہ تباہی تو بس یونہی جاری رہے گی۔ جاری رہے گی" اتنا کہہ کر وہ وہاں سے واپس ہوا، دروازے کے قریب پلٹ کر اس نے کہا "فکر نہ کرو ڈاکٹر، اگلے چند روز کے اندر تمہارے پاس بہت دلچسپ کام آنے والا ہے۔"

میں اپنی جگہ کپکپا کر رہ گیا۔ میں جانتا تھا کہ ڈاکٹر مینگلے پھر جڑواں افراد کی لاشیں میرے پاس پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

○☆○

ان دنوں پھر لاش بھٹیوں کے کارخانوں میں بڑی سرگرمی تھی۔ نئی لاشوں کو جلانے کے لیے بھٹیاں تیار کی جارہی تھیں۔ خصوصی کمانڈوز بھٹیوں کی صفائی کررہے تھے، ان کے بھاری دروازوں کے قبضوں میں تیل دے رہے تھے، ان پر پینٹ کررہے تھے، ڈائنمو اور ہوادان دن بھر چلتے رہتے تھے۔ ماہرین ہر چیز کا جائزہ لے رہے تھے اور ان بھٹیوں کی کارکردگی کو بے نقص بنانے میں مصروف تھے۔ وجہ یہ تھی کہ یہ اعلان کردیا گیا تھا کہ "لٹزمان اسٹاڈٹ" کے یہودی باڑے سے انسانوں کی تازہ کھیپ ان بھٹیوں میں جلانے کے لیے آنے والی تھی۔

لٹزمان اسٹاڈٹ کا یہودی باڑہ جرمنوں نے ۱۹۳۹ء میں قائم کیا تھا۔ ابتدا میں اس باڑے میں ۵ لاکھ افراد تھے۔ یہ لوگ جرمنی کی ان بڑی بڑی فیکٹریوں میں کام کرتے تھے جو شب و روز جنگی ساز و سامان تیار کرنے میں مصروف تھیں۔ اپنی محنت کے عوض انھیں ان باڑوں کے لیے خاص طور پر جاری کی جانے والی کرنسی میں اجرت ادا کی جاتی تھی۔ یہ اجرت اس قدر ناکافی ہوتی تھی کہ اس سے وہ پیٹ بھر کر کھانے کے لیے اشیاء بھی خرید نہ سکتے تھے۔ سخت محنت اور کم ہی نہیں بلکہ ناقص غذا کے نتیجے میں اس یہودی باڑے میں شرح اموات بہت زیادہ تھی۔ وہ مختلف قسم کی بیماریوں

میں مبتلا ہوگئے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۴۴ء کے موسم سرما میں اس یہودی باڑے کی آبادی صرف ۷۰ ہزار نفوس پر مشتمل رہ گئی۔ اور اب ان ستر ہزار افراد کا بھی آخری وقت آگیا تھا۔

وہاں سے ان بدقسمت افراد کی آمد دس ہزار افراد کے گروپوں کی صورت میں شروع ہوئی تھی۔ ان آنے والوں میں سے ۹۵ فی صد افراد بائیں طرف بھیج دیے جاتے تھے جو ان کی فوری موت کی راہ تھی۔ صرف ۵ فی صد افراد کو دائیں طرف بھیجا جاتا تھا۔ موت ان کا بھی مقدر تھی لیکن فوری طور پر نہیں، کچھ عرصے بعد۔

یہودی باڑے میں پانچ برس کی اذیت ناک زندگی گزارنے کے بعد جسمانی اور اخلاقی طور پر وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ مسلسل محنت اور ناقص غذا نے انھیں وقت سے پہلے بوڑھا کردیا تھا۔ انھیں اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ جرمنی میں ان کی نسل کو لعنتی قرار دے کر دنیا ہی میں واصل جہنم قرار دینے کا فیصلہ کردیا گیا تھا۔ اب جبکہ وہ یہودی باڑے سے آش وٹز پہنچے تھے، انھیں یقین تھا کہ وہ یہاں قتل گاہ میں آئے ہیں پھر بھی وہ جیسے اپنے انجام سے بالکل بے پروا تھے۔ ان میں زندہ رہنے کی ذرا سی بھی خواہش نہیں تھی۔

ان لوگوں میں سے جب ایک کبڑا شخص گزرا تو وہ ڈاکٹر مینگلے کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس کبڑے شخص کی عمر ۵۰ کے لگ بھگ تھی اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی ۱۵ برس کا ایک دبلا پتلا، طویل قامت اور خوش شکل نوجوان بھی تھا۔ البتہ اس میں ایک جسمانی نقص تھا۔ اس کی ایک ٹانگ خراب تھی۔ اس نقص کو دور کرنے کے لیے اس کی ٹانگ پر فولاد کی ایک پٹی باندھ دی گئی تھی اور اس کے لیے خاص طور پر موٹے تلے کا جوتا بنایا گیا تھا جو اس کے پیر میں تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹے تھے۔ ڈاکٹر مینگلے نے سوچا کہ ان باپ بیٹوں کی صورت میں اسے اپنا یہ نظریہ ثابت کرنے کے لیے ایک ٹھوس ثبوت مل گیا ہے کہ یہودی ایک ناقص نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نے باپ بیٹے، دونوں کو علیحدہ کھڑا کردیا اور اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھا، پھر انھیں ایس ایس گارڈز کے حوالے کردیا کہ انھیں لاش بھٹی کے کارخانۂ اول میں پہنچادیا جائے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ اس روز کارخانۂ اول میں کوئی کام نہیں ہورہا تھا میں اپنے کمرے میں لیٹا تھا کہ ایک ایس ایس گارڈ میرے پاس آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ مجھے گیٹ پر طلب کیا گیا ہے۔ باپ بیٹے گیٹ پر موجود تھے۔ میرے نام ڈاکٹر مینگلے کا پیغام تھا "یہ دونوں افراد بھیجے جارہے ہیں۔ ان کا طبی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے۔ ان کے جسم اور ہاتھ پیروں کی پیمائش احتیاط سے ہونی چاہیے۔ رپورٹ میں ان کے بارے میں تمام ضروری اور دلچسپ معلومات درج ہونی چاہئیں۔ خاص طور پر ان وجوہ کا تعین کیا جانا چاہیے جن کی بنا پر ان میں مختلف جسمانی نقائص پیدا ہوئے ہیں۔"

دوسرا پیغام مسفیلڈ کے لیے تھا۔ میں اس کو پڑھے بغیر ہی اس کے مضمون سے واقف ہوچکا تھا۔ میں نے ایس ایس گارڈ سے کہا کہ وہ یہ پیغام مسفیلڈ کو پہنچادے۔

یہودی باڑے میں ۵ برس کا اذیت ناک عرصہ گزارنے کے بعد انسان کی کیا حالت ہوجاتی ہے، ان باپ بیٹے کی حالت اور ان کے چہرے کی بے رونقی اس کا ثبوت تھی۔ وہ بہت زیادہ خوف زدہ تھے، سوالیہ نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔ میں انھیں صحن میں لے آیا جس میں اس وقت دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں انھیں پوسٹ مارٹم کے کمرے میں لے آیا، انھیں... دلاسا دیتا رہا۔ شکر ہے کہ اس وقت کمرے میں کوئی لاش نہیں تھی۔

معلوم ہوا کہ باپ لٹزمان اسٹاڈٹ کا ایک باعزت شہری تھا، کپڑے کا بیوپار کرتا تھا۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان امن کا جو عرصہ گزرا تھا، اس میں وہ اپنے بیٹے کو اکثر طبی معائنے اور علاج کے لیے ویانا لے جایا کرتا تھا جہاں اپنے وقت کے بہترین معالج اور ماہرین تھے۔ میں نے سب سے پہلے باپ کا تفصیلی معائنہ کیا۔ کسی ضروری تفصیل کو نظرانداز نہیں کیا۔ سب سے زیادہ توجہ اس کو ریڑھ کی ہڈی پر دی۔ معائنے سے معلوم ہوا کہ اس کے کب کا سبب ریڑھ کی ہڈیوں کے مہروں کا نقص تھا۔ میں نے اس کا نہایت توجہ سے معائنہ کیا تھا اس کے باوجود اس میں کسی اور بیماری یا مرض کی علامات میں دریافت نہیں کرسکا تھا۔ اس دوران میں یہ تسلی بھی دیتا رہا کہ اسے شاید کسی ورک کیمپ میں بھیج دیا جائے گا۔

لڑکے کا معائنہ کرنے سے قبل میں نے اس سے طویل گفتگو کی۔ وہ بہت خوش بھی تھا اور ذہین بھی لیکن ۵ برس کی اذیت ناک زندگی گزارنے کی وجہ سے اس کا اعتماد بری طرح مجروح ہوگیا تھا۔ خوف اور دہشت سے کپکپاتے ہوئے اس نے سپاٹ لہجے میں ان اذیتوں اور غیر انسانی مشقتوں اور جانوروں جیسی زندگی کی تفصیلات بیان کیں جو اس نے یہودی باڑے میں برداشت کی تھیں۔ اس باڑے میں اس کی

ماں مرگئی تھی کیونکہ اس نے کئی ہفتے تک محض اس لیے کچھ نہیں کھایا تھا کہ اس طرح وہ اپنے شوہر اور بیٹے کو چند نوالے زیادہ کھانے کے لیے دے سکتی تھی۔ اس کے نتیجے میں وہ پہلے ہی برس میں اپنے شوہر اور بچے کی زندگی کو طول دینے کے لیے خود لقمۂ اجل بن گئی تھی۔

اور اب وہ دونوں باپ بیٹے لاش بھٹیوں کے کارخانۂ اول میں تھے۔ میں قسمت کی اس ستم ظریفی پر دل ہی دل میں نوحہ کناں تھا۔ میں ایک یہودی ڈاکٹر تھا اور اپنے ان ہم مذہب افراد کی موت سے قبل طبی اور نظام الاعضاء کے نقطۂ نظر سے ان کا تفصیلی معائنہ کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس معائنے کے بعد انہیں قتل کردیا جائے گا اور ان کی لاشیں میرے پاس چیر پھاڑ کے لیے آئیں گی لیکن میں یہ فرائض انجام دینے پر مجبور تھا۔ میں کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا۔ آخر یہ سب کیوں تھا؟ کیا سبب تھا کہ ہماری نسل پر یہ عذاب پے درپے نازل ہو رہے تھے؟ وہ کیا گناہ تھے جس کی سزائیں ہمیں دی جارہی تھی۔ یہ مشیتِ ایزدی تو ہرگز نہیں ہوسکتی۔ یزداں اتنا ظالم تو نہیں ہوسکتا۔ پھر یہ سب کیا تھا؟ پہلی مرتبہ یہ سوالات میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ پہلی مرتبہ۔۔۔ ہاں غالباً پہلی مرتبہ میں پاگل پن کی حد پر آپہنچا تھا۔

میں نے خود پر بدقت تمام قابو پایا اور اس ۱۵ سالہ نوجوان کا معائنہ شروع کیا۔ اس کے بائیں پیر کے نقص کا سبب یہ تھا کہ اس کی پنڈلی کی ایک "مچھلی" یا بونگ کم تھی۔ ماہر ہاتھوں نے اس کی ٹانگ کے کئی آپریشن کیے تھے جس کے نشانات موجود تھے۔ ان آپریشنوں کے نتیجے میں اس کی ٹانگ چھوٹی ہوگئی تھی تاہم پنڈلی پر پٹی باندھ کر اور اس پر خصوصی موزے چڑھانے کے بعد وہ چل پھر سکتا تھا۔

معائنے کے بعد میں نے ان دونوں سے پوچھا کہ وہ کچھ کھانا پسند کریں گے تو انہوں نے بتایا کہ کئی وقت سے ایک کھیل بھی اڑ کر ان کے منہ میں نہیں گئی ہے۔ میں نے ایک خصوصی کمانڈو سے کہا کہ ان کے لیے کھانا لے کر آئے۔ گوشت اور نوڈلز کی دو پلیٹیں لائی گئیں۔ یہ وہ خوراک تھی جو ان دنوں باہر ملنا محال تھی۔ دونوں باپ بیٹے مربھکوں کی طرح ٹوٹ پڑے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ ان کی زندگی کا آخری طعام ہے۔

کوئی نصف گھنٹے بعد ہی ڈاکٹر سفیلڈ، چار خصوصی کمانڈوز کے ساتھ وہاں آدھمکا اور ان دونوں کو بھٹیوں والے کمرے میں لے گیا۔ وہاں معمول کے مطابق ان کے کپڑے اتروائے گئے۔ اس کے بعد سفیلڈ کا ریوالور دو مرتبہ چلا، دونوں باپ بیٹے مرگئے۔ ان کی لاشیں سیمنٹ کے فرش پر پڑی تھیں، خون میں لت پت۔ ڈاکٹر سفیلڈ نے نہایت فرمانبرداری سے ڈاکٹر مینگلے کے احکام کی تعلیم کی تھی۔

اور اب پھر میری باری تھی۔ ان دونوں کی لاشیں پوسٹ مارٹم کے کمرے میں پہنچادی گئیں۔ دونوں لاشیں ابھی ٹھنڈی بھی نہیں ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں اب بھی گوشت پھڑک رہا تھا۔ میں اس تمام واقعے سے ذہنی طور پر شدید نڈھال تھا۔ ان لاشوں کی چیر پھاڑ کرنا میرے بس کی بات نہ تھی، چنانچہ یہ کام میں نے اپنے نائبین پر چھوڑ دیا اور خود صرف مختلف تفصیلات نوٹ کرتا رہا۔ اس پوسٹ مارٹم کے نتیجے میں اس سے زیادہ کوئی نئی بات سامنے نہ آسکی جس کا میں پہلے ہی ان کی زندگی میں ان کے طبی معائنے میں چلا چکا تھا۔ ان دونوں باپ بیٹوں کے جسمانی نقائص میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ ایسے نقص ہر نسل اور ہر مذہب کے لوگوں میں پائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود نازی ان باپ بیٹوں کی مثال کو یہودیوں کے خلاف اپنے پروپیگنڈے کے لیے استعمال کرسکتے تھے۔ وہ یہودیوں کو کم تر درجے کی انسانی نسل قرار دے سکتے تھے۔

اس روز ڈاکٹر مینگلے کم وبیش دس ہزار افراد کو زہریلی گیس سے ہلاک کرکے اور انہیں لاش بھٹیوں میں جلا کر سہ پہر کے وقت پوسٹ مارٹم کے کمرے میں آیا اور بہت غور سے اس نے دونوں باپ بیٹوں کے بارے میں میری ان دو رپورٹوں کا مطالعہ کیا جو ان کی موت سے پہلے اور موت کے بعد تیار کی گئی تھیں۔ رپورٹیں پڑھنے کے بعد ڈاکٹر مینگلے نے کہا "ان لاشوں کو جلایا نہیں جائے گا۔ ان کے ہڈیوں کے ڈھانچے برلن کی اینتھروپولوجیکل میوزیم کو بھیجے جائیں گے۔ ڈاکٹر، ان کے ہڈیوں کے ڈھانچے تیار کرنے کے کیا طریقے ہیں؟" اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"دو طریقے ہیں جناب" میں نے کہا "پہلا یہ کہ لاشوں کو لائم کلورائڈ میں ڈال دیا جائے۔ اس طرح دو ہفتے کے اندر گوشت گل سڑ کر ہڈیوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد ڈھانچے کو گیسولین سے غسل دیا جاتا ہے جس سے تمام چکنائی صاف ہوجاتی ہے اور ڈھانچا خشک ہوجاتا ہے، ہڈیاں سفید ہوجاتی ہیں اور ان کی بو بھی ختم ہوجاتی ہے۔"

میں سانس لینے کو رکا ہی تھا کہ ڈاکٹر مینگلے نے دریافت کیا "اور دوسرا طریقہ؟"

"دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان لاشوں کو پانی میں ڈال کر اُبالا جائے اور اس حد تک اُبالا جائے کہ گوشت آسانی سے

ہڈیوں سے جدا کیا جاسکے۔ اس کے بعد انہیں گیسولین سے غسل دے دیا جائے" میرا جواب تھا۔

"تو پھر ڈھانچے تیار کرنے کے لیے دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے" ڈاکٹر مینگلے یہ حکم دے کر چلتا بنا۔

آش وٹز میں احکام دے دیے جاتے تھے۔ قیدیوں کو یہ نہیں بتایا جاتا تھا کہ ان احکام کی تعمیل کے لیے ضروری سامان وہ کہاں سے حاصل کرسکتے ہیں۔ قیدیوں کو بس ہر قیمت پر احکام کی تعمیل کرنا ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے ایک نہایت گمبھیر اور اہم مسئلے کا سامنا تھا۔ آخر میں ان دونوں لاشوں کو کس چیز میں ابالوں؟ میں نے یہ مسئلہ ڈاکٹر سفیلڈ کے سامنے رکھا کہ مجھے دو لاشوں کو ابالنے کے لیے کسی بڑے برتن کی ضرورت ہے۔ اس تصور سے وہ بھی لمحے بھر کے لیے دہشت زدہ ہوگیا تھا لیکن بس یہ لمحاتی تاثر تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے کہا "صحن میں لوہے کے دو بڑے ٹب پڑے ہیں۔ عام طور پر یہ ٹب اسٹور ہاؤس والوں کے استعمال میں رہتے ہیں لیکن میں انہیں استعمال کرسکتا ہوں۔" ساتھ ہی اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ان دونوں ٹبوں کو کھلے صحن میں اینٹوں کے عارضی چولہے بنا کر ان پر رکھ دوں اور ان کے نیچے آگ جلا کر اپنا کام کروں۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ خصوصی کمانڈوز کو آگ جلانے کے لیے لکڑیاں جمع کرنے پر لگا دیا گیا۔ تھوڑی دیر میں لکڑیاں جمع ہوگئیں، اس دوران میں ٹبوں میں پانی بھر کر ان میں لاشیں ڈال کر ٹبوں کو چولہوں پر چڑھایا جاچکا تھا۔ لکڑیاں جمع ہوگئیں تو ان ٹبوں کے نیچے آگ جلادی گئی۔ چند خصوصی کمانڈوز کو آگ جلائے رکھنے پر مامور کردیا گیا۔ چند گھنٹے بعد میں نے لاشوں کو ٹیسٹ کیا۔ گوشت اب آسانی سے ہڈیوں سے جدا ہوسکتا تھا۔ میں نے آگ بجھانے کا حکم دے دیا لیکن ٹب چولہوں پر ہی رہنے دیے کیونکہ اب انہیں ٹھنڈا بھی تو ہونا تھا۔

میرے پاس اب کوئی کام نہیں تھا۔ میں اپنے کمرے میں آگیا۔ میں بہت خاموش تھا۔ میرے وجود کے اندر بھی سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ آش وٹز میں یہ سب سے ہولناک تجربہ تھا جس سے میں گزرا تھا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ لاش بھٹیوں کو گرم کیا جارہا تھا۔ انسانوں کی نئی کھیپ کو موت کے گھاٹ اتار کر ان کی لاشوں کو جلانے کی تیاریاں زور وشور سے جاری تھیں۔ اس مخصوص شور سے میرے کان بخوبی واقف تھے۔ شام کا دھندلکا تیزی سے اندھیارے میں تبدیل ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب وہ ٹب جن میں لاشوں کو ابالا گیا تھا ٹھنڈے ہوچکے ہوں گے۔ مجھے اب دوسرے مرحلے پر کام کرنا تھا۔

میں بستر سے اٹھنے ہی والا تھا کہ میرا ایک معاون ہانپتا، کانپتا میرے پاس آیا۔ خوف اور دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اس نے کہا "ڈاکٹر! جلدی کرو، پولینڈ کے قیدیوں نے لاشوں کا گوشت کھانا شروع کردیا ہے۔"

میں تو جیسے پاگل ہوگیا تھا۔ بھاگم بھاگ میں موقعے پر پہنچا۔ چار افراد، قیدیوں کی دھاری دار وردی پہنے لوہے کے ٹبوں کے قریب کھڑے تھے، ان کے چہروں پر عجیب وحشت برس رہی تھی۔ یہ چاروں پولینڈ کے تھے، پیشے کے اعتبار سے راج تھے۔ کام ختم کرنے کے بعد صحن میں آگئے تھے اور ان ایس ایس گارڈز کے منتظر تھے جو انہیں یہاں سے آش وٹز ون میں لے جانے والے تھے۔ بہت زیادہ بھوکے تھے۔ اتفاقاً ان ٹبوں کے پاس آنکلے۔ یہ سمجھے کہ شاید خصوصی کمانڈوز کے لیے گوشت پکایا جارہا ہے، انہوں نے موقع غنیمت جانا۔ وہ خصوصی کمانڈوز جو ان ٹبوں کی نگرانی پر مامور تھے، چند منٹ کے لیے وہاں سے جاچکے تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی گوشت کھانا شروع کردیا۔ ابھی دو چار لقمے ہی حلق سے اترے تھے کہ ان ٹبوں کی نگرانی پر مامور محافظ وہاں آگئے۔ انہوں نے جو یہ منظر دیکھا تو شور مچادیا۔ پولینڈ کے وہ قیدی جو گوشت کھا رہے تھے، رک گئے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ یہ انسانی گوشت ہے تو ان کی حالت غیر ہوگئی۔

ڈھانچے کو گیسولین سے غسل دینے کے بعد میرے معاونین نے تمام ہڈیاں نہایت احتیاط سے جمع کیں اور انہیں اس میز پر لاکر رکھ دیا جہاں ایک گزشتہ شام میں نے ان دونوں کا معائنہ کیا تھا۔ ڈاکٹر مینگلے اس کارگزاری پر بے حد خوش تھا۔ وہ کئی افسروں کے ساتھ آیا تھا اور سب اس میز کے گرد کھڑے ہوکر موٹی موٹی طبی اصطلاحات کے حوالے سے اس طرح تبادلۂ خیال میں مصروف تھے جیسے انہوں نے طبی دنیا میں تہلکہ مچادینے والی کوئی انوکھی بات دریافت کرلی ہو حالانکہ ان باپ بیٹوں کے جسمانی نقائص میں کوئی انوکھا پن نہیں تھا۔ دنیا کے ہر کونے میں ہر نسل اور ہر مذہب کے افراد میں ایسے نقائص پائے جاتے ہیں لیکن جرمنوں کو تو بس یہودیوں کی تذلیل کا کوئی بہانہ ہاتھ آنا چاہیے تھا پھر وہ تحقیر وتذلیل کے لیے ایسی ایسی سائنسی تاویلات پیش کرتے کہ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

بہرحال پھر ان ڈھانچوں کو نہایت احتیاط سے مضبوط اور موٹے کاغذوں کے بڑے بڑے تھیلوں میں بند کرکے برلن

بھیج دیا گیا۔۔۔ ان تھیلوں پر موٹے موٹے حروف میں یہ الفاظ تحریر کیے گئے تھے۔ "ارجنٹ۔ قومی دفاع" ان ڈھانچوں کے وہاں سے جانے کے بعد میرے ذہن کو قدرے سکون ملا تھا۔

لٹزمان اشاڈٹ کے یہودی باڑے سے آنے والے یہودیوں کو بھٹیوں میں جلا کر راکھ کرنے کا عمل ایک ہفتے میں مکمل ہوگیا۔ اس کے فوراً بعد خزاں کا موسم آگیا۔ آسمان پر ہروقت بادل اور دھند چھائی رہتی۔ آش وٹز کے اس عقوبت خانے کی بیرکوں پر ہروقت کہر اور دھند کی چادر پھیلی رہتی۔ پھر بارشوں کا لامتناہی سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ ٹھنڈ تھی کہ ہڈیوں کے گودے میں اترتی محسوس ہوتی تھی۔ میں جدھر بھی نکل جاتا بس وہی خاردار تار نظر آتے تھے جن سے بجلی کی لہر ہر وقت گزرتی رہتی تھی۔ یہاں سے فرار کی ہر امید دم توڑ گئی تھی۔ زندگی ان خاردار تاروں کی باڑھ سے باہر تھی۔ ان کے اندر بس موت تھی۔

لٹزمان اشاڈٹ کے یہودی باڑے سے آنے والوں کو راکھ ہوئے تین دن گزرے تھے کہ خصوصی کمانڈوز کا انچارج ایک عورت اور دو بچوں کو پکڑ لایا۔ وہ پانی میں شرابور تھے اور سردی سے بری طرح کپکپا رہے تھے۔ وہ راکھ ہونے والوں کی آخری کھیپ میں شامل تھے اور کسی طرح وہاں سے بچ نکلے تھے۔ انہوں نے احاطے میں لکڑیوں کے ڈھیر میں چھپ کر پناہ حاصل کی تھی۔ ان کے تمام ساتھی اور عزیز و اقارب ان کی آنکھوں کے سامنے جل کر خاک ہوگئے تھے۔ سردی اور خوف سے گنگ، وہ لکڑیوں کے ڈھیر میں چھپے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ شاید کوئی ایسا کرشمہ ہوجائے کہ وہ اس جہنم سے بچ نکلیں۔ تین دن تک وہ سردی اور بارش میں وہیں چھپے رہے۔ ان کے پاس نہ کھانے کو تھا، نہ سردی اور بارش سے بچنے کے لیے کوئی سامان۔ پھر خصوصی کمانڈوز کے انچارج کی نظر ان پر پڑ گئی۔ اس وقت ان تینوں پر نیم غشی طاری تھی۔ انچارج ان کی مدد بھی نہیں کرسکتا تھا اور اس حالت میں انہیں مرنے کے لیے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا اس لیے وہ ان کو لے آیا تھا۔

عورت کی عمر ٣٠ برس تھی لیکن وہ پچاس برس کی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسفیلڈ کے قدموں میں گر گئی۔ وہ بری طرح بلک رہی تھی۔ وہ اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی جن کی عمریں دس اور بارہ برس کی تھیں۔ اس نے یہودی باڑے میں قائم ملبوسات تیار کرنے والی فیکٹری میں ٥ سال مشقت کی تھی۔ وہ اب بھی کام کرنے کے لیے تیار تھی، ہر کام کرنے کے لیے راضی تھی۔

لیکن اس عورت کی یہ تمام التجائیں بے سود اور بے ا[illegible] تھیں۔ یہاں کسی کے لیے رحم اور معافی کا کوئی تصور نہ [illegible] یہاں صرف موت تھی اور ڈاکٹر مسفیلڈ تو رحم نام کے [illegible] جذبے سے ہی ناواقف تھا۔ اس کے باوجود مسفیلڈ نے [illegible] تینوں کو خود گولی نہیں ماری، اس نے یہ کام کسی اور کو سونپ دیا۔

○☆○

ان تینوں ماں بیٹوں کی یہ ایک اور چھوٹی سی کہانی تھی [illegible] ہم اگر پاگل پن سے بچنا چاہتے تھے تو لازماً ایسے واقعات [illegible] فراموش ہی کردینا ضروری تھا۔ اس کے بعد ہمارے لیے [illegible] طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ امید اور روشنی کی کوئی کر[illegible] کہیں نظر نہیں آتی تھی۔

اکتوبر ختم ہوگیا تھا، نومبر ١٩٤٤ء کا مہینہ تھا۔ برف بار[illegible] شروع ہوچکی تھی۔ ہر چیز نے سفید لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ سرد [illegible] بستہ ہوائیں اور تیز ہوگئی تھیں۔ سارے پرندے رفتہ رفتہ غائب ہوگئے تھے، بس کوّے تھے جو اڑتے نظر آتے تھے۔ چ[illegible] دن خاموشی کے بعد لاش بھٹی کے کارخانے میں پھر معمول [illegible] سرگرمیوں کی آوازیں شروع ہوگئیں۔ ہواداتوں کے پنکھے [illegible] چلنے لگے تھے، بھٹیاں گرم کی جارہی تھیں۔ یہ اطلاع ہر شخص کو مل چکی تھی کہ چیکوسلواکیہ کے "تھرے سائن اشاڈٹ" کے یہودی باڑے سے قیدیوں کی ایک نئی کھیپ لائی جارہی ہے جسے جلد از جلد بھٹیوں میں جلانا ہے۔

جمہوریہ چیکوسلواکیہ کے قیام کے بعد سے "تھرے سائن اشاڈٹ" کا قصبہ ایک فوجی چھاؤنی تھا۔ اس پر قبضے کے بعد سے جرمنوں نے اس قصبے کی ہیئت ہی تبدیل کردی [illegible] اور اسے ایک مثالی یہودی باڑے کی شکل دے دی [illegible] اس باڑے میں آسٹریا، ہالینڈ اور چیکوسلواکیہ کے یہودیوں [illegible] رکھا گیا تھا جن کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ اس باڑے میں رہنے والوں کی زندگی نسبتاً بہتر تھی۔ وہ اپنے پیشہ ورانہ فرائض آزادی سے انجام دیتے تھے، انہیں خط و کتابت [illegible] بھی اجازت تھی۔ ریڈ کراس کی تنظیم اس یہودی باڑے [illegible] امداد بھی فراہم کرتی تھی۔ عالمی ریڈ کراس کی جماعتیں [illegible] یہودی باڑے کا دورہ کرتی تھیں اور یہاں کے ماحول [illegible] قیدیوں کے حالات کے بارے میں اچھی رپورٹیں دیتے تھے [illegible] اس یہودی باڑے کو جرمنوں نے دنیا کی نظروں میں دھو[illegible] جھونکنے کے لیے کامیابی سے استعمال کیا تھا۔ اس باڑے [illegible] بارے میں عالمی ریڈ کراس کی رپورٹوں کے ذریعے جرمن[illegible] کے قائم کردہ عقوبت خانوں اور لاش بھٹیوں کے بارے میں پھیلنے والی خبروں کا توڑ کیا جاتا تھا۔

لیکن اب جبکہ تیسری جرمن جمہوریہ اپنے زوال کے دہانے پر آگئی تھی تو عالمی رائے عامہ کی بھی اسے کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنے چہرے سے مصنوعی انسانیت کی نقاب بھی اتار پھینکی تھی اور اس نے بڑی تیزی سے ان تمام یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا شروع کردیا تھا جو اس کی قید میں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ چیکوسلواکیہ کے اس مثالی یہودی باڑے کے لوگوں کے مرنے کی بھی باری آگئی تھی۔

جب یہ لوگ آش وٹز پہنچے تو وہ جسمانی طور پر اچھی حالت میں تھے۔ ہر ایک کے پاس مندرجہ ذیل حکم نامہ تھا۔ یہ حکم نامہ جرمن جمہوریہ کی اس سرکاری ایس ایس کمیٹی کی طرف سے جاری کیا گیا تھا جو بیگار کے لیے محنت کشوں کو بھرتی کرتی تھی۔ حکم نامے کا متن کچھ اس نوعیت کا تھا۔

"جرمن جمہوریہ کے زیرِ انقلاب فلاں "فلاں" یہودی کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اسے لازمی بے گار کے لیے منتخب کرلیا گیا ہے۔ اس کو حکم دیا جاتا ہے کہ بے گار پر روانہ ہونے سے قبل وہ اپنے پیشہ ورانہ کام کے تمام اوزار اور سازو سامان موسم سرما میں استعمال کیے جانے والے کپڑے اور ایک ہفتے کی خوراک کمیٹی کے نمائندے کے پاس جمع کرادے۔ روانگی کی تاریخ کا اعلان پبلک نوٹس کے ذریعے کیا جائے گا۔"

لازمی بے گار کی کہانی ایک سفید جھوٹ تھا۔ اس کا مقصد کسی شور شرابے اور کسی رکاوٹ کے بغیر انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ اس کا دوسرا مقصد بعض ضروری اوزار و آلات اور گرم ملبوسات جمع کرنا تھا جن کی جرمن آبادی کو شدید ضرورت تھی۔ غرض اس قسم کے حکم نامے کی آڑ میں ٢٠ ہزار افراد کو گیس چیمبروں میں ہلاک کرکے ان کی لاشیں بھٹیوں میں جلادی گئی تھیں۔ اور یہ بیس ہزار افراد ناکارہ یا معذور نہیں تھے بلکہ نوجوان اور صحت مند تھے۔ ان سب کو انسانوں سے راکھ میں تبدیل کرنے کے عمل میں صرف ٤٨ گھنٹے لگے تھے۔

دو ہفتے بعد ایسے ہی بدقسمت افراد سے بھری ہوئی مزید ٹرینوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس مرتبہ بھی تمام افراد کو بائیں طرف بھیج دیا گیا تھا۔ یہ ان افراد کے عزیز و اقارب تھے جو ان کی آمد سے قبل موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تھے۔ ان میں سے ہر فرد کے پاس اس قسم کا حکم تھا جس میں ان سے کہا گیا تھا کہ انہیں اپنے شوہروں اور والد کے پاس بھیجا جارہا ہے تاکہ وہ اپنے شوہر اور والد کے ساتھ وہیں قیام کرسکیں جہاں وہ ملازم ہیں۔ وہاں ان کے لیے عمدہ رہائش گاہیں ہیں اور عمدہ خوراک بھی۔ تاہم سفر کرنے والوں کو ایک ہفتے کے راشن کا خود انتظام کرنا ہوگا۔

اس شیطانی نوٹس کی آڑ میں ٢٠ ہزار عورتوں اور بچوں کو آش وٹز بھیجا گیا تھا اور انہیں بھی گیس چیمبروں میں ہلاک کرکے بھٹیوں میں جلا کر راکھ کردیا گیا۔

١٧ نومبر ١٩٤٤ء کو علی الصباح ایک ایس ایس گارڈ میرے کمرے میں آیا اور اس نے مجھے اعتماد میں لے کر بتایا کہ اعلیٰ کمان سے حکم آیا ہے کہ اب سے کسی بھی قیدی کو ہلاک کرنا ممنوع ہے۔ کسی بھی قیدی کو عقوبتی کیمپ میں کسی بھی طریقے سے ہلاک نہیں کیا جائے گا۔ اتنے بہت سے جھوٹ اور افترا کا مشاہدہ کرنے کے بعد میرے لیے اس اطلاع پر یقین کرنا مشکل تھا۔ میں نے اپنے شکوک و شبہات کا اظہار اس پر بھی کردیا تھا لیکن اس نے پہلے سے زیادہ زوردار طریقے سے مجھے یقین دلایا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ احکام ابھی ابھی ریڈیو پر ایس ایس فوجیوں اور لاش بھٹیوں کے کارخانوں کے انچارجوں کو موصول ہوچکے ہیں۔ لیکن پھر بھی مجھے یقین نہ تھا۔

بہرحال جلد ہی اس کے بیان کی تصدیق ہوگئی۔ مویشیوں کی حمل و نقل کے استعمال ہونے والے پانچ ڈبوں پر مشتمل ایک مال گاڑی اسٹیشن پر آکر رکی تھی۔ اس مال گاڑی سے ٥٠٠ قیدی لائے گئے تھے۔ یہ تمام کے تمام قیدی بیمار اور معذور تھے۔ وہ سب کے سب لاش بھٹیوں کے کارخانہ اول و دوم کے درمیان پلیٹ فارم پر اترے تھے۔ یہاں ایس ایس گارڈز سے قیدیوں کے ساتھ آنے والے محافظوں کے درمیان کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ آخر کار ان قیدیوں کو دوبارہ ڈبوں میں سوار ہونے کی ہدایت کی گئی اور یہ ٹرین ایف کیمپ یعنی اسپتال کی بیرکوں کی طرف روانہ ہوگئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ آش وٹز بھیجے جانے والے بیمار اور معذور قیدیوں کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا گیا تھا بلکہ انہیں آش وٹز کے اسپتال کی بیرکوں میں رکھا گیا تھا۔ ان کو علاج معالجے اور آرام کی سہولتیں فراہم کی گئی تھیں۔

اس کے ایک گھنٹے بعد سلواکیہ کے ٥٠٠ قیدیوں کو لے کر ایک اور ٹرین آش وٹز پہنچی تھی۔ وہ سب پلیٹ فارم پر اترے۔ میں پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس پلیٹ فارم پر آنے والے قیدیوں کو فوری طور پر موت کے گھاٹ اتارنے اور بعض کو کیمپوں میں رکھنے کے لیے انتخاب ہوتا تھا۔ مرنے کے لیے منتخب

ہونے والے بائیں ہاتھ کی طرف بھیج دیے جاتے تھے لیکن اس روز بلا کسی استثنا کے تمام قیدیوں کو دائیں ہاتھ پر ڈی کیمپ کی سمت بھیج دیا گیا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے اندر خوشی کی لہر دوڑتی محسوس کی تھی۔ ایس ایس کے گارڈ نے مجھے جو خبر دی تھی وہ درست تھی۔ اس میں کوئی چھل اور فریب کی بات نہ تھی۔

آش وٹز کے عقوبت خانے کے قیدیوں کے لیے یہ ایک نیک شگون تھا۔ ان کے زندہ بچ جانے کی امید پیدا ہو چلی تھی لیکن خصوصی کمانڈوز کے لیے یہ ایک بُرا شگون تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ان کا انجام قریب آگیا ہے۔ یہ خصوصی کمانڈوز کا تیرہواں گروپ تھا جو ان دنوں آش وٹز میں کام کر رہا تھا اور اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس گروپ کو چار ماہ کی مدت سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

آش وٹز میں زندگی ایک نئے انداز سے شروع ہو گئی تھی۔ اب لوگوں کو قتل نہیں کیا جا رہا تھا لیکن آش وٹز کیمپ کے ساتھ جو خونیں ماضی وابستہ تھا اس کو چھپانا بھی ضروری تھا۔ لاش بھٹیوں کو توڑنا اور چتا گھاٹ کی خندقوں کو پاٹنا لازمی تھا' ساتھ ہی ان تمام لوگوں کا خاتمہ بھی ناگزیر تھا جو اس کیمپ میں قیدیوں کے قتل عام اور ان پر ہولناک مظالم میں شریک تھا یا ان کے چشم دید گواہ تھے۔

انسانوں کے قتل عام کی کہانی صرف آش وٹز تک محدود نہیں تھی۔ انسانوں کو گیس چیمبروں میں ہلاک کر کے ان کی لاشوں کو بھٹیوں میں جلانے والے کارخانوں کا جال اور بھی کئی مقامات پر پھیلا ہوا تھا۔ میڈانک' تری بلنکا' آش وٹز اور برکناؤ میں اس قسم کے بڑے بڑے کارخانے موجود تھے جہاں کئی لاکھ انسانوں کو اسی طرح سفاکانہ انداز میں موت کے گھاٹ اتارا جا چکا تھا۔ ان کیمپوں میں پہنچنے والے قیدی اپنی آمد کے چند گھنٹوں بعد راکھ میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ اب موت کے ان کارخانوں سے چند ہزار افراد کے زندہ بچ نکلنے کی امید پیدا ہو چلی تھی۔

خصوصی کمانڈوز کے انجام کے خیال سے میرا ذہن بہت پراگندہ ہو گیا تھا اس لیے میں اس ایس ایس جرمن فوجی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا جس نے صبح کے وقت مجھے یہ خوش خبری سنائی تھی کہ اب قیدیوں کو ہلاک نہیں کیا جایا کرے گا۔ میں اس سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر خصوصی کمانڈوز کے بارے میں کیا فیصلہ کیا گیا ہے۔ خوش قسمتی سے وہ کمرے میں تنہا تھا اور میں اس سے اطمینان کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کر سکتا تھا۔

میرے سوال پر اس نے کہا "خصوصی کمانڈوز کے بارے میں..." وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر بولا "ہاں ان کے بارے میں بھی فیصلہ ہوا ہے۔ چند دن بعد تم لوگوں کو سامانِ حرب تیار کرنے والے ایک زیرِ زمین کارخانے میں بھیج دیا جائے گا۔ یہ کارخانہ برسلاؤ سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

مجھے اس کی بات پر قطعی یقین نہ آیا۔ لیکن پہلی مرتبہ مجھے یہ یقین تھا کہ وہ مجھے جھوٹی تسلی دینے کے لیے جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ میں نے چند دن قبل اس کا علاج کیا تھا۔ وہ شدید علیل تھا اور میرے علاج سے صحت یاب ہو گیا تھا۔ شاید اسی بنا پر وہ مجھے کوئی بُری خبر سنانا نہیں چاہتا تھا۔

○☆○

ہمارے شب و روز پھر اسی بے کیفی کے عالم میں گزرنے لگے۔

وہ بھی عجیب سا دن تھا۔ سہ پہر کے دو بجے تھے۔ میں کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ بادل بہت گہرے اور نیچے تھے' برف باری کا سلسلہ کسی وقت بھی شروع ہو سکتا تھا۔ اچانک بھٹیوں کی کمرے کی راہداری سے زوردار آواز تحکمانہ انداز میں ابھری۔

"تمام خصوصی کمانڈوز احاطے میں جمع ہو جائیں۔"

اس کے بعد یہی حکم دو تین مرتبہ دُہرایا گیا۔ ہر مرتبہ حکم دینے والے کی آواز پہلے سے زیادہ کرخت تھی۔ تھوڑی دیر بعد میرے کمرے کے دروازے کے باہر بھاری قدموں کی آواز ابھری' ایک ایس ایس گارڈ نے دروازہ کھولا اور کرخت لہجے میں کہا "سنا نہیں تم نے' چلو باہر چلو۔"

میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بوجھل قدموں اور بوجھل دل کے ساتھ لاش بھٹی کے کارخانۂ اوّل کے احاطے میں پہنچا' جہاں دیگر ساتھی بھی موجود تھے۔ چاروں طرف ایس ایس گارڈز مشین گنیں ان پر تانے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ ہمارا آخری وقت آپہنچا ہے۔ میں نے آس پاس کے ماحول پر آخری اور الوداعی نظر ڈالی۔ احاطے میں کہیں کہیں اب بھی برف جمی ہوئی تھی' پائین کے درخت برف کی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ تمام ماحول بہت پُرسکون تھا۔

تمام خصوصی کمانڈوز کی حاضری لی گئی۔ سب کے سب موجود تھے۔ اس کے بعد ہمیں بھٹیوں کے کمرے میں ہنکا دیا گیا۔ تمام ایس ایس گارڈز باہر رہ گئے۔ انہوں نے دروازوں اور کھڑکیوں پر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ ان کی مشین گنوں نے ہمیں نشانے پر لے رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے بند کر دیے گئے۔ کھڑکیوں پر پھسلنے والی آہنی چادریں چڑھا دی گئیں۔ اب اس کمرے سے ہمارے نکلنے کے تمام امکانات مفقود ہو چکے تھے۔ کمرے میں کارخانۂ دوم میں کام کرنے والے خصوصی کمانڈوز بھی موجود تھے۔ تھوڑی دیر بعد بھٹیوں کے کمرے کا دروازہ کھلا اور کارخانۂ چہارم میں کام کرنے والے خصوصی کمانڈوز بھی اندر دھکیل دیے گئے۔ ہم ۴۶۰ افراد اب اس کمرے میں بند موت کا انتظار کر رہے تھے۔ ہمیں بس یہ معلوم نہیں تھا کہ جرمن ہمیں کس طریقے سے موت کے گھاٹ اتاریں گے۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ ہمیں قتل کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں گیس چیمبر میں ہلاک کیا جا سکتا ہے لیکن شاید خصوصی کمانڈوز کو اس طرح مارنا وہ پسند نہ کریں۔ میں نے سوچا' وہ ہمیں مشین گن سے فائر کر کے بھی ہلاک کر سکتے تھے لیکن اس کمرے میں ایسی کوئی کارروائی مناسب نہ ہوتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس عمارت ہی کو دھماکے سے اڑا دیتے۔ اس طرح موت کا یہ کارخانہ بھی تباہ ہو جاتا اور ساتھ ہی ہمارا کام بھی تمام ہو جاتا۔ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ فاسفورس کا بم اس کمرے میں کسی کھڑکی سے پھینک دیتے۔ یہ بھی ہمیں قتل کرنے کا ایک موثر طریقہ تھا۔ جرمنوں نے یہ طریقہ اس سے قبل مالکو کے یہودی باڑے سے آنے والوں کو قتل کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔

میں سوچتا رہا کہ ہم زندہ لاشوں کو مردہ بنانے کے لیے جرمن کیا طریقہ اختیار کر سکتے ہیں' لیکن فوری طور پر میں اس بارے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ اچانک کمرے کا آہنی دروازہ کھلا۔ ایس ایس گارڈز کے انچارج اشٹائن برگ نے دروازے پر آکر چیخ کر کہا "تمام ڈاکٹرز باہر آجائیں۔"

میں اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ باہر آگیا۔ ایس ایس گارڈز نے ہمیں ایک طرف کھڑا کر دیا۔ اشٹائن برگ کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جو اس نے میری طرف بڑھا دیا اور مجھ سے کہا کہ میں اس کاغذ پر لکھے ہوئے نمبروں میں سے اپنا اور اپنے ساتھیوں کے نمبر قلم زد کر دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور کاغذ واپس اشٹائن برگ کو دے دیا۔ اشٹائن برگ نے ایک نظر کاغذ پر ڈالی اور ہم سے کہا کہ ہم اپنے کمرے میں واپس جائیں اور اگلے حکم تک کمرے میں ہی ٹھہریں۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔

اگلے روز لاش بھٹی کے کارخانے کے احاطے میں پانچ ٹرک داخل ہوئے اور انہوں نے اپنا مال فرش پر الٹ دیا۔ یہ مال خصوصی کمانڈوز کی لاشوں پر مشتمل تھا۔ ان لاشوں کو جلانے کے لیے ۳۰ خصوصی کمانڈوز پر مشتمل نیا گروپ ترتیب دے دیا گیا تھا۔ مرنے والے کمانڈوز کی لاشیں بُری طرح جھلسی ہوئی تھیں۔ ان کو شناخت کرنا ممکن نہیں تھا۔

میں اب تک یہاں لوگوں کو.... قتل کرنے کے پانچ طریقوں سے واقف تھا۔ قیدیوں کو زہریلی گیس سے' چتا گھاٹ پر' کلوروفارم کے انجکشنوں سے' گدی میں گولی مار کر اور فاسفورس بموں سے ہلاک کیا جاتا تھا۔ یہ لوگوں کو ہلاک کرنے کا چھٹا.... طریقہ تھا جو سامنے آیا تھا۔

ہمارے ساتھی خصوصی کمانڈوز کو رات کے وقت ایک قریبی جنگل میں لے جا کر انہیں آگ لگانے والے بموں سے ہلاک کیا گیا تھا۔ ہم چار اگر ابھی تک زندہ تھے تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جرمنوں کو ہم سے کوئی ہمدردی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں ابھی ہم سے کچھ اور کام لینے تھے اور اسی لیے انہوں نے ہماری موت کو ملتوی کر دیا تھا۔ ڈاکٹر مینگلے نے ہمیں ایک اور موقع فراہم کیا تھا۔ اس طرح زندہ رہنے پر ہمیں کوئی خوشی نہ تھی۔

غرض اس طرح آش وٹز میں خصوصی کمانڈوز کا تیرہواں گروپ بھی ہلاک کر دیا گیا۔ ایک مرتبہ پھر ہمارے دن خاموشی اور اکتاہٹ اور بددلی کے ساتھ گزرنے لگے۔ ہمارے پاس کوئی کام نہ تھا۔ ہم بس خالی الذہنی کی کیفیت میں اس خونی چار دیواری کے احاطے میں ٹہلتے رہتے۔ ہمیں نہ تو کوئی کام دیا جاتا تھا نہ ہمارے لیے کرنے کا کوئی کام تھا۔ اس عمارت میں ہم صرف چار نفوس باقی رہ گئے تھے۔ وہ تیس افراد جو موت کے اس کارخانے میں کام کرتے تھے وہ خصوصی کمانڈوز میں شامل نہیں تھے۔ انہیں آش وٹز کے کیمپ میں رکھا گیا تھا۔ وہ صرف ان افراد کی لاشیں جلانے روزانہ یہاں آتے تھے جو اسپتال میں دم توڑ دیتے تھے۔

ہم اپنے انجام کا انتظار کر رہے تھے۔ ہماری تنہائی کا عالم یہ تھا کہ مسفیلڈ بھی ہم سے بات کرنے یا ہمارا سامنا کرنے سے کتراتا تھا۔ اس کی تو شخصیت ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ اس کو غالباً یہ احساس ہو گیا تھا کہ اب اس آش وٹز کیمپ میں اس کا کردار ختم ہو گیا ہے اور جلد ہی اس کی قسمت کا بھی فیصلہ ہو جائے گا۔ وہ بس اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ ہر وقت شراب کے نشے میں دُھت رہتا۔ شاید وہ ماضی کو بھولنا اور مستقبل کے خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک دینا چاہتا تھا۔

ایک دن ڈاکٹر مینگلے خلافِ توقع آگیا اور ہمیں تلاش کرتا ہوا ہمارے کمرے میں آگیا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اوپر

سے حکم آیا ہے کہ آش وتز کو مکمل طور پر تباہ کردیا جائے۔ وہ اس وقت اس کیمپ میں موجود انسانوں کی بات نہیں کررہا تھا بلکہ موت دینے والے اس ادارے کی بات کررہا تھا جو آش وتز کیمپ کہلاتا تھا۔ ڈاکٹر مینگلے نے کہا تھا کہ لاش بھٹیوں کے دو کارخانے تباہ کردیے جائیں گے۔ تیسرا کارخانہ اسپتال میں مرنے والوں کی لاشیں جلانے کے لیے کام کرتا رہے گا۔ پوسٹ مارٹم کا کمرہ اور اس کا عملہ یعنی میں اور میرے تینوں ساتھیوں کو کارخانہ چہارم میں منتقل کردیا جائے گا۔ وہی کارخانہ قائم رہے گا۔ پہلا اور دوسرا کارخانہ تباہ کردیا جائے گا۔ جبکہ نمبر تین تو اکتوبر کی بغاوت میں پہلے ہی تباہ ہوچکا تھا۔

یہ ایک تاریخی اور مُسرت کا موقع تھا۔ اگلے روز قیدیوں کی ایک جماعت وہاں آئی اور اس نے دو گروہوں میں تقسیم ہوکر موت کی اس فیکٹری کو ڈھانے کا کام شروع کردیا۔ اس فیکٹری کی دیواریں، یکے بعد دیگرے ڈائنا مائٹ کے دھماکوں سے منہدم ہورہی تھیں۔ یہ جرمنی کی تیسری جموریہ... کی تباہی کی بھی علامت تھی۔ یہودیوں نے اس کارخانے کی دیواریں اٹھائی تھیں، وہی ان دیواروں کو ڈھارہے تھے۔ موت کے ان کارخانوں کو تباہ کرنے کا کام تمام قیدی بڑے جوش و خروش سے کررہے تھے۔ ان کے چہرے امید سے چمک رہے تھے۔

پوسٹ مارٹم کے کمرے کی وہ تمام اشیا جو منتقل کی جاسکتی تھیں، پیک کردی گئی تھیں۔ چیر پھاڑ کی میز کی سنگ مرمر کی سلوں کو منتقل کردیا گیا تھا۔ چند گھنٹوں میں پوسٹ مارٹم کا دوسرا کمرہ کارخانہ چہارم میں قائم ہوگیا تھا اور ہم بھی وہیں منتقل ہوگئے تھے۔

اگلے دس دن کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ ایک شام جبکہ ہم ڈنر کھا رہے تھے، ڈاکٹر مسفیلڈ شراب کے نشے میں دھت لڑکھڑاتا ہوا وہاں آپہنچا اور میز پر دونوں ہاتھ ٹیک کر آگے جھکتے ہوئے کہا "گڈ ایوننگ بجو! میں ایک بات تمہیں بتادوں۔ بہت جلد تم مار دیے جاؤ گے لیکن تمہارے بعد ہماری بھی باری آئے گی، ہم بھی مار دیے جائیں گے۔" ایک شرابی کے منہ سے شراب کے نشے میں ایک حقیقت بیان ہوگئی تھی۔ میرا اندازہ درست ہی تھا۔ ہمارے ساتھ ہمارے جرمن محافظوں کو بھی ختم ہونا تھا۔

میں نے گرم گرم چائے میں گرم رم ملا کر مسفیلڈ کو پیش کی۔ اس نے جلد جلد اسے حلق سے انڈیل لیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس روز مسفیلڈ جیسے سب کچھ اگل دینا چاہتا تھا۔

اس نے ہمیں بتایا کہ اس کی بیوی ایک ہوائی حملے میں مار جاچکی ہے اور اس کا بیٹا روسی محاذ پر لڑ رہا ہے اور پھر اس نے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا "سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔ روسی فوجیں آش وتز سے بمشکل چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں۔ تمام جرمنی فرار ہورہا ہے، ہر شخص سڑکوں پر آگیا ہے۔ ہر شخص بھاگ رہا ہے۔ ہر شخص سرحدی علاقوں کو چھوڑ کر مغرب کی طرف پناہ کے لیے دوڑ رہا ہے۔"

مسفیلڈ کے الفاظ ہمارے لیے بڑے خوش آئند تھے۔ اس کی مایوسی ہمارے لیے امید کی کرن تھی۔ ایک عجیب سی سرخوشی ہم پر طاری تھی۔ پہلی مرتبہ یقین آنے لگا تھا کہ ہم زندہ بچ جائیں گے۔

○☆○

امید و بیم کی اسی کیفیت میں ۱۹۴۵ء کا نیا سال شروع ہوگیا۔ وہ یکم جنوری کی تاریخ تھی۔ ہر چیز برف کی چادر میں لپٹی سورہی تھی۔ میں احاطے میں ٹہل رہا تھا کہ براؤن رنگ کی ایک بڑی گاڑی احاطے میں داخل ہوئی۔ یہ گاڑی قیدیوں کو لانے لے جانے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ اس کے رنگ کی وجہ سے ہم لوگ اسے "براؤن ٹونی" کہا کرتے تھے۔ اس میں سے ایک طویل قامت جرمن افسر ڈاکٹر کلائن اترا۔ وہ عہدے کے لحاظ سے میجر تھا۔ یہ شخص نہایت تند خو، بد مزاج اور ظالم تھا۔ میں نے قواعد کے مطابق اسے سلیوٹ کیا۔ وہ آش وتز کیمپ کی بیرک نمبر دس سے سو افراد کو لے کر آیا تھا۔

کلائن نے کارخانہ چہارم کے ایس ایس گارڈز کے انچارج سے کہا "لو آفیسر، سالِ نو پر تمہارے لیے کچھ کام آیا ہے۔"

انچارج نشے میں دھت تھا، اس کے لیے تو پیروں پر کھڑا ہونا بھی دوبھر ہورہا تھا۔ سالِ نو کے موقعے پر وہ کوئی کام کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ پھر کام بھی انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا۔ میجر کلائن جن ایک سو افراد کو لے کر آیا تھا وہ سب کے سب عیسائی تھے اور پولینڈ کے رہنے والے۔ ایس ایس گارڈز کے انچارج کو بہرحال یہ کام کرنا ہی تھا۔ تمام قیدیوں کو بھٹیوں کے کمرے کے برابر والے خالی کمرے میں لے جایا گیا اور انہیں فوری طور پر لباس اتارنے کا حکم دیا گیا۔ اس دوران کلائن، ایس ایس گارڈز کے انچارج کے ہمراہ احاطے میں ٹہلتا رہا۔

میں جلدی سے اس کمرے میں پہنچا جہاں آنے والے قیدی لباس اتارنے میں مصروف تھے اور پھر میں نے ان سے سوالات شروع کردیے۔ ایک قیدی نے بتایا کہ اس نے کراکاؤ میں اپنے چند عزیزوں کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ گسٹاپو نے اسی لیے اس کو گرفتار کیا تھا۔ اس پر مزاحمتی تحریک کا ساتھ دینے کا الزام تھا۔ اسی الزام میں اس پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا اور اس کو سزائے موت سنادی گئی۔ اس نے بتایا کہ اسے یہاں یہ کہہ کر لایا گیا ہے کہ اب اسے کسی بیگار پر بھیجا جارہا ہے اور اس سے قبل اسے غسل کرنا ہے۔

ایک اور قیدی کو اس بنا پر موت کی سزا دی گئی تھی کہ اس نے بلیک مارکیٹ سے ایک پاؤنڈ مکھن خریدا تھا۔ یہ ایک سنگین جرم تھا کیونکہ اس طرح اس نے افراطِ زر پیدا کرنے میں تعاون کیا تھا جو ایک سنگین جرم تھا۔ ایک اور شخص کو اس لیے موت کی سزا دی گئی تھی کہ وہ علاقۂ ممنوعہ میں جانکلا تھا۔ اس کو مزاحمتی تحریک کا جاسوس قرار دیا گیا تھا۔ اسی قسم کے الزامات باقی لوگوں پر بھی تھے۔

ان دنوں کیونکہ خصوصی کمانڈوز نہیں تھے اس لیے ان قیدیوں کو ہلاک کرکے بھٹیوں میں جلانے کا کام ایس ایس گارڈز نے انجام دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر کلائن وہاں سے روانہ ہوگیا۔ ان قیدیوں کی ہلاکت بہرصورت ۲۷ نومبر کے اس حکم کی خلاف ورزی نہیں تھی جس کے تحت قیدیوں کو ہلاک کرنے پر پابندی عائد کردی گئی تھی۔ آج سو افراد کو کورٹ مارشل کے احکام کے تحت موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

○☆○

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ دن آتے رہے، جاتے رہے۔ آش وتز کا ماحول آہستہ آہستہ تبدیل ہورہا تھا۔ ہر نئے دن کے ساتھ جرمن فوجیوں کے چہروں پر تاریکی چھاتی جارہی تھی۔ بے یقینی سے پیدا ہونے والی وحشت ان کی آنکھوں سے ظاہر تھی۔ ڈاکٹر مینگلے، آش وتز سے فرار ہوگیا تھا اور اس کی جگہ نئے ڈاکٹر نے لے لی تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اب اس کیمپ کو "ZAT KAT" کے بجائے "ورک کیمپ" کا نام دے دیا گیا تھا۔

حُسنِ اتفاق کہ پہلی جنوری کا ایک اخبار میری نظروں سے گزرا۔ اس اخبار سے مجھے روسی فوجوں کی یلغار کے بارے میں معلوم ہوا۔ بھاری توپ خانے کی گولہ باری کی آوازیں آش وتز میں بھی سنائی دیتی تھیں۔ بعض اوقات دھماکے اتنے شدید ہوتے کہ کھڑکیوں اور دروازوں کے پٹ بُری طرح بج اٹھتے اور دیواریں لرز کر رہ جاتیں۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ دھماکوں کی آوازیں شدید ہوتی جارہی تھیں اور قریب آتی جارہی تھیں۔

۱۷ جنوری کو میں جلد ہی بستر پر لیٹ گیا حالانکہ میں تھکا ہوا بھی نہ تھا۔ قریب ہی پتھر کے کوئلے کا اسٹوو جل رہا تھا اور اس کی نرم نرم آنچ اعصاب کے لیے بڑی فرحت بخش تھی۔ نصف شب کے قریب پے در پے، زوردار دھماکوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ فضا میں ہر طرف آگ کی لکیریں پھیل رہی تھیں۔ مشین گنیں تڑاتڑ گولیاں برسا... رہی تھیں، دھماکے ہورہے تھے۔ میں نے دروازوں کے کھلنے، بند ہونے اور دوڑتے قدموں کی آوازیں سنیں۔ میں گھبرا کر اٹھا اور کمرے سے باہر آگیا۔ عجیب منظر میرے سامنے تھا۔ خلافِ معمول بھٹیوں کے کمرے کے دروازے کھلے تھے۔ ایس ایس گارڈ کے کمروں کے دروازے بھی کھلے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جرمن گارڈ بہت عجلت میں اور گھبرا کر بھاگ نکلے ہیں۔ کارخانے کا گیٹ بھی کھلا پڑا تھا۔ کہیں بھی کوئی جرمن گارڈ نظر نہیں آرہا تھا۔ واچ ٹاورز بھی خالی تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے یہاں واچ ٹاورز کو خالی دیکھا تھا۔ میں دوڑتا ہوا واپس آیا۔ اپنے ساتھیوں کو بیدار کیا، انہیں حالات سے آگاہ کیا۔ جلدی جلدی ہم نے کپڑے بدلے، ہم بھی یہاں سے نکل بھاگنے کے لیے تیار تھے۔ ایس ایس گارڈز کے فرار ہونے کے بعد ہم یہاں ایک لمحے کے لیے بھی رکنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہم نے آٹھ مہینے گزارے تھے اور پل پل موت کا انتظار کیا تھا۔ اس کیفیت میں یہ آٹھ مہینے ہمیں آٹھ سال کیا آٹھ صدیاں معلوم ہوتے تھے۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ سردی کے اس شدید موسم کے لیے ہمارے پاس بہترین اور آرام دہ گرم کپڑے تھے۔ سوئٹر، اوور کوٹ، جوتے وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں بہت غنیمت تھیں کیونکہ ان دنوں درجۂ حرارت منفی دس درجے تھا۔ ہم سب نے خوراک کے دو پاؤنڈ والے ڈبے لیے، جیبوں میں دوائیں اور سگریٹیں بھر لیں۔ اب ہم ایک طویل سفر کے لیے تیار تھے۔ موت کی کھائی سے زندگی کی وادی کی طرف سفر کے لیے۔

ہم آزادی کی توقع لیے آش وتز سے نکلے۔ ہمارا رُخ برکناؤ کی طرف تھا۔ وہاں بھی موت کے کارخانے تھے، وہاں بھی زندہ لوگوں کو مار کر اور بھٹیوں میں جلا کر راکھ کردینے والا پورا انتظام موجود تھا۔ اس سمت آسمان روشن تھا۔ شاید برکناؤ کا موت کا کارخانہ بھی جل رہا تھا۔

بھٹیوں والے کمرے کے سامنے سے ہوتے ہوئے ہم اس کمرے کے سامنے سے گزرے جس میں سونا ذخیرہ کیا جاتا

تھا۔ اس کمرے میں اب بھی سونے سے بھرے ہوئے صندوق رکھے تھے لیکن ہمیں اس دولت اور اس سونے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انسان کی زندگی جب داؤ پر لگی ہو تو دنیا کی ہر دولت اس کے لیے ہیچ ہوجاتی ہے۔ زندگی اور آزادی سے زیادہ قیمتی کوئی شے نہیں۔

ہم مین گیٹ سے بھی گزر گئے۔ آج ہمیں کوئی روکنے والا نہ تھا' آج ہم پر کوئی گولیاں برسانے والا نہ تھا۔ یہ بھی کیسی عجیب تبدیلی تھی۔ چند گھنٹے پہلے ہم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ ہم برکناؤ کے چھوٹے سے جنگل سے اسی راستے سے گزر رہے تھے جس راستے سے گزر کر لاکھوں افراد موت کے منہ میں پہنچ چکے تھے لیکن ہم زندگی کی طرف جارہے تھے۔

ہمارا خیال درست ثابت ہوا۔ برکناؤ جل رہا تھا' ایس ایس گارڈ کے کمرے' جن میں اس عقوبتی کیمپ کا ریکارڈ موجود تھا' جل رہے تھے۔ ان سے آگ کے شعلے بلند ہورہے تھے۔ برکناؤ کیمپ کے گیٹ کے سامنے کوئی تین ہزار افراد جمع تھے' وہ شاید روانگی کے حکم کے منتظر تھے۔ میں بے دھڑک ان لوگوں میں شامل ہوگیا۔ یہاں کوئی شخص مجھ سے واقف نہ تھا۔ اب میں خصوصی کمانڈوز کے دستے کا رکن نہیں تھا' اب میں موت کے کارخانوں کے خونی رازوں کا امین نہیں تھا اس لیے اب میں موت کا حق دار بھی نہیں رہا تھا۔ یہاں میں بس ایک عقوبتی کیمپ کا قیدی تھا۔ موجودہ حالات میں میرے لیے یہی بہترین موقع تھا۔ میرے ساتھیوں نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا تھا۔ ہر شخص برکناؤ سے فرار ہورہا تھا۔ تاہم میرا خیال تھا کہ وہ لوگ ہمیں شاید زیادہ دور نہ لے جاسکیں۔ دو ایک دن میں روسی فوجیں ہمیں آلیں گی لیکن ایسا وقت آنے سے پہلے ہی ایس ایس فوجی ہمیں چھوڑ کر بھاگ لیں گے۔ فی الحال ہمارے لیے بہتر یہی تھا کہ دونوں فوجوں کے درمیان سے گزرتے چلے جائیں۔

رات کا ایک بج چکا تھا۔ آخری ایس ایس گارڈ بھی کیمپ چھوڑ کر جاچکا تھا۔ آخری گارڈ نے آہنی گیٹ بند کرکے مین سوئچ بورڈ سے بجلی کی سپلائی منقطع کردی تھی۔ برکناؤ کا وسیع و عریض عقوبتی کیمپ تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ یہ کیمپ بھی لاکھوں انسان کا مرگھٹ تھا' ایک قبرستان تھا۔ ایسا قبرستان جس میں ایک قبر بھی نہیں تھی۔

ایس ایس گارڈز ایک کمپنی ہمیں اپنے گھیرے میں لے کر چل رہی تھی۔ ہم اپنے نئے ساتھیوں سے گفتگو کررہے تھے' اپنے بارے میں بتارہے تھے ان کی کہانیاں سن رہے تھے۔ ہم سب کی کہانیاں ایک جیسی ہی تھیں۔ المناک اور بھیانک۔ ہمارے ساتھ ہماری بے یقینی بھی چل رہی تھی۔ ہوسکتا تھا کہ ایس ایس گارڈز ہمیں کسی نئے قید خانے تک پہنچانے میں کامیاب ہوجائیں یا راستے میں ہی ہمیں چھوڑ بھاگیں۔

ہم نے ۵ کلومیٹر کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ بائیں پہلو سے زبردست فائرنگ شروع ہوگئی۔ ہم پر سب مشین گن سے فائرنگ ہورہی تھی۔ انہیں ہلکے ٹینک کی مدد بھی حاصل تھی۔ ایس ایس گارڈز نے جواباً فائرنگ شروع کردی اور ہم سے زمین پر لیٹ جانے کے لیے کہا۔ ہم پیٹ کے بل کھسکتے ہوئے سڑک کے دونوں جانب بنی ہوئی خندقوں میں اتر گئے۔ کچھ دیر دونوں طرف سے زبردست فائرنگ ہوتی رہی پھر اچانک فائرنگ کا سلسلہ ختم ہوگیا اور سناٹا پھیل گیا۔ ہم نے پھر اپنا سفر شروع کردیا۔

آہستہ آہستہ اندھیرا چھٹنے لگا اور روشنی ہونے لگی۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم نے ۱۵ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرلیا ہے' اس کے باوجود ہم ابھی تک برف پر ہی چل رہے تھے۔ راستے بھر ہمیں جگہ جگہ برتن' کمبل اور لکڑی کے جوتے بکھرے پڑے ملے جنہیں ہم سے آگے جانے والی خواتین کے قافلے نے غالباً پھینک دیا تھا۔ چند کلومیٹر کا... مزید فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں اور بھی دردناک مناظر دیکھنے کو ملے۔ ہر چالیس' پچاس گز کے بعد سڑک کے کنارے خندقوں میں ایک دو خون میں لتھڑی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ اس کے بعد کئی کلومیٹر تک یہی منظر تھا۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ یہ وہ بدقسمت افراد تھے جو کمزوری اور تھکن کی وجہ سے مزید چل نہیں سکتے تھے اور ایس ایس گارڈز نے ان کی گردن میں گولی مار کر ان کی زندگی کا سفر مختصر کرکے انہیں موت کی وادی میں پہنچادیا تھا۔

اس کا مطلب یہی تھا کہ وحشت اور بربریت اور موت بھی ہماری ہم سفر تھی۔ ہمیں ان سے ابھی تک نجات نہیں ملی تھی۔ ایس ایس گارڈز کو غالباً یہ ہدایت تھی کہ وہ کسی قیدی کو زندہ پیچھے نہ چھوڑیں۔ ان لاشوں کو دیکھ کر ہماری رفتار خود بہ خود تیز ہوگئی۔ ہماری زندگی کا انحصار چلتے رہنے پر ہی تھا۔

کچھ وقت اور گزرا۔ اب خود ہمارے قافلے میں گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جو شخص بھی تھک کر گرتا' لڑکھڑاتا یا بیٹھ جاتا' اس کو مار دیا جاتا۔ پھر وقفے وقفے سے ایسا ہونے لگا۔ دس منٹ نہ گزرتے کہ کوئی نہ کوئی فرد

گولی سے ماردیا جاتا۔

دوپہر کے وقت ہم "چیل سو" پہنچے۔ یہاں ہم نے پہلی مرتبہ قیام کیا۔ ہم نے ایک اسٹیڈیم میں ایک گھنٹا آرام کیا۔ جس کے پاس خوراک تھی اس نے تھوڑا بہت کھایا۔ ایک گھنٹے بعد ہم پھر برف سے ڈھکی ہوئی سڑک پر چل پڑے۔ چلتے چلتے ایک ہفتہ گزر گیا' دو ہفتے گزر گئے۔ ۲۰ دن تک چلتے رہنے کے بعد ہم دو سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے ایک اسٹیشن پر پہنچے۔ اس دوران ہم نے ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ راتوں کو ہم آسمان تلے سخت سردی میں سوتے تھے۔ موسم کی سختیاں جھیلتے ہوئے جب ہم ریٹی بور پہنچے تھے تو صرف دو ہزار نفوس تھے۔ ایک ہزار افراد کو راستے میں گولی سے ہلاک کردیا گیا تھا۔ اسٹیشن پر مال گاڑی ہماری منتظر تھی۔ ٹرین کو دیکھ کر ہماری جان میں جان آئی۔ ہم ڈبوں میں سوار ہوگئے۔

ہم نے وہ رات اسی اسٹیشن پر ڈبوں میں گزاری۔ اگلے روز صبح کے وقت گاڑی میں حرکت ہوئی۔ ٹرین کا یہ سفر بھی پانچ دن کا تھا۔ شدید سردی میں ہمارے ساتھی ہلاک ہوتے رہے۔ آخر ہم ماؤ تھاسن کے عقوبت خانے پہنچ گئے۔ یہی ہماری منزل تھی۔ وہاں ہماری تعداد صرف ۱۵۰۰ رہ گئی تھی۔ باقی جو لوگ ہمارے ساتھ نہیں پہنچ سکے تھے' ان میں سے کئی راستے میں موقع پاکر فرار ہوگئے تھے۔

ماؤ تھاسن کا عقوبت خانہ ایک ایسی پہاڑی پر واقع تھا جس کے دامن میں اسی نام کا ایک شہر آباد تھا۔ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا یہ کارخانہ ایک قلعہ نما شہر تھا۔ اس کی فصیلیں پتھروں سے تعمیر کی گئی تھیں۔ دور سے یہ ازمنۂ وسطیٰ کا کوئی قلعہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ قلعہ چونکہ نیا نیا تعمیر ہوا تھا اس لیے اس کی دیواریں اس حُسن سے محروم تھیں جو قدامت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جرمنی کی تیسری جمہوریہ نے یہ قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ جرمنی نے جب فرانس پر قبضہ کیا تھا تو وہاں سے ۴۰ ہزار ری پبلکن افراد کو پکڑ کر یہاں لایا گیا تھا۔ ان کے علاوہ تقریباً ایک لاکھ یہودی بھی یہاں گرفتار کرکے لائے گئے تھے۔ انہی قیدیوں نے پہاڑ کاٹ کر پتھر تراشے تھے اور انہیں سات کلومیٹر کے فاصلے سے یہاں تک ڈھو کر لائے تھے اور ان پتھروں سے یہ قلعہ تعمیر کیا گیا تھا۔ اس قلعے کے وہ معمار اس کی تعمیر کرتے کرتے مرکھپ گئے تھے۔ انہیں اس کی دیواروں کے اندر قیدیوں کے لیے بنائی جانے والی بیرکوں میں ایک رات بھی گزارنا نصیب نہیں ہوا تھا لیکن اس کے باوجود یہ بیرکیں کبھی غیر آباد نہیں رہی تھیں۔ یورپ کے

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
سردیوں کی طویل راتیں
الوداعیہ دسمبر کی یادگاریں

اولین صفحات — اس پہیلی کی داستان جسے صرف باتوں سے تسخیر و مسمار کیا جاسکتا ہے... ایچ اقبال کے انداز نگارش کا شاہکار نامہ
گرداب — واقعات کے نئے گرداب میں گرفتار کرداروں کا آغاز و انجام اسما قادری کا سلسلہ
جواری — احمد اقبال کے شربار قلم سے ایک جواری کے کھیل کے نت نئے انداز
مغرب کے نرالے انداز — مغرب کی تہذیب اور ماحول کی عکاس جرم اور محبت کی ناقابل فراموش کہانیاں
سرورق کی کہانیاں
پہلی کہانی — رنگ و نور کے اجالوں سے اندھیروں میں بھٹک جانے والوں کی دلچسپ کتھا...
دوسری کہانی — پولیس اور جرائم پیشہ افراد کے گرد گھومتی ایک تیز رفتار پُرتجسس کہانی...
چیں بہ جبیں نکتہ چینی
آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کہتا ہیں

مقبوضہ ممالک میں جرمنوں کے خلاف جدوجہد کرنے والی خفیہ تنظیموں، ملکی فوجوں اور مزاحمتی تحریکوں کے ارکان اور یہودیوں کو گرفتار کرکے یہاں لایا گیا تھا۔ ان کی تعداد ہزاروں اور لاکھوں میں تھی۔ یہاں چند دن گزارنے کے بعد وہ مار کر اور جلا کر راکھ کردیے گئے تھے۔

اور اب ہمارا قافلہ جس کا ہر فرد طویل سفر اور بھوک سے نڈھال اور چور تھا، پہاڑ کی چوٹی پر بنے ہوئے اس قلعے کو جانے والے برف پوش گھومتے ہوئے راستے پر بڑھ رہا تھا، اپنے نئے قید خانے کی طرف جہاں نامعلوم مصائب اور عذاب اس کے منتظر تھے۔ آخر ہم اس عقوبت خانے کے گیٹ پر پہنچ کر قطار بنا کر کھڑے ہوگئے۔ اس وقت شام کا دھندلکا تیزی سے پھیل رہا تھا۔

میں نے اپنے ہم سفر ساتھیوں پر نظر ڈالی۔ آش وٹز کے پوسٹ مارٹم روم میں میرے ساتھ کام کرنے والے چاروں ساتھیوں میں سے مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ فشر کو تو میں نے "پیل سو" کے بعد سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی حالت تو پیل سو پہنچتے پہنچتے ہی غیر ہوگئی تھی۔ وہ شاید وہیں مرکھپ گیا تھا۔ ڈاکٹر کورنزریٹی بور تک ساتھ تھا۔ اس کے بعد وہ بھی نظر نہیں آیا تھا۔ میرا خیال تھا، وہ ٹرین کے سفر کے دوران ہی موقع پاکر فرار ہوگیا تھا۔ رہا ڈاکٹر کوروگ، تو اس کی ذہنی حالت تو آش وٹز میں ہی خراب ہوتی جارہی تھی۔ اسے میں نے اور میرے دوسرے ساتھیوں نے بڑی مشکل سے ڈاکٹر مینگلے اور مسفیلڈ سے بچایا تھا۔ انہیں ذرا سی بھی خبر ہوجاتی کہ کوروک ذہنی طور پر غیر متوازن ہوتا جارہا ہے تو وہیں اس کی زندگی ختم ہوجاتی۔ آش وٹز سے فرار ہوتے وقت اس نے مجھے وصیت کی تھی۔

"نکولس، میرے دوست! تم تو بڑے مضبوط اعصاب کے شخص ہو۔ بلا کی خود اعتمادی ہے تم میں۔ مجھے یقین ہے کہ تم زندہ بچ نکلو گے لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے، میں جانتا ہوں کہ میں زندہ نہیں بچ سکوں گا۔ میں ختم ہوچکا ہوں میرے دوست" میں نے اس کی ہمت بندھانا چاہی تو اس نے مجھے خاموش کردیا "مجھے بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش نہ کرو۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو۔ دیکھو، مجھے معلوم ہے کہ میری بیوی اور بیٹی دونوں گیس چیمبر میں ہلاک ہوچکی ہیں لیکن میں اپنے بارہ برس کے بیٹے کو "کوس زیگ" کے پادریوں میں چھوڑ آیا تھا۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ اگر تم زندہ سلامت اپنے گھر پہنچ جاؤ میرے اس بیٹے کو ان پادریوں سے لے کر اسے اپنے بیٹے کی طرح پالنا۔ وعدہ کرو نکولس، میں جانتا ہوں کہ میں صرف چند دن کا مہمان ہوں۔"

میں نے ڈاکٹر کوروگ سے وعدہ کرلیا تھا اور اس کو نبھانے کا عزم بھی رکھتا تھا۔

ڈاکٹر کوروگ ہمارے ساتھ آش وٹز سے نکلا تھا لیکن وہ پیل سو بھی نہیں پہنچ پایا تھا۔

گیٹ پر ہماری حاضری لی گئی جس کے بعد ہمیں ایک تنگ اور پُرپیچ راستے سے غسل خانوں کی طرف بھیج دیا گیا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ دوسرے کیمپوں سے اور بھی قیدی ہم سے پہلے آچکے ہیں۔ اس چھوٹی سی تنگ جگہ میں کوئی دس ہزار افراد موجود تھے۔ قلعے کی دیواروں میں تیز ہوا اپنا سر پٹخ رہی تھی اور سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ جس پہاڑ پر یہ کیمپ بنایا گیا تھا وہ کوہ الپس کے سلسلے کا آغاز تھا۔ یہاں موسم بہت شدید ہوتا تھا۔ یہاں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ یہاں سے ہمیں چالیس، چالیس افراد کے گروپ میں غسل کے لیے بھیجا جائے گا۔ میں نے حساب لگایا تو اندازہ ہوا کہ سب لوگوں کو غسل کرنے میں تین دن لگ جائیں گے۔

اس کیمپ میں محافظوں کی حیثیت سے خطرناک جرمن قیدیوں کو متعین کیا گیا تھا۔ یہ جرمن قیدی قتل، ڈکیتی جیسے خطرناک جرائم کے ارتکاب میں مختلف جیلوں میں سزا کاٹ رہے تھے اور افرادی قوت کی کمی کی بنا پر انہیں گارڈز کے فرائض سونپے گئے تھے۔ اس روز ان کا کام قیدیوں کو گروپوں کی صورت میں غسل کے لیے بھیجنا تھا۔ وہاں ایک اور بات سامنے آئی۔ قیدیوں میں سب سے پہلے آریائی نسل سے تعلق رکھنے والوں کو غسل کے لیے بھیجا جارہا تھا۔ آریائی نسل کے قیدیوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس فیصلے کے نتیجے میں ہم یہودی قیدیوں کا نمبر تیسرے دن سے پہلے آنا ممکن نہ تھا۔ اس سخت سردی میں دو دن تک یہاں اس حالت میں انتظار کرنا، زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وجہ یہ تھی کہ غسل سے پہلے کوئی قیدی بیرک میں نہیں جاسکتا تھا اور بیرک میں جاکر اپنا اندراج کرائے بغیر کسی کو نہ تو خوراک مل سکتی تھی نہ سونے کے لیے جگہ۔ ہم لوگ جو طویل سفر سے پہلے ہی تھکے ہوئے تھے، جو تھکن اور بھوک سے پہلے ہی نیم جان تھے، غسل کے انتظار میں دو دن کے اندر مر بھی سکتے تھے کیونکہ اس عرصے میں ان کی ٹانگیں بھی جواب دے سکتی تھیں اور نیند کے غلبے سے بھی وہ برف پر گر بھی سکتے تھے اور پھر کبھی ان کو اٹھنا نصیب نہ ہوتا۔ میرے چاروں طرف کوئی ایک سو قیدی تو پہلے ہی برف پر بے ہوش پڑے ہوئے تھے اور کسی کو بھی ان کی کوئی پروا نہ تھی۔ کیونکہ

وہاں تو ہر شخص کو اپنی زندگی بچانے کی فکر تھی۔ ہر شخص خود کو زندہ رکھنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔

میں نے خطرے کو بھانپ لیا اور ایک فیصلہ کرلیا۔ میں لوگوں کے درمیان سے جگہ بناتا زبردستی آگے بڑھتا رہا اور غسل خانوں کی طرف جانے والی سیڑھیوں کے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں کئی محافظ موجود تھے۔ چالیس افراد کا ایک گروپ غسل خانوں کی طرف جانے کے لیے وہاں موجود تھا۔ وہ سب آریائی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ میں محافظوں کے انچارج کے سامنے پہنچا اور بڑے پُراعتماد لہجے میں اس سے کہا "میں آش وٹز سے آنے والے قافلے کا ڈاکٹر ہوں۔ مجھے غسل کے لیے پہلے بھیجا جائے۔"

انچارج نے میرا غور سے سرتاپا جائزہ لیا۔ شاید وہ میرے عمدہ لباس، میرے پُراعتماد لہجے اور جرمن لہجے پر میرے عبور کی وجہ سے متاثر ہوگیا۔ مجھ سے کوئی سوال کیے بغیر اس نے سیڑھیوں پر متعین محافظوں سے کہا "ڈاکٹر کو اندر جانے دو۔"

میں تنہا سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا۔ میں اب فوری طور پر موت سے محفوظ تھا۔ حمام کی گرم ہوا نے میری سرد اور ٹھٹھرتی ہوئی ٹانگوں میں نئی توانائی اور قوت بھردی تھی۔ کئی ہفتوں کے بعد ایسا گرم ماحول جو میسر آیا تھا۔ پھر گرم پانی کے غسل نے میرے اعصاب کو اور بھی سکون بخشا۔ جرمنوں کے خیال میں ہمارے لباس جراثیم سے آلودہ تھے اس لیے انہوں نے مجھ سے میرا اوورکوٹ، سوئیٹر اور تمام دیگر کپڑے لے لیے البتہ جوتے رہنے دیے جو بڑے عمدہ اور اچھے تھے۔ مجھے اپنے گرم اور آرام دہ لباس کے چھن جانے پر افسوس تھا لیکن انہوں نے جوتے چھوڑ دیے تھے، یہی غنیمت تھا۔ سرد موسم اور برف میں جوتے بھی انسان کی زندگی بچانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جوتے پہن کر برہنہ حالت میں ہم یخ بستہ ہوا میں بیرکوں کی طرف روانہ ہوئے۔ شکر ہے کہ یہ راستہ طویل نہ تھا۔ پچاس گز کے فاصلے پر بیرک تھی۔ بیرک نمبر ۳۳ جہاں ہمیں قرنطینہ میں رکھا جاتا تھا۔ وہاں ہمیں قیدیوں والا دھاری دار لباس دیا گیا۔ لباس پہن کر ہم ایک اور شخص کے پاس گئے۔ اس نے ہمیں ایک چوتھائی ڈبل روٹی اور گوشت کی چربی سے بنا ہوا مارجرین دیا اور ایک مگ گرم کافی کا بھی۔ دس دن کے بعد یہ خوراک ہمیں شاہی ضیافت معلوم ہوئی تھی۔ کھانے کے بعد میں بیرک کے ایک دور افتادہ کونے میں پڑ کر سو گیا۔

ہم تین دن تک اسی بیرک میں رہے۔ اس دوران میں ہم سے کوئی کام نہیں لیا گیا۔ خوراک بھی غنیمت تھی، جس کی وجہ سے نئی آزمائشوں اور نئی سختیوں کو جھیلنے کے لیے جسم میں توانائی پیدا ہوگئی تھی۔ بیرک میں قیام کے تیسرے روز ایک جرمن جنرل ایک ایس ایس افسر کے ساتھ وہاں آیا اور اس نے حکم دیا کہ جو قیدی آش وٹز میں کام کرچکے ہیں، وہ آگے آجائیں۔

یہ حکم سن کر خون میری رگوں میں منجمد ہوگیا۔ جرمن ایک نہایت منظم قوم ہیں، ہر کام نہایت قرینے سے کرتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یقیناً ان کے پاس آش وٹز میں کام کرنے والے قیدیوں کی فہرست ہوگی۔ پھر اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر ایسا ہوتا تو وہ ایسے قیدیوں کے نمبر پکارتے۔ جرمنوں کو یقیناً آش وٹز میں کام کرنے والے خصوصی کمانڈوز کی تلاش تھی۔ وہ ان کو ختم کردینا چاہتے تھے کیونکہ یہ کمانڈوز آش وٹز کے موت کے کارخانے میں ہونے والے گھناؤنے اور بھیانک واقعات سے دنیا کو آگاہ کرسکتے تھے۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ یہاں کوئی بھی مجھے نہیں جانتا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں آش وٹز میں خصوصی کمانڈوز کے گروپ میں شامل تھا اس لیے میں خاموشی سے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔ چند سیکنڈ کا یہ عرصہ بہت طویل معلوم ہوا۔ جب کوئی آگے نہ آیا تو جرمن جنرل وہاں سے چلا گیا۔ میں نے ایک اور مرحلہ جیت لیا تھا۔

اسی رات ہمیں ماؤتھاسن ریلوے اسٹیشن لے جایا گیا۔ وہاں ہمیں پھر مال گاڑی میں سوار کردیا گیا۔ ہم سب سات ہزار افراد تھے۔ ہمیں "میلک ان ڈرڈوناؤ" کے عقوبت خانے لے جایا گیا۔ یہ سفر مختصر تھا۔ یہاں قیدیوں کے لیے حالات ماؤتھاسن سے زیادہ بہتر تھے۔ یہ عقوبت خانہ بھی پہاڑ پر بنایا گیا تھا۔ دراصل یہ پہلے ایک جیل تھا جسے بعد میں عقوبت خانے میں تبدیل کردیا گیا تھا۔ یہاں بھی ہزاروں افراد کو قتل کرکے ان کی لاشوں کو جلا کر راکھ کردیا گیا تھا۔ اس عقوبت خانے سے پہاڑ کے دامن میں بہتا ہوا دریائے ڈینیوب بھی نظر آتا تھا۔ وہی دریائے ڈینیوب جو میرے شہر اور میرے ملک سے گزرتا تھا۔ اس دریا کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ ہمارا گھر اب زیادہ دور نہیں ہے۔

○☆○

۱۹۴۵ء کا موسم بہار شروع ہوچکا تھا۔ اپریل کے آغاز کے ساتھ ہی درختوں پر سبز پتے ابھر آئے تھے، کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ دریائے ڈینیوب کے کنارے جو چند ماہ پیشتر سفید برف سے ڈھکے ہوئے تھے، سبز ہوگئے تھے۔ سبز مخملیں گھاس

نے برف کی جگہ لے لی تھی۔ "میلک ان ڈرڈوناؤ" کے عقوبتی کیمپ میں ہمیں آٹھ ہفتے گزر چکے تھے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ کچھ کام نہ کرنے کے باوجود مجھ پر بے حد تھکن اور نقاہت طاری ہوتی جارہی تھی۔ اگر یہ امید نہ ہوتی کہ ہماری رہائی اور آزادی کے دن قریب آچکے ہیں تو شاید میں کبھی کا مرچکا ہوتا لیکن کیا میں زندہ تھا؟

یہاں ہر چیز بکھر رہی تھی، ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ جرمنوں کے تیسری جمہوریہ کی عمارت کی ایک ایک اینٹ اپنی جگہ چھوڑ رہی تھی۔ اس عمارت کے منہدم ہونے کے آثار ہمارے سامنے آرہے تھے۔ شکست خوردہ جرمن فوجیں اس عقوبت خانے کے سامنے سے گزر کر ملک کے اندرونی حصوں کی طرف جاتی نظر آتی تھیں۔ یہ سلسلہ لامتناہی تھا۔ دریائے ڈینیوب کی سطح بلند ہوگئی تھی۔ اس پر تیرتے ہوئے بجرے اور کشتیاں ان شہروں کے باسیوں کو منتقل کرنے میں مصروف تھیں جنہیں خالی کردیا گیا تھا۔ دنیا پر ہزاروں برس حکومت کرنے کا خواب جو نازی جرمنوں نے دیکھا تھا چکنا چور ہوچکا تھا۔ نسلی برتری کے غرور میں مبتلا قوم مایوسی کا شکار تھی۔

۷ اپریل ۱۹۴۵ء کو اس عقوبت خانے کے احاطے کو رات کے وقت روشن رکھنے والی تیز روشنیاں گل رہیں۔ تاریکی اور خاموشی اس عقوبت خانے پر مسلط رہی۔ کیمپ کو خالی کرکے اس کے گیٹ بند کردیے گئے تھے۔ وہاں موجود سات ہزار قیدیوں کو اندرون ملک منتقل کردیا گیا۔ سات روز کے سفر کے بعد ہم "اے بنسی" کے عقوبت خانے پہنچے۔ یہ چوتھا عقوبت خانہ تھا جس کے گیٹ سے میں گزرا تھا۔

یہاں بھی حالات مختلف نہ تھے۔ قیدیوں سے کوئی مشقت نہیں لی جاتی تھی۔ جرمن فوجیوں کا رویّہ بھی بدل گیا تھا۔ ان کے چہرے مایوسی، خوف اور شکست کے احساسات کی زندہ تصویر بن گئے تھے۔ نہ معلوم کس امید پر وہ اب بھی یہ فرائض انجام دے رہے تھے۔

۵ مئی ۱۹۴۵ء کو "اے بنسی" کے واچ ٹاور پر سفید جھنڈا لہرادیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی نازیوں کے غرور کا سرنیچا ہوگیا۔ انہوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ ہٹلر مرچکا تھا۔ صبح نو بجے سورج بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اسی لمحے ایک امریکی لائٹ ٹینک وہاں آیا۔ اس ٹینک پر تین امریکی فوجی سوار تھے۔ انہوں نے اس عقوبتی کیمپ کا قبضہ لے لیا۔

ہم آزاد ہوگئے۔

○☆○

میں نے بیماری کی حالت میں بوجھل دل کے ساتھ اپنے گھر کی طرف واپسی کا سفر شروع کیا۔ یہ سفر انتہائی تکلیف دہ تھا۔ ہر طرف موت اور تباہی کے مناظر پھیلے ہوئے تھے۔ جو شہر کبھی ہنستے بستے تھے، زندگی کی رونقوں سے معمور تھے، اب کھنڈر اور قبرستان بن کر رہ گئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ میں جس گھر کی طرف جارہا ہوں وہ بھی کھنڈر بن گیا ہوگا۔ وہ بالکل خالی ہوگا، بھائیں بھائیں کررہا ہوگا، اس کی ہر چیز لوٹ لی گئی ہوگی۔ وہاں نہ میرے والدین ہوں گے نہ میری بیوی اور بیٹی۔ پھر مجھے اس خالی گھر میں خوفناک اور بھیانک یادوں کے ساتھ زندگی گزارنا ہوگی۔ کیسا اذیت ناک خیال تھا یہ۔ عقوبتی کیمپوں میں خوفناک تجربوں سے گزرنے کے بعد بھیانک تنہائی میں زندگی گزارنا کتنا بڑا عذاب ہوتا، یہ میں ہی جانتا تھا۔

آخر میں اپنے شہر میں، اپنے گھر میں آگیا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا، سوائے درودیوار کے کچھ بھی تو نہ تھا۔ وہ عمارت بھی قیدخانوں جیسی ہی تھی۔ خالی گھر، خالی کمرے، نہ کوئی آواز، نہ دوست، نہ غم گسار۔ بس یادیں تھیں جو میرے سینے میں دفن تھیں۔

مجھے واپس لوٹے کئی ہفتے گزر گئے تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں آتش دان کے سامنے بیٹھا تھا، ہلکی ہلکی آنچ کمرے میں پھیلی ہوئی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں اپنے خوابوں سے چونک اٹھا۔ ابھی میں کرسی سے اٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ میری بیوی اور بیٹی کمرے میں آگئیں۔ وہ دونوں ٹھیک ٹھاک تھیں۔ صحت اچھی تھی۔ چند دن پہلے ہی وہ برگن بیلسن کے عقوبت خانے سے رہا ہوئی تھیں۔ یہ عقوبت خانہ جرمنی کا سب سے بدنام عقوبت خانہ تھا۔ میں نے انہیں اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ وہ بُری طرح بلک رہی تھیں۔ پھر وہ کئی گھنٹے تک عقوبتی کیمپ کے واقعات کو یاد کرکے سسکتی رہیں۔

میرے لیے زندگی پھر بامقصد ہوگئی تھی۔ اب مجھے پھر کسی کے لیے زندہ رہنا تھا۔ ڈاکٹر گوروگ کے بیٹے کو بھی تلاش کرنا تھا لیکن میں نے ایک قسم کھائی تھی۔ اب میں کبھی جراحی کے نشتر کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔

فلمی الف لیلہ

قسط: 222

علی سفیان آفاقی کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ جو نصف صدی سے علم وادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزاول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پروازمیں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر وبلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کردیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید وشنید اورمیل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب وصحافت سے فلمی دنیا تک درازایک داستاں درداستاں سرگزشت

پاکستان اور ہندوستان دو الگ ملک، الگ مذہب، الگ تہذیب اور الگ قومیت کے حامل ہیں اس کے باوجود ہندوستان کی بہت سی رسومات اور روایات ہمارے ملک میں عام ہیں۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی پاکستان کے بہت سے رواج اور رسومات رائج ہیں۔ پاکستانی فلمی صنعت کا تو ہماری حکومت اور خود فلم سازوں نے مل کر تیاپانچا کردیا ہے لیکن ہندوستان کی فلمی صنعت جو بالی وڈ کہلاتی ہے تقسیم ملک کے بعد بے حد ترقی کرچکی ہے۔ جس زمانے میں

ہمارے ملک کی فلمی صنعت میں بدمعاش، جواری اور اسمگلرز جوق درجوق شامل ہورہے تھے بھارتی فلمی صنعت میں تعلیم یافتہ، روشن خیال، ذہین اور تربیت یافتہ افراد مختلف شعبوں سے وابستہ ہورہے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری فلمی صنعت رفتہ رفتہ جاہل ان پڑھ اور جرائم پیشہ لوگوں کے قبضے میں چلی گئی۔ حکومت بھی خاموش تماشا دیکھتی رہی اور فلم اسٹوڈیو کے مالکان بھی دولت کے لالچ میں اس طبقے کو اہمیت دیتے رہے جو روپیہ لگاتے ہوئے فلمی صنعت میں داخل ہوئے تھے۔ تربیت یافتہ، تعلیم یافتہ، ذہین، تجربہ کار اور ہنرمند جنہوں نے پاکستان میں اپنی پُرخلوص اور ان تھک محنت سے بالآخر بھارتی فلمی صنعت کے ہم پلہ نہیں تو اس کے نزدیک پہنچادیا تھا سرمایہ کاروں، تقسیم کاروں اور اسٹوڈیو کے مالکوں کی بے اعتنائی کی وجہ سے اتنی پستی کا شکار ہوئی کہ اب قریب قریب ختم ہی ہوچکی ہے۔ نہ معقول فلم ساز رہے، نہ ہدایت کار، نہ موسیقار، نہ مصنف اور شاعر، اور نہ ہی تربیت یافتہ معاون جو اپنے سینئرز سے سیکھ کر کچھ جگہ حاصل کرلیتے تھے۔ گویا ہندوؤں کے مطابق ہماری فلم کا ''بولو رام'' ہوگیا یعنی اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ہم تو خیر ہر شعبے میں بڑی تیزی سے مسلسل انحطاط کا شکار ہوتے رہے لیکن بھارتی فلمی صنعت نے گزشتہ دنوں اپنی 100 ویں سالگرہ منائی اور بڑی دھوم دھام سے منائی۔ ان کی لاگت اور منافع اب اربوں تک پہنچ گیا ہے۔ بڑی بڑی کارپوریشن کمپنیاں اس صنعت میں سرمایہ کاری کررہی ہیں۔ بالی وڈ کے اداکاروں کے مومی مجسمے لندن کے موم گھر میڈم تساؤ میں نصب کیے جارہے ہیں۔ پہلے راجکپور نے آوارہ کے ذریعے سوویت یونین اور باہر کی دنیا میں ہندوستانی فلموں کو معروف کیا تھا اب ہندوستانی اداکار ہر ملک میں پہچانے جاتے ہیں۔ شاہ رخ خان، یورپ، امریکا، مشرق وسطیٰ، جاپان، ترکی اور چین تک مشہور ہے اور وہ لوگ اس کے پرستار ہیں۔ اس کی فلمیں مختلف زبانوں میں ڈب کرکے پیش کی جاتی ہیں۔ غرضیکہ بالی وڈ اب فلموں کی تعداد اور مقبولیت کے اعتبار سے ہالی وڈ پر بازی لے گیا ہے۔ وجہ ان کا خلوص، محبت اور سب سے بڑھ کر قوم پرستی ہے۔ بدقسمتی سے ہم ان چیزوں سے عاری ہیں۔

اس وقت موضوع بحث فلم اسٹار ہیں۔ اب جبکہ فلمیں اربوں روپے میں بنائی جارہی ہیں تو ان کے معاوضے کروڑوں میں پہنچ گئے ہیں۔ کچھ اسٹار پانچ کروڑ سے 25 کروڑ تک اور فلم کے منافع میں حصہ بھی وصول کرتے ہیں۔ ٹی وی، اشتہارات اور دوسرے پروگراموں کے ذریعے بھی کروڑوں کمارہے ہیں۔ دولت اور خوش حالی کی ریل پیل ہے۔ دنیا کی ہر نعمت انہیں حاصل ہے لیکن......

''خوشی کے ساتھ دنیا میں ہزاروں غم بھی ہوتے ہیں۔'' زر، زن، زمین کو ہمیشہ فساد کی جڑ کہا جاتا ہے لیکن لوگ ان ہی کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس دولت کا کیا کریں گے۔ چند اداکاروں کی معمولی فلاحی کوششوں کے علاوہ یہ کروڑپتی غریبوں اور ضرورت مندوں کے لیے کوئی فلاحی کام بھی نہیں کرتے جبکہ ہالی وڈ اسٹار اور صنعت کار اس معاملے میں اربوں ڈالر فلاحی کاموں پر خرچ کرتے ہیں۔

بات وہیں پہنچ گئی جہاں سے چلی تھی۔ پاکستان میں بھتاخوری، اغوا برائے تاوان جیسے کام اب عام ہوچکے ہیں لیکن بالی وڈ میں بھی اب یہ رواج چل نکلا ہے۔ خدا جانے ان کاموں کا آغاز کہاں سے ہوا تھا۔ پہلے پاکستان سے یا بھارت سے۔ بہرحال یہ تو سچ ہے کہ اسمگلر اور انڈرورلڈ کافی عرصے سے پس پردہ رہ کر فلمی صنعت میں سرمایہ کاری کرتے رہے ہیں اور فلمی اداکار اور فلم ساز ان سے خوف زدہ بھی رہے ہیں۔ لیکن اب یہ معاملہ بڑھ چکا ہے۔ اب فلم اسٹاروں کو بھتے کے لیے پرچیاں اور ٹیلی فون پر دھمکیاں دینا معمول بنتا جارہا ہے جس سے پریشان ہوکر ممبئی کے بڑے بڑے فلم اسٹار دبئی میں شاندار محلات خرید رہے ہیں اور وہاں منتقل ہورہے ہیں۔ اب تک امیتابھ بچن، شاہ رخ خان، سلمان خان، کپور خاندان اور دوسرے کئی بڑے فلم اسٹار اس خوف سے دبئی میں رہائش اختیار کررہے ہیں کہ جان ہے تو جہان ہے۔ دبئی میں رہائش کا یہ مقصد ہے کہ فلموں کی شوٹنگ یا تو باہر کہیں ہوگی یا پھر ممبئی میں ہوگی تو یہ لوگ فلموں کی شوٹنگ کے لیے خاموشی سے آئیں گے اور کام ختم کرکے چلے جائیں گے مگر رہائش دبئی میں رکھیں گے۔

گزشتہ دنوں بھارتی فلمی صنعت کی 100 ویں سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ بھارتی فلمی صنعت نے ان سو سالوں میں بہت ترقی کی ہے بلکہ قابل رشک ترقی کی ہے۔ ادھر ہمارے نصیب دیکھیے کہ یہاں فلمی صنعت ہی بے نام ونشان ہوکر رہ گئی ہے۔ جو اِکا دُکا فلمیں بنائی بھی جارہی ہیں ان سے فلم انڈسٹری کو بننے میں کتنا عرصہ لگے گا اور آیا ہماری فلمی صنعت میں دوبارہ جان بھی پڑ سکے گی!!

فلم دوپٹا میں سدھیر اور نور جہاں

نہیں، ہم جیسے لوگوں کے لیے یہ ناقابلِ فہم سوال ہیں۔ ہم نے بھی اپنی زندگی کا ایک بڑا اور قیمتی حصہ فلمی دنیا میں گزارہ ہے۔ اس کا قیام، عروج اور زوال سب ہمارے سامنے کی باتیں ہیں۔ اس لیے دل بھی دکھتا ہے اور دوسروں کی ترقی کرتے دیکھ کر ان پر رشک بھی آتا ہے۔ کئی بار سیف الدین سیف مرحوم کے ساتھ کیے گئے ان کے پہلے اور آخری طویل انٹرویو کے دوران میں ان کا المناک لہجہ اور فقرہ بہت یاد آتا ہے۔ وہ قیامِ پاکستان سے بھی پہلے سے فلمی صنعت سے وابستہ تھے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی نغمہ نگار، مصنف، فلم ساز اور ہدایت کار کی حیثیت سے بہت نمایاں کام کیا۔ جس وقت یہ انٹرویو لیا گیا اس وقت پاکستان کی فلمی صنعت بدمعاشوں اور اسمگلروں کے قبضے میں تھی اور پرانے تجربہ کار اور ہنرمند فلمی صنعت سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔

ہم نے سیف صاحب سے دریافت کیا۔ ''آپ نے زندگی کا ایک بڑا حصہ فلمی صنعت میں گزارہ ہے۔ اب کیسا محسوس کرتے ہیں۔''

انہوں نے جواب دیا۔ ''آفاقی صاحب، ایسا لگتا ہے جیسے زندگی رائگاں ہی گئی۔''

اس کے چند ماہ بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ لیکن یہ تو وہ حالات ہیں جو سب کے سامنے ہیں۔ آیئے ہم کچھ پرانی اور خوش کن باتوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس تحریر میں اشتیاق احمد صاحب کا بھی قلیل ذکر ہے۔ اشتیاق صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ مغرب میں تعلیم حاصل کی اور وہاں پڑھایا بھی ہے مگر انہیں ہمیشہ سے پاکستانی فلموں سے بہت دلچسپی رہی ہے۔ انہوں نے اس کے بارے میں کافی تحقیق اور معلومات بھی اکٹھی کی ہیں۔ ہندوستان کی فلمی صنعت کے قیام کو اگر سو سال گزر چکے ہیں تو لاہور کی فلمی صنعت نوزائدہ نہیں ہے۔ لاہور میں پہلی خاموش فلم ''ڈاٹر آف ٹوڈے'' 1924ء میں بنی اور ریلیز ہوئی تھی۔ یہ فلم ریلوے کے ایک افسر کے جی مہتا نے بنائی تھی۔ انہوں نے اس کے لیے لندن سے کیمرا منگایا تھا۔ اے آر کاردار جو دراصل لاہور میں فلمی صنعت کے بانی کہے جاتے ہیں اور ہیں بھی، انہوں مہتا جی کے ساتھ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے طور پر کام کیا تھا۔ اے آر کاردار نے راوی کے کنارے ایک فلم اسٹوڈیو بھی بنایا تھا جو لاہور کا پہلا فلم اسٹوڈیو تھا اور ایک مسلمان نے یہ بنایا تھا۔ اس اسٹوڈیو کی صرف چار دیواری تھی۔ چھت نہیں تھی۔ جس روز دھوپ نکلی ہوتی تھی اس روز یہاں شوٹنگ ہوتی تھی۔ اگر بادل ہوں یا بارش ہوجائے تو شوٹنگ روک دی جاتی تھی۔

کاردار کے دوست ایم اسماعیل جو مصور بھی تھے اور اداکاری میں بھی دلچسپی رکھتے تھے وہ کاردار کے ساتھ تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے پاکستانی فلموں میں بھی کام کیا تھا۔ بہت نفیس، شائستہ اور بااخلاق انسان تھے۔ ہم نئے نئے صحافی بنے اور اسٹوڈیو جانا شروع کیا تو ایم اسماعیل سے ملاقات ہوجاتی تھی اور وہ ابتدائی زمانے کے قصے سنایا کرتے تھے۔ اے آر کاردار نے اس اسٹوڈیو میں جو پہلی فلم بنائی تھی وہ اس کے ہیرو اور ہدایت کار بھی تھے۔ گلزار بیگم اس کی ہیروئن تھیں۔ ایم اسماعیل نے ایک معاون کردار کیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس فلم میں ایک امریکن خاتون آئرس کرافورڈ نے بھی کام کیا تھا۔ لاہور اس وقت ایک خوبصورت اور بڑا شہر بن چکا تھا اور یہاں ہر قوم کے لوگ رہا کرتے تھے جن میں مغربی ملکوں کے لوگ بھی شامل تھے۔ کاردار کی اس فلم کا نام حسن کا ڈاکو عرف مسٹریس ایگل تھا۔ اس زمانے میں۔۔۔ ہر فلم کا ایک انگریزی اور ایک اردو نام ہوتا تھا۔ حسن کا ڈاکو کامیاب فلم ثابت ہوئی مگر اس کے بعد کاردار نے اداکاری بالکل ترک کردی۔ ہدایت کاری اور بعد میں فلم سازی پر پوری توجہ دی۔ اس زمانے میں لاہور کا بمبئی کی بجائے کلکتہ سے تعلق تھا۔ وہیں سے سرمایہ آتا تھا اور لاہور کے فن کار اور ہنرمند بمبئی کی بجائے کلکتہ کا رخ کیا کرتے تھے۔ کاردار کی اگلی فلم سرفروش تھی جس کے ہیرو اس

دور کے خوبصورت اور مقبول ترین اداکار گل حمید تھے۔ سرفروش ایک کامیاب فلم تھی جس کی شہرت بمبئی تک جا پہنچی۔ اس زمانے میں لاہور کی فلمی صنعت نے کلکتہ اور بمبئی کے بعد تیسرے فلمی مرکز کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔

لاہور میں پہلی بولتی فلم بنانے کا شرف بھی اے آر کاردار کو حاصل ہے۔ یہ فلم پنجابی میں بنائی گئی تھی اور ہیر رانجھا کی لوک کہانی پر بنائی گئی تھی۔ یہ فلم کامیاب ثابت ہوئی۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس سے پہلے ہندوستان کی پہلی بولتی فلم "عالم آرا" ایک سال پہلے ہی ریلیز ہوئی تھی جس نے ہمارے ملک میں دھوم مچادی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ دادا بھائی پھالکے اور اردشیر ایرانی کی طرح اے آر کاردار بھی برصغیر کی فلموں کے اہم ستونوں میں شامل ہیں مگر ان دونوں کا نام تو بار بار دہرایا جاتا ہے لیکن اے آر کاردار کی ابتدائی خدمات کا اعتراف نہیں کیا جاتا حالانکہ برصغیر میں صنعت فلم سازی کی تعمیر و ترقی میں اے آر کاردار کا بھی برابر کا حصہ ہے۔ ممکن ہے تعصب کی وجہ سے ایک عظیم مسلمان فلم ساز اور ہدایت کار کو اہمیت نہ دی گئی ہو جو کہ ہندوؤں کی ہمیشہ سے پالیسی رہی ہے۔ پنجاب کی مشہور لوک کہانی جس کی اہمیت رومیو جولیٹ سے کم نہیں ہے اس کو پہلی بار فلمانے اور کامیاب کرانے کا سہرا بھی کاردار ہی کے سر بندھنا چاہیے۔ ہیر رانجھا وارث شاہ کا شاہکار ہے۔ ایک ایسی تخلیق جو لافانی حیثیت اختیار کرچکی ہے رانجھا کا بنسری بجانا اور پھر ہیر کی شادی کسی اور سے ہوجانا "دیوداس" جیسی اہمیت رکھتی ہے۔

ہیر رانجھا، میں مختلف مذاہب کی رسمیں گندھی ہوئی ہیں اسی لیے یہ کہانی ہندو مسلمان اور سکھوں سب کے دل کو لگتی ہے۔ اس میں مذہبی روحانیت بھی ہے اور محبت کی چاشنی بھی۔

اے آر کاردار کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے لاہور میں 1932ء میں ہیر رانجھا دوبارہ بنائی جس نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ہیر رانجھا ایسی کہانی ہے جو ہمیشہ ہر ایک کو بھاتی ہے اور اس کی اہمیت اور دلکشی میں کبھی کوئی کمی نہیں آئی۔ 1970ء میں اعجاز درانی نے رنگین ہیر رانجھا بنائی جس میں موسیقار خواجہ خورشید انور نے ناقابلِ فراموش موسیقی بنائی تھی۔ اس سے پہلے اور بعد میں بھی ہندوستان میں اردو اور پنجابی میں "ہیر رانجھا" بنائی گئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اعجاز درانی اور فردوس نے اس رنگین فلم میں بہت اچھا کام کیا ہے۔ خواجہ خورشید انور کی موسیقی بھلائے نہیں بھولتی۔ مسعود پرویز نے ہدایت کاری میں ایسی ہنرمندی کا مظاہرہ کیا کہ دیکھنے والے یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئے کہ اس پائے اور معیار کی ہیر رانجھا، پہلے کبھی نہیں بنائی گئی۔ مسعود الرحمٰن کی خوبصورت عکاسی نے اس فلم کے حسن میں چار چاند لگادیئے تھے۔ یہ فلم بہترین ٹیم ورک اور ہنرمندی کا ایک شاہکار ہے۔ لیکن ہمارے ملک کے ٹی وی چینلز جو بے ہودہ اور بے مقصد عریاں بھارتی فلمیں دکھاتے رہتے ہیں انہوں نے اس "ہیر رانجھا" کو اتنی اہمیت نہیں دی۔ کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ اس ملکِ خداداد کے لوگوں میں قوم پرستی کا ایسا جذبہ کیوں نہیں ہے جیسا بھارت اور بنگلہ دیش کے عوام میں ہے حالانکہ یہ بھی برصغیر ہی کا ایک حصہ ہیں اور بنگلہ دیش تو کافی عرصے تک مشرقی پاکستان تھا لیکن بھارتی ایجنٹوں اور مقامی ہندوؤں نے وہاں کے بچے مسلمانوں کے دلوں میں ایسا نفرت کا زہر بھرا اور نفرت اور غلط فہمیوں کی آگ بھڑکائی جس کی آنچ میں مجیب الرحمٰن جیسے رہنماؤں نے پاکستان کے دونوں حصوں کو دو ٹکڑے کردیا۔ لیکن مغربی پاکستان کے حکمرانوں اور بیورو کریٹس نے بھی ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی بجائے اپنے طرزِ عمل سے اس آگ کو مزید ہوا دی۔ بھٹو صاحب اور جنرل یحییٰ نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی جب ان کی اکثریتی جماعت کو ملک کا اقتدار سونپنے کی بجائے ملک کو دو ٹکڑے کرنے کے اس عمل کو تیز کردیا۔ جنرل یحییٰ کو تو عیش و عشرت سے فرصت نہیں تھی اور وہ بھٹو صاحب کے اشاروں پر چلتے تھے یہاں تک کہ اکثریت کو اقتدار سپرد کرنے کی جگہ "اُدھر تم اِدھر ہم" کا نعرہ بلند کردیا گیا۔ بہرحال یہ ایک علیحدہ سیاسی تاریخ ہے ورنہ یہ سوچنے کی بات ہے کہ بنگالی جنہوں نے مسلم لیگ کو بنانے اور پاکستان کی تحریک کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا وہ قائداعظم کے پاکستان کو توڑنے پر کیوں مجبور ہوئے؟ مشرقی پاکستانیوں کی اکثریت اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے تو سرگرداں تھی لیکن مجیب الرحمٰن کی منافقت اور سازشوں کا علم نہ تھا۔ وہ پاکستان سے علیحدگی کے حامی نہیں تھے۔ ہمارے بنگالی فلم والوں سے گہرے تعلقات تھے جو اپنے ساتھ ناانصافیوں سے شاکی تو تھے مگر بنگلہ دیش بن جانے کے بعد جب ہم وہاں گئے تو بھی سوگوار اور پشیمان نظر آئے۔ کئی محفلوں میں ان لوگوں نے برملا کہا کہ ہم اپنے حقوق چاہتے تھے، پاکستان سے الگ ہوکر دوسرا ملک

بنانے کا ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

یہ ایک دلگداز اور عبرت انگیز داستان ہے جس سے ہمارے مغربی پاکستان کے حکمرانوں اور سیاستدانوں نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا اور بدستور وہی طرزِ عمل اپنائے ہوئے ہیں۔ اللہ انہیں نیک ہدایت دے اور پاکستان کو ایک مخلص، دیانت دار اور قوم پرست قیادت عطا فرمائے جو اس کو یکجہتی، اتحاد اور ترقی کے راستوں پر گامزن کردے۔ آمین!

یہ قصہ اس لیے درمیان میں آگیا کیونکہ ہم نے یورپ اور امریکا میں ہندوؤں کی قوم پرستی اور پاکستان دشمنی کا مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جن دنوں "ہیر رانجھا" مقبولیت اور بلند معیاری کے نئے ریکارڈ قائم کررہی تھی ہمیں لندن جانے کا موقع ملا۔ وہاں رہائش پذیر پاکستانی بھی بھارتی فلموں کے سحر میں اور ہندوؤں کے اس جھانسے میں آچکے تھے کہ پاکستان میں تو بھارتی فلموں کے چربے بنتے ہیں۔ ان کی بجائے اصل فلمیں کیوں نہ دیکھی جائیں۔ ہر پاکستانی کے گھر میں وڈیو پلیئر موجود تھا جو بڑے شوق سے بھارتی فلموں کے وڈیو لاکر دیکھا کرتے تھے۔ اس میں ہماری حکومتیں بھی برابر کی قصور وار ہیں جنہوں نے مغربی ملکوں میں پاکستانی فلموں کو پسندیدہ اور مقبول بنانے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔ بھارتی سفارت خانے اپنے فن کاروں کو پریس سے ملواتے تھے اور سفارت خانوں میں بھارتی فلموں کی نمائش کی جاتی تھی جنہیں پاکستانی، ہندوستانی اور انگریز بھی دیکھتے تھے۔ جب کوئی بڑا بھارتی اداکار، اداکارہ لندن جاتی تھی تو سفارت خانے کے اطلاعات کے شعبے کا ایک بڑا افسر ان کی امداد کے لیے مقرر کیا جاتا تھا جو انہیں مقامی پریس اور میڈیا سے متعارف کرانے کے لیے پریس کانفرنسیں کرکے ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملادیا کرتے تھے۔ اس کے برعکس پاکستانی فلموں کے پرنٹ اور بڑے بڑے اداکاروں کی انگلستان آمد سے پاکستانی سفارت خانے بے خبر رہتے تھے۔ اگر کسی سہولت کے سلسلے میں سفارت خانے سے رابطہ کیا جائے تو عموماً وہاں کوئی ذمے دار عہدے دار موجود ہی نہ ہوتا تھا۔ چوکیداروں اور معمولی کارندوں سے یہی جواب ملتا تھا کہ فلاں وزیر آئے ہوئے ہیں اس لیے سفیر اور دوسرا عملہ ان کی اور ان کی بیگم کی حاضری میں لگا ہوا ہے۔

ہم جس پاکستانی دوست کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے وہ کٹر پاکستانی اور محبِ وطن تھے۔ عابد شاہ ان کا نام تھا۔ وہ انگلستان میں نمائش کے لیے پاکستانی فلمیں خریدتے تھے مگر سینما گھروں پر ہندوستانیوں کا قبضہ تھا۔ عابد شاہ لندن، برمنگھم اور دوسرے شہروں میں سینما گھر ٹھیکے پر حاصل کرکے پاکستانی فلموں کی نمائش کا اہتمام کرتے تھے۔ لیکن ہندوستانی ان سینماؤں کا رخ تک نہیں کرتے تھے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے عابد شاہ نے بیک وقت دو فلمیں دکھانے کا بندوبست کیا۔ ایک پاکستانی اور ایک ہندوستانی مگر ہندو اپنی فلمیں دیکھ کر سینما سے چلے جاتے تھے۔ عابد شاہ نے پاکستانی فلم کی نمائش پہلے اور ہندوستانی فلم کی نمائش بعد میں کرنے کی ترکیب اپنائی مگر ہندوستانی ان سے زیادہ ہوشیار نکلے۔ وہ پہلے شو کو دیکھنے آتے ہی نہیں تھے۔ جب دوسرے شو میں ہندوستانی فلم دکھائی جاتی تھی تو ہندوستانیوں کا ہجوم اکٹھا ہوجاتا تھا۔

عابد شاہ کی اس وقت تک شادی نہیں ہوئی تھی اس لیے برمنگھم میں ان کا گھر دوستوں کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ ان کی عادت تھی کہ گھر میں موجود ہوتے تو پاکستانی نغموں کی ٹیپ چلایا کرتے تھے۔ گھریلو کام کاج کے لیے ان کے گھر ایک ہندو عورت سرلا آتی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس کا پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ پاکستانی فلم کا ٹیپ اتار کر اپنے بیگ میں سے ہندوستانی فلم کا ٹیپ لگادیتی تھی۔ شاہ جی اس بات کو ناپسند تو کرتے تھے مگر اخلاقاً کچھ کہتے نہیں تھے۔ ہم نے سرلا کی اس حرکت پر ان سے سخت احتجاج کیا اور کہا کہ وہ سرلا کو ایسا کرنے سے منع کیوں نہیں کرتے۔ آخر ایک دن عابد شاہ نے سرلا سے کہا کہ آپ پاکستانی میوزک کیوں نہیں سنتیں؟

اس نے معصومیت سے جواب دیا۔ "شاہ جی، ان گانوں کی زبان اتنی مشکل ہوتی ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

ہم سے نہ رہا گیا۔ ہم نے کہا "دیکھیے زبان تو دونوں ملکوں کی ایک جیسی ہوتی ہے لیکن آپ انڈین گانے سننے کو ترجیح دیتی ہیں۔ آپ یہ گانے سننے کا شوق کہیں اور جاکر پورا کرلیا کریں۔ یہ کیا حرکت ہے کہ ہم اپنی پسند کے گانے سن رہے ہیں اور آپ کسی سے اجازت لیے بغیر اپنی پسند کے گانے لگادیتی ہیں۔"

اس نے کہا۔ "آئندہ ایسا نہیں کروں گی۔" مگر اس کو یہ بات ناگوار گزری اور کام کے دوران میں اس کا منہ پھولا ہی رہا۔

اس کے جانے کے بعد شاہ جی نے ہم سے

کہا۔ ”آفاقی صاحب آپ نے وہ کام کیا ہے جو میں نہیں کرسکتا تھا مگر ایسا نہ ہو کہ یہ میرے ہاں کام کرنا ہی چھوڑ دے۔“

ہم نے کہا ”شاہ جی، آپ یوں تو بڑے محبِ وطن پاکستانی بنتے ہیں مگر ایک ملازمہ کو ناخوش کرنے کے ڈر سے آپ کی پاکستانیت گم ہوجاتی ہے۔ کیا یہاں سرلا کے علاوہ کوئی اور ملازمہ نہیں مل سکتی؟“

شاہ جی چپ ہوگئے۔ دوسرے دن سرلا حسبِ معمول کوئی انڈین گانا گنگناتی ہوئی آگئی مگر اس نے انڈین گانوں کا ٹیپ نہیں لگایا۔ ہم نے شاہ جی سے کہا ”شاہ جی، اس کو اپنی نوکری پیاری ہے مگر آپ کو ملک پیارا نہیں ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔“

شاہ جی کھسیانے سے ہوگئے۔ وہ بھی کہیں سے تلاش کرکے پاکستانی فلموں کے ویڈیو لاتے تھے مگر دکاندار سب ہندو تھے اس لیے ان کے پاس سپرہٹ پاکستانی فلموں کے ویڈیو مشکل ہی ملتے تھے۔ شاہ جی نے ہیر رانجھا کی بہت تعریف سنی تھی۔ اگلے دن ہم ان کے ساتھ بازار گئے تو ویڈیو کی دکان پر بھی چلے گئے۔

دکاندار نے بڑے زوردار انداز میں نمستے کیا۔

ہم نے پوچھا۔ ”آپ کے پاس ”ہیر رانجھا“ کی ویڈیو ہوگی؟“

”کیوں نہیں جی۔ ہم یہاں ویڈیو کا بزنس کرنے کے لیے ہی تو بیٹھے ہیں۔“

پھر اس نے ایک الماری سے ہم کو ویڈیو کیسٹ نکال کر دیا۔ یہ ایک بھارتی فلم کا کیسٹ تھا جو اردو میں بنائی گئی تھی اور حال ہی میں ریلیز ہوئی تھی۔ ہم نے ویڈیو واپس دیتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں پاکستانی فلم ”ہیر رانجھا“ کا ویڈیو چاہیے۔“

وہ حیران ہوکر بولا۔ ”اچھا پاکستان میں بھی کوئی ہیر رانجھا بنی ہے۔ مجھے اس کا پتا نہیں ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”لالہ جی، آپ کی یہ فلم تو گھاس پھوس ہے۔ اصلی ”ہیر رانجھا“ پاکستان ہی میں بنی ہے۔“

وہ نرمی سے بولا۔ ”ناراض نہ ہوں، کسی اور دکان سے پتا کرلیں۔“

ہم نے ویڈیو کی کئی دکانیں چھان ماریں مگر کسی کو پاکستانی ”ہیر رانجھا“ کی خبر تک نہ تھی یا شاید وہ ایسا ظاہر کررہے تھے۔

ہم دکان سے واپس چلے آئے۔ شاہ جی سے ہم نے کہا۔ ”دیکھا شاہ جی، قوم پرستی اور حب الوطنی ایسی ہوتی ہے اور ہمارے پاکستانی گھروں میں بڑے شوق سے انڈین فلمیں دیکھتے ہیں۔“

وہ بے بسی سے بولے۔ ”آفاقی صاحب، اس کا علاج تو یہ ہے کہ یہاں پاکستانی بھی ویڈیو کرائے پر دینے کی دکانیں کھول لیں۔“

ہم نے کہا۔ ”مگر وہ ویڈیو لے گا کون۔ یہاں تو پاکستانیوں کے دماغ میں یہ ڈال دیا گیا ہے کہ ساری پاکستانی فلمیں بھارتی فلموں کا چربہ ہوتی ہیں۔ یہاں کئی پاکستانیوں نے پاکستانی فلمیں نہ دیکھنے کی یہ وجہ ہمیں بتائی ہے۔“ شاہ جی بولے۔ ”بس وہ ان کی باتوں میں آگئے ہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”یہ بات نہیں ہے شاہ جی۔ دراصل ہمارے دلوں میں وطن کی محبت کا جذبہ ہی نہیں ہے۔ ہندو ہماری باتوں میں کیوں نہیں آجاتے؟ یہ ان کی قوم پرستی کا جذبہ ہے جو بدقسمتی سے پاکستانیوں میں نہیں ہے۔“

اس بات کو سالہا سال گزر گئے مگر یہ دکھ ہمارے دل میں تازہ ہے اور یہ زخم ہر بار ہرا ہوجاتا ہے جب آج کل پابندیوں کے بغیر ہندوستانی فلمیں ہمارے سینما گھروں میں لوگ دیکھنے کو ٹوٹے پڑتے ہیں۔ ہمارے ٹی وی چینلز بھی اس نیکی میں برابر کے شریک ہیں۔ کاش کوئی حب الوطنی کا ایسا انجکشن ایجاد ہو جو ہماری قوم کو لگا کر انہیں بھی قوم پرست بنایا جاسکے۔ مگر جہاں حکومت، سیاستدان، علماء، دانشور سبھی دولت کمانے کے چکر میں رہتے ہیں وہاں تو ایسے انجکشن پر پابندی لگادی جائے گی۔ اشتیاق احمد صاحب نے یہ سوال کیا ہے کہ وارث شاہ نے تو اپنے شاہکار کو صرف ”ہیر“ کا نام دیا تھا پھر یہ نام ہیر رانجھا کیسے ہوگیا۔ ایک محقق نے اس کا جواب یہ دیا کہ وارث شاہ نے اس نظم میں عورتوں کی بے بسی اور مظلومیت پر زور دیا ہے جنہیں مرد اپنے مطلب کے مطابق استعمال کرتے رہتے ہیں۔ ان کی یہ داستان گجرات کے جاٹوں سے تعلق رکھتی ہے جہاں کے جاٹ بہت طاقتور اور خودسر ہوتے تھے۔ وارث شاہ مردوں کی ذہنیت کی عکاسی کرنا چاہتے تھے اس لیے اس داستان کا نام صرف ”ہیر“ رکھا تاکہ عورتوں کے جذبات کی ترجمانی بھی ہوسکے کیونکہ مرد عورت ذات کو اپنا محکوم سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ عورت کو بھی اس طرح اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے ہیں جیسے کہ اپنی زمینوں اور مویشیوں کو۔ یہی وجہ ہے کہ آئے دن آج بھی عورتیں مردوں

کی عزت کے سوال پر قتل کردی جاتی ہیں یا ان کے چہروں پر تیزاب پھینک کر انہیں داغدار کردیا جاتا ہے۔ یہ مردوں کا احساسِ برتری اور احساسِ ملکیت نہیں تو اور کیا ہے؟ بہرحال کچھ بھی ہو شاید مردوں نے اپنی اہمیت برقرار رکھنے کے لیے ہیر کے ساتھ رانجھا کا نام بھی نتھی کردیا۔

لاہور کی ابتدائی فلمی صنعت کے قیام میں جن لوگوں نے نمایاں کردار ادا کیا ان میں روپ کے شوری بھی تھے جن کی بنائی ہوئی فلمیں پنجاب سے باہر بھی پسند کی جاتی تھیں۔ ”قسمت کا ہیر پھیر“ جیسی فلموں نے لاہور کی فلموں کو صوبے کے باہر بھی مقبول بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ لاہور کی پنجابی فلمیں پنجاب کے علاوہ کلکتہ، دہلی میں بھی بہت شوق سے دیکھی جاتی تھیں۔

لاہور میں جب فلمی صنعت نے اپنے پاؤں جما لیے ان کامیابیوں کو دیکھ کر سیٹھ پنچولی نے بھی لاہور کی فلمی صنعت کو ترقی دینے میں نمایاں حصہ لیا۔ انہوں نے لاہور میں فلموں کے ساتھ ساتھ سینما گھر بھی بنائے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہندو اور سکھ جو لاہور کی فلمی صنعت پر چھائے ہوئے تھے مشرقی پنجاب اور بمبئی میں بھی پنجابی فلمیں بنانے لگے مگر ان کی تعداد اور منافع بہت کم تھا اس لیے اردو ہندی فلموں کو بہت عروج حاصل ہوا کیونکہ وہ سارے ملک میں دیکھی جاتی تھیں اور پنجابی تو ان کے دلدادہ تھے۔ تقسیم کے بعد پاکستان میں انڈین فلموں کی درآمد پر بندش نہیں تھی اس لیے وہاں کی اردو فلموں کے علاوہ پنجابی فلمیں بھی پاکستان میں لائی جاتی تھیں۔ یہ ہلکی پھلکی رقص و نغمے اور مزاح سے بھرپور ہوتی تھیں اس لیے پاکستان میں بھی پسند کی جاتی تھیں لیکن وہ پہلے والی بات نہ تھی۔ بمبئی کی اردو فلموں میں پنجابی گانے، رقص اور مزاح تو دکھایا جاتا تھا مگر بنیادی طور پر یہ اردو فلمیں تھیں۔ پنجابی زبان کے اس تڑکے کو ہندوستان بھر کے فلم بین پسند کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد علاقائی زبانوں کی فلموں میں سب سے زیادہ نقصان پنجابی فلموں کو اٹھانا پڑا جب بمبئی جاکر لاہور کے فلم سازوں، ہدایت کاروں، موسیقاروں اور ہنرمندوں نے بھی وسیع مارکیٹ کی وجہ سے اردو فلمیں بنانی شروع کردیں۔

پنجاب کے اداکار، مصنف، فلم ساز، ہدایت کار اور موسیقار بمبئی گئے تو اپنے تجربے اور صلاحیتوں کے باعث انہوں نے وہاں بھی بہت کامیابیاں حاصل کیں۔ اے آر کاردار تو پہلے ہی بمبئی جاچکے تھے۔ ان کے بعد بی آر چوپڑہ، رامانند ساگر جیسے لوگوں نے بمبئی میں بہت نام پیدا کیا۔ جہاں تک اداکاری کے شعبے کا تعلق ہے اس میں تقسیم ملک کے بعد سے آج تک پنجابی چھائے ہوئے ہیں۔ آپ کسی بڑے ہیرو یا ہیروئن کا نام لیں فوراً کوئی پنجابی سامنے آجائے گا۔ پنجاب میں داستان گوئی کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے۔ بیٹھکوں میں ہیر وارث شاہ، سسی پنوں، پورن بھگت، سوہنی مہینوال کے قصے بہت شوق سے سنے جاتے تھے۔ جب تھیٹر کا زمانہ تھا تو اس میں بھی پنجابی داستانیں پیش کی جاتی تھیں جو بہت کامیاب بھی ہوتی تھیں۔ پنجاب میں اس قسم کے کردار اور کہانیاں بہت پسند کی جاتی تھیں جن میں پنجابی کلچر اور روایات کی جھلک نظر آئے۔ لوک داستانوں کے علاوہ سچی کہانیاں بھی مشہور ہوجاتی تھیں۔ لاہور میں ایسے انوکھے کردار عموماً دیکھنے میں آئے جیسے شاہ حسین۔ وہ صوفی تھے، شراب پی کر رقص بھی کرتے تھے بلکہ لاہور کی سڑکوں پر بھی رقص کرتے نظر آتے تھے۔ ان کی دوستی یا محبت ایک برہمن زادہ مادھو سے بہت مشہور تھی۔ ان دونوں کی عشق کی داستانیں عام تھیں یہاں تک کہ مرنے کے بعد ان دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا۔ یہ ایک افسانہ لگتا ہے لیکن یہ افسانہ نہیں حقیقی داستان ہے۔ بلھے شاہ ایک اور انوکھے کردار تھے، وہ قصور کے رہنے والے تھے مگر لاہور میں آکر رہنے لگے تھے۔ وہ قادری صوفی تھے۔ انہوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے کلچر کو روحانی رنگ دے دیا تھا۔ بلھے شاہ کے مریدوں اور چاہنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ لاہور اس وقت فنونِ لطیفہ کا مرکز تھا۔ یہاں ناچنے گانے والیوں اور گلوکاروں اور استادوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ یہ رواج مہاراج رنجیت سنگھ کے زمانے میں بہت زور پکڑ گیا چونکہ وہ خود بھی ایک رنگین مزاج اور عیش پسند حکمراں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دور دور سے گانے ناچنے والیوں نے لاہور میں آکر بسیرا کرلیا۔ انگریزوں کو بھی اپنی فوج میں بھرتی کرنے کے لیے مضبوط اور طاقتور پنجابیوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس لحاظ سے انہوں نے پنجاب میں ایکا پیدا کرنے کے لیے اردو زبان کو فروغ دیا تاکہ دوسری زبانیں بولنے سے سب گھل مل جائیں۔ ہندوستان کے کسی شہر اور صوبے میں انگریزی حکومت نے اردو بورڈ قائم نہیں کیا لیکن لاہور میں ہندوستان کا پہلا اردو بورڈ قائم کیا گیا تھا جس کی وجہ سے پنجابی مسلمان، ہندو، پارسی، سکھ سب ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ لاہور میں اس وقت دنیا بھر کی قوموں کے لوگ رہا

صبیحہ اور سنتوش کمار

کرتے تھے۔ لاہور رفتہ رفتہ تعلیم، تہذیب اور ثقافت کا مرکز بن گیا اور دوسرے صوبوں کے لوگوں نے بھی لاہور میں رہائش اختیار کرلی۔ لاہور میں اس وقت مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ہندو اور سکھ چالیس فیصد تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو فوقیت حاصل تھی' دوسرے صوبوں سے .... بنگالی بھی بڑی تعداد میں آکر لاہور میں آباد ہوگئے اور پٹھانوں نے بھی لاہور کا رخ کرلیا کیونکہ یہاں تعلیم و ثقافت کے علاوہ ادب، فنونِ لطیفہ اور تفریح کے مواقع زیادہ تھے .... مسلمانوں نے تھیٹر کمپنیاں بنائی تھیں۔ کئی کمپنیاں شہر شہر گھوم کر تھیٹر دکھاتی تھیں ایک مسلمان پٹھان نے بھی لاہور میں ایک تھیٹر بنایا تھا۔ لاہور کے ہندو اور سکھ بھی ان سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے اور اس طرح ایک مشترکہ تہذیب اور ثقافت نے جنم لیا۔ جگہ جگہ گائیک اور موسیقاروں کی بیٹھک تھی جہاں بڑے بڑے استاد اپنے فن کا مظاہرہ کرتے اور شاگردوں کو تربیت دیا کرتے تھے۔ کئی لوگ رات کو ہیر وارث شاہ سنا کر سب کو مسحور کردیتے تھے۔ قوالی کی محفلیں بھی سجائی جاتی تھیں۔ بزرگوں کے مزاروں پر قوالوں اور سننے والوں کا ہجوم اکٹھا ہوجاتا تھا۔ سڑکوں پر مداری اور جادوگر اپنے کرتب اور تماشے دکھاتے تھے۔ کٹھ پتلیوں کے تماشے بھی ہوا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور کو ثقافت، فنونِ لطیفہ اور کھیل تماشوں کا مرکز کہا جاتا تھا۔ ہندوستان کا کون سا شہر ہے جہاں کا ادیب، شاعر، صحافی، مصنف اور اداکار لاہور میں آکر رہائش پذیر نہ ہوا ہو، اس نے طویل عرصے تک قیام نہیں کیا ہو۔ لاہور کا ایک اپنا ہی حسن تھا جو سارے ہندوستان میں مشہور تھا۔ جب ہم میرٹھ میں پڑھتے تھے تو لاہور کی رنگینی، رعنائی، چہل پہل اور تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں کے قصے سنا کرتے تھے۔ ہمارے ساتھ ایک لاہور کا رہنے والا لڑکا بھی پڑھتا تھا۔ وہ کہا کرتا کہ سفیان، اگر لاہور کسی نے نہیں دیکھا تو سمجھو وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ گویا لاہور کی یہ تعریف اور توصیف کوئی نئی بات نہیں ہے۔ وہ بتاتا کہ مال روڈ پر کتنی رونق ہوتی ہے۔ ہوٹلوں اور ریستورانوں میں ڈانس ہوتا ہے۔ لکشمی چوک پر فلم والوں کی کیسی چہل پہل ہوتی ہے۔ اور نسبت روڈ تو حسینوں کی وجہ سے کسی اور دنیا کا حصہ نظر آتا ہے۔ ہندو اور سکھ لڑکیاں اور خواتین رنگ برنگے لباس اور لہریا دار دوپٹے گلوں میں ڈال کر جب گروہ کی شکل میں ٹہلتی ہیں تو نسبت روڈ پرستان نظر آتا ہے۔ ہم نوعمر تھے، اس عمر میں اس قسم کی دلچسپیوں کا تذکرہ دل پر بہت اثر کرتا ہے۔ اس وقت تو ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ہم بھی کبھی لاہور جائیں گے اور یہ جلوہ گری دیکھیں گے۔ لیکن تقدیر ہمیں 1949ء میں لاہور لے آئی۔ اس وقت ہندو سکھ پریاں یہاں سے رخصت ہوکر انڈیا چلی گئی تھیں۔ اس زمانے میں لاہور ایک لٹے پٹے آتش زدہ اور ویران شہر کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ جب لاہور میں ہندوستان بھر کے مہاجر اکٹھے ہوگئے اور خوشحالی کا دور شروع ہوا تو لاہور کی رعنائیاں ہمیں بھی مسحور کرنے لگیں۔ باغِ جناح، گلستان فاطمہ، شملہ پہاڑی کے گلستان اور حسین مناظر، نوجوانوں کے جمگھٹے۔ اس زمانے میں بے پردہ مسلمان لڑکیاں بہت کم نظر آتی تھیں مگر وہ سیاہ برقعے اس انداز میں پہن کر نکلتی تھیں اور رخِ روشن سے نقاب اٹھا کر چلتی پھرتی نظر آتی تھیں تو واقعی لاہور کے لوگوں کا حسن اور خوبصورتی بہت متاثر کرتا تھا۔ خوبرو گورے یا سانولے رنگ کے گبرو نوجوان اور برقعوں میں جلوے بکھیرتی ہوئی لڑکیاں دیکھ کر ہم ہکا بکا رہ جاتے تھے کیونکہ دہلی، میرٹھ اور دیگر شہروں میں ایسے خوبصورت اور صحت مند چہرے نظر آتے تھے نہ وہ بے تعلقانہ ماحول تھا جو ہمیشہ لاہور کی دلکشی کا باعث رہا ہے۔ مال روڈ کا کمرشل ایریا بہت خوبصورت تھا، چیرنگ کراس سے اپر مال کی طرف جائیں تو مال روڈ کا حسین سبزہ زار، پھول اور خوبصورت درخت دلوں کو کھینچ لیتے تھے۔ مال روڈ واقعی بے حد حسین سڑک تھی۔ جب ہم یورپ گئے اور وہاں کی پُررونق سڑکیں دیکھیں اور موازنہ کیا تو لاہور کی مال روڈ کا

واقعی کوئی جواب نہ تھا۔ ایسی خوبصورت سڑک ہم نے کہیں اور نہیں دیکھی۔ لاہور میں اس وقت بھی ہوٹلوں اور ریستورانوں میں ڈانس ہوا کرتا تھا۔ مال روڈ پر پال ریسٹورنٹ کی چھت پر ہر شام انجیلا کا رقص ہوتا تھا۔ انجیلا ایک بہت خوبصورت اینگلو انڈین لڑکی تھی۔ سارے لاہور میں اس کی دھوم تھی۔ ریلوے کے کلبوں میں تو ایسی محفلیں عام تھیں چونکہ یہاں اینگلو انڈین یا ماڈرن لڑکیوں کی اکثریت تھی۔ پھر جیم خانہ کلب کی محفلیں تھیں۔ نیا سال لاہور میں بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ چڑیا گھر کے سامنے میٹرو ہوٹل کے پچھلے حصے میں بھی ہر شام کیبرے ہوتا تھا۔ عجائب گھر، بھنگیوں کی توپ، مال روڈ کی انگریزوں کے زمانے کی بنائی ہوئی خوبصورت عمارتیں جن میں کچھ اب بھی باقی رہ گئی ہیں۔ مال روڈ پر سبزے اور درختوں نے عجیب سماں باندھا تھا۔ فٹ پاتھ اور سروس روڈ کے درمیان میں گھاس کے سرسبز اور موسم کے پھول ایک عجیب بہار دکھاتے تھے۔ اس وقت انارکلی بازار لاہور کا سب سے مصروف اور بارونق بازار تھا۔ یہاں موٹر کاروں وغیرہ کا داخلہ منع تھا لیکن گاہکوں کا ایک ہجوم ہر وقت موجود رہتا تھا جن میں خریداروں سے زیادہ شوقین لوگ زیادہ ہوتے تھے۔ ہر قسم کے فن کار اور ہنرمندوں نے لاہور کو ٹھکانا بنالیا تھا۔ لاہور شہر کی خوبصورتی اور روایات بھی ایسی تھیں کہ جو ایک بار یہاں آیا پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اگر گیا بھی تو کسی مجبوری سے۔

لاہور کے چٹ پٹے کھانے، چاٹ، سیخ کباب، تکّے اور مختلف قسم کے کھانے اتنے لذیذ اور چٹخارے دار ہوتے ہیں کہ جس نے ایک بار چکھ لیا اس کا دلدادہ ہوگیا۔ لاہور میں کھانوں کے بے شمار ریستوران اور اڈے تھے۔ پان والے، چاٹ والے، کباب والے بہت مشہور تھے۔ بھاٹی گیٹ کی مچھلی اور لسی پینے کے لیے ہر وقت جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ قیامِ پاکستان سے پہلے کے ایک کردار کا قصہ اشتیاق صاحب نے بیان کیا ہے۔ اس کا نام استاد پہلوان تھا۔ یہ چاٹ کی دکان لگاتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ خرید و فروخت کرتے ہوئے فلمی گانے بھی گاتا تھا یہاں تک کہ کلاسیکی گانے بھی سناتا تھا۔ جب وہ خاموش ہوتا تو لوگ اس سے فرمائش کرتے تھے کہ گانا سناؤ۔ اس کے آلو چھولے سارے شہر میں مشہور تھے جیسے مولا بخش کے پان کھانے کے لیے دور دور سے لوگ آتے تھے۔ بعض لوگ اس پر آوازے بھی کستے تھے لیکن وہ مگن ہو کر گاتا گاتا رہتا تھا۔ یہ پاکستان بننے کے فوراً بعد کے واقعات ہیں۔ رفتہ رفتہ لوٹ مار، قتل و غارت اور آتش زدگی کا سلسلہ بند ہوچکا تھا اور مہاجرین کے ساتھ ساتھ لاہور والے بھی نئے حالات کا اپنے آپ کو عادی بنا رہے تھے۔ مال روڈ کی کمرشل مارکیٹ کے ایک کونے میں ایک پہلوان کی دکان تھی۔ یہ خود بھی پہلوان تھے اور ان کی دکان پر نامور پہلوانوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ اس پہلوان کے پان سارے لاہور میں مشہور تھے۔ پہلوان صاحب ہر وقت خاموش رہتے تھے ہم نے کبھی ان کو بولتے نہیں دیکھا بلکہ کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ ان کا خاص انداز یہ تھا کہ جو بھی پان مانگتا تھا پہلوان جی منہ سے ایک لفظ بولے بغیر اپنے ہاتھ سے اس کے منہ میں پان رکھ دیتے تھے۔ اگر خریدار منہ پیچھے کرکے اپنا ہاتھ بڑھائے تو پہلوان جی پان واپس رکھ دیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ سب ہی ان کی اس عادت سے واقف تھے۔ وہ پان کا آرڈر دے کر منہ پھاڑ کر ان کے سامنے کھڑے ہوجاتے تھے۔ خدا جانے وہ گونگے تھے یا جان بوجھ کر خاموش رہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ایک پان فروش گلے میں لکڑی کی ایک کشتی لٹکائے مال روڈ پر گھومتے تھے۔ ان کی آواز بہت پتلی اور زنانہ تھی۔ مگر وہ مستقل "پا کا شوق ہے؟" کی آوازیں لگاتے رہتے تھے۔ یوں تو بہت سے ایسے کیریکٹر تھے لیکن مال روڈ پر اسلحہ کی دکان کے ایک معمر چوکیدار دکان کے سامنے گرمیوں کے موسم میں پانی کے بڑے بڑے گھڑے رکھواتے تھے جن پر سرخ کپڑا پڑا ہوتا تھا۔ ماشکی تھوڑی تھوڑی دیر میں ان گھڑوں کو بھرتا رہتا تھا۔ یہ صاحب ہر پیاسے کو اپنے ہاتھ سے گلاس میں پانی ڈال کر دیتے تھے اور شاید اپنی ساری تنخواہ اسی پر خرچ کردیا کرتے تھے۔ لاہور کے مخصوص کرداروں کے لیے ایک علیحدہ موضوع پر لکھنا ہوگا کیونکہ لاہور واقعی عجوبوں کا شہر تھا۔ آبادی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ کاریں بہت کم نظر آتی تھیں۔ تانگے والوں کا راج تھا مگر انہیں مال روڈ پر آنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ صرف مال روڈ کراس کرسکتے تھے۔ ہر چوک پر لکڑی کے ڈبے نما اسٹول پر ٹریفک کا سپاہی کھڑا ہوتا تھا۔ اگر سائیکل والے کی گھنٹی نہ ہو، لائٹ نہ ہو اور پچھلی جانب سرخ رنگ کی بتی نما چیز نہ ہو تو اس کا چالان ہوجایا کرتا تھا۔

مال روڈ پر ایک ٹریفک کا سپاہی بہت مقبول تھا جسے دیکھ کر لوگ تماشا دیکھنے کھڑے ہوجاتے تھے۔ یہ اپنے دونوں ہاتھوں سے ٹریفک اس طرح کنٹرول کرتا تھا جیسے رقص کر رہا ہو۔

☆☆☆

خیر، یہ تو لاہور کا قصیدہ شروع ہوگیا لیکن اصلی موضوع کچھ اور تھا۔ لاہور کی فلمی صنعت بہت اتھل پتھل ہوچکی تھی۔ اے آر کاردار پہلے ہی بمبئی آچکے تھے جہاں انہوں نے کاردار اسٹوڈیو قائم کیا اور بڑی شاندار اور کامیاب فلمیں بنائیں۔ لاہور میں رہنے والے کاردار کے اسسٹنٹ ایم صادق، بابو صادق، اداکار سریش (جن کا اصلی نام نسیم احمد تھا) اور دوسرے چھوٹے بڑے اداکار لاہور سے رخصت ہوگئے تھے۔ گلوکار محمد رفیع اور شمشاد بیگم بھی بمبئی چلے گئے تھے۔ دیو آنند کے بھائی، میوزک ڈائریکٹر جھنڈے خان، فیروز نظامی، موسیقار جین لعل، بھگت رام، گلوکار، مہندر سنگھ، موسیقار خواجہ خورشید انور، موسیقار خیام اور ونود بھی بمبئی جابسے تھے۔ موسیقار غلام حیدر نے لاہور سے بمبئی جاکر موسیقی کا ایک منفرد انداز متعارف کرایا۔ موسیقار شیام سندر بھی بمبئی چلے گئے۔ شیام سندر نے گاؤں کی گوری، لاہور اور بازار کی بہت خوبصورت موسیقی بنائی۔ موسیقار ونود اور شیام سندر نے بہت خوبصورت موسیقی بنا کر بہت نام پیدا کیا تھا۔ بدقسمتی سے یہ دونوں جوان العمری ہی میں فوت ہوگئے ورنہ بمبئی میں موسیقی کو مزید ترقی دیتے۔ ہدایت کار کیدار شرما، اوم پرکاش، تنویر نقوی اور ڈی این مدھوکر نے لاہور سے اپنے کام کا آغاز کیا تھا، وہ بمبئی چلے گئے۔ مصنف سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، نغمہ نگار قمر جلال آبادی بھی بمبئی چلے گئے تھے مگر پھر سعادت حسن منٹو لاہور آگئے۔ تنویر نقوی اور قمر جلال آبادی بھی لاہور واپس آگئے تھے۔ اس طرح بہت سے لوگ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آگئے۔ 1947ء میں بی آر چوپڑا، آئی ایس جوہر لاہور میں فلم بنانے کی تیاریاں کررہے تھے مگر فسادات کے بعد وہ بمبئی چلے گئے۔ موسیقار او پی نیر جنہوں نے بمبئی جاکر بہت نام پیدا کیا انہوں نے لاہور میں گراموفون کمپنی کے لیے بہت مقبول گانے بنائے تھے جن میں پریتم آن ملو، دکھیا جیا بلائے اور آن ملو شامل ہیں۔ لاہور سے بمبئی چلے گئے۔ وہ 1948ء میں بمبئی گئے تھے جب انہوں نے لاہور کی فضا کو اپنے لیے سازگار نہیں پایا۔ ولین جیون، مصنف راجندر سنگھ بیدی، گیت نگار نقش لائل پوری نے لاہور سے گیت نگاری کا آغاز کیا تھا مگر پھر بمبئی چلے گئے۔ معروف گانے والی بہنیں سریندر کور اور پرکاش کور نے بھی بمبئی کا رخ کرلیا اور بھی کئی غیر مسلم فن کار لاہور چھوڑ کر بمبئی چلے گئے تھے۔

اداکار ہدایت کار فلم ساز نذیر اپنی بیگم اداکارہ سورن لتا کے ساتھ بمبئی سے لاہور آگئے تھے مگر ان کے بھانجے کے آصف بمبئی میں ہی رہے اور وہاں بہت نام کمایا۔ ان کی فلم ''مغلِ اعظم'' کو تو ہندوستان کی سب سے عظیم فلم کہا جاتا ہے۔ کاردار تو بمبئی میں رہ گئے لیکن ان کے بھائی نصرت کاردار لاہور آگئے تھے۔ ثریا اور ان کے گھر والوں نے بمبئی میں رہنے کو ترجیح دی اور بہت عروج حاصل کیا۔ شاعر ساحر لدھیانوی قیامِ پاکستان کے بعد لاہور سے بمبئی چلے گئے تھے جہاں انہوں نے تہلکہ مچادیا۔ موسیقار خورشید انور اور غلام حیدر کچھ عرصے بعد بمبئی سے لاہور لوٹ آئے مگر لاہور میں کافی عرصے تک بھارتی اثرات قائم رہے اور کئی مسلمان اداکاروں نے فلموں کے لیے ہندووانی نام رکھ لیے تھے جن میں موسیٰ رضا اور ان کے بھائی عشرت قابلِ ذکر ہیں۔ موسیٰ رضا سنتوش کمار کے نام سے اور عشرت درپن کے نام سے بہت مشہور ہوئے۔ راج کمار کے ایک ماموں نے مسلمان خاتون سے شادی کی تھی جن کا نام مسز مہرا تھا۔ بہت سے مسلمان فنکار بمبئی ہی میں رہ گئے اور وہاں بہت شہرت اور دولت حاصل کی۔ کئی فن کار لاہور سے بمبئی اور بمبئی سے لاہور آتے جاتے رہے۔ ہدایت کار کے کرشن کمار ہندوستان سے پاکستان آگئے اور کے خورشید کے نام سے یہاں کافی عرصے تک ہدایت کاری کرنے کے بعد بالآخر ہندوستان واپس چلے گئے۔ ہندوستان اور پاکستان کی فلمی صنعت میں پنجابی فنکاروں نے بہت کامیابیاں حاصل کیں۔

1940ء میں لاہور میں اردو فلمیں بھی بننی شروع ہوگئی تھیں۔ خاندان، خزانچی اور داسی بہت کامیاب اردو فلمیں تھیں۔ خاندان کے ہدایت کار شوکت حسین رضوی، ہیرو پران اور ہیروئن نور جہاں تھیں۔ شوکت حسین رضوی اور نور جہاں بھی بمبئی چلے گئے تھے جہاں شوکت صاحب نے زینت، نوکر اور جگنو جیسی فلمیں بنائیں مگر کچھ عرصے بعد وہ بھی لاہور آگئے اور یہاں شاہ نور اسٹوڈیو بنایا اور فلمسازی اور ہدایت کاری بھی کی۔ ہدایت کار اور فلم ساز سبطین فضلی بھی ایک کامیاب فلمی زندگی چھوڑ کر لاہور آگئے تھے۔ ان کے بعد ایس ایم یوسف لاہور آگئے اور انہوں نے یہاں بہت کامیاب فلمیں بنائیں مگر سبطین فضلی اور ان کے بھائی حسنین فضلی کو زیادہ کامیابیاں نہیں ملیں۔ البتہ ان کے بڑے بھائی فضل کریم فضلی نے سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد فلم سازی اور ہدایت کاری شروع کردی۔ چراغ جلتا رہا اور ایسا بھی ہوتا ہے، ان کی مشہور فلمیں ہیں۔ انہوں

نے محمد علی، زیبا، دیبا، کمال ایرانی جیسے فن کار پاکستان کی فلمی صنعت کو عطا کیے۔ مشہور ہدایت کار نجم نقوی بھی پاکستان آگئے تھے۔ انہوں نے کراچی میں پہلی فلم بنائی تھی جس کا نام کنواری بیوہ تھا۔ اس فلم نے شمیم آرا جیسی ہیروئن پاکستان کی فلمی صنعت کو مہیا کی۔ لاہور پاکستان کی فلم سازی کا مرکز بن گیا۔ مگر کراچی سے بہت کامیاب اداکار، ہدایت کار لاہور کی فلمی صنعت میں چار چاند لگانے کے لیے آگئے۔ وحید مراد، زیبا، دیبا، شمیم آرا، پرویز ملک، گیت نگار مسرور انور، حکیم فاضلی، گلوکار احمد رشدی، مسعود رانا، اور کئی فلم ساز ہدایت کار اور اداکار کراچی ہی کا تحفہ ہیں۔ اس کے بعد جب مشرقی پاکستان میں اردو فلموں کا آغاز ہوتو شبنم، موسیقار روبن گھوش، شبانہ، مصطفیٰ جیسے فن کار اور سرور بارہ بنکوی جیسے شاعر اور رحمٰن جیسے اداکار بھی لاہور آکر بہیں کے ہورہے۔ شبانہ کے سوا جو بعد میں ڈھاکا چلی گئی تھیں۔ رونا لیلیٰ جیسی گلوکارہ بھی بنگالی تھیں۔ جس وقت تک مشرقی پاکستان قائم رہا ان دونوں علاقوں کے گلوکار ہنر مند، ہدایت کار، فلم ساز اور اداکار بھی لاہور آتے رہے۔ اداکار ندیم رہنے والے تو کراچی کے تھے۔ گلوکاری کا شوق انہیں ڈھاکا لے گیا جہاں فلم ساز وہدایت کار احتشام نے انہیں فلم چکوری میں ہیرو بنادیا اور کامیابیاں ان کے قدم چومنے لگیں۔ احتشام کی بیٹی فرزانہ کی شادی بھی ندیم سے ہوگئی تھی مگر فرزانہ مغربی پاکستان میں کبھی خوش نہیں رہیں۔

ہدایت کار ایم صادق اور نذیر اجمیری ہدایت کار راگنی بھی پاکستان آگئے تھے۔ ہندوستانی فلمی صنعت سے کئی اور فن کار اور ہدایت کار بھی پاکستان آگئے تھے جن میں میڈم نور جہاں اور شوکت حسین رضوی سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ اداکارہ راگنی جو بمبئی چلی گئی تھیں.... اپنے وطن واپس آگئی تھیں۔ اداکارہ شبنم اور اداکارہ نجمہ بھی پاکستان آگئی تھیں۔ ایک فلم میں کام کرنے کے بعد انور کمال پاشا نے شمیم سے شادی کرلی تھی۔ اس عرصے چند پاکستانی فلموں میں کام کرنے کے بعد اداکارہ نجمہ سے فلم ساز اور تقسیم کار باری ملک نے شادی کرلی تھی۔ عام شہریوں کے علاوہ پاکستان اور انڈیا کے مابین بہت سے فن کاروں اور ہنرمندوں نے بھی ایک ملک سے دوسرے ملک میں نقل مکانی کی۔

پاکستان میں فسادات، قتل وخون اور لوٹ مار کے بعد جب امن قائم ہوا تو پاکستان آنے والے اور پاکستان میں رہنے والے فلمی صنعت سے تعلق رکھنے والوں نے لاہور میں ازسرِ نو فلمی صنعت قائم کرنے کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا۔ ہدایت کار لقمان جو بمبئی میں شوکت حسین رضوی کے معاون خصوصی تھے اور بمبئی میں بھی فلم بنا چکے تھے انہوں نے پاکستان آکر پہلے تو شوکت حسین رضوی کی معاونت کی اور پھر بطور ہدایت کار بہت اچھی فلمیں بنائی جن میں ایاز، فرشتہ جیسی فلمیں شامل ہیں۔

پاکستانی صنعت کے نئے جنم کا ہر مرحلہ ہم نے دیکھا ہے۔ نہ سرمایہ تھا نہ مکمل اسٹوڈیو، نہ ہنر مند اور تجربہ کار اداکار۔ لیکن ایک جذبہ تھا جس نے فلمی صنعت سے وابستہ لوگوں کو حوصلہ دیا تھا۔ پاکستانیوں میں جذبہ شدت اختیار کرگیا تھا کہ چاہے روکھی سوکھی کھائیں، یا پیٹ پر پتھر باندھیں لیکن پاکستانی فلمی صنعت کو بھارتی فلموں کے ہم پلہ بنائیں۔ اس بارے میں تفصیلات پہلے بھی کئی بار بیان کی جاچکی ہیں۔ لیکن پاکستانی حوصلہ مندوں کی کوششیں رنگ لائیں۔ بھارت سے مقامی فلموں کو تحفظ دینے کے لیے چھوٹی سی بے آسرا صنعت نے ان کی بندش کے خلاف ایک طویل مہم چلائی جو بالآخر ایوب خان کے دورِ حکومت میں ان کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے بھارتی فلموں کی درآمد پر پابندی عائد کردی گئی۔ یہ ایوب خان کا پاکستان کی فلمی صنعت پر بہت بڑا احسان تھا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ سیاستداں اور عوامی نمائندوں نے قومی صنعت کی بھلائی کے لیے کوئی کام نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس بھارتی فلموں کے تقسیم کاروں کے دباؤ اور انہیں مخالف طریقوں سے خوش کرنے کے لیے روڑے اٹکائے گئے۔ ڈھاکا میں اسمبلی کا اجلاس ہوا تو ڈسٹری بیوٹرز نے ایم این اے صاحبان کی بیگمات کو شاپنگ کے لیے کلکتہ بھیج دیا۔ اس وقت تک مشرقی پاکستان اور کلکتہ کے مابین آمدورفت عام تھی۔ پاکستان میں فلمی صنعت کے تحفظ کے لیے دو شخصیات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ایک ڈبلیو زیڈ احمد جنہوں نے پونا میں اپنا اسٹوڈیو اور بے انتہا نقصان اٹھانے کے باوجود لاہور کا رخ کیا تھا اور اس مہم کو ان کی قیادت کے بغیر کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی تھی، دوسری شخصیت صدر ایوب خان کی ہے جنہوں نے فلم والوں کے لاہور سے اسلام آباد کے مارچ کے بعد اپنے وزیرِ قانون خورشید صاحب کو بھارتی بندش کے لیے قانون سازی کی ہدایت کی گئی۔ یہ قانون بن گیا۔ بھارتی فلموں کی درآمد اور نمائش پر پابندی عائد کردی گئی جو آج بھی ہمارے آئین کا حصہ ہے لیکن آج بھارت سے غیر قانونی طور پر

فلموں کی کھلم کھلا نمائش جاری ہے لیکن نہ تو فلم سنسر بورڈ نے اور نہ ہی متعلقہ محکموں نے اس آئین شکنی کا کوئی نوٹس لیا۔ پاکستانی فلمی صنعت حکومت کی بے حسی اور لاتعلقی کے باعث تقریباً ختم ہوچکی ہے۔ اب اگر کچھ حوصلہ مند افراد پاکستان میں فلمیں بنانے کی کوشش کررہے ہیں تو ان کی حوصلہ شکنی کی جارہی ہے۔ حکومت کی اس پالیسی کو مرے کو مارے شاہ مدار، ہی کہا جاسکتا ہے۔

فلم والوں نے حکومت کے تعاون اور امداد کے بغیر ہی فلمی صنعت کو ترقی دی اور ایک وقت ایسا آیا جب پاکستان میں 125 فلمیں سالانہ بنائی جاتی تھیں اور ڈیڑھ سو کے قریب فلمیں زیرِ تکمیل رہتی تھیں۔ پاکستانی فلموں کے معیار میں اضافہ ہوا۔ سیکڑوں نئے سینما گھر تعمیر ہوئے۔ فلمی صنعت سے وابستہ لوگوں کو روزگار ملا اور خوشحالی آئی۔ لاکھوں افراد فلمی صنعت کی وجہ سے روزگار سے لگ گئے اور ان کے خاندانوں کو بھی خوشحالی سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا لیکن ایک بار پھر حکومت کی بے پروائی اور افسروں کی بدعنوانیوں کے باعث پاکستان کی ترقی پذیر فلمی صنعت کا آج نام ونشان تک نہیں ہے۔ اسمگلرز، بدمعاش، جاہل جرائم پیشہ لوگ، قماربازی کے اڈوں کے مالکوں نے اپنی دولت کے بل پر پاکستان کی فلمی صنعت کو تہس نہس کردیا۔ اس قدر جاہلانہ اور غیر مہذب ماحول ہوگیا کہ تجربہ کار تعلیم یافتہ اور قابل افراد ایک ایک کرکے فلمی صنعت سے کنارہ کش ہوگئے اور سالہا سال کی جدوجہد خاک میں مل گئی۔

جن دنوں فلمی صنعت عروج پر تھی تو بے شمار تعلیم یافتہ اداکار و فلم ساز اور ہدایت کار بھی تربیت پاکر فلموں کے معیار کو بہتر بنانے میں مصروف ہوگئے۔ تعلیم یافتہ اور اچھے گھرانوں کے لڑکے اور لڑکیاں بھی فلمی صنعت سے وابستہ ہوگئے جن کی فلموں نے ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی مقبولیت حاصل کی اور انہیں ڈب کرکے روس، چین اور دوسرے ممالک میں ان کی نمائش کی گئی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حکومت کا اس ترقی میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ نہ کوئی پالیسی تھی نہ منصوبہ بندی۔ اس طرح یہ سنہری باب بند ہوگیا۔ حکمران... آج بھی فلمی صنعت سے بے تعلق ہیں اس کے برعکس انڈیا میں حکومت اور بڑے بڑے تجارتی اداروں نے فلمی صنعت کو دنیا کی سب سے بڑی فلمی صنعت بنادیا۔ بھارتی اپنی فلم صنعت پر فخر کرتے ہیں اور ان فلموں کی بدولت بھارتی ثقافت، سیاست اور مذہب کو دنیا بھر میں فروغ حاصل ہورہا ہے۔ فلم اپنے ملک، تہذیب وتمدن، نظریات کو دنیا بھر میں متعارف کراتی ہے اور ان کا اندازسے پراپیگنڈا کرتی ہے۔ سوویت یونین کو توڑنے میں بالی وڈ کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ دنیا بھر میں امریکی کلچر اور زندگی کو عام کرنے میں بھی فلموں نے مفید کام کیا ہے۔ بھارتی فلمیں دنیا بھر میں اپنے ملک کی شناخت بنارہی ہیں اور اپنے ملک کا کلچر، مذہب اور نظریات کو عام کررہی ہیں مگر ہمارے حکمران اور نوکر شاہی کے نزدیک یہ سب فضول باتیں ہیں۔

☆☆☆

مصطفیٰ قریشی یوں تو سندھی ہیں لیکن سندھی کے علاوہ اردو اور پنجابی بھی ایسے نستعلیق لہجے میں بولتے ہیں کہ ان پر اہل زبان کا گمان گزرتا۔

مصطفیٰ قریشی نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ کے تمام اہم شعبوں میں ا... کرچکے ہیں۔ سندھ یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد وہ ریڈیو پاکستان، حیدرآباد سے منسلک ہوگئے۔ یہیں ان کی ملاقات محمد علی سے ہوئی وہ بھی ریڈیو حیدرآباد سے اپنی آواز کا جادو جگاتے تھے اور مختلف کردار اور پروگرام اتنے دلنشین انداز میں کرتے تھے کہ سننے والے ان کے پروگراموں کے منتظر رہا کرتے تھے۔ معروف شاعر حمایت علی شاعر بھی ان دنوں حیدرآباد ہی میں تھے۔ پیشہ تو ان کا درس وتدریس تھا لیکن شاعری میں نام پیدا کرلیا تھا اور مشاعروں میں حصہ لیتے تھے۔ اس طرح یہ تینوں یہیں اکٹھے ہونے کے باعث شناسا اور پھر دوست بن گئے۔ اس وقت ان میں سے شاید کسی کو گمان بھی نہ ہوگا کہ ایک دن وہ تینوں فلمی صنعت سے وابستہ ہوکر بہت نام کمائیں گے۔

محمد علی کو فضل کریم فضلی نے اپنی پہلی فلم چراغ جلتا رہا میں ولن کے کردار میں کاسٹ کیا تو وہ حیدرآباد چھوڑ کر کراچی چلے گئے۔ یہ ایک اصلاحی اور بامقصد فلم تھی۔ فضلی صاحب نئے ہدایت کار تھے لیکن انہوں نے نامور اور پرانے اداکاروں کی جگہ بالکل نئے چہرے منتخب کیے۔ اس فلم میں زیبا اور دیبا نے بھی اداکاری کی تھی اور کمال ایرانی کا تعارف بھی اسی فلم کے ذریعے ہوا تھا۔ فلم تو کاروباری طور پر ناکام ہوگئی مگر اس کا چرچا بہت عرصے تک ہوتا رہا۔ محترمہ فاطمہ جناح بذاتِ خود اس فلم کے پریمئر میں تشریف لائی تھیں۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد انہوں نے پھر کبھی سینما گھر میں قدم نہیں رکھا۔ ان کو رضامند کرنے میں

صاحب کی قابلیت، شرافت اور کارکردگی کا بھی بہت بڑا حصہ تھا۔ فضلی صاحب سول سروس سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ان کے دو بھائی ہندوستان میں فلمی صنعت سے منسلک ہوچکے تھے۔ سبطین فضلی اور حسنین فضلی، یہ دونوں بھائی مل کر فلمیں بناتے تھے اسی لیے ان کے فلم ساز ادارے کا نام فضلی برادرز تھا۔ انہوں نے ہندوستان میں بہت شائستہ اور خوب صورت معاشرتی فلمیں بنائی تھیں جن کا پس منظر اسلامی ہوتا تھا۔ فلمیں بھی بہت اچھی بناتے تھے جو کامیاب بھی ہوتی تھیں۔ اس طرح یہ دونوں بھائی جو بہت منفرد خاندان سے تعلق رکھتے تھے بہت کامیاب ہوئے۔ اس زمانے میں فضل کریم فضلی جو اُن کے بڑے بھائی تھے سول سروس کے سلسلے میں ہندوستان کے شہر شہر اور صوبہ صوبہ خدمات انجام دیتے رہے۔ تخلیقی قوت اور ادب وشاعری سے لگاؤ غالباً انہیں خاندانی وراثت میں ملا تھا۔ فضل کریم فضلی بھی بہت اچھے ادیب اور شاعر تھے۔

قیام پاکستان کے بعد تینوں بھائی پاکستان آگئے۔ سبطین فضلی نے لاہور میں بسیرا کیا۔ حسنین فضلی اور فضل کریم فضلی کراچی میں رہائش پذیر ہوگئے۔ حسنین فضلی نے کراچی میں ایک فلم دعا کے نام سے شروع کی تھی لیکن ان کی وفات کے باعث وہ مکمل نہ ہوسکی اس لیے کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس معیار کی فلم تھی۔

سبطین فضلی نے لاہور میں شاہ نور اسٹوڈیو میں فلم دوپٹا کا آغاز کیا۔ اس فلم میں میڈم نور جہاں ہیروئن تھیں۔ ایک نئے ہیرو وجے کمار کے فلمی نام سے فلم سے وابستہ تھے۔ بمبئی سے آنے کے بعد دوپٹا نور جہاں کی پہلی فلم تھی۔ نور جہاں بھی پہلی بار پاکستان فلم میں جلوہ گر ہورہی تھیں۔ سبطین فضلی ایک نہایت خلیق، فیاض اور ہنرمند شخص تھے۔ انہوں نے اس ابتدائی دور میں بھی ایک بہت اچھی ٹیم اکٹھی کرکے یہ فلم بنائی۔ فضلی صاحب اطمینان سے مرضی کے مطابق کام کرنے کے عادی تھے۔ لاہور میں بھی ان کا یہی دستور تھا۔ باتیں کرنے کے بہت شوقین تھے۔ فضلی صاحب اپنے دفتر میں بیٹھے گپ شپ کررہے ہیں ادھر فلم کا سیٹ اور تمام اداکار تیار ہوکر منتظر بیٹھے ہیں۔ اسسٹنٹ بار بار آکر اطلاع دے رہے ہیں کہ سر شاٹ ریڈی ہے مگر فضلی صاحب باتوں میں مگن ہیں۔ جب شام ہوجاتی تو کہتے شوٹنگ ملتوی کردو۔ یہ سین اب کل فلمائیں گے۔ شاہانہ مزاج کے آرام طلب ہدایت کار تھے مگر بہت اچھے ہدایت کار تھے۔ ان کی فلم دوپٹا جب لاہور میں ریلیز ہوئی تو سینما گھر کے سامنے کی سڑک پر ٹریفک بند ہوگیا۔ ہر شخص فضلی صاحب کی فلم اور نور جہاں کو پاکستانی فلم میں دیکھنے کا آرزومند تھا۔ درحقیقت فضلی صاحب نے ان ابتدائی اور کٹھن دنوں میں بھی ایک شاہکار تخلیق کیا تھا۔ فیروز نظامی اس کے موسیقار اور مشیر کاظمی نغمہ نگار تھے جنہوں نے اس سے پہلے زندگی میں کبھی فلم کے گانے نہیں لکھے تھے لیکن اس فلم کے تقریباً تمام گانے بہت مقبول ہوئے تھے۔ دوپٹا اتنے اعلیٰ معیار کی فلم تھی کہ جب اس کی ہندوستان میں نمائش ہوئی تو مشہور فلمی انگریزی جریدے فلم فیئر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بہت تعریف کی اور ہندوستان کے فلم سازوں کو خبردار کیا کہ Beware pakistani flims are here

(ہوشیار ہوجائیں پاکستانی فلمیں آگئی ہیں)

دیکھیے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہندوستانی فلم بین بھی نور جہاں کی فلم دیکھنے کے لیے سینما گھروں پر ٹوٹ پڑے۔ متعصب ہندو یہ برداشت نہ کرسکے اور کلکتہ میں اس سینما گھر کو جلادیا جہاں دوپٹا چل رہی تھی اور دھمکی دی کہ جو سینما گھر پاکستانی فلم چلائے گا اسے جلا کر راکھ کردیا جائے گا۔ یہ پاکستان کی اعلیٰ ترین فلم کا ہندستان میں حشر ہوا۔ اس طرح ہندوستان میں پاکستانی فلموں کا داخلہ بند ہوگیا۔

ادھر فلم چراغ جلتا رہا تو فلاپ ہوگئی مگر اس کے نئے اداکار مقبول ہوگئے۔ زیبا مقبول ہیروئن بن گئیں۔ دیبا بھی ہیروئن بن گئیں اور محمد علی چند فلموں میں ولن کے کردار کرنے کے بعد اپنی وجاہت، قدوقامت، خوب صورت نقش و نگار اور آواز کی خوبیوں کے باعث ہیرو بن گئے۔ حمایت علی شاعر نے بھی فلم سازوں کے مدعو کرنے پر کراچی کا رخ کیا اور بہت اچھے اور شاعرانہ نغمے لکھے۔ اس طرح وہ بھی دیکھتے ہی دیکھتے فلمی دنیا کے اہم گیت نگار بن گئے۔ کچھ عرصے بعد وہ بھی بوریا بستر سمیٹ کر لاہور پہنچ گئے جہاں نغمہ نگاری کے ساتھ انہوں نے فلم سازی بھی کی اور بہت اچھی فلمیں بنائیں۔

اب ان تینوں میں سے ایک دوست مصطفیٰ قریشی حیدرآباد میں تنہا رہ گئے۔ اس وقت کراچی اور لاہور میں معیاری فلموں کی تخلیق شروع ہوگئی تھی اور کراچی کا ہر ابھرتا ہوا اچھا فنکار، گلوکار لاہور ہی کا رخ کرتا تھا کیونکہ یہ فلمی مرکز تھا اور یہاں بہت زیادہ مواقع تھے۔

مصطفیٰ قریشی نے اپنی اداکاری کا آغاز کراچی میں

1959ء میں ریلیز ہونے والی فلم کا پوسٹر

ایک سندھی فلم میں اداکاری کرکے کیا تھا۔ فلم کا نام پردیسی تھا اور یہ 1958ء میں بنائی گئی تھی۔ انہوں نے بھی دو اور سندھی فلموں میں اداکاری کرنے کے بعد لاہور کا رخ کیا۔ وہ مردانہ وجاہت کا نمونہ تھے۔ دراز قد، مناسب نقش و نگار، بہت پُراثر آواز ان کا سرمایہ تھا۔

لاہور میں رضا میر اور افضل حسین فلم لاکھوں میں ایک بنا رہے تھے جس کا اسکرپٹ معروف شہرت یافتہ مصنف ضیا سرحدی نے لکھا تھا۔ اعجاز اس فلم کے ہیرو تھے۔ شمیم آرا ہیروئن کا کردار ادا کر رہی تھیں۔ اس فلم میں بھی مصطفیٰ قریشی کو ولن کا کردار ہی دیا گیا مگر اپنی شخصیت، آواز اور اداکاری کے انداز سے وہ بھی نمایاں رہے۔ لاکھوں میں ایک، ایک رومانی فلم تھی جس میں ایک ہندوستانی لڑکی اور مسلمان لڑکے کا عشق دکھایا گیا تھا لیکن بہت محتاط انداز میں۔ فلم کی موسیقی نثار بزمی نے بنائی تھی۔ وہ بھی کراچی سے درآمد کیے گئے تھے۔ اس فلم میں شمیم آرا کے رقص بھی تھے مگر وہ اس فن سے شناسا نہیں تھیں مگر شوق اور لگن ایسی تھی کہ ایک کورس ڈانس کی بلاناغہ سولہ سترہ دن تک ایوینیو اسٹوڈیو کی چھت پر ریہرسل ہوتی رہی اور اسکرین پر دیکھنے والے حیران رہ گئے کیونکہ انہوں نے ایک ماہر رقاصہ کے طور پر رقص کیے تھے۔

لاکھوں میں ایک پاکستان کی شاہکار کلاسیکی فلموں میں شمار ہوتی ہے۔ ہر اعتبار سے یہ ایک یادگار فلم تھی۔ ولن کی حیثیت سے مصطفیٰ قریشی نے اپنا کردار اس خوبی سے نبھایا تھا کہ اتنے بڑے اور پرانے فنکاروں کے مقابلے میں انہوں نے بلاجھجک کام کیا اور سب نے ان کو بہت سراہا۔ اس طرح مصطفیٰ قریشی کی فلموں میں آمد ہوئی۔ بعد میں انہوں نے عندلیب، انیلا، بنکاک کا چور، ہانگ کانگ کے شعلے، چوروں کا بادشاہ اور کئی فلموں میں بہت اچھی اداکاری کی۔ اپنی کامیابیوں سے حوصلہ پاکر انہوں نے اپنی ذاتی فلم ندیا کے پار بنائی جس میں محمد علی اور زیبا نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ محمد علی نے اس فلم میں ڈبل رول کیا تھا۔ یہ ایک تاریخی پس منظر کی فلم تھی جس میں مصطفیٰ قریشی نے مشہور گائیک تان سین کا کردار بہت خوبی سے ادا کیا۔ اس کردار کے گیٹ اپ اور اداکاری نے دیکھنے والوں کو بہت متاثر کیا۔ اس طرح مصطفیٰ قریشی نے مختلف قسم کے کردار بہت خوبصورتی سے ادا کیے لیکن بدقسمتی سے یہ فلم کامیاب نہ ہوسکی۔ فلم کی تھیم موسیقی اور گلوکاری تھی۔ مصطفیٰ قریشی نے اس کردار کے ساتھ مکمل انصاف کیا لیکن فلم بینوں کو یہ فلم پسند نہیں آئی۔

جب مصطفیٰ قریشی کی اردو فلمیں پے در پے ناکام ہونے لگیں تو پنجابی فلموں میں قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔ وہ پنجابی فلموں میں زبان اور ماحول سے ناواقفیت کی وجہ سے کام نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن دوستوں کے اصرار پر کمر کس کر میدان میں آگئے۔ اسلم پرویز کے کہنے پر ہدایت کار الطاف نے انہیں فلم چار خون کے پیاسے میں لینے کا فیصلہ کرلیا۔ پنجابی لہجے میں مکالمے بولنا ان کے لیے مشکل تو تھا لیکن انہوں نے اس پر عبور حاصل کرنے کے لیے بہت محنت کی۔ یہ ان کی پہلی پنجابی فلم تھی۔

اس زمانے میں سلطان راہی پنجابی فلموں کے بے تاج بادشاہ تھے۔ ہدایت کار یونس ملک نے فلم مولا جٹ کا آغاز کیا تو ایک انتہائی اہم کردار میں مصطفیٰ قریشی کو سلطان راہی کے ساتھ کاسٹ کرلیا۔ فلم میں دونوں کردار اہم تھے مگر مولا جٹ مرکزی کردار تھا اور سلطان راہی کے سوا کوئی اور یہ کردار ادا کرنے کے لیے موزوں نہیں تھا۔ مصطفیٰ قریشی کے لیے یہ ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔ یوں سمجھ لیجیے کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑنے لگے مگر قریشی کو خود پر اعتماد تھا۔

فلم کی ریہرسلوں میں انہوں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ سلطان راہی اونچی اور گرجدار آواز میں مکالمے بولنے کے عادی ہیں۔ اس فلم میں انہوں نے نوری نت کا کردار ادا کیا تھا۔ اپنی ذہانت کی وجہ سے انہوں نے سوچا کہ اگر وہ بھی سلطان راہی کے انداز میں بلند آواز سے مکالمے ادا کریں گے تو شاید کامیاب نہ ہوسکیں اس لیے انہوں نے ہدایت کار یونس ملک سے مشورہ کرکے یہ فیصلہ کیا کہ سلطان راہی کی گرج دار آواز کے مقابلے میں وہ آہستگی اور نرمی سے مکالمے ادا کریں گے۔ یونس ملک نے جب ان سے ان کے انداز میں مکالمے سنے تو خوشی سے اچھل پڑے۔ فلم کی شوٹنگ کا آغاز ہوا تو مصطفیٰ قریشی نے مکالموں کی ادائیگی کا ایک نیا انداز اپنایا اور دھیمی آواز میں اس طرح مکالمے بولے کہ کئی مناظر میں سلطان راہی کو بوکھلا دیا۔ ایک تکیہ کلام بھی انہوں نے اختیار کرلیا مثلاً نواں آیا اے سوہنیو۔ ان کا یہ انداز اور تکیہ کلام بے حد مقبول ہوا۔ یہ ایک انوکھا انداز تھا اور پنجابی فلموں کی زوردار بلند آواز مکالموں کے مقابلے میں اس کی مقبولیت اور زیادہ بڑھ گئی۔ مولا جٹ نے نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا بھر میں دھوم مچادی۔ کئی انگریز تبصرہ نگاروں نے پاکستانی نقادوں کے مقابلے میں اس فلم کی تھیم، اداکاری اور انداز کو بہت سراہا۔ ایک انگریز خاتون کا مضمون بھی ہم پیش کرچکے ہیں جو اس فلم کی دلدادہ تھیں اور کئی بار انہوں نے اس فلم کو دیکھا۔ پاکستانی نقادوں کا یہ اعتراض کہ اکیلا مولا جٹ اتنے بہت سے آدمیوں کو ہلاک کرکے فتح کیسے حاصل کرسکتا ہے۔ خاتون صحافی نے لکھا کہ یہ اعتراض کرنے والوں نے شاید ریمبو کی فلمیں نہیں دیکھیں جوتن تنہا پوری دشمن فوج کا خاتمہ کردیتا ہے۔

مولا جٹ کے بارے میں اتنی بحث ہوئی کہ پنجابی فلمیں نہ دیکھنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی اسے دیکھنے پر مجبور ہوگئے۔ اس فلم کی کامیابی میں ان کے دھیمے لہجے اور مکالموں کی ادائیگی کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا جسے ہر ایک نے سراہا۔

فلم مولا جٹ نے ڈائمنڈ جوبلی منائی اور کروڑوں روپے کا بزنس کیا جو کہ ایک مثال تھی۔ لاہور کے مختلف سینماؤں میں یہ فلم باری باری ڈھائی سال تک چلتی رہی جو کہ ایک ریکارڈ ہے جسے کوئی اور پاکستانی فلم نہ توڑ سکی۔

مصطفیٰ قریشی اب کامیابیوں اور مقبولیت کے جھولے پر سوار تھے۔ ان کی خود اعتمادی میں بے انتہا اضافہ ہوگیا تھا۔ فلم ساز اور ہدایت کار بھی ان کے بغیر فلم کو ناکام سمجھتے تھے۔ سلطان راہی اور مصطفیٰ قریشی کی جوڑی پنجابی فلموں میں ناگزیر سمجھی جانے لگی لیکن ابھی ایک اور کامیابی مصطفیٰ قریشی کی منتظر تھی۔

مولا جٹ کی کامیابی کے بعد پنجابی فلم بشیرخان بنائی گئی۔ اس فلم میں ہیرو اقبال حسن تھے اور مصطفیٰ قریشی نے ایک پولیس افسر کا کردار بہت خوب صورتی سے نبھایا تھا۔ انجمن کے رقص اور فلم کی موسیقی کا بھی اس کی بے پناہ کامیابی میں نمایاں حصہ ہے۔ اس طرح مصطفیٰ قریشی جو پنجابی فلموں میں کام کرتے ہوئے جھجکتے تھے پنجابی کے نامور اداکار بن گئے۔ سلطان راہی کے ساتھ مصطفیٰ قریشی کو کاسٹ میں شامل کرنا فلم سازوں کی ضرورت بن گئی۔ سلطان راہی کے ساتھ انہوں نے ڈھائی تین سو پنجابی فلموں میں کام کیا جن میں سے بیشتر کامیاب ہوئیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل لگنے لگے تھے۔

سلطان راہی کے اچانک پُراسرار قتل کے بعد پنجابی فلمیں زوال کا شکار ہوگئیں۔ مصطفیٰ قریشی بھی اپنے دوست اور ساتھی کی کمی شدت سے محسوس کرتے تھے مگر وہ اردو اور پنجابی فلموں میں کام کرتے رہے۔ ہماری فلم آبرو میں بھی انہوں نے بہت اچھا کردار ادا کیا تھا۔ یہاں ان کے مقابل محمد علی جیسی گرج دار آواز کے سپرہٹ ہیرو تھے۔ اس فلم کی کہانی ہم نے تفصیل سے انہیں سنائی۔ شروع میں ہی انہوں نے کہا کہ آفاقی صاحب آخر آپ مجھ پر ولن کا ٹھپا کیوں لگا رہے ہیں۔ ہم نے کہا کہ بھائی پوری کہانی پڑھ لو تو معلوم ہوگا کہ کلائمکس میں تم ہیرو بن گئے ہو اور دیکھنے والوں کی ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ وہ محمد علی کے ساتھ کافی عرصے بعد کام کرتے ہوئے بھی گھبرا رہے تھے مگر ہم نے انہیں وہی نسخہ استعمال کرنے کا مشورہ دیا کہ محمد علی کی گرج چمک کے مقابلے میں تمہارا دھیما اور مطمئن انداز بہت اچھا لگے گا۔ اس فلم میں محمد علی اور مصطفیٰ قریشی امتحان میں پڑگئے۔ کئی مناظر میں مصطفیٰ قریشی زیادہ نمایاں نظر آتے تھے۔ ہم نے محمد علی کو سمجھایا کہ تم جذباتی ہونے کی بجائے سادگی اور ٹھنڈے دل سے اپنا کردار نبھاؤ۔ بہرحال فلم کے ہیرو تو تم ہی ہو اور ابتدائی حصے میں مصطفیٰ قریشی ولن نظر آتے ہیں۔ اس فلم میں شبنم ہیروئن تھیں جنہوں نے جڑواں بہنوں کا کردار بہت خوب صورتی سے ادا کیا تھا۔ انہوں نے بیک اپ، گیٹ اپ، بول چال کے انداز میں بھی نمایاں فرق رکھا تھا۔ یہ ایک بہت پُراثر اور دلچسپ فلم تھی جس میں مزاح کا عنصر بھی تھا۔

تسلیم فاضلی کا لکھا ہوا ایک گانا جو شبنم پر فلمایا گیا تھا۔ شبنم کا قصہ یہ ہے کہ وہ بھی مصطفیٰ قریشی کی رشتے دار ہیں لیکن ان کی پیدائش کے بعد قریشی صاحب نے ایک بچی کو کسی ملازم کے ہاتھ کسی کو دے دینے یا مار دینے کی ہدایت

کی۔ دوسری بچی کو انہوں نے اپنی بیٹی بنا کر پرورش کی۔ ملازم نے بچی کو مارنے کے بجائے کسی غریب آدمی کے حوالے کر دیا۔ جو مشکلوں سے پلی اور مردانہ بھیس بدل کر ملازمت کرنے لگی۔ محمد علی نے ایک بار پیٹرول پمپ پر اس کو دیکھا اور جب اس نے محمد علی کا پرس لوٹا دیا تو انہوں نے اس کو اپنے گھر میں ملازم رکھ لیا۔ شبنم نے اس فلم میں بہت اچھی طرح اپنا کردار نبھایا تھا اور یہ ہماری ہدایت کاری میں بنائی جانے والی فلم آس سے بھی زیادہ کامیاب ہوئی تھی مگر ہمارے حصے میں صرف تعریف ہی آئی۔ ڈسٹری بیوٹرز نے بہت زیادہ منافع بنانے کے بعد بھی پوری رقم ادا نہیں کی جس کی وجہ سے ہمیں اس زمانے میں 70-75 ہزار روپے سے ہاتھ دھونے پڑے۔ دراصل پاکستانی فلمی صنعت کی تباہی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ فلم ساز جو سرمایہ بھی لگاتا تھا اور محنت کر کے فلم بناتا تھا فلم کی کامیابی اور ڈائمنڈ جوبلی کے باوجود تقسیم کار اور سینما گھروں والے یہ منافع آپس میں تقسیم کر لیتے تھے اور فلم ساز خالی ہاتھ رہ جاتا تھا۔

آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب فلم میکر کو منافع نہیں ملے گا تو وہ کب تک یہ کاروبار کر سکتا ہے۔ فلم فلاپ ہونے کے بعد تو فلم ساز تقسیم کاروں کا قرض دار ہو جاتا تھا۔ بھارتی صنعتِ فلم سازی یہاں تک کہ بنگلہ دیش (پہلے مشرقی پاکستان) میں بھی فلم کارپوریشن فلم ساز کو اس کا جائز حصہ ملتا ہے۔ جس کی وجہ سے فلم ساز خوش حال اور دولت مند ہیں۔

مصطفیٰ قریشی ایک خوش اخلاق، شائستہ اور وضع دار انسان ہیں۔ جب وہ فلموں میں آئے تھے اس وقت ان کی منگنی روبینہ سے ہو چکی تھی جو سندھی اور اردو فلموں کی گلوکارہ تھیں اور حیدرآباد ریڈیو سے ان کے گانے نشر ہوتے تھے۔ یہیں ان کی اور مصطفیٰ قریشی کی ملاقات ہوئی جو رفتہ رفتہ پسندیدگی اور پھر محبت میں تبدیل ہو گئی۔ مصطفیٰ قریشی کے قریبی دوستوں کو اس بات کا علم تھا اور وہ انہیں اس حوالے سے چھیڑتے رہتے تھے۔

جب ہم فلم ہم سفر کے یونٹ کے ساتھ یورپ گئے تھے تو شبنم، محمد علی، زیبا بیگم، آغا طالش، ساقی بھی ہمراہ تھے۔ راشد مختار اس کے فلم ساز اور پرویز ملک ہدایت کار تھے۔ لندن میں فلم یونٹ ایمبیسی ہوٹل میں مقیم تھا جہاں سب کو اپارٹمنٹس میں ٹھہرایا گیا تھا۔ یہاں باورچی خانے کا تمام ضروری سامان اور فرنیچر موجود ہوتا ہے۔ کچن بھی بہت اچھا ہوتا ہے۔ آپ جو چاہیں پکائیں یا پھر ہوٹل کے ریسٹورنٹ یا کسی اور جگہ کھانا کھائیں۔ یہ اپارٹمنٹ صرف رہائش کے لیے ہوتا ہے لیکن صفائی اور بستروں کی چادریں تبدیل کرنے کا فرض ہوٹل کا اسٹاف ادا کرتا ہے۔

یہاں جب تک ہم رہے آغا طالش جو کھانے کے بھی شوقین تھے اور کھانا بھی بہت اچھا پکاتے تھے انہوں نے اعلان کر دیا کہ صبح کا ناشتا وہ بنایا کریں گے۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ میں صبح سویرے باورچیوں کی طرح کمر میں ایپرن باندھ کر کھڑے ہو جاتے اور ہر آنے والے سے دریافت کرتے۔

"آپ کیا ناشتا کرنا پسند کریں گے؟"

"مجھے فرائڈ ایگ اور ٹوسٹ بنا دیجیے اور ہاں چائے بھی۔"

وہ کہتے۔ "بھئی بڑے کند ذہن ہو ناشتے کے ساتھ چائے تو لازمی سی چیز ہے۔ ہاں اگر دودھ پینا چاہو تو فیڈر منگوا دوں۔"

دوسرے صاحب انڈے پراٹھے کی فرمائش کرتے جو آغا طالش بڑی مہارت سے پلک جھپکتے میں تیار کر دیتے۔ اس طرح صبح کے وقت ان کے اپارٹمنٹ میں ناشتے کے لیے سب اکٹھے ہو جاتے تھے۔ اگر کوئی ساڑھے نو بجے کے بعد آتا تو وہ کہتے۔ "میرے بھائی، ناشتے کا وقت صرف ساڑھے نو بجے تک ہے۔"

"آغا جی، کچھ تو کرو میں تو بھوکا مر جاؤں گا۔"

آغا صاحب کہتے۔ "اچھا آپ کو چائے کے ساتھ ٹوسٹ دے سکتا ہوں مگر مکھن لگائے بغیر۔"

وہ کہتے۔ "آغا جی اتنی ناانصافی تو نہ کیجیے۔ آپ تو بڑے سخی اور فیاض ہیں۔ اگر ٹوسٹ پر مکھن لگا دیں گے تو زندگی بھر احسان مند رہوں گا۔"

آغا جی مسکراتے۔ "یار تم تو مکھن لگانے میں ماہر لگتے ہو۔ تم نے مجھے مکھن لگا کر میرا دل خوش کر دیا ہے۔ اب بتاؤ کیا ناشتا کرو گے؟"

وہ کہتے۔ "پراٹھا اور فرائڈ ایگ۔"

آغا صاحب فوراً انہیں پراٹھا بنا کر کھلا دیتے تھے۔ اس طرح ہوٹل کے اس حصے میں ایک پکنک کا سا سماں رہتا تھا۔ مصطفیٰ قریشی سے جب آغا طالش پوچھتے۔

"قریشی صاحب، آپ کیا ناشتا کریں گے؟"

وہ کہتے۔ "جو بھی آپ بنا دیں۔"

"بہت سعادت مند ہو۔ شاید شوہر بننے کی پریکٹس کر رہے ہو۔" اور سب ہنس پڑتے۔ اس ہوٹل کا ایک

دلچسپ واقعہ بھی سن لیجیے۔

ہم لوگ ہوٹل کے جس علیحدہ حصے میں ٹھہرے ہوئے تھے اس کی صفائی، چادریں اور تولیے بدلنا جس کی ذمے داری تھی۔۔ وہ ایک خوش مزاج اور بے تکلف قسم کی لڑکی تھی۔ سرخ و سفید رنگ، سنہری بال، سنہری آنکھیں۔ وہ جب بھی میرے کمرے میں داخل ہوتی ہنستی مسکراتی ہوئی آتی تھی اور خاصی بے تکلف اور باتونی بھی تھی۔ جب ہم کمرے میں اکیلے ہوتے تو وہ ہم سے پاکستان کے اور پاکستانی فلموں کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔

ہم نے اس سے پوچھا "تم کہاں کی رہنے والی ہو؟"

بولی۔ "آج کل تو لندن میں رہتی ہوں مگر میں ایرانی ہوں۔"

ایک دن پوچھنے لگی ۔ "کیا آپ شادی شدہ ہیں؟" ہم نے انکار میں جواب دیا۔

"مگر کیوں؟ آپ کو کسی نے پسند نہیں کیا یا آپ نے کسی کو پسند نہیں کیا۔ آپ تو فلمی دنیا میں رہتے ہیں۔ وہاں تو سنا ہے کہ بہت خوب صورت لڑکیاں ہوتی ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "دراصل ہم نے ابھی شادی کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔"

"میں حیران ہوتی ہوں کہ آپ کنوارے بھی ہیں۔ بہت رنگین دنیا میں رہتے ہیں مگر فارغ وقت میں آپ کمرے میں بیٹھے لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں ہوتی آپ کو۔"

"ہم اپنے ساتھیوں کے ساتھ شوٹنگ کے سلسلے میں گھومتے رہتے ہیں۔"

اس نے کہا۔ "میرا مطلب ہے آپ کو فلم دیکھنے کا شوق نہیں ہے یا تھیٹر سے دلچسپی نہیں ہے؟"

"کیوں نہیں۔"

"تو پھر کسی دن میرے ساتھ فلم دیکھنے چلیے نا۔ ڈنر بھی کسی ریستوران میں کریں گے۔"

ہم سمجھ گئے کہ یہ ہم سے ڈیٹنگ کرنا چاہتی ہیں جو ہم نے کبھی نہیں کی۔ اس لڑکی کا نام شہناز تھا۔ انگریزی اور اردو میں ہم لوگوں سے بات چیت کرتی تھی یعنی دونوں زبانوں سے بہ خوبی واقف تھی۔

"تم نے اردو کہاں سے سیکھی؟"

"میرے والد ہندوستان کے تھے۔ ہمارے گھر میں فارسی اور اردو بولی جاتی تھی۔ پھر کب چل رہے ہیں فلم دیکھنے؟"

ہم کچھ گھبرا گئے پھر کہا۔ "کسی دن سوچ کر پروگرام بنائیں گے۔"

وہ مسکرائی۔ "آپ شاید بدنامی سے ڈرتے ہیں۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"

مغربی ماحول میں اس قسم کی باتیں اور پروگرام غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے اس بات کو اہمیت نہیں دی۔ شہناز نے ہمت نہ ہاری اور ہمیں ہر شام باہر چلنے کا مشورہ دیتی رہی۔ ایک دن آغا طالش ہمارے کمرے میں آ گئے۔ کچھ دیر بعد شہناز کام کرنے کے لیے کمرے میں آئی اور سیدھی غسل خانے میں چلی گئی۔

آغا طالش شرارت سے مسکرا کر بولے۔ "میاں یہ کیا چکر ہے، یہ کون لڑکی ہے جو اتنی بے تکلفی سے غسل خانے میں چلی گئی؟"

ہم نے کہا۔ "یہ ہمارے کمروں کی صفائی کرتی ہے۔"

"بڑے خوش قسمت ہو۔ ہمارے کمروں کی صفائی تو ایک بڑی بی کرتی ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "آغا صاحب، یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے۔" اسی وقت شہناز غسل خانے سے تولیے لے کر باہر نکلی۔

ہم نے آغا طالش سے کہا۔ "آغا جی، آپ بھی خود کو ایرانی کہتے ہیں۔ یہ لڑکی شہناز بھی ایرانی ہے۔ ذرا اس سے فارسی میں بات کر کے دکھایئے تو ہم جانیں۔"

آغا طالش نے فوراً شہناز سے فارسی میں باتیں شروع کر دیں مگر وہ ان کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ آغا صاحب نے پھر اس سے کوئی سوال پوچھا مگر وہ خاموش رہی ہمیں بہت حیرت ہوئی۔

ہم نے کہا۔ "شہناز تم آغا صاحب کی باتوں کا جواب کیوں نہیں دے رہی ہو؟"

وہ کھسیانی سی ہو گئی پھر اردو میں بولی۔ "دراصل میں بچپن ہی میں ایران سے آ گئی تھی۔ انگلستان میں ہی رہی۔ یہیں پرورش پائی اس لیے جو تھوڑی بہت فارسی آتی تھی وہ بھی بھول گئی۔"

ہمیں معاً خیال گزرا کہ یہ لڑکی جھوٹی اور فراڈ ہے لیکن اس کو یہ ڈھونگ رچانے کی ضرورت کیا تھی؟"

رفتہ رفتہ جب سب نے آپس میں شہناز کے بارے میں بات چیت کی تو معلوم ہوا کہ وہ بہت چالاک لڑکی ہے۔

ہر ایک کو بے وقوف بنا کر پیسے بٹورتی ہے۔ ہمارے کچھ ساتھی اس کے ساتھ فلم دیکھنے بھی گئے تھے۔ فلم دیکھنے کے بعد اس نے کہا۔

”اتنی رات گئے گھر کیا جائیں آئیں یہیں کہیں ہوٹل میں کمرا لے لیتے ہیں۔“

وہ شریف آدمی تھے فوراً چوکنا ہو گئے اور سمجھ گئے کہ اس کا اصل مقصد کیا ہے۔ مغرب میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے خصوصاً ملازمت پیشہ لڑکیوں کا یہی رویہ ہے اور ان کی اضافی آمدنی کا ذریعہ بھی ہے۔ یہ سب باتیں سن کر مصطفیٰ قریشی خاموش بیٹھے رہے۔

جب سب چلے گئے تو ہم نے پوچھا۔ ”قریشی صاحب، آپ کچھ نہیں بولے کیا مس شہناز نے آپ کو دام میں پھانسنے کی کوشش نہیں کی؟“

وہ مسکرائے اور بولے۔ ”آفاقی صاحب، میں تو شروع دن ہی اس کے ارادے پہچان گیا تھا۔ اس لیے حوصلہ افزائی نہیں کی مگر وہ کبھی کبھی مجھ سے کسی ضرورت کے بہانے ایک دو پونڈ مانگ لیا کرتی تھی۔“

ہم نے کہا۔ ”یہ آپ کی شرافت ہے یا بھابی کا ڈر؟“

وہ ہنسنے لگے، دو دن بعد ہمارا یونٹ ہوٹل چھوڑ کر اگلی منزل کی طرف چل پڑا۔

شادی کے بعد مصطفیٰ قریشی نے گلبرگ میں ایک خوب صورت بنگلا بنا لیا تھا۔ ہم اکثر وہاں جایا کرتے تھے۔ روبینہ بھابی بہت ہنس مکھ، خوش اخلاق اور بہت اچھی میزبان بھی تھیں۔ لاہور کے فلم سازوں نے بہت کوشش کی کہ وہ ان کی فلموں کے لیے گلوکاری کریں مگر وہ رضامند نہیں ہوئیں البتہ جب ان کے گھر میں دوستوں کی دعوت ہوتی تھی تو وہ سب کے اصرار پر نغمہ سرائی کرتی تھیں۔ وہ جتنی خوب صورتی سے سندھی کافیاں گاتی تھیں اسی طرح اردو غزلیں بھی گاتی تھیں۔ سندھ سے آنے والے فنکاروں کے اعزاز میں بھی قریشی صاحب کے گھر پر محفلیں سجائی جاتی تھیں جہاں ہم کئی معروف سندھی گانے والوں کے فن سے بھی لطف اندوز ہوئے۔

مصطفیٰ قریشی پہلے بھی ہمارے دوست تھے آج بھی ویسے ہی عزیز دوست ہیں، یہ اور بات ہے کہ کافی عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی۔

مصطفیٰ قریشی کے بارے میں ان کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی قابلِ ذکر ہے۔ جب ہم یونٹ کے ساتھ لندن گئے تو یوگنڈا میں رہنے والے ایک دوست نے ہمیں چار سو پونڈ کا ایک چیک دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر خرچ سے کچھ بچ جائے تو میرے اس اکاؤنٹ میں جمع کروا دیجیے گا۔

ہم لندن پہنچے تو عابد شاہ جو ہمارے عزیز دوست اور انگلستان کے لیے ہماری فلمیں خریدتے تھے ائرپورٹ پر ہی آ کر ملے اور انہوں نے ہماری فلموں کے حساب میں ڈھائی سو پونڈ دے دیے۔ غیر ملکی کرنسی پاکستان سے لے جانے پر پابندی تھی۔ ہم نے لندن کے چند دوستوں کے نام خطوط بھی لے لیے تھے جو بوقتِ ضرورت ہم ان سے لے سکتے تھے .... پونڈز ان دنوں بلیک مارکیٹ میں 24 سے 28 روپے تک مل جاتے تھے۔ انگلستان دوسرے یورپی ملکوں کے مقابلے میں بہت سستا ملک تھا۔ اس لیے ہمارے پاس جو رقم تھی وہ ضرورت سے کہیں زیادہ جمع ہو گئی تھی اور ہم پریشان تھے کہ اتنے ڈھیر سارے پونڈز کا کیا کریں گے۔ فلم ساز راشد مختار باقاعدہ اسٹیٹ بینک سے فلمی اخراجات کے لیے کافی رقم لے کر گئے تھے باقی سب لوگ چھپا کر یا لندن کے دوستوں کے نام پونڈ جمع کرنے کے لیے خطوط لے گئے تھے۔

ہم نے اپنے اور والدہ و بہن بھائیوں کے لیے کچھ خریداری کی لیکن پھر بھی سرمایہ باقی بچ رہا۔ ہمارے ساتھیوں کے پاس جب پونڈ ختم ہو جاتے تو وہ ہم سے ادھار لے لیا کرتے تھے کہ پاکستان چل کر ادا کر دیں گے۔ یہاں تک کہ ایک بار راشد مختار صاحب کو بھی فوری طور پر ڈیڑھ سو پونڈ کی ضرورت پڑ گئی۔ مصطفیٰ قریشی نے بھی ہم سے پچاس پونڈ لیے۔ شبنم کو ایک فلم ساز نے لندن میں رقم دینی تھی جو انہوں نے نہیں دی۔ اس وجہ سے شبنم نے بھی ہم سے پچاس پونڈ ادھار لے لیے۔ ہماری حیثیت ایک سیٹھ جیسی تھی جو ہر ایک کی ضرورت پوری کرتا ہے۔

ہم یونٹ سے پہلے لندن سے روانہ ہو گئے کیونکہ ہمیں چند روز جنیوا میں بھی قیام کرنا تھا۔ اب بھی ہم رئیسوں کی طرح خرچ کرتے رہے۔ بہرحال بیس روز بعد ہم پاکستان واپس آئے تو معلوم ہوا کہ قریشی صاحب لاہور پہنچتے ہی پچاس پونڈ کے مساوی پاکستانی روپیہ ہمارے گھر دے گئے تھے مگر کسی اور نے یہ خیال نہ کیا جیسے بھول ہی گئے ہوں۔ ہم نے تنگ آ کر ان سے تقاضے شروع کر دیے مگر بڑی مشکل سے یہ رقم واپس ملی۔ شبنم سے ہم نے پچاس پونڈ واپس لینے سے انکار کر دیا۔

قریشی صاحب سے ملاقات ہوئی تو ہم نے کہا کہ بھائی آپ کو فوراً پاکستان پہنچتے ہی قرض چکانے کی کیا ضرورت تھی جبکہ ہم پاکستان میں تھے ہی نہیں۔

کہنے لگے۔ ”آفاقی صاحب قرض دار اپنا بھی ایک بوجھ ہوتا ہے۔ دوستی اپنی جگہ مگر پیسے کا حساب اپنی جگہ۔“

ان کی یہ بات ہم ابھی نہیں بھولے۔

☆☆☆

دلیپ کمار کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ اس سالگرہ پارٹی میں بھارتی فلمی صنعت کی سبھی ممتاز ہستیوں نے شرکت کی۔ دلیپ کی مقبولیت اور محبوبیت کا یہ عالم ہے کہ فلمی صنعت کے جن لوگوں کو بلایا نہیں جاسکا تھا وہ بھی اپنے خاندانوں کے ساتھ اس تقریب میں شریک ہوئے۔ دلیپ کی سالگرہ کے موقع پر انڈیا کی معروف فلمی ہستیوں کی شرکت ان لوگوں کے لیے ایک خواب تھا جنہیں ... کبھی دلیپ کمار کو قریب سے دیکھنے یا ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اس موقعے پر فلم فیئر نے ایک خصوصی نمبر شائع کیا تاکہ یہ تقریب ہمیشہ کے لیے ایک یادگار بن جائے۔

فلم انڈیا کے شمارے میں دلیپ کمار کے بارے میں بے شمار مضامین لکھے گئے لیکن اس کی خصوصیت وہ انٹرویو ہے جو دلیپ کمار سے خاص طور پر لیا گیا ہے۔ فلم فیئر کی ایک نمائندہ نے خصوصی طور پر وقت لے کر یہ انٹرویو حاصل کیا تھا کیونکہ دلیپ کمار کو انٹرویو دینے کی عادت نہیں ہے اور گزشتہ 16 سالوں میں انہوں نے باوجود کوششوں کے کسی کو انٹرویو نہیں دیا۔ فلم فیئر کا یہ انٹرویو ان ہی الفاظ میں پیش کیا جا رہا ہے جس طرح لکھا گیا ہے۔

وہ آئے انہوں نے دیکھا اور ہمیں فتح کر لیا۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جو سالہا سال تک عوام کے دلوں پر راج کرتی رہتی ہیں اور آج بھی ان کی حکمرانی قائم ہے۔ وقت اور زمانے نے ان کی مقبولیت پر کوئی اثر نہیں ڈالا ہے۔ دلیپ کمار نے لگ بھگ بیس سال تک باکس آفس کو اپنے قابو میں رکھا ہے۔ جب تک انہوں نے اداکاری کی وہ فلم کے ہیرو سے بھی زیادہ معاوضہ وصول کرتے رہے۔ دلیپ کمار کا نام ہی کسی فلم کی کامیابی کی ضمانت تھا۔ ان کے گھر کے سامنے فلم سازوں کا مجمع لگا رہتا تھا جو منہ مانگے معاوضے پر انہیں فلم میں لینا چاہتے تھے لیکن دلیپ کمار بہت سوچ سمجھ کر فلم سائن کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 60 سال تک فلموں میں کام کرنے کے بعد بھی ان کی کُل فلموں کی تعداد 60 ہے۔ وہ سال میں ایک فلم میں کام کرتے تھے حالانکہ وہ زیادہ سے زیادہ فلموں میں کام کر کے بے شمار دولت اکٹھی کر سکتے تھے مگر انہوں نے اپنا یہ اصول کبھی ترک نہیں کیا۔ اس کے برعکس امیتابھ بچن کو جو فلم بھی پیش کی گئی اس کو سائن کر لیا اور ان گنت فلموں میں کام کیا۔ انہوں نے رومانی، ایکشن، مزاحیہ، ولن، باغیانہ قسم کی فلموں میں کام کیا۔ اس لیے ان کا کوئی ایک خاص امیج نہ بن سکا۔ اس کے برعکس دلیپ کمار کی فلمیں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن لوگوں نے یہ فلمیں دیکھی ہیں وہ انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

لوگ امیتابھ اور شاہ رخ خان کی فلمیں دیکھنے کے لیے سینما گھروں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ شاہ رخ خان ان دونوں کا مجموعہ ہے۔ اس نے سنجیدہ اداکاری کا سبق دلیپ کمار سے سیکھا اور مزاحیہ، روایتی اور ایکشن فلموں کا سبق امیتابھ سے حاصل کیا۔ اس لحاظ سے اس کو ان دونوں اداکاروں کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کی مجموعی اداکاری سے سبق حاصل کر کے وہ ایک مقبول ترین اداکار بن گیا۔ اس کی فلمیں ہر عمر کے لوگ پسند کرتے ہیں۔ ہر عمر اور ہر ذوق کے فلم بین اس کی فلمیں دیکھنے کے مشتاق رہتے ہیں۔ یہ فلم فیئر کا اعزاز ہے کہ اس نے ان تینوں عظیم اداکاروں کو یکجا کر دیا ہے۔ یہ تینوں فلمی دنیا کے بادشاہ ہیں۔ ہندوستان کی فلم سازی کے ایک سو سال گزرنے کے بعد وہاں بہت خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ یہ انٹرویو بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ فلم فیئر نے اس کو سرورق کی اسٹوری بنا کر شائع کیا ہے اور اس کا عنوان ہے۔

”اپنے انداز اور اپنی قسم کے سب سے الگ۔“

”شہنشاہ کیا کہتا ہے؟“

یوسف خان سے دلیپ کمار تک ایک منفرد اداکار۔ مقبول ترین اداکار سے ہمارے نمائندے میرا جوشی ان کے ماضی کے سفر کی داستان سناتے ہیں۔

دلیپ کمار کو ٹریجڈی کا بادشاہ کہا جاتا تھا لیکن یہ درست نہیں ہے کیونکہ دلیپ کمار نے مختلف قسم کے کردار ادا کر کے اور ان سے مکمل انصاف کر کے یہ تسلیم کرا لیا ہے کہ وہ ہر قسم کی اداکاری میں منفرد ہیں جن کا مقابلہ آج تک کوئی نہ کر سکا۔ ان کی فلم آج بھی پیش کی جاتی ہے تو لوگ اسکرین کے سامنے دم بخود بیٹھے رہ جاتے ہیں۔ ان کے مقابلے کا

کوئی اداکار اب تک ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔ ان کے مکالمے بولنے کا انداز، چہرے کے تاثرات اور کردار کے ساتھ انصاف کرنے کا انداز سب سے جدا ہے۔ وہ ہر قسم کا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ دیہاتی، شہری دونوں قسم کے کردار میں وہ نگینے کی طرح نظر آئے۔ یہ وہ شخص ہے جسے زندگی سے بھی بڑھ کر فتوحات حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ آج بھی جب وہ کسی تقریب میں جاتے ہیں تو دوسرے تمام فنکار ان کے سامنے بونے نظر آتے ہیں اور سب کی نظریں اس 96 سالہ شخص پر جم کر رہ جاتی ہیں۔ بڑے بڑے فنکاروں اور حسین ترین اداکاراؤں کے چراغ ان کے سامنے ٹمٹما کر رہ جاتے ہیں۔ اس عمر میں بھی ان کی مقبولیت اور شخصیت سب کو مسحور کر دیتی ہے۔ وہ آج بھی فلم انڈسٹری کی سب سے محترم اور مقبول شخصیت ہیں۔ ان کے انٹرویو کے اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

سوال: کیا آپ بچپن میں بھی فلمیں دیکھنے کے شوقین تھے؟ آپ نے سب سے پہلے کون سی فلم دیکھی اور تجربہ کیسا ثابت ہوا؟

دلیپ کمار: جب میں نے بمبئی ٹاکیز میں کام کیا تو ہمارے لیے ضروری تھا کہ ہر قسم کی فلمیں دیکھی جائیں۔ یہ فلمیں ہمارے لیے سبق کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان میں انگریزی اور اردو فلمیں دونوں شامل تھیں۔ مجھے سب سے زیادہ جو فلم پسند آئی وہ فار ہوم دی بیل ٹالز For whome the bell talls تھی۔ مجھے یہ فلم اتنی پسند آئی کہ میں سینما کے ہر شو میں یہ فلم جا کر دیکھتا تھا۔ اس فلم کو کئی آسکر ایوارڈز کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ ہمیں ہدایت کی گئی تھی کہ اس فلم کے بارے میں اپنی رائے اور تبصرہ اسٹوڈیو کی مالک دیویکا رانی کو لکھ کر دیں۔ مجھے اس فلم میں انگرڈ برگمین کی اداکاری بہت پسند آئی تھی۔ میں نے فلم کے تبصرے کے ساتھ انگرڈ برگمین کے بارے میں بھی تفصیل سے تبصرہ لکھا۔ یہ پہلی فلم تھی جو میں نے دیکھی اور پسند کی تھی۔ مجھے بچپن میں فلمیں دیکھنے کا شوق نہیں تھا۔ گھر میں رہنا، ہنسنا بولنا، فٹ بال کھیلنا یہ میرے شوق تھے۔

لوگ میرے دھیمے انداز میں مکالمے بولنے کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہمارے گھر میں سب دھیمے انداز میں بولتے تھے۔ میں نے کبھی اپنے والد یا والدہ کو غصے میں بھی اونچی آواز میں بولتے ہوئے نہیں سنا۔ بولنے کا یہ انداز میں نے اپنے گھر میں دیکھا۔ مجھے گھر سے باہر رہنا، تنہائی میں گھومنا اچھا لگتا۔ میں سوچتا رہتا تھا، میرے دل میں ہر طرح کے سوال ہوتے تھے اور میں ان کے جواب تلاش کرتا رہتا تھا۔ پڑھنے کا شوق تھا جس کی وجہ سے میں اپنے کلاس فیلوز سے زیادہ قابل تھا۔ میں کسی سے پیچھے رہنا نہیں چاہتا تھا۔ میں ہی طالب علم تھا اور خود ہی ٹیچر تھا۔

جب میں اداکار بنا تو میں نے سوچا کہ میری اداکاری کا انداز دوسروں سے مختلف ہونا چاہیے۔ مجھ میں شوخی، شرارت کا جذبہ نہیں تھا۔ میں نمود و نمائش کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن میں نے اپنے اصلی مکالمے بولنے کے انداز کو نہیں چھوڑا۔ میں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتا تھا دراصل یہ میری عادت تھی۔ میرے گھر کے ماحول کا اثر تھا۔ اپنی عمروں کے مقابلے میں میری دوستی تجربہ کار اور بڑے لوگوں کے ساتھ بھی جو بالکل سادہ تھے مثلاً ایس مکرجی، موسیقار انیل بسواس، اشوک بھیا، ہدایت کار نتن بوس۔ میں اسکرپٹ خصوصاً اپنے کردار کو بہت غور سے پڑھتا، سوچتا تھا کہ اس کردار کے لیے مجھے کیا انداز استعمال کرنا چاہیے۔ مجھے تجربہ کار، سادگی پسند اور قابل لوگوں کے ساتھ دوستی کرنا بہتر لگا کیونکہ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ فلم ملن میں کام کرنے کے بعد میری نتن بوس سے دوستی ہو گئی۔ میں لوگوں کی عام زندگی کو غور سے دیکھتا۔ وہی میرے استاد ہیں۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ فلم دیوداس میں کام کرنے کے بعد آپ پر اتنا اعصابی اثر ہوا کہ آپ نے کوہ نور میں کام کرنا شروع کیا تاکہ ذہنی بوجھ کم ہو؟

دلیپ کمار: میں نے آغاز ہی سے المیہ فلموں میں کام کیا۔ سر جان گل گڈ اور سر لارنس اولیور نے بڑی عمر میں المیہ اداکاری شروع کی تھی مگر میں تو روز اول سے المیہ کردار کر رہا تھا۔ صرف دیوداس ہی نہیں دوسری المیہ فلموں نے بھی مجھے ذہنی اور اعصابی طور پر متاثر کیا تھا۔ میں اس رنج و الم سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے ہلکے پھلکے کردار قبول کیے۔ میں لندن میں ایک ماہر نفسیات سے ملا جس نے مجھے سمجھایا کہ اب کامیڈی کردار کرو تاکہ اس المیہ ماحول سے باہر نکلو۔ اس لیے میں نے فلم کوہ نور میں کام کیا جس نے مجھ پر اچھا اثر ڈالا۔

سوال: مغل اعظم ایک عظیم یادگار فلم ہے کے آصف کا کون سا جذبہ تھا جس نے یہ یادگار فلم بنانے پر مجبور کیا؟

دلیپ کمار: آصف دراصل سلیم اور انارکلی کے بارے میں فلم بنانا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں، میں شہید میں کام کر رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے بات کی۔ میں نے شہید، ندیا کے پار، شبنم جیسی فلموں میں کام کیا تھا۔ آصف نے کہا کہ میں یہ فلم اس وقت بناؤں گا جب اس کے لیے مجھے بہت زیادہ سرمایہ لگانے والا ملے اور جو میں مانگوں مجھے دے۔ بیس سال تک وہ اپنے خواب کو رنگ دینا چاہتا تھا اور آخرکار اس نے یہ خواب پورا کر دکھایا۔

سوال: آپ کے اور راج کپور کے درمیان رقابت تھی، یہ درست ہے یا صرف میڈیا نے اچھالا ہے؟

دلیپ کمار: اس کا جواب میں کئی بار دے چکا ہوں۔ راج کپور اور میں بھائیوں کی طرح تھے۔ ہم ایک ساتھ اسکول جاتے تھے۔ بمبئی آئے تو ہم دونوں نے ایک ہی کالج میں پڑھا۔ ہم دونوں کو فٹ بال کھیلنے کا شوق تھا۔ ہم ایک دوسرے کے گھروں میں اس طرح جاتے تھے جیسے وہ ہمارا گھر ہے۔ راج کپور مجھ سے کہا کرتا تھا کہ تم اتنے خوب صورت ہو، اداکار کیوں نہیں بن جاتے۔ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے اداکار پرتھوی راج کپور کا بیٹا تھا مگر میں بہت شرمیلا تھا۔ میں اداکاری کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم دونوں نے ایک ہی پیشہ اختیار کیا تھا۔ میڈیا کی سنسنی خیز خبروں سے اثر نہ لیں۔ لوگ جانتے ہی نہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کس قدر قریب تھے۔

سوال: آپ نے سب سے پہلے منفی کردار فلم امر میں کیا تھا؟

جواب: میں نے محسوس کیا کہ یہ کردار میرے لیے بہت موزوں ہے پھر میں نے فلم گنگا جمنا لکھی۔ جب ہم فلم کے رنگین پرنٹس بنوانے کے لیے لندن گئے تو انہوں نے کہا کہ آپ کو یہ فلم آسکر کے لیے ضرور بھیجنی چاہیے۔ جب یہ فلم قاہرہ، کارلووی، چیکوسلاویہ اور بوسٹن وغیرہ میں ریلیز ہوئی تو فلمی نقاد میری اداکاری دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ فلم بنانے اور فلمانے کے لیے کتنی ریسرچ کی گئی۔ وہ میری اداکاری کے بھی معترف تھے۔ اس فلم کے کلائمکس کے لیے ہم نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا۔ میں نے اپنے مختلف کرداروں پر بہت محنت کی ہے، بہت غور کیا ہے اور اس کا میرے اعصاب پر بہت اثر پڑا ہے۔

سوال: کیا آپ امیتابھ بچن اور شاہ رخ خان کو اپنے انداز سے متاثر سمجھتے ہیں؟ کیا وہ آپ کی اداکاری کا تسلسل ہیں؟ کیا وہ دانستہ طور پر یا نادانستہ آپ کی اداکاری کی نقل کرتے ہیں؟

دلیپ کمار: میں سمجھتا ہوں کہ امیتابھ ایک مکمل اداکار ہے۔ شاہ رخ انتہائی مقبول ہے۔ انہوں نے اداکاری میں اپنا انداز اپنایا ہے۔

سوال: آپ نے گورودت کی فلم میں کام کیوں نہیں کیا۔ اگر یہ کردار آپ نے کیا ہوتا تو یہ لافانی ہو جاتا؟

دلیپ کمار: دراصل میں ان دنوں میں دیوداس میں کام کر رہا تھا۔ گورودت نے مجھ سے بات کی تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ ایک ہی قسم کے دو کردار کرنا مشکل ہے۔ کردار کے ساتھ ناانصافی بھی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ نہ صرف یہ کہ مجھ پر بوجھ ہوتا ریلز کے بعد ان فلموں کا آپس میں ہی مقابلہ ہو جاتا۔ ایک فلم زیادہ کامیاب ہوتی اور دوسری کم۔ بزنس کے اصولوں کے مطابق بھی یہ صحیح نہ تھا۔

سوال: کیا یہ درست ہے کہ دیوار، نیا دور، لگان، مدھومتی اور اوم شانتی اوم ایک ہی انداز سے متاثر ہو کر بنائی گئی ہیں؟

دلیپ کمار: سلیم جاوید نے مجھے بتایا تھا کہ جب وہ فلم دیوار لکھ رہے تھے تو گنگا جمنا سے متاثر تھے۔ یہ خیال کہ فلم میں ایک بھائی قانون کا پاسبان اور دوسرا قانون شکن تھا ان فلموں میں بھی نمایاں رہا۔ جب یش (چوپڑہ) کی فلم دیوار کامیاب ہوئی تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ یہ تو ساری دنیا میں ہوتا ہے کہ کامیاب فلموں سے متاثر ہو کر فلمیں بنائی جاتی ہیں۔

سوال: آپ کس ہیروئن کے ساتھ اپنی فلمی جوڑی کو سب سے بہتر سمجھتے ہیں؟

دلیپ کمار: وجینتی مالا کے ساتھ میں نے سات سُپر ہٹ فلموں میں کام کیا تھا۔ تو یہ سب سے زیادہ کامیاب جوڑی کہی جا سکتی ہے۔ آزاد اور کوہ نور میں مینا کماری کے ساتھ ہماری جوڑی کامیاب تھی۔ مدھوبالا نے میرے ساتھ فلم ترانہ اور مغل اعظم میں کام کیا اور دونوں کامیاب فلمیں تھیں۔

سوال: سائرہ بانو نے آپ کے ساتھ بہت اچھی اداکاری کی؟

دلیپ کمار: سائرہ بانو کی مختلف فلموں میں اداکاری سے میں حیران رہ گیا۔ ہم دونوں نے سگینہ، گوپی میں کام کیا اور یہ دونوں اچھی فلمیں تھیں۔ بیوی کی حیثیت سے

سائرہ نے مجھے جتنی محبت دی اور جس طرح میرا خیال رکھا وہ شاید کم ہی بیویاں ایسا کرتی ہیں۔ سائرہ کی شکل میں اللہ نے مجھے ایک بے بہا تحفہ دیا ہے۔ اتنا زیادہ خیال میری والدہ ہی نے کیا جتنا کہ سائرہ نے کیا۔

سوال: آپ نے امتابھ بچن کے ساتھ فلم شکتی میں کام کیا۔ اس زمانے کی کوئی قابلِ ذکر بات؟

دلیپ کمار: امتابھ ایک شائستہ اور ضابطوں کا پابند اداکار اور جنٹلمین ہے۔ میڈیا کی خبروں کے برعکس ہم دونوں کے تعلقات اور رابطہ بہت اچھا رہا۔ ہم دونوں نے اپنے مناظر اور مکالمے بہت غور سے پڑھے تھے۔ ہم دونوں کے مشترکہ مناظر میں امتابھ نے بہت اچھا کام کیا۔ میں نے ہدایت کار رمیش سپی سے کہا کہ میں ان مناظر میں امتابھ سے بہت متاثر ہوا ہوں جہاں وہ کوئی مکالمہ نہیں بولتا لیکن محض تاثرات سے کام لیتا ہے۔ میں نے سپی سے کہا کہ یہ وہ اداکار ہے جو اداکاری کا گر سمجھتا ہے۔

سوال: شاہ رخ خان کی کون سی خوبی آپ کو پسند آئی؟ سائرہ نے ایک بار کہا تھا کہ اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا تو میری خواہش تھی کہ وہ شاہ رخ خان کی طرح ہوتا۔ وہ انہیں بیٹوں ہی کی طرح سمجھتے ہیں؟

دلیپ کمار: شاہ رخ ایک دلچسپ اور دل جیتنے والا اداکار ہے۔ وہ بہت شائستہ، بااخلاق، ہنسنے ہنسانے والا ہے۔ اس نے ہمیشہ میرا احترام کیا جیسا کہ ایک نوجوان پٹھان اپنے بزرگ کا کرتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ سائرہ اسے بہت پسند کرتی ہے۔ میں نے عامر خان، سلمان خان کو بھی بہت باادب اور لحاظ کرنے والا پایا ہے۔ اگر کسی ہجوم میں، میں پھنس گیا تو ان لڑکوں نے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے سہارا دیا جیسا کہ بیٹے اپنے باپ کو دیتے ہیں۔ وہ دل سے مجھ سے محبت کرتے ہیں جس سے ان کی اعلیٰ نسبی اور تربیت کا احساس ہوتا ہے۔ میں ان کی محبت سے بہت متاثر ہوا ہوں۔

اسی شمارے میں امتابھ کے تاثرات بھی شامل ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ بچپن میں کارٹون فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ کچھ بڑے ہوئے تو دلیپ کمار کی فلمیں دیکھیں جو میرے آئیڈیل ہیں۔ فلموں میں آنے کے بعد میری مسلسل گیارہ فلمیں فلاپ ہوئیں مگر دیوار نے میری تقدیر بدل دی۔ فلم چندر لیکھا میں رنجن کی تلوار بازی مجھے اچھی لگی۔ دلیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند کی فلمیں بھی باقاعدگی سے دیکھتا تھا۔

سوال: وہ کون سا اداکار ہے جو آپ کو بہت زیادہ پسند آیا؟

امتابھ بچن: جیسا کہ میں نے کہا دلیپ کمار بچپن ہی سے میرے لیے ایک نمونہ رہے ہیں۔ مجھے موتی لال بھی پسند تھے۔ وہ حقیقی انداز میں اداکاری کرتے تھے۔ فلم انڈسٹری میں نئے لوگوں کی آمد ایک خوش آئند بات ہے۔

سوال: آپ ہمیشہ سے دلیپ کمار کے مداح رہے ہیں۔ ان فلموں کا ذکر کیجیے جن میں آپ نے ان کے ساتھ کام کیا؟

امتابھ بچن: ان کی تقریباً سبھی فلموں سے بہت کچھ سیکھا۔ 1961ء میں بنائی جانے والی فلم گنگا جمنا دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ایک اداکار جو پٹھان گھرانے میں پیدا ہوا ہے اس کے مکالموں کی ادائیگی مجھ سے بہتر ہے حالانکہ میں الہ آباد (یوپی) میں پیدا ہوا تھا۔ گنگا جمنا میں دلیپ کمار نے جس طرح پوربی زبان بولی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔

سوال: آپ کو کون سی رومانی فلم سب سے زیادہ پسند آئی؟

امتابھ بچن: کاغذ کے پھول، اس فلم میں مینا کماری نے غضب کی اداکاری کی تھی۔ انہوں نے ہر فلم میں اچھا کام کیا۔ ان کی شخصیت میں ایک شوخی بھی تھی۔ دیوار اور کبھی کبھی مجھے اپنی فلموں میں سب سے زیادہ پسند ہیں۔ میں نے اپنی بیگم جیا بچن کی فلم ابھیمان دیکھی جس میں ان کی اداکاری قابلِ تعریف ہے۔

سوال: ہندوستانی فلموں میں کس فلم کو آپ کلاسک سمجھتے ہیں؟

امتابھ بچن: فہرست بہت لمبی ہو جائے گی لیکن محبوب خان، راج کپور، بمل رائے، گورودت کی فلمیں کلاسک کہلا سکتی ہیں۔ اگرچہ دوسرے ہدایت کاروں نے بھی لاجواب فلمیں بنائیں جن کی طویل فہرست ہے۔

سوال: آپ نے فلم شکتی میں دلیپ کمار کے ساتھ کام کیا؟

امتابھ بچن: یہ وہ منظر ہے جب پولیس افسر دلیپ کمار جیل میں مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اگر وہ ایک سوری ٹیک دیں گے تو سب ایک سے بڑھ کر ایک ہوں گی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان میں بہترین کون سی ہے۔ میں اس وقت بہت متاثر ہوا جب

میری فلم بلیک دیکھنے کے بعد میں سینما گھر سے باہر نکلا تو میں نے دیکھا کہ دلیپ کمار میرے انتظار میں کھڑے تھے۔ انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن ان کے ہاتھ کا لمس ان کے جذبات کا اظہار تھا۔ ان کی اسی محبت نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میری آنکھیں نمناک ہوگئیں۔

دلیپ کمار نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں شاہ رخ خان میری نقالی کرتے ہیں لیکن میں نے کبھی ایسا محسوس نہیں کیا۔ شاہ رخ خان بذاتِ خود بہت اچھا اداکار ہے۔

شاہ رخ خان کے، امتابھ بچن اور دلیپ کمار کے بارے میں تاثرات اگلی بار سہی۔

☆☆☆

پشاور سے شوکت رحمٰن خٹک بسترِ علالت پر دراز ہونے کے باوجود فلموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت عطا فرمائے۔ الف لیلہ میں کئی بار ان کے معلوماتی اور دلچسپ خطوط پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ وہ پیشے کے اعتبار سے فوٹوگرافر ہیں لیکن فلموں میں بے انتہا دلچسپی رکھنے کی وجہ سے فلمی کوچوں کی خاک بھی چھانتے رہے ہیں۔ اداکاری کا بھی شوق تھا اور فلمی اداکاروں اور فن کاروں سے ملنے کا بھی۔ اس لیے اس وقت کے کئی نامور فنکاروں سے بھی ان کی دلچسپ ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں جن کا احوال وہ وقتاً فوقتاً بیان کرتے رہتے ہیں۔

پچھلے دنوں ان کے ایک دوست سے ملاقات ہوئی۔ ان کے اور بھی کئی دوستوں کا کہنا تھا کہ فلمی نغمہ

تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے
پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے
تو پیا سے مل کے آئی ہے
بس آج سے نیند پرائی ہے
دیکھے گی سپنے بالم کے

دوستوں کا خیال تھا کہ یہ گانا قتیل شفائی کا لکھا ہوا ہے لیکن شوکت کا کہنا تھا کہ یہ گانا سیف الدین سیف نے لکھا ہے۔ انہوں نے میری ایک تحریر کا بھی حوالہ دیا۔ شوکت رحمٰن کو فلموں میں کام کرنے کا موقع بھی ملا اور فلمی اداکاروں اور اہم شخصیات سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا۔ جن دنوں قتیل شفائی پشتو فلم قصہ خوانی بنا رہے تھے تو شوکت رحمٰن خٹک اور پشتو کے فن کار رحمت علی، قاضی صغیر، فخرالدین درانی کے ہمراہ خٹک صاحب بھی فلم کی شوٹنگ میں حصہ لینے کے لیے لاہور آئے تھے۔ پشاور سے اور بھی فن کار لاہور گئے تھے جنہیں قتیل صاحب نے ہوٹل میں ٹھہرایا مگر مذکورہ چاروں کو اپنے گھر میں مہمان رکھا جو کہ ان لوگوں کے لیے ایک اعزاز تھا۔

ایک رات فرصت کے وقت میں قتیل شفائی کے ساتھ گفتگو میں دوسری فلموں کا بھی ذکر آیا۔ جب گمنام کے اس گانے کے بارے میں ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ گانا ان کا لکھا ہوا نہیں ہے جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے یہ گانا سیف الدین سیف ہی کا لکھا ہوا ہے۔ یہ فلم انور کمال پاشا نے بنائی تھی جس میں مرکزی کردار یعنی ہیروئن صبیحہ خانم پر یہ گانا فلمایا گیا تھا۔ اقبال بانو اس کی گلوکارہ تھیں، وہ فلمی صنعت کا ابتدائی دور تھا اور معروف شعرا میں سے سیف الدین سیف اور قتیل شفائی سے فلموں کے نغمات لکھوائے جاتے تھے۔

دراصل اس غلط فہمی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ جب انور کمال پاشا نے فلم قاتل بنائی تو اس میں قتیل شفائی کے نغمات تھے۔ ان میں ایک گانا بے حد مقبول ہوا تھا۔ یہ بھی اقبال بانو کا گایا ہوا تھا۔

الفت کی نئی راہوں کو چلا تو بانہیں ڈال کے بانہوں میں
دل توڑنے والے دیکھ کے چل ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

یہ وہ زمانہ تھا جب انور کمال پاشا عروج پر تھے اور پے در پے فلمیں بنا کر انہوں نے پاکستان کی فلمی صنعت کو مضبوط بنانے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

بھی صبیحہ خانم پر فلمایا گیا تھا اور سچویشن کے لحاظ سے اتنا موزوں تھا کہ بے اختیار رو دینے کو جی چاہتا تھا۔ صبیحہ خانم جو سنتوش کمار سے محبت کرتی ہیں یہ دیکھتی ہیں کہ سنتوش کمار مسرت نذیر کی بانہوں میں بانہیں ڈالے سیڑھیوں سے اتر رہے ہیں۔ یہ فلم مسرت نذیر کی پہلی اردو فلم تھی جس میں انہوں نے معاون اداکارہ کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ درحقیقت ان کی پہلی فلم پنجابی تھی جس کے ہدایت کار نعمان صاحب تھے اور سنتوش کمار ہی اس فلم کے ہیرو تھے۔ یہ بہت کامیاب فلم تھی جس نے مسرت نذیر کو راتوں رات پنجابی فلموں کی ہیروئن بنا دیا تھا۔ فلم قاتل انہوں نے پتن کی ریلیز سے پہلے سائن کی تھی اور ویسے بھی اس زمانے میں انور کمال پاشا کا بہت شہرہ تھا اور ان کی فلم میں کام کرنا ہر اداکار اور اداکارہ کی خواہش ہوتی تھی۔

انور کمال پاشا کی فلموں کے یہ دونوں گانے نہ صرف پاکستان میں بے حد مقبول ہوئے بلکہ ہندوستان والے بھی پاکستان سے آنے والوں سے ان گانوں کا ریکارڈ لانے کی فرمائش کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بمبئی میں معروف فلم ساز ہدایت کار اور دوسرے فلمی لوگوں میں بھی یہ گانے بہت پسند کیے جاتے تھے اور وہ ان کی بہت تعریف کرتے تھے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان دونوں گانوں نے بمبئی کی فلمی دنیا میں ہلچل مچادی تھی تو غلط نہ ہوگا۔

ان گانوں کے لکھنے والوں کے بارے میں جو ابہام پیدا ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں گانے اقبال بانو کے گائے ہوئے انور کمال پاشا ہی کی فلموں کے ہیں۔

ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

کی بے مثال کامیابی نے ایک زمانے میں قتیل شفائی اور اقبال بانو کو ایک دوسرے سے بہت قریب کردیا تھا۔ بعد میں یہ صورتِ حال تبدیل ہوگئی تھی۔ قتیل شفائی مرحوم ایک رنگین مزاج اور دل پھینک طبیعت کے مالک تھے۔ وہ اپنی اس کمزوری کو چھپاتے بھی نہیں تھے اپنی خود نوشت میں انہوں نے اپنے بہت سے رومانی مراسم کا بڑی بے تکلفی سے ذکر کیا ہے۔ جہاں تک اقبال بانو کا تعلق ہے انہیں ان دونوں گانوں کی بدولت بہت شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی جس کی وہ حق دار بھی تھیں۔ ان کی آواز میں جو تازگی اور شگفتگی تھی وہ دوسری گلوکاراؤں سے مختلف تھی اور ان کی آواز سننے والوں کے دلوں میں اتر جاتی تھی۔ انہوں نے بعد میں فیض احمد فیض کی غزلیں گا کر بھی بہت شہرت حاصل کی۔ غالب کی غزلیں بھی وہ بہت شوق سے گاتی تھیں۔

اقبال بانو ذاتی زندگی میں بہت شائستہ، بااخلاق اور رکھ رکھاؤ رکھنے والی خاتون تھیں اور جس محفل میں وہ نغمہ سرا ہوتی تھیں سننے والے اس کو بھول نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے ہماری لکھی ہوئی کسی فلم میں کام نہیں کیا۔ اس کے باوجود وہ جب بھی کہیں ملتی تھیں تو ایسے خلوص سے ملتی تھیں جیسے ہم لوگ بہت دیر سے ایک دوسرے کے شناسا ہیں۔ یہ جذبہ دو طرفہ تھا کیونکہ وہ ہمیں بھی بہت اچھی لگتی تھیں۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ جب بھی ملاقات ہوتی تھی تو ان کی فرمائش ہوتی تھی کہ کسی دن اپنی بیگم کو لے کر میرے گھر ضرور آئیں۔ ہم بھی پروگرام بناتے رہے مگر کبھی ان کے گھر جانے یا انہیں اپنے گھر مدعو کرنے کا موقع نہیں ملا۔

ان کے پروگرام محفل کی جان ہوا کرتے تھے۔ آخری بار جب چند سال پہلے ایک عزیزہ کے گھر ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے محفل میں ایسا رنگ باندھا کہ سننے والے شاید کبھی فراموش نہ کرسکیں۔ اس محفل کے دوران میں بارش شروع ہوگئی۔ یہ محفل آؤٹ ڈور میں شامیانے لگا کر سجائی گئی تھی۔ سب مہمانوں نے اِدھر اُدھر پناہ لے لی۔ اقبال بانو میزبان کے گھر میں جا کر بیٹھ گئیں۔ ہم بھی ان کے ساتھ اسی کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑے سے وقت میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ انہوں نے بہت محبت سے لبنیٰ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ان سے کہا کہ آپ کبھی آفاقی صاحب کو لے کر میرے گھر ضرور آئیں، مجھے بہت خوشی ہوگی۔ ہم نے پھر وعدہ کرلیا لیکن بارہا ارادہ کرنے کے باوجود ان کے گھر نہ جاسکے۔ کچھ دیر میں بارش تھم گئی اور محفل پھر شامیانے میں آراستہ ہوگئی۔ اقبال بانو نے اپنی نغمہ سرائی سے سماں باندھ دیا۔ افسوس کہ دوبارہ ان سے رُوبرو ملاقات کا موقع نہیں مل سکا البتہ مختلف پروگراموں میں ان کو سننے کے لیے چلے جاتے تھے مگر سامعین کے ہجوم میں شامل ہوتے تھے اس لیے علیک سلیک کی نوبت بھی نہیں آسکی۔ کچھ عرصہ بعد ان کے انتقال کی خبر شائع ہوئی تو بہت دکھ اور پچھتاوا ہوا کہ ہم ان کے بارہا مدعو کرنے کے باوجود ان کے گھر کیوں نہ گئے۔

اقبال بانو ایک بہت باوقار اور گریس فل خاتون تھیں۔ شائستگی اور آدابِ محفل تو ان پر ختم تھے۔ عموماً ساڑی باندھتی تھیں جو اُن پر بہت موزوں اور باوقار لگتی تھی۔ اب تو پرانی یادیں ہی رہ گئی ہیں۔ اقبال بانو نے میڈم نور جہاں جیسی گلوکارہ کے زمانے میں بہت نام پیدا کیا تھا اور اپنی علیحدہ شناخت بنائی تھی۔ میڈم بھی ان کی قدر داں تھیں۔

اب نہ وہ ہستیاں رہیں نہ وہ محفلیں۔

اللہ غریقِ رحمت کرے۔ کیسے کیسے لوگ اور کیسی کیسی ہستیاں تھیں جن کے دم سے زندگی میں رونق اور خوب صورتی تھی۔ اب تو بقول غالب

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

زبیدہ خانم بھی پچھلے دنوں انتقال کرگئی ہیں ان کے بارے میں پہلے بھی لکھ چکے ہیں، اس عظیم مگر سادگی پسند اور شہرت سے دور بھاگنے والی گلوکارہ کے بارے میں اگلی بار سہی۔ مانسہرہ کے ایاز راہی صاحب کا ایک تجربہ بھی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے۔

جاری ہے

شاہی سوتن

مریم کے خان

شاہی خاندان کے افراد بھی انسان ہوتے ہیں۔ ان کے دلوں میں بھی نفرت ومحبت پرورش پاتی ہے۔ ایسی ہی ایک روداد جس نے عرصہ تک عوام کو شش وپنج میں رکھا۔ لوگ خاموش نگاہوں سے محبت کے اس تکون کو دیکھتے رہے جس نے پوری دنیا کو متوجہ کررکھا تھا۔ محبت شادی، طلاق کے گرد گھومتے وہ مشہور واقعات جس کے بارے میں جاننے کے لیے لوگ بے چین رہا کرتے تھے۔

مشہور ترین واقعات میں سے ایک اہم رودادِ محبت

29 جولائی 1981ء کا دن برطانیہ کے شاہی خاندان اور برطانوی عوام کے لیے نہایت خوشی اور اہمیت کا حامل تھا کیونکہ اس دن تاج برطانیہ کا وارث چالیس سالہ شہزادہ چارلس رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے جا رہا تھا۔ خلافِ معمول طویل عرصے تک کنوارے رہنے کے بعد بالآخر شہزادہ چارلس کی شادی ایک اعلیٰ برطانوی گھرانے کی بیس سالہ دوشیزہ ڈیانا سے طے پائی تھی۔ شہزادہ عمر میں ڈیانا سے دوگنا بڑا تھا لیکن اسے ایک رومان انگیز شادی

قرار دیا جا رہا تھا۔ پُرجوش میڈیا اور عوام بالکل بھول گئے تھے کہ شاہی جوڑے میں صرف عمروں میں ہی نہیں بلکہ مزاج اور فطرت میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا۔ ڈیانا ایک نرم دل اور جذباتی عورت تھی۔ اس کے برعکس شہزادہ چارلس سرد مزاج اور سخت فطرت کا آدمی تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کے ساتھ ہر عورت گزارا نہیں کر سکتی .... صرف وہی عورت چارلس کے ساتھ رہ سکتی ہے جو اس کی فطرت کو سمجھ سکے اور ڈیانا میں اس کی صلاحیت نہیں تھی۔

رشتہ طے ہونے کے بعد شاہی جوڑے کی آنے والی رومان انگیز زندگی اور مصروفیات کی تصویریں کھینچی جانے لگیں جیسے سچ مچ ایسا ہی ہوگا۔ میڈیا کہانیاں بنانے میں پیش پیش تھا۔ اس لیے ایک معمولی سی ارینج اور نام نہاد لو میرج کو یوں بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا جیسے نہ جانے کتنے معرکتہ الآرا عشق کے بعد چارلس اور ڈیانا کی شادی ہونے جا رہی تھی۔ یہ شو بزنس کا ایک فن ہے اور دیگر جدتوں کی طرح مغرب اس کا امام ہے۔ برطانوی عوام اور مغرب کے علاوہ وہ تمام تیسری دنیا کے ممالک جہاں کسی زمانے میں برٹش راج رہا تھا آج بھی کسی نہ کسی طرح برطانیہ کے زیر اثر ہیں اور اس وجہ سے وہ اس شادی میں ایسے دل چسپی لے رہے تھے جیسے یہ ان کی ذاتی شادی ہو۔ برٹش اور بین الاقوامی میڈیا نے اسے رنگ آمیزی کے ساتھ دکھا کر کیش کرا لیا۔

شادی کی تقریب نہایت رنگا رنگ تھی جس میں ہزاروں خصوصی مہمانوں نے شرکت کی تھی۔ لاکھوں افراد اسے دیکھنے کے لیے سڑکوں پر موجود تھے اور بلاشبہ کئی کروڑ افراد اسے براہِ راست ٹی وی پر دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد کسی شادی کو براہ راست اتنے افراد نے نہیں دیکھا تھا۔ جب یہ جوڑا روانہ ہوا تو لوگوں کا جوش و خروش اور خوشی دیکھنے والی تھی لیکن اتنے سارے لوگوں میں مہمانوں میں شامل ایک عورت نہایت سپاٹ چہرے کے ساتھ شامل تھی۔ اس ساری تقریب کے دوران اس کے چہرے پر ایک بار بھی خوشی کی رمق نظر نہیں آئی تھی بلکہ بعض موقع پر وہ آزردہ اور کبیدہ خاطر بھی دکھائی دی۔ لیکن اس وقت کسی نے یہ بات نوٹ نہیں کی۔ شاید ہی کوئی جانتا تھا کہ آنے والے دنوں میں شاہی جوڑے میں طلاق کی بنیادی وجہ یہی عورت ہوگی۔ اس وقت شاید صرف تین افراد یہ بات جانتے تھے۔ ایک شہزادہ چارلس، دوسری لیڈی ڈیانا اور تیسری یہ عورت جو اس وقت کمیلا پارکر کہلاتی تھی۔

☆☆☆

17 جولائی 1947 کی تاریخ کو رائل آرمی کے سابق میجر بروس شینڈ اور روز النڈ کیوبٹ کے ہاں کنگز کالج اسپتال لندن میں ایک بچی نے جنم لیا۔ انہوں نے اسے روزمیری ٹی شینڈ کے نام سے بپتسمہ دلوایا۔ بچی بہت پیاری اور صحت مند تھی اور پھر اس جوڑے کی پہلی اولاد تھی اس لیے ماں باپ نہال ہو گئے۔ بچی کے بال سنہری مائل سفید اور آنکھیں سیاہی مائل سرخ تھیں۔ بالوں اور آنکھوں کا یہ جوڑ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ روزا خوب صورت عورت تھی لیکن اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور بال اسی طرح سنہرے مائل سفید تھے۔ اس نے بچی کو دیکھنے کے بعد اپنے شوہر بروس سے کہا۔ ”ہماری بچی کی آنکھیں سیاہی مائل سرخ ہیں۔ ایسی لڑکیاں بہت مستقل مزاج ہوتی ہیں۔“

میجر بروس ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا اس کے خیال میں انسان کی تمام صفات تربیت اور ماحول کے اثر سے ہوتی ہیں۔ اس نے بات کو ٹالنے کے لیے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ”میں نے بہت ساری ایسی عورتیں دیکھی ہیں جن کی آنکھوں کا رنگ بالکل مختلف ہوتا ہے لیکن وہ نہایت مستقل مزاج ہوتی ہیں۔“

”میں صرف آنکھوں کے رنگ کی بات نہیں کر رہی ہوں۔“ روزا نے وضاحت کی۔ ”میں بالوں کے برعکس رنگ کی بات کر رہی ہوں۔ ایسی لڑکیاں اپنے اندر کی بات سب سے چھپا کر رکھتی ہیں اور اپنا ظاہر سپاٹ کر لیتی ہیں۔“

بروس نے اعتراض کیا۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ لڑکیاں کسی کے سامنے تو کھلتی ہیں۔“

”ہاں صرف اس کے سامنے جس سے وہ سچ مچ محبت کرتی ہوں۔“

ننھی کمیلا اس بات سے بے خبر کہ اس کے ماں باپ اس کے بارے میں کیا بات کر رہے ہیں اپنے پالنے میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ ان کے طبقے کے رواج کے مطابق کمیلا کو دن اور رات میں بیشتر وقت اپنے پالنے میں گزارنا پڑتا تھا اور اسے صرف خوراک، صفائی یا کچھ دیر کھیلنے کے لیے پالنے سے نکالا جاتا تھا۔ یہ رواج تقریباً تمام سفید اقوام میں ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح بچے مضبوط بنتے ہیں۔ ان کی تنہائی انہیں آگے بڑھنے اور زندگی کے چیلنج قبول کرنے پر اکساتی ہے۔ حالانکہ اس رواج کی وجہ سے بچوں کا ماں باپ سے تعلق کمزور پڑ جاتا ہے اور وہ خود مختار ہونے کے بعد عام

طور سے پلٹ کر ماں باپ کی طرف دیکھتے بھی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے رشتوں سے لاپرواہی، بے حسی اور کسی حد تک خود غرضی مغربی اقوام کی فطرت میں شامل ہو گئی ہے۔

دو بختے کی عمر میں کمیلا کے لیے گورنس رکھی گئی۔ میجر بروس کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ وہ اپنی بچی کے لیے گورنس کا خرچ برداشت کر سکتا... اگر اس کے پاس جاگیر کی آمدنی نہ ہوتی۔ خاندانی لحاظ سے وہ متمول آدمی تھا۔ اس لیے کمیلا کو بچپن سے تمام آسائشیں اور سہولتیں میسر تھیں۔ سسیکس کاؤنٹی میں پلمپٹن ریس کورس کے سامنے میجر بروس کی آبائی جاگیر اور حویلی تھی۔ اس عالی شان حویلی میں بے شمار بڑے کمرے اور ایک بہت بڑا ہال تھا۔ جب حویلی میں کوئی تقریب ہوتی تو اس ہال کو استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کا فرش سفید اور سیاہ ماربل کا بنا ہوا تھا اور ننھی کمیلا کو اس پر دوڑ کر پھسلنا اچھا لگتا تھا۔ یہ کام وہ اپنی گورنس مسز ماربل سے چھپ کر کرتی تھی۔ ایک دن وہ موقع پا کر فرش پر پھسل رہی تھی کہ اس کا پاؤں سچ مچ پھسلا اور وہ بہت زور سے گری۔ اس کے گھٹنے پر شدید چوٹ آئی تھی اور ایک ہفتے تک وہ ٹھیک سے چل نہیں سکی تھی اس کے بعد ہال میں اس کا داخلہ بند ہو گیا۔

میجر بروس کا شمار قومی ہیروز میں ہوتا تھا۔ وہ دوسری جنگِ عظیم میں برطانوی فوج کی طرف سے جرمنوں کے خلاف لڑا اور اس جنگ کے دوران وہ قیدی بھی بن گیا تھا۔ جنگ کے بعد اسے ملٹری کراس سے نوازا گیا۔ کمیلا کی پیدائش کے بعد اس نے فوج سے ریٹائرمنٹ لے لی اور شراب کی تجارت شروع کر دی۔ وہ کامیاب رہا اور اس نے خاصی دولت کمائی تھی۔ اس کامیابی کو اس نے کمیلا کے نام کیا کہ اس کی پیدائش بروس کے لیے کامیابی کا پیغام لائی تھی۔ روزا بھی خوش تھی کیونکہ فوج میں ہونے کی وجہ سے بروس زیادہ تر حویلی سے دور رہتا تھا لیکن اب وہ اس کے پاس ہوتا تھا۔ شادی کے ابتدائی سال روزا نے بہت تنہائی میں گزارے تھے۔ پھر کمیلا کی صورت میں اسے ایک مصروفیت اور مل گئی تھی۔ کمیلا کے بعد ان کے خاندان میں مارک اور اینابیل کا اضافہ ہوا تھا۔

شینڈ خاندان کی بھی شاہی خاندان سے قرابت داری تھی۔ اسی طرح روز النڈ کیوبٹ کا خاندان برطانیہ کے اعلیٰ خاندانوں میں شمار ہوتا ہے۔ ان دونوں خاندانوں کے بہت سے لوگوں نے تاج برطانیہ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں اور صلے میں اونچے مناصب اور جاگیریں حاصل کیں۔ تین سال کی عمر میں اسے کھیلوں کا شوق ہوا تھا لیکن

وہ شوخ اور شریر نہیں تھی۔ جو کھیل کھیلتی پوری سنجیدگی اور متانت کے ساتھ کھیلتی تھی۔ اس کی یہ عادت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پختہ ہوتی چلی گئی۔ ابھی اس کے اسکول جانے کی عمر نہیں ہوئی تھی۔ مگر مسز ماربل اور روزا اسے گھر میں پڑھاتے تھے۔ مسز ماربل اسے برطانیہ کی تاریخ اور ثقافت کے بارے میں بتاتی تھی اور روزا اسے خاندان کے بارے میں بتاتی تھی۔ خود کمیلا کو بھی اپنے خاندان کے بارے میں سننا اچھا لگتا تھا۔ کمیلا کو سب سے زیادہ دل چسپی اپنی رشتے کی ایک پردادی ایلس کیپل سے تھی۔ ایلس جو شادی کے بعد ایلس فریڈریکا ایڈمن اسٹون کہلانے لگی تھی۔ اس نے شوہر سے طلاق لے لی اور بادشاہ ایڈورڈ ہفتم کی مسٹریس بن گئی۔ ایڈورڈ ہفتم نے 1898 سے 1910 تک برطانیہ پر حکومت کی تھی۔

کمیلا کو ایلس کے بارے میں بے انتہا تجسس تھا اور وہ اکثر ماں سے اس کے بارے میں سوالات کرتی تھی کہ اس نے کس طرح بادشاہ کے دل میں گھر کیا تھا۔ ایلس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ملکہ اور شاہی خاندان کی دوسری تمام خواتین سے زیادہ ایڈورڈ ہفتم کے مزاج میں دخل رکھتی تھی۔ شاہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ نجی تقریبات اور دعوتوں میں ایلس ہی شاہ کے ساتھ ہوتی تھی اور بعض اوقات وہ سرکاری تقریبات میں بھی ملکہ کی جگہ شاہ کے ساتھ جاتی تھی۔ ملکہ اور دوسری شاہی خواتین ایلس سے نفرت کرتی تھیں لیکن وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھیں۔ افسوس کہ شاہ ایڈورڈ کو زیادہ عرصے حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ صرف بارہ برس بعد وہ تخت اور دنیا دونوں سے رخصت ہو گیا۔ اس کے ولی عہد ایڈورڈ ہشتم نے تو تاریخ رقم کر دی جب اس نے ایک بیوہ ول سمپسن کی خاطر تخت برطانیہ سے دست برداری اختیار کر لی اور ملک چھوڑ کر امریکا چلا گیا۔

ایسا لگتا ہے انیسویں صدی کے شاہانِ برطانیہ کو بیوہ یا طلاق یافتہ عورتوں سے خاص رغبت تھی۔ صرف یہی نہیں ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ شاہانِ برطانیہ کو غیر شاہی خواتین سے کچھ زیادہ ہی دل چسپی تھی۔ وہ ان کی خاطر اپنی ملکاؤں اور دوسری شاہی خواتین کو نظر انداز کرنے سے لے کر تاج و تخت چھوڑنے تک سب کچھ کرنے کو تیار رہا کرتے تھے۔ یہ کہنا تو ٹھیک نہیں ہوگا کہ ننھی کمیلا نے اسی وقت کسی شہزادے پر ڈورے ڈالنے کا سوچ لیا ہوگا لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اسے

شاہی خاندان کے مردوں اور خاص طور سے صاحبانِ اختیار کے مزاج کا اندازہ کم عمری میں ہو گیا تھا اور وہ جان گئی تھی کہ انہیں کس طرح متاثر کیا جا سکتا تھا یا ان کے دل میں کس طرح جگہ بنائی جا سکتی تھی۔

پانچ برس کی عمر میں کمیلا کو اسکول میں داخل کرانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے لیے کاؤنٹی کا... بہترین ڈمبریلز اسکول چنا گیا۔ یہ مخلوط تعلیم کا ادارہ تھا اور یہاں زیادہ تر امرأ اور لارڈز خاندانوں کے بچے زیرِ تعلیم تھے۔ کمیلا دس برس کی عمر تک اسی اسکول میں زیرِ تعلیم رہی اور یہیں اس نے وہ دوست بنائے جو ساری عمر اس کے دوست رہے۔ خاموش اور سنجیدہ رہنے والی کمیلا میں دوسروں کو متوجہ کرانے کی ایسی صلاحیت تھی جو بہ ظاہر محسوس نہیں ہوتی تھی لیکن اس کے پاس آنے والے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ وہ کھیلوں اور غیر نصابی سرگرمیوں کی زیادہ شوقین نہیں تھی لیکن وہ جس کام یا کھیل میں حصہ لیتی اس میں نمایاں پوزیشن حاصل کر لیتی تھی۔ تعلیم میں وہ اوسط سے کہیں بہتر طالبہ تھی اور شاہی تاریخ اس کا پسندیدہ موضوع تھا۔ بعد میں اس نے یورپ کی شاہی تاریخ کو بہ طور مضمون لیا تھا۔ کمیلا کی ایک اسکول ٹیچر مسز لیگو رتھ نے اس کے بارے میں بتایا۔

”کمیلا بہت نمایاں نہیں تھی۔ وہ منظرِ عام پر رہنا پسند نہیں کرتی تھی۔ مگر ساتھ ہی وہ دوسروں کو متاثر کرنے کا فن جانتی تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کا صبر و تحمل اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت تھی۔ جب اسے مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا تو وہ سمندر کی چٹان بن جاتی تھی جو بہ ظاہر نمایاں نہیں ہوتی ہے لیکن اندر ہی اندر وہ بپھری لہروں کا مقابلہ کرتی ہے۔ جب میں نے سنا کہ اس کا شہزادہ چارلس سے افیئر ہے تب مجھے یقین ہو گیا کہ ایک دن وہ اسے حاصل کر کے رہے گی۔“

کمیلا کا اگلا اسکول ساؤتھ کینسنگٹن میں واقع فیشن ایبل کوئنز گیٹ اسکول تھا۔ اس کا شمار برطانیہ کے چند اعلیٰ ترین ابتدائی تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے اور یہاں اچھے خاندان کی ذہین طالبات کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ کمیلا نے یہاں سے او لیول کی ڈگری ہی حاصل نہیں کی بلکہ اس نے سیکھا کہ اسے آنے والے دنوں میں اپنی سوسائٹی میں کن مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا اور ان سے اسے کس طرح نمٹنا ہے۔ اسکول کی طالبات کے لیے لازم تھا کہ وہ کچھ عرصے بیرونِ ملک کسی اسکول میں مہمان طالبہ کی حیثیت سے وقت گزاریں۔ یہ ایک طرح سے تربیتی دورہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد انہیں ڈگری دی جاتی تھی۔ کمیلا نے سوئٹزر لینڈ کے مون فرنائل اسکول کا انتخاب کیا۔ وہ تین مہینے یہاں رہی اور اس نے برطانوی ہسٹری کا مطالعہ کیا اور آخر میں وہ کچھ عرصے پیرس کے انسٹیٹیوٹ آف برٹانیکا میں زیرِ تعلیم رہ کر لندن لوٹ آئی۔

کوئنز گیٹ اسکول میں کمیلا نے صرف تعلیم ہی حاصل نہیں کی تھی بلکہ اس نے وہاں یہ بھی سیکھا کہ برطانوی معاشرے میں ایک نوجوان لڑکی کے کیا مشاغل ہوتے ہیں اور اسے کس طرح مختلف سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہیے۔ سولہ سال کی عمر لڑکیوں کے لیے خاصی سنسنی خیز ہوتی ہے جب وہ نت نئی چیزیں سیکھتی ہیں اور ان کے اندر آنے والی جسمانی و ذہنی تبدیلیاں انہیں نئے جہانوں سے روشناس کراتی ہیں۔ وہ لذت اندوزی کے نئے راستوں سے واقف ہوتی ہیں۔ جنسِ مخالف اور نشہ ان کی زندگی میں شامل ہوتے ہیں۔ کمیلا بھی اس دور سے گزری اور اس نے ان چیزوں کو اپنی زندگی پر حاوی ہونے نہیں دیا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں سے دور رہی تھی۔ اس کا اولین بوائے فرینڈ روڈی جو ایک لارڈ خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ کمیلا سے اس کی دوستی بہت مختصر عرصے کے لیے ہوئی اور جب وہ تربیت کے لیے بیرونِ ملک گئی تو یہ دوستی وہیں ختم ہو گئی۔

ملک واپسی کے بعد کمیلا نے اپنی تعلیم کا سلسلہ آگے شروع کیا۔ اب تک وہ ایک بہت بڑے گھر میں رہتی آئی تھی لیکن کالج میں داخلے کے بعد اسے لندن .... منتقل ہونا پڑا۔ یہاں وہ بیل گریویا کے علاقے کینڈی اسٹریٹ پر دو بیڈروم کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتی تھی۔ پورا فلیٹ اس کی حویلی میں اس کے بیڈروم سے بھی چھوٹا تھا۔ مزے کی بات ہے اس میں بھی وہ اکیلی نہیں تھی بلکہ اسے فلیٹ موزا کیم بیل کے ساتھ شیئر کرنا پڑا تھا۔ موزا ایبری کون کے چوتھے ڈیوک جیمس ہملٹن کی بیٹی تھی۔ اس کی ماں ملکہ الزبتھ دوم کی ذاتی خادمہ تھی اور اس کی ملکہ الزبتھ (مادر ملکہ) سے دوستی تھی۔ موزا سے کمیلا کی شروع میں اتنی بے تکلفی نہیں تھی لیکن رفتہ رفتہ وہ اچھی دوست بن گئیں اور ایک دوسرے کا خیال رکھنے لگی تھیں۔ موزا کی ماں کے توسط سے ہی کمیلا پہلی بار مادر ملکہ الزبتھ سے ملی۔ ملکہ کو یہ لڑکی اچھی لگی تھی جس کا جسم کسی ایتھلیٹ جیسا تھا لیکن اس کی باتوں میں علمیت تھی۔ مگر جلد موزا شادی کر کے چلی گئی اور کمیلا کی اگلی

ساتھی ورجینیا کیرنگٹن تھی۔ وہ ایک سابق طاقتور سیاست دان اور لارڈ کیرنگٹن کی بیٹی تھی۔ بڑے خاندان سے تعلق کے باوجود دوسرے نوجوانوں کی طرح کمیلا نے بھی اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا۔ بریوں اسے جو رقم دیتا تھا وہ اس کی ضرورت کے لیے کافی ہوتی تھی اس کے باوجود وہ خود کمانا چاہتی تھی۔ اگرچہ وہ ابھی زیرِ تعلیم تھی۔ یہ مغربی معاشرے کی روایت ہے یہاں انسان جیسے ہی جوان ہوتا ہے اور اسکول کی تعلیم مکمل کرتا ہے اسے خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونا پڑتا ہے اور وہ بھول جاتا ہے کہ وہ کس باپ کی اولاد ہے اور کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے معلوم ہے معاشرہ اسے اس کی صلاحیتوں سے پہچانے گا اس کے خاندان سے نہیں۔

کمیلا کو نوکری تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور ایک فرم میں اسے پارٹ ٹائم سیکریٹری کے طور پر کام مل گیا۔ یہ انٹیریئر ڈیکوریشن فرم تھی۔ اس ملازمت کے دوران اسے انٹیریئر ڈیکوریشن سے دل چسپی پیدا ہوئی اور اس نے بغیر کسی ڈگری کے اس کام میں اتنی مہارت پیدا کر لی کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسی فرم میں اسے ڈیکوریٹر کی جاب مل گئی۔ اس میں تنخواہ تو اتنی نہیں تھی لیکن اسے یہاں سے سیکھنے کا موقع ملا۔ چند سال بعد اس نے ملازمت کے ساتھ ہی ٹھیکے لینا شروع کر دیے تھے۔ جلد وہ اتنا کمانے لگی کہ اس نے لندن میں اپنا فلیٹ خرید لیا۔ ان ہی دنوں اس کے پاس پہلی کار آئی تھی۔ یہ امریکن شیورلیٹ تھی۔ چند سال چلی ہوئی یہ کار بہت اچھی حالت میں تھی اور کمیلا نے اسے ایک نیلام گھر سے خریدا تھا۔

ایک فوجی باپ کی بیٹی اور جاگیردار خاندان سے تعلق کی وجہ سے ہتھیار اور نشانے بازی کمیلا کے لیے کوئی اجنبی چیز نہیں تھی۔ سات سال کی عمر میں اس نے بندوق چلانا سیکھ لیا تھا اور دس سال کی عمر میں اس کا نشانہ اتنا پختہ ہو گیا تھا کہ سو گز کے فاصلے سے بیئر کی بوتل اُڑا دیتی تھی۔ بارہ سال کی عمر میں وہ ماہر گھڑ سوار بن گئی تھی۔ اس نے پولو کھیلنے کی کوشش کی مگر وہ اس میں زیادہ مہارت پیدا نہیں کر سکی تھی اس لیے اس نے جلد اس کھیل کو خیرباد کہہ دیا لیکن اس کی پولو سے... دلچسپی دیکھنے کی حد تک برقرار رہی تھی۔ لندن میں انٹیریئر ڈیکوریٹر کے طور پر کام کرنے والی کمیلا کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ نشانے بازی اور گھڑ سواری کی بھی ماہر ہے۔

جیسے امریکا میں ہرن اور بارہ سنگھے کا شکار قومی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح برطانیہ میں لومڑی کا شکار ایک قومی روایت ہے۔ بادشاہ سے لے کر امرأ تک سب اس میں جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں۔ لومڑی کے شکار کے لیے خاص طور سے رائفلیں بنائی جاتی ہیں۔ گھوڑے اور کتے سدھائے جاتے ہیں اور اس میں خاصی دولت خرچ کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ میں فرمز ہیں جو خاص طور سے امرأ کے لیے لومڑی کے شکار کا انتظام کرتی ہیں۔ دولت مند منہ مانگے داموں شکار کھیلتے ہیں۔ ایسی ہی ایک فرم میں خاتون شکاری معاون کی ملازمت کا اشتہار آیا۔ کمیلا نے محسوس کیا کہ وہ یہ کام کر سکتی ہے حالانکہ اس نے پہلے کبھی لومڑی کا شکار نہیں کھیلا تھا لیکن اس کا نشانہ بہت اچھا تھا اور وہ ماہر گھڑ سوار تھی۔ کمیلا کو مزید آمدنی کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ کچھ نیا کام کرنا چاہتی تھی اس لیے اس نے ملازمت کے لیے درخواست دے دی اور اسے منتخب بھی کر لیا گیا۔ وہ لومڑی کا شکار کروانے لگی۔ بہ ظاہر یہ کام اتنا مشکل نہیں تھا لیکن شکار کرنے والے جانتے تھے کہ لومڑی کا شکار آسان نہیں ہوتا ہے۔ لومڑی درمیانے اور چھوٹے درندوں میں سب سے چالاک جانور ہے۔ بعض اوقات یہ شکاریوں کو ایسے چکر دیتی ہے کہ خود ان کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔

ساؤتھ ویلز میں ایک بار چند امریکی دولت مندوں کو شکار کھلانے کے دوران کمیلا تقریباً موت کے منہ میں جا پہنچی تھی۔ کتوں نے جھاڑیوں میں چھپی ایک لومڑی کو تلاش کر کے باہر آنے پر مجبور کیا لیکن اناڑی نشانے باز اسے نشانہ نہیں بنا سکے اور لومڑی بھاگ نکلی۔ کمیلا اور دونوں شکاری گھوڑوں پر سوار ہو کر لومڑی کا پیچھا کرنے لگے۔ وہ گھوڑوں سے بچنے کے لیے ایک ندی میں اتر گئی جس میں پانی زور و شور سے بہہ رہا تھا۔ لومڑی کو اوپر لانے کے لیے کمیلا گھوڑے سمیت ندی کے کنارے آئی تو گھوڑے کا توازن بگڑ گیا اس نے کمیلا کو گرا دیا۔ وہ لڑھک کر ندی میں گرنے والی تھی کہ ایک گرے ہوئے درخت کے تنے کا ایک نکلا ہوا حصہ کمیلا کے ہاتھ میں آ گیا اور وہ اس کے سہارے لٹک گئی۔ فوراً ہی شکاریوں نے آ کر اسے اوپر کھینچ لیا۔ اگر اس روز تنے کا نکلا حصہ اس کے ہاتھ نہ آتا تو شاید کمیلا اسی وقت تاریخ کا حصہ بن جاتی۔ وہ اس حادثے سے خوف زدہ نہیں ہوئی تھی... بلکہ اسے لومڑی کے شکار کا ایسا چسکا لگا کہ جب اس نے یہ ملازمت چھوڑ دی تب بھی وہ شکار پر جاتی رہی اور اس وقت

شکار ترک کیا جب 2004 میں اس پر پابندی لگ گئی تھی۔

انٹیریئر ڈیکوریشن اور شکار کے بعد کمیلا کا تیسرا شوق باغبانی اور ایک خاص نوع کی باغبانی تھی جسے ہورٹی کلچر کہتے ہیں۔ اس میں درخت اور پودے ان کے مخصوص ماحول میں لگائے جاتے ہیں۔ یعنی انہیں وہ ماحول فراہم کیا جاتا ہے جو ان کے لیے فطری ہو۔ اس طرح بہترین پھل، سبزی اور پھول حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ انٹیریئر ڈیکوریشن کے حوالے سے کمیلا کو باغبانی سے دل چسپی ہوئی تھی اور ویسے بھی اس کا تعلق ایک جاگیردار خاندان سے تھا۔ یہ سب اس کے لیے نامانوس نہیں تھا۔ مگر ہورٹی کلچر اس کے لیے ایک نئی چیز تھی اور اسی نے اسے متوجہ کیا۔ رفتہ رفتہ اس کی دل چسپی اتنی بڑھی کہ اس نے اس بارے میں دستیاب تمام کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اس کے بعد اس نے ہورٹی کلچر کے کچھ کورسز کیے اور اسے بھی اپنے انٹیریئر ڈیکوریشن کا ایک حصہ بنالیا۔

اب وہ کسی لارڈ کو بتاتی کہ اس کے ڈرائنگ روم کے ساتھ شیشے کی دیوار کے پیچھے کسی ٹراپیکل باغ کا منظر دکھائی دے سکتا ہے یا صحرا میں کھجور کا چھوٹا سا باغ ہوسکتا ہے تو اسے یقین نہیں آتا۔ مگر جب کمیلا نے اس قسم کے کچھ کام کرکے دکھائے تو اس کے کام کو چار چاند لگ گئے تھے۔ یہ سارے شوق اور مشاغل اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے لیے مخصوص تھے۔

ایسا لگ رہا تھا کمیلا نے وہ تمام شوق اور مشغلے اپنائے تھے جو اسے اوپری طبقے میں مقبول بناتے۔ لیکن اس نے انہیں صرف اپنایا نہیں تھا بلکہ...... ان میں مہارت بھی حاصل کی تھی۔ خاص طور سے ہورٹی کلچر میں وہ برطانیہ کے چند گنے چنے ماہرین میں سے ایک ہے۔

نوجوانی میں کمیلا کے وہی مشاغل تھے جو اس عمر کی ایک برطانوی لڑکی کے ہوسکتے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ تفریح، تعلیم، ملازمت، مستقبل کی فکر اور شادی کے لیے ایک موزوں شخص کی تلاش۔ جس وقت برطانیہ میں متوسط طبقے میں شادی کرنے کا رجحان کم ہورہا تھا اس وقت اوپری طبقے میں شادی کرنے کا رجحان برقرار تھا۔ یہاں نوجوان لڑکیاں تعلیم کے بعد شادی تک وقت گزاری کے لیے نوکری یا کوئی کام کرتی ہیں۔ ایسا ہی کمیلا کر رہی تھی۔ اس کی اینڈریو پارکر سے پہلی ملاقات 1970 سے ذرا پہلے ہوئی جب وہ صرف بائیس برس کی تھی۔ قسمت کی بات دیکھیے کہ تقریباً ان ہی دنوں اس کی ملاقات شہزادہ چارلس سے ہوئی تھی۔ لیکن یہ ملاقات فوراً ہی پسند کے رشتے میں نہیں ڈھلی تھی۔ اسی طرح اس نے میجر اینڈریو کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دی تھی جو اس وقت برٹش آرمی میں تھا اور وہ ایک سال بعد میجر بن چکا تھا۔ اس کا تعلق بھی اعلیٰ برطانوی طبقے سے تھا۔ البتہ اس سے کئی ملاقاتوں کے بعد کمیلا نے محسوس کیا کہ وہ اس کے لیے ایک موزوں امیدوار ہوسکتا ہے۔

خود میجر اینڈریو بھی کمیلا میں دل چسپی لے رہا تھا۔ شروع میں یہ دل چسپی بہت سطحی قسم کی تھی لیکن جلد میجر اینڈریو نے محسوس کیا کہ کمیلا عام لڑکیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذہین اور باصلاحیت تھی۔ اسے لوگوں سے ملنے اور ان کے دل موہ لینے کا فن آتا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ خاندان کی لڑکی تھی اور اس کی ذات میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو میجر اپنی بیوی میں دیکھنا چاہتا تھا مگر میجر اینڈریو اس بات سے ناواقف تھا کہ وہ جس عورت کو اپنی بیوی کی حیثیت دینا چاہتا تھا، وہ پرنس آف ویلز چارلس سے آشنائی رکھتی ہے اور ان دونوں میں پسند کا رشتہ بھی پنپ رہا تھا۔ اسی طرح شہزادہ چارلس انجان تھا کہ اس کی پسند کمیلا پارکر ایک اور شخص سے بھی تعلق رکھتی ہے اور یہ تعلق اتنا گہرا ہے کہ وہ آنے والے دنوں میں اس کی شادی کی درخواست بھی قبول کرنے والی تھی۔

1970 میں جب کمیلا کی میجر بروس سے دوستی ہوئی تقریباً ان ہی دنوں اس کی شہزادہ چارلس سے ایک پولو میچ کے دوران ملاقات ہوئی۔ ابتدائی گفتگو کے بعد چارلس نے کمیلا میں دل چسپی لینا شروع کردی تھی۔ پرنس آف ویلز کی کمیلا سے ملاقات اس کی ایک سابق گرل فرینڈ لوسیا سانتا کرز نے کرائی تھی۔ وہ چارلس کی کئی گرل فرینڈز میں سے ایک تھی اور ایک زمانے میں یہ تاثر عام تھا کہ شہزادہ چارلس اس سے شادی کرے گا۔ مگر جلد ہی شاہی خاندان کی طرف سے لوسیا کے لیے ناپسندیدگی کے جذبات کھل کر سامنے آگئے اور ملکہ الزبتھ دوم نے شہزادے کو خبردار کیا کہ لوسیا سے اس کی شادی شاہی خاندان اور اس کے ہونے والے بادشاہ کے لیے کسی طرح سودمند ثابت نہیں ہوگی۔ ملکہ نے لوسیا کو شاہی خاندان کے لیے نااہل قرار دیا تھا۔ مجبوراً چارلس کو لوسیا سے تعلق محدود کرنا پڑا تھا۔ اب وہ صرف گرل فرینڈ تھی اور چارلس نے اسے واضح الفاظ میں بتادیا تھا کہ ان کی آپس میں شادی ممکن نہیں ہے۔ لوسیا اگر دل برداشتہ بھی ہوئی تھی تب بھی اس نے چارلس سے تعلق ختم کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ وہ بہرحال پرنس آف ویلز تھا اور اس سے تعلق

کسی بھی عورت کے لیے باعثِ فخر ہوسکتا تھا۔

برطانوی مصنف رابرٹ لاسے اپنی کتاب ”ہر میجسٹی“ میں لکھتا ہے۔ ”ملکہ الزبتھ دوم آغاز میں ہی چارلس اور کمیلا کے افیئر سے آگاہ ہوگئی تھی اور اس نے کمیلا کو مسترد کر دیا تھا۔ اگرچہ مادر ملکہ جو کمیلا سے مل چکی تھی وہ اس کے حق میں تھی اور اس نے ملکہ الزبتھ دوم کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی کہ کمیلا چارلس کے لیے ایک موزوں انتخاب ہے۔ مگر ملکہ الزبتھ دوم اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ چارلس کمیلا کے معاملے میں سنجیدہ ہے اور اگر اسے کمیلا سے دور کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی تو وہ اس سے منگنی کا اعلان بھی کرسکتا ہے۔ بہت غور و فکر کے بعد ملکہ نے اس کام کے لیے اپنے رشتے کے چچا لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے رابطہ کیا۔ ساری صورتِ حال اس کے علم میں تھی۔ خود لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو کمیلا ناپسند تھی۔ اس لیے جب ملکہ نے اس سے کچھ کرنے کی درخواست کی تو اس نے نہایت ہوشیاری سے چکر چلا کر شہزادہ چارلس کو طویل لازمی فوجی خدمات پر ملک سے باہر چلتا کیا۔ (ملکہ نے درست انتخاب کیا تھا کیونکہ موصوف کو سازشوں کا نہایت طویل تجربہ تھا) لیکن اس معاملے کے پسِ پردہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ایک اور فکر میں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شہزادہ اس کی پوتی اماندا نچ بل سے شادی کرلے اور وہ پرنسز آف ویلز بن سکے۔ لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی سازش کا یہ حصہ ناکام ثابت ہوا۔ چارلس نے اماندا میں قطعی کوئی دل چسپی ظاہر نہیں کی حالانکہ ان دنوں یہ خاتون شہزادے کے آس پاس منڈلاتی تھیں۔ حسن اور چالاکی میں اپنی دادی یعنی لیڈی ماؤنٹ بیٹن پر گئی تھی جو ایک زمانے میں جواہر لال نہرو کی منظورِ نظر تھی اور تقسیمِ ہند کے دوران ہونے والی سازشوں اور ناانصافیوں میں اس خاتون کا ہاتھ بھی تھا۔

کمیلا سے ابتدائی ملاقاتوں کے بعد چارلس کو محسوس ہوا کہ ان دونوں میں بہت زیادہ ذہنی ہم آہنگی ہے۔ دونوں کی دل چسپیاں اور مشاغل ایک جیسے تھے۔ جیسے شہزادے کو بھی ہسٹری سے دل چسپی تھی۔ وہ گھڑ سواری، پولو اور شکار کا شوقین تھا۔ اسے بھی کمیلا کی طرح بیرونی تفریحات زیادہ پسند تھیں۔ چارلس کو باغبانی سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی لیکن وہ اس بارے میں معلومات ضرور رکھتا تھا۔ پھر اسے کمیلا کے پختہ ذہن اور مضبوط سوچ نے بھی متاثر کیا تھا۔ چارلس کے آس پاس جو لڑکیاں اور خواتین منڈلاتی تھیں ان میں سے بیشتر کم ذہن اور ایک مخصوص سوچ کی حامل تھیں۔ انہیں سوائے بننے سنورنے اور ناز نخرے دکھانے کے کسی کام میں مہارت حاصل نہیں تھی... یا وہ زیادہ سے زیادہ کسی ایک شعبے کے بارے میں کچھ جانتی تھیں۔ ان کے مقابلے میں کمیلا اسے اپنے معیار کی لگی تھی اور پھر ان میں ذہنی ہم آہنگی بھی ہوگئی تھی۔

انگریز دوسری یورپی اقوام کے مقابلے میں عورتوں کی خوب صورتی سے زیادہ ان سے ذہنی ہم آہنگی کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک شکل صورت ثانوی چیز ہے، اصل چیز عورت کا کردار اور اس کی ذہنی صلاحیت ہے۔ یہی وجہ ہے انگریزوں کے بارے میں طنزاً کہا جاتا ہے کہ یورپ کی تمام اقوام کی اپنی لائف ہے لیکن انگریزوں میں اس کی جگہ گرم پانی کی بوتل ہے۔ وہ سیکس پارٹنر کے بجائے لائف پارٹنر کے قائل ہیں۔ چارلس بھی انگریز ہے اس نے بے شمار حسین ترین عورتوں اور لڑکیوں کو نظر انداز کرکے کمیلا کا انتخاب کیا جو جوانی میں بھی بہت خوب صورت نہیں تھی۔ ہاں اسے دلکش ضرور کہا جاسکتا تھا۔

کمیلا میں دل چسپی کے باوجود چارلس ابھی تک اسے پروپوز نہیں کرسکا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو شہزادے کی ناتجربے کاری تھی۔ وہ ہچکچاہٹ کا شکار تھا کہ اس نے درست انتخاب کیا ہے یا نہیں؟ دوسری وجہ خاندان کی مخالفت تھی۔ اس کی ماں اور بہنوں نے پالیسی بنا رکھی تھی کہ وہ جس لڑکی کو پسند کرے گا وہ اس کی مخالفت کریں گی۔ شاید اس کے پس پشت سب سے برتر ہونے کا جذبہ تھا۔ وہ پیدائشی شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن چارلس کی شادی کے بعد وہ ایک ایسی عورت کی عزت پر مجبور ہو جاتے جس کا شاہی خاندان سے کوئی تعلق نہ ہوتا اور شادی سے پہلے وہ یقیناً کم تر رتبے کی حامل ہوتی۔ چارلس نے جن لڑکیوں کو پسند کیا ان میں سے کوئی بھی کم رتبہ نہیں تھی۔ وہ سب اچھے اور معزز برطانوی خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس کے باوجود شاہی خاندان کی جانب سے ان کی مسلسل مخالفت مخصوص ذہنیت کا شاخسانہ ہوسکتی تھی۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی یہ سازش بھی کامیاب رہی۔ 1972 میں شہزادہ چارلس بیرونِ ملک روانہ ہوا تو اس کا کمیلا سے عشق ہنوز ادھورا تھا۔ اسے اتنی عجلت میں روانہ کیا گیا کہ اسے کمیلا سے عہد و پیماں کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ وہ اس کی واپسی کا انتظار کرے گی۔ دل برداشتہ کمیلا پہلے ہی ہچکچا

رہی تھی۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ ملکہ نے اسے مسترد کر دیا ہے، ایسے میں چارلس سے اس کی شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے چارلس کے بیرونِ ملک جانے کے بعد وہ اینڈریو پارکر کی طرف زیادہ ملتفت ہوئی تھی۔ اس بار ان کا تعلق نہایت تیزی سے پروان چڑھا تھا اور ایک سال کے اندر وہ رشتۂ ازدواج میں بندھ چکے تھے۔ یوں ملکہ اور اس کے چچا کی مشترکہ سازش کامیاب رہی اور کمیلا چارلس کی راہ سے ہٹ گئی۔

اس سلسلے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ اینڈریو پارکر کو اس شادی پر باقاعدہ آمادہ کیا گیا تھا۔ اسے اعتماد میں لے کر بتایا گیا کہ شہزادہ اس معاملے میں سنجیدہ ہے اور ملکہ نے کمیلا کو مستقبل کی ملکہ کی حیثیت سے مسترد کر دیا ہے اس لیے اب ایک ہی راستہ رہ گیا جو شاہی خاندان میں ہونے والے فساد کو روک سکتا تھا۔ یعنی کمیلا کی شادی ہو جائے اور وہ شہزادے کا پیچھا چھوڑ دے۔ کیونکہ اینڈریو پارکر پہلے ہی کمیلا میں دل چسپی لے رہا تھا اس لیے وہ اس کام کے لیے ایک موزوں ترین امیدوار بن سکتا تھا۔ اس سے ملک اور تاج برطانیہ کی بہتری کے نام پر اپیل کی گئی اور محبِ وطن میجر اینڈریو پارکر نے اس پر لبیک کہتے ہوئے کمیلا کو پوری طرح اپنے شیشے میں اتار لیا اور بالآخر اسے شادی پر آمادہ کر لیا۔ اگر اینڈریو پارکر نے سچ مچ اس طرح شادی کی تھی تو اس کی حب الوطنی حیرت انگیز ہے۔ اس نے نہ صرف شادی کی بلکہ اسے آخر تک نبھایا بھی تھا۔ بیرونِ ملک مقیم شہزادہ چارلس کمیلا سے دور ہوا تھا لیکن وہ حالات سے بے خبر نہیں تھا۔ 4 جولائی 1973 کی تاریخ کو چھبیس سالہ کمیلا شینڈ چونتیس سالہ میجر اینڈریو پارکر سے شادی کر کے کمیلا پارکر ہو گئی اور اس کا یہ نام اتنا مشہور ہوا کہ آج بھی کوئی کمیلا چارلس کہتا ہے تو لوگ نہیں سمجھ پاتے کہ کس کا ذکر ہو رہا ہے لیکن کمیلا پارکر کہتے ہی لوگ جان جاتے ہیں کہ کس کا ذکر ہے۔ یہ شادی گارڈز چیپل، ولنگٹن بیرکس، لندن میں ہوئی اور اس میں مادر ملکہ الزبتھ، شہزادیوں اینی اور مارگریٹ سمیت آٹھ سو معزز افراد نے شرکت کی تھی۔ شادی کے فوراً بعد نو بیاہتا جوڑا ولٹ شائر روانہ ہو گیا جو اینڈریو پارکر کی آبائی رہائش گاہ تھی۔ انہوں نے اپنا ہنی مون یہیں منایا تھا۔ کمیلا اور اینڈریو کی شادی کا سن کر چارلس کا ردِعمل اس خط سے ظاہر ہے جو اس نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو لکھا۔ ”میں اپنی ذات میں ایک خلا محسوس کر رہا ہوں لیکن مجھے امید ہے کہ جلد یہ وقت گزر جائے گا۔“

بے خبر چارلس جسے اپنا غم گسار سمجھ رہا تھا اسی نے اس کی اور کمیلا کی محبت کی پشت میں چھرا گھونپا تھا۔ بعد میں ہونے والے واقعات سے ثابت ہوا تھا کہ شہزادہ اپنی ذات میں جس خلا کا ذکر کر رہا تھا وہ کبھی پُر نہیں ہو سکا تھا۔ اپنی بیرونی فوجی خدمت سے واپس آتے ہی چارلس نے دوبارہ کمیلا سے ملاقاتیں شروع کر دیں اور ان کا تعلق جہاں سے ختم ہوا تھا وہیں سے شروع ہو گیا۔ اگرچہ یہ واضح نہیں ہے کہ ان کے تعلق میں رومان کا عنصر شامل تھا یا اب شہزادہ کمیلا کو صرف ایک دوست کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ کم سے کم اس نے اپنے واقف کاروں سے یہی کہا تھا کہ اب کمیلا صرف اس کی ایک اچھی دوست ہے۔ اس کا اینڈریو پارکر کے گھر آنا جانا تھا۔ وہ جب ولٹ شائر جاتا تو ان کے گھر ٹھہرتا تھا۔ اسی طرح جب کمیلا اور اینڈریو لندن آتے تو چارلس کے مہمان ہوتے۔

مگر بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ وہ اسے بھولا نہیں تھا اور نہ بھولنا چاہتا تھا۔ کمیلا کے دل میں کیا تھا وہ کھل کر سامنے نہیں آیا تھا مگر وہ بہ ظاہر اپنے شوہر کی وفادار تھی اور اینڈریو اس تعلق کو نبھانے میں پوری کوشش سے مصروف تھا۔ اسے چارلس اور کمیلا کی دوستی پر کوئی اعتراض نہیں تھا مگر وہ اس شادی کو بہر صورت برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے شہزادے اور اپنی بیوی کے تعلقات بھی نظر انداز کر رہا تھا۔ بعد میں برٹش پریس نے اسے ایک ایسا آدمی قرار دیا جس نے ملک کی خاطر اپنی بیوی گنوا دی تھی۔ مگر برٹش میڈیا کی بات کا اعتبار مشکل ہے کیونکہ یہ اپنی بدترین خامی کو بہترین خوبی بنا کر پیش کرنے کے ماہر ہیں۔

چارلس ایک طرف تو کمیلا پارکر کا دم بھر رہا تھا دوسری طرف وہ اپنی ہونے والی بیوی ڈیانا سے بھی محبت کرنے کا دعویٰ کر رہا تھا۔ ڈیانا شاہی خاندان کا ایک ایسا انتخاب تھی جسے شاہی خاندان میں کسی نے پسند نہیں کیا۔ مگر ڈیانا کے منتخب ہوتے ہی برٹش عوام اور پریس نے اسے پرنس آف ویلز قرار دے دیا اور شاہی خاندان اسے مسترد کرنے یا اس کی کھل کر مخالفت کرنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ چارلس کو ایک منصوبے کے تحت ڈیانا کی طرف دھکیلا گیا تھا۔ چارلس کی منتخب کردہ لڑکیوں کو تو اتر سے مسترد کرنے سے شاہی خاندان پر انگلیاں اٹھ رہی تھیں اور بعض اخبارات نے تو کھل کر لکھ دیا تھا کہ تاج برطانیہ کا اگلا شاہ

کنوارہ ہو گا اور اس کے بعد تاج کسی اور کو منتقل ہو جائے گا۔ حالانکہ چارلس اکیلا ولی عہد نہیں تھا بلکہ برطانوی شاہی روایت کے مطابق کے بعد دیگرے کئی ولی عہد تھے اس لیے چارلس لاولد بھی رہ جاتا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے بعد اس کا بھائی شاہ بن جاتا۔ مگر برطانوی عوام نسل در نسل شاہ چاہتے ہیں۔ شاہ یا ملکہ کے بعد ان کے کسی بھائی بہن کا تخت پر بیٹھنا اچھا شگون نہیں سمجھا جاتا ہے۔

اس لیے جب ڈیانا کے نام قرعہ کھلا تو سب بادلِ ناخواستہ متفق ہو گئے۔ اس میں مسترد کرنے کی کوئی بات نہیں تھی۔ ڈیانا اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھی بلکہ اس کی رگوں میں شاہی خون تھا۔ وہ خوب صورت اور کمسن تھی جس وقت اس کی چارلس سے شادی ہوئی وہ عمر میں اس سے نصف تھی۔ یعنی شادی کے وقت شہزادہ جوانی سے گزر کر بڑھاپے کی دہلیز تک آ پہنچا تھا اور اب شادی میں مزید تاخیر مناسب نہیں تھی۔ دوسری طرف چارلس کا کمیلا سے دوبارہ میل جول بھی خطرے کی نشانی تھی۔ سابق شاہ ایڈورڈ ہشتم کا معاملہ سامنے تھا جس نے ایک بیوہ سے شادی کی خاطر تاج و تخت ٹھکرا دیا تھا۔ اس لیے بہتر سمجھا گیا کہ ڈیانا پسند نہ آنے کے باوجود اس کی شادی چارلس سے کر دی جائے۔ ڈیانا کو ناپسند کرنے کی سب کے پاس اپنی اپنی وجوہات تھیں۔ ملکہ اور شہزادیوں کو اس سے یوں چڑ تھی کہ شادی سے پہلے ہی برطانوی اور بین الاقوامی میڈیا نے ڈیانا کو بہت زیادہ کوریج دینا شروع کر دی تھی اور اسے شاہی خاندان سے زیادہ مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ ان لوگوں سے اس کی مقبولیت ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ چارلس کو اس سے شروع سے کوئی ... دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے ڈیانا کو صرف بھینٹ سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ اس سے زیادہ اس کی اور کوئی اہمیت نہیں تھی۔

بعد میں ڈیانا کے ساتھ ہونے والے سلوک سے واضح ہو گیا کہ وہ اس تکون کی سب سے مظلوم فریق تھی۔ شاید چارلس کو کمیلا کے چنگل سے نکالنے کے لیے شاہی خاندان نے ڈیانا کو کڑوا گھونٹ سمجھ کر بھر لیا تھا۔ مگر وہ بھول گئے تھے کہ چارلس اسی خاندان کا ایک فرد تھا اور وہ بھی اپنی ماں اور بہنوں کی طرح حد درجے ضدی تھا۔ اس نے مجبور کرنے پر ڈیانا سے شادی تو کر لی لیکن کمیلا اس کے دل سے نہیں نکلی تھی اور ڈیانا کے لیے اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ یہ بات ڈیانا نے شادی کے پہلے دن سے اس پر واضح بھی کر دی تھی۔ شادی کے اگلے دن ڈیانا کی جو تصاویر لی گئیں ان میں وہ شاذ ہی کسی میں مسکراتی یا خوش نظر آ رہی ہے۔

دیکھا جائے تو صورتِ حال تینوں فریقوں کے لیے نہایت پیچیدہ ہو چکی تھی۔ خاص طور سے چارلس اور کمیلا کے لیے، وہ دونوں شادی شدہ تھے اور دونوں کے لیے شادی کے یہ بندھن توڑنا دشوار تھا۔ شہزادے کی ڈیانا سے جس طرح شادی ہوئی تھی اس سے اس پر مزید دباؤ آ گیا تھا۔ اگر وہ ڈیانا کو چھوڑتا تو برطانوی عوام کے نزدیک مجرم بن جاتا۔ جیسا کہ بعد میں ہوا۔ اس کے اندر کمیلا کو کھو دینے پر ایک غبار سا بھر رہا تھا۔ بے شک ان میں دوستی تھی اور ممکن ہے جسمانی تعلق بھی قائم رہا ہو لیکن وہ اس کی بیوی نہیں بن سکی تھی۔ کمیلا کی مخالفت اصل میں شاہی خاندان کی طرف سے تھی۔ یہ تو ہوتا آیا تھا شہزادہ جس لڑکی یا عورت کو پسند کرتا شاہی خاندان اور خاص طور سے شہزادے کی ماں بہنوں کی طرف سے اسے مسترد کر دیا جاتا۔ حد یہ کہ ڈیانا کی بھی مخالفت کی گئی ... ابھی اس نے شادی کر کے بکھنگم پیلس میں قدم بھی نہیں رکھا تھا کہ ملکہ و شہزادیوں کا رویّہ اس سے سرد ہو گیا تھا۔ شادی کے بعد یہ رویّہ بدتر ہو گیا تھا۔

ڈیانا روزِ اول سے جانتی تھی کہ چارلس اصل میں کمیلا کی زلفوں کا اسیر ہے اور اس سے شادی صرف مجبوری میں کی ہے۔ لیکن شاید اسے توقع تھی کہ وہ اپنی محبت سے چارلس کو جیت لے گی۔ مگر جلد اسے پتا چل گیا کہ یہ اس کی خام خیالی ہے۔ چارلس کا اس سے رویّہ نہایت سرد تھا اور وہ گویا صرف رسمی تعلق کی خاطر اس کے پاس آتا تھا۔ شاہی خاندان اس سلوک سے واقف تھا اور وہ چارلس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شادی کے چند مہینے بعد ہی ڈیانا کو نروس بریک ڈاؤن ہوا۔ اس بیماری میں بھی شہزادے اور دوسرے لوگوں نے اس سے اپنا رویّہ نہیں بدلا تھا۔ اس لیے جب ڈیانا صحت یاب ہو کر واپس آئی تو وہ بالکل بدل گئی تھی۔ اس نے چارلس کو اسی کے سکوں میں ادائیگی کا فیصلہ کیا اور جلد اس کے نت نئے معاشقے منظرِ عام پر آنے لگے۔ اگر اسے کسی کی پروا تھی تو یہ اس کے بچے تھے۔ اپنے بچوں کی وجہ سے اس نے بہت دن شوہر اور اس کے گھر والوں کو برداشت کیا تھا۔

چارلس اور اس سے زیادہ کمیلا کی کوششوں سے ان کا تعلق دو عشرے سے زیادہ راز رہا تھا سوائے ایک محدود حلقے کے اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ پرنس آف ویلز اصل میں کس عورت سے محبت کرتا ہے۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کیونکہ

برطانیہ اور یورپ کا میڈیا ہمیشہ شاہی افراد کی ٹوہ میں رہتا ہے اور سب سے چٹ پٹا موضوع ہوتا ہے محبت۔ پاپارازی رپورٹر کی اصطلاح اسی طرح وجود میں آئی۔ مگر صحافت کے پاپارازیوں کو چارلس اور کمیلا کے گہرے تعلق کا بہت دیر سے جا کر پتا چلا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں نے اپنے تعلق میں کس درجے کی رازداری برتی تھی۔ خوش قسمتی سے ان کے آس پاس جو لوگ تھے وہ بھی اس رازداری میں شامل تھے۔ اس لیے دو عشرے تک یہ راز عوام کی حد تک راز ہی رہا تھا۔

عوام تک یہ راز اس وقت پہنچا جب ڈیانا کی کتاب ''ہر ٹرو اسٹوری'' 1992 میں منظرِ عام پر آئی۔ یہ ڈیانا کی اپنی بائیوگرافی اس کی اپنی زبانی تھی یعنی خودنوشت تھی۔ اس میں نے اس پہلی بار چارلس اور کمیلا کے تعلق سے پردہ اٹھایا۔ اس کتاب نے تہلکہ مچا دیا تھا اور اسے کمیلا گیٹ اسکینڈل کا نام دیا گیا تھا۔ اس کتاب میں کمیلا اور چارلس کے درمیان ہونے والی ایک فون کال کی گفتگو شامل کی گئی تھی اور اس گفتگو سے پتا چلتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کتنا گہرا تعلق ہے۔ ایک بار یہ معاملہ کھل کر سامنے آیا تو ڈیانا نے میڈیا پر اس بارے میں بات شروع کر دی تھی۔ بی بی سی کے پروگرام پنورامامیں انٹرویو کے دوران میزبان نے سوال کیا۔ ''پرنسز آف ویلز، آپ کے خیال میں پرنس آف ویلز اور لیڈی کمیلا پارکر کا افیئر آپ کی شادی کے خاتمے کی وجہ بن سکتا ہے؟''

ڈیانا نے بہت معنی خیز جواب دیا۔ ''دو کے تعلق میں تین کا مطلب ہجوم ہوتا ہے۔''

اس وقت کمیلا پارکر عوام اور میڈیا میں ایک معمولی شخصیت سمجھی جاتی تھی اور اسے پسند بھی نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ وہ پس منظر میں رہنے کی عادی تھی۔ ڈیانا کی کتاب اور انٹرویو کے بعد کمیلا پارکر ایک جانی پہچانی شخصیت بن گئی مگر ساتھ ہی اس کے لیے لوگوں کی ناپسندیدگی میں اضافہ ہوا تھا۔ کمیلا نے رپورٹرز اور میڈیا کے سوالات کا جواب دینے سے ہمیشہ گریز کیا تھا، اس کی نامقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ رپورٹر اور کیمرے دیکھتے ہی کمیلا پارکر کا چہرہ اور تاثرات سخت ہو جاتے تھے اور وہ اپنا منہ مضبوطی سے بند کر لیتی تھی یہی وجہ ہے کہ اس کے اکثر پبلک فوٹوز اسی انداز میں لیے گئے ہیں اور جب یہ اخبارات میں شائع ہوتے یا ٹی وی پر آتے تھے تو ان سے کمیلا کا منفی تاثر بنتا تھا۔ اس کی طرف سے کوئی بیان نہ دینے اور کسی سوال کا جواب نہ دینے سے میڈیا کو اس کے بارے میں اپنی مرضی کی قیاس آرائیاں کرنے کا بھرپور موقع ملا تھا۔

ڈیانا کے کتاب لکھنے اور پھر اپنے ذاتی معاملات کو میڈیا پر لانے کے بعد چارلس بھی جوابی کارروائی پر مجبور ہوا۔ چارلس بھی اپنے معاملات خود تک رکھنے کا عادی تھا اور اس نے آج تک میڈیا پر کوئی ایسا بیان نہیں دیا تھا جس سے پتا چلے کہ اس کے اور ڈیانا کے درمیان اَن بن ہے مگر اب وہ مجبور تھا۔ وہ ایک عوامی شخصیت بھی اور لوگ اس سے سوال کر سکتے تھے۔ وہ بیان دینے لگا اور اس نے ٹی وی انٹرویوز کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ایک ٹی وی انٹرویو میں شہزادہ چارلس نے اعتراف کیا کہ اس کے اور کمیلا کے تعلقات اس وقت پھر سے پروان چڑھنے لگے تھے جب اس کی ڈیانا سے شادی مشکل حالات سے گزر رہی تھی۔ چارلس نے پہلی بار ڈیانا کے افیئرز کے بارے میں اشارتاً ذرا تلخ لہجے میں بات کی۔ اس نے شکوہ کیا کہ میڈیا اور پریس صرف اسے قصوروار قرار دے رہا ہے۔ یہ درست تھا کہ میڈیا اور عوام کا تاثر شہزادے کے بجائے ڈیانا کے حق میں تھا۔ اس انٹرویو سے عوام نے یہ تاثر لیا کہ ڈیانا اور چارلس کی شادی میں ناکامی کی واحد وجہ کمیلا پارکر تھی۔ حالانکہ یہ درست نہیں تھا۔

اس کہانی کا ایک اور کردار یعنی اینڈریو پارکر اپنی سروس کی وجہ سے میڈیا سے بچا ہوا تھا۔ زبان بند رکھنا اس کی مجبوری تھی کیونکہ ایک طرف اس کی بیوی تھی تو دوسری طرف ملک کا ہونے والا شاہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کمیلا اصل میں چارلس سے محبت کرتی ہے۔ ممکن ہے وہ شادی کے ابتدائی دنوں میں اس سے بے خبر رہا ہو لیکن چارلس کی وطن واپسی اور کمیلا سے تجدیدِ تعلق کے بعد اسے یقینی طور پر اس محبت کا پتا چل گیا تھا اس کے باوجود اس نے شادی کو برقرار رکھنے کی اپنی سی ہر ممکن کوشش کی۔ کیونکہ اس کے خیال میں اسی میں ملک کا مفاد تھا۔ وہ بائیس برس ساتھ رہے اور اس دوران میں ان کے ہاں دو بچے ہوئے۔ ٹام جو اسی سال پیدا ہوا جس سال ان کی شادی ہوئی اور وہ شادی کے وقت کمیلا کے پیٹ میں تھا۔ اب وہ چارلس کا سوتیلا بیٹا ہے۔ اس سے چھوٹی بیٹی لورا تھی جو 1978 میں پیدا ہوئی۔

اینڈریو پارکر کیتھولک عیسائی ہے اور اس کے دونوں بچے بھی اسی مذہب سے ہیں۔ اس کے برعکس کمیلا چارلس کی طرح چرچ آف انگلینڈ کی پیروکار ہے۔ جس کا سربراہ

روایتی طور پر شاہ برطانیہ ہوتا ہے۔ یعنی ملکہ الزبتھ دوم صرف ملکہ نہیں بلکہ اپنے ملک کی مذہبی پیشوا بھی ہے۔

جیسے جیسے چارلس اور کمیلا کا تعلق بڑھ رہا تھا اسی رفتار سے اینڈریو پارکر کا صبر جواب دے رہا تھا۔ یہ بات میڈیا تک نہیں پہنچی تھی لیکن اس کا تمام حلقہ احباب جان گیا تھا کہ اس کی بیوی اور پرنس آف ویلز میں کیا کھچڑی پک رہی تھی۔ پھر ڈیانا کے انکشاف کے بعد ملک کا بچہ بچہ جان گیا تھا۔ ظاہر ہے اس کے بعد اس معاملے کو کسی نہ کسی کروٹ تو بیٹھنا تھا۔ ممکن ہے اب تک اینڈریو پارکر بچوں کی وجہ سے خاموش رہا ہو مگر اب بچے بڑے ہو رہے تھے۔ ٹام نے آرمی جوائن کر لی تھی اور لورا بھی ہائی اسکول پاس کرنے والی تھی۔ یعنی اب بچوں کو ان کی خاص ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس لیے اینڈریو پارکر نے بہتر سمجھا کہ اس شادی کا خاتمہ کر دیا جائے جو کسی ڈرامے سے کم نہیں تھی۔ جیسے ڈرامے میں مرد عورت میاں بیوی کا کردار ادا کرتے ہیں لیکن درحقیقت ان کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا ہے ایسے ہی وہ بائیس سال سے میاں بیوی کا کردار ادا کر رہے تھے۔

اگرچہ کمیلا اور اینڈریو کے درمیان مارچ 1995 میں طلاق ہوئی مگر اس کے لیے وہ ذہنی طور پر خاصے عرصے پہلے تیار ہو گئے تھے اور طلاق کی قانونی کارروائی خاصے عرصے سے جاری تھی لیکن معاملہ ابھی میڈیا اور عوام سے چھپا ہوا تھا اس لیے کسی نے بھی خاص طور سے توجہ نہیں دی تھی۔ طلاق کے بعد کمیلا ولٹ شائر میں واقع اینڈریو پارکر کی چودھویں صدی کی آبائی حویلی اور جاگیر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ البتہ اس کے دونوں بچے اس وقت باپ کے ساتھ رہے تھے اور انہوں نے ماں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس طلاق کے فوراً بعد اینڈریو پارکر نے اپنی طویل عرصے کی گرل فرینڈ روز میری پٹ مین سے شادی کر لی۔ یہ وہ عورت تھی جس سے اینڈریو پارکر سچ مچ محبت کرتا تھا اور... اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ کمیلا سے تجدیدِ تعلق کے بعد ہی ان دونوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ شادی کریں گے۔ مگر وہ دونوں ہی شادی شدہ تھے اور بہ ظاہر طلاق کا کوئی امکان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے دونوں ثابت قدمی سے وقت کا انتظار کرنے لگے کہ وہ ان کے لیے کب آسانی لاتا ہے۔ کمیلا اور اینڈریو کی طلاق خاص مسئلہ نہیں تھی اور اس سے صرف ایک گھر متاثر ہوتا لیکن چارلس اور ڈیانا کی طلاق بہت بڑا مسئلہ تھی اس سے ایک پورا ملک اور حکومت متاثر ہوتی۔ عوام کی ساری ہمدردیاں ڈیانا کے ساتھ تھیں اور وہ اسے بہر صورت ملکہ برطانیہ دیکھنا چاہتے تھے۔ چارلس سے علیحدگی کی صورت میں وہ پرنسز آف ویلز نہیں رہتی۔ اگر طلاق کی بات شہزادے کی طرف سے سامنے آتی تو عوام میں اس کی ساکھ کو ناقابلِ تلافی نقصان بھی ہو سکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ عوام کی جانب سے اسے ولی عہدی سے ہٹانے کا مطالبہ سامنے آ جاتا۔ اس لیے چارلس اور شاہی خاندان کی خواہش تھی کہ طلاق کی بات پرنسز ڈیانا کی طرف سے ہو۔ گویا وہ آخری حد تک اپنا دامن بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اب کمیلا آزاد تھی۔ جب وہ کمیلا پارکر تھی تب بھی اکثر شہزادے کے ساتھ نظر آتی مگر اب اسے مکمل آزادی میسر آ گئی تھی اور وہ چارلس کے ساتھ تقریبات میں اس کی غیر سرکاری ساتھی کی حیثیت سے شریک ہونے لگی۔ مگر یہ ایسی تقریبات ہوتی تھیں جہاں عام طور سے پریس کی رسائی نہیں ہوتی تھی۔ ان تقریبات میں ڈیانا نے کئی سال پہلے شرکت چھوڑ دی تھی اور وہ چارلس کی ہمراہی سے پیچھے ہٹ گئی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ نوے کے عشرے کے آغاز میں چارلس اور ڈیانا کے ذہن میں طلاق کا خیال آ گیا تھا لیکن وہ دونوں اسے زبان پر لاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ مگر جب کمیلا طلاق کے بعد چارلس سے مستقل نتھی ہو گئی اور ہر جگہ اس کے ساتھ یوں رہنے لگی جیسے وہی ڈیانا کی جگہ چارلس کی بیوی ہو تو بالآخر لیڈی ڈیانا کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور اس نے 20 نومبر 1995 کو بی بی سی کے پروگرام پنوراما میں ہی میزبان مارٹن بیشر کے علیحدگی سے متعلق سوال پر نہایت تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں اسے ختم کرنے والی ہوں۔'' پھر اس نے کمیلا کے بارے میں کہا۔ ''اس شادی میں دو نہیں تین افراد ہیں۔'' اس نے آگے مستقبل کی ملکہ کے سوال پر جواب دیا۔ ''میں ملکہ برطانیہ کے بجائے ملکہ عوام بننا پسند کروں گی۔ میں بکھنگم پیلس کے بجائے لوگوں کے دلوں میں رہنا چاہتی ہوں۔''

اب یہ بات کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ ڈیانا چارلس کے ساتھ رہنے کو مزید تیار نہیں تھی۔ ملکہ برطانیہ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ایک خط لکھ کر ڈیانا اور چارلس کو طلاق کی ابتدائی کارروائی کا مشورہ دیا۔ یہ پنوراما کے انٹرویو کے فوراً بعد کی بات تھی۔ گویا شاہی خاندان نے ڈیانا سے چھٹکارے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دسمبر 1995 میں بکھنگم پیلس کی طرف سے ایک اعلامیہ جاری کیا گیا کہ ملکہ نے خط لکھ کر

ڈیانا اور چارلس کو طلاق کا مشورہ دیا ہے۔ ملکہ نے برطانوی وزیراعظم اور پریوی کونسل کو بھی اس سلسلے میں ضروری اقدامات کرنے کی ہدایت جاری کردی تھی۔ وزیراعظم اور ملکہ سے ملاقات کے بعد ڈیانا نے طلاق کے بارے میں ذاتی بیان جاری کیا اور اس میں اس نے طلاق کی شرائط اور دوسری تفصیلات بھی پیش کر دیں۔ یوں 28 اگست 1996 کے دن ڈیانا اور چارلس کے درمیان باضابطہ طلاق ہوگئی۔ ایک طویل اور مشکل دور کا خاتمہ ہوا تھا۔ دونوں فریقوں نے اس شادی میں پایا کم اور کھویا زیادہ تھا۔

بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ اب کمیلا اور چارلس کے درمیان تمام رکاوٹیں دور ہوگئی ہیں۔ دونوں آزاد تھے اور آپس میں شادی کر سکتے تھے۔ مگر یہ سب اتنا آسان نہیں تھا جتنا نظر آرہا تھا۔ شادی میں حائل رکاوٹوں سے قطع نظر کمیلا اور چارلس کی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ البتہ اگست 1997 میں طلاق کے ٹھیک ایک سال بعد ڈیانا کی حادثاتی موت کے بعد ان ملاقاتوں کا سلسلہ کچھ عرصے کے لیے رک گیا تھا۔ بہ ظاہر ایسا لگنے لگا کہ ان دونوں نے اپنے تعلق کو محدود کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس فیصلے کے پس پشت وہ رکاوٹیں ہوسکتی تھیں جو ان کی شادی میں حائل تھیں۔ ایک ممکنہ وجہ تو ڈیانا اور چارلس کے بیٹے ولیم اور ہیری تھے جو چارلس کے پاس تھے اور وہ لازمی طور پر کمیلا سے شدید نفرت کرتے تھے اور کسی صورت اسے اپنی ماں کے روپ میں دیکھنے کو تیار نہیں تھے۔ ان میں شہزادہ ولیم ولی عہدی کی لائن میں شامل ہو چکا تھا۔ لیکن دو سال بعد 1999 میں ایسی تصاویر اخبارات میں شائع ہوئیں جن میں کمیلا اور چارلس رٹز ہوٹل میں ایک سالگرہ میں شامل تھے اور وہ اس ساری تقریب کے دوران ساتھ ساتھ رہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پریس نے چارلس اور کمیلا کی ساتھ ساتھ تصاویر شائع کی تھیں۔

اینڈریو سے طلاق کے بعد کمیلا ولٹ شائر سے کلارینس ہاؤس منتقل ہوگئی اور یہ مادر ملکہ الزبتھ کا سابق گھر تھا۔ کلارینس ہاؤس اب چارلس کی ملکیت تھی اور اس نے کمیلا کو یہ گھر رہائش کے لیے دے دیا۔ وہ دونوں ساری دنیا سے چھپ کر یہاں وقت گزارتے تھے اور یقیناً کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی۔ 2003 میں کمیلا نے کلارینس ہاؤس اور بکھنگم پیلس دونوں جگہوں کی ری ڈیکوریشن شروع کی تب یہ معاملہ پریس اور عوام کے علم میں آیا۔ کمیلا نے پہلے کلارینس ہاؤس کی ری ڈیکوریشن مکمل کی تھی۔ بکھنگم پیلس کی ری ڈیکوریشن کا خرچ بکھنگم پیلس کے لیے مخصوص عوامی فنڈز سے کیا گیا جب کہ یہ فنڈز ری ڈیکوریشن کے لیے استعمال نہیں ہو سکتے تھے۔ اس ٹھیکے میں کمیلا کو کئی لاکھ پاؤنڈز کی خطیر ادائیگیاں کی گئیں۔ یہ ساری ادائیگیاں عوامی فنڈ سے کی گئی تھیں مگر اس وقت معاملہ دبا رہا۔

2005 میں ایک اخباری رپورٹ میں انکشاف ہوا کہ چارلس عوامی فنڈز کمیلا پر خرچ کر رہا تھا۔ اس رپورٹ کا شدید ردعمل سامنے آیا اور عوام میں چارلس اور کمیلا کی نامقبولیت میں اضافہ ہوا تھا۔ عوامی دباؤ کی وجہ سے ہاؤس آف کامن کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی نے اس معاملے کی چھان بین شروع کر دی کہ کیا واقعی شہزادہ مالی بے ضابطگیوں میں ملوث تھا۔ مگر ابتدائی چھان بین کے بعد کمیٹی نے اس بارے میں رپورٹ کو خفیہ کر دیا اور امکان یہی تھا کہ کمیٹی کے ارکان نے اندرونِ خانہ شہزادے کو ہلکی پھلکی وارننگ دے کر رپورٹ کو سرد خانے میں بھیج دیا ہوگا کیونکہ یہ کبھی منظرِ عام پر نہیں آئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہی خاندان نے ہاؤس آف کامن پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے معاملے کو ختم کر دیا تاکہ چارلس کی ساکھ کو کوئی ناقابلِ تلافی نقصان نہ ہو۔

نئی صدی کے آغاز میں ہی چارلس اور کمیلا کے تعلقات پوری طرح بحال ہو چکے تھے اور وہ اب ہر جگہ ساتھ ساتھ نظر آنے لگے تھے۔ مختلف اسکینڈلز اور ڈیانا کی موت کا صدمہ کم ہونے کے بعد برطانوی عوام نے اپنے اگلے شاہ کو تقریباً معاف کر دیا تھا۔ پریس و میڈیا کے ساتھ اس معاملے میں چارلس کا رویہ سخت اور لابحث تھا۔ 1995 میں ڈیانا سے علیحدگی نے شہزادے کی ساکھ کو شدید متاثر کیا تھا اور عوام میں اس کی مقبولیت گر کر صرف بائیس فیصد رہ گئی تھی۔ اس سے پہلے کبھی اسے یا کسی اور پرنس آف ویلز کو اس قدر عدم مقبولیت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اسی وقت سے چارلس اپنی ساکھ اور مقبولیت کی بحالی کی فکر میں لگ گیا تھا۔ پھر ڈیانا کے یکے بعد دیگرے سامنے آنے والے اسکینڈلز نے بھی اس کی مدد کی اور برطانوی عوام کو اندازہ ہوگیا کہ وہ جس فریق کو بہت زیادہ مظلوم سمجھ رہے تھے وہ اتنی بھی مظلوم نہیں تھی۔ پھر ڈیانا کی موت نے یہ باب تقریباً ختم کر دیا اور چارلس کی عوامی ساکھ رفتہ رفتہ بحال ہونے لگی۔

چارلس اور کمیلا غالباً ڈیانا سے علیحدگی کے فوراً بعد

ہمیشہ کے لیے ایک ہونے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ مگر کمیلا کے طلاق یافتہ ہونے کی وجہ سے چارلس اور وہ شادی کا فیصلہ کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ عوام اسے قبول نہیں کریں گے اور مستقبل کے شاہ کو بہرصورت عوام کے جذبات کا خیال رکھنا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ اب برطانیہ میں اٹھنے والی وہ آوازیں تھیں جو ملک کو مکمل طور پر جمہوریہ بنانا چاہتی تھیں اور یہاں سے بادشاہت کا سرے سے خاتمہ کرنا چاہتی تھیں۔ شمالی انگلینڈ ہمیشہ سے شاہ مخالفوں کا گڑھ رہا ہے۔ کئی صدیوں سے یہ تحریک وہاں پنپتی رہی ہے۔ ان لوگوں کی ہی کوششوں اور قربانیوں سے دنیا کا اولین جمہوری آئین منظور ہوا اور اس میں بتدریج شاہی خاندان کے اختیارات کو ختم کر دیا گیا۔ آج برطانیہ میں تمام فیصلے پارلیمنٹ اور وزیراعظم ہاؤس میں ہوتے ہیں۔

اس کے باوجود برطانیہ پر شاہی خاندان کا غلبہ موجود ہے۔ شاہی خاندان اور اس کے حاشیہ بردار چند سو افراد ملک کی کھربوں پاؤنڈز کی دولت اور جائیداد پر بنا کسی استحقاق کے قابض ہیں۔ برطانیہ واحد یورپی ملک ہے جہاں اب تک جاگیرداری سسٹم موجود ہے۔ دوسری طرف ملک کی آبادی کا دس فیصد حصہ غربت کی زندگی گزار رہا ہے اور ہر سال سردیوں میں پندرہ ہزار افراد صرف اس لیے زندگی ہار جاتے ہیں کہ ان کے پاس حرارت حاصل کرنے کے وسائل نہیں ہیں۔ ایسے میں چند سو افراد جو ذاتی حیثیت میں ادب پتی ہیں ان پر عوام کا اربوں پاؤنڈز خرچ کرنا برطانیہ کی جمہوری ساکھ پر بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔

یہی وجہ تھی چارلس اپنی اور کمیلا کی عوامی مقبولیت میں اضافہ چاہتا تھا اس سے پہلے کہ وہ کمیلا کو اپنی زندگی میں باضابطہ شامل کرتا، بے ضابطہ وہ پہلے ہی اس کی زندگی کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ ڈیانا کی موت اور اس پر اڑنے والی شکوک کی گرد بیٹھ جانے کے بعد 2000 میں کمیلا نیشنل اوسٹیو پوروسس سوسائٹی کی صدر بنا دی گئی اور وہ پہلی بار ایک عوامی شخصیت کے طور پر سامنے آئی تھی۔ لیکن وہ اس وقت زیادہ کھل کر سامنے آئی جب اسکاٹ لینڈ جہاں پرنس آف ویلز روایتاً جاگیر رکھتا ہے اور اس کا سال میں ایک بڑا حصہ وہیں گزرتا ہے۔ اس کے اعزاز میں اور کچھ مخصوص تقریبات جو ہر سال ہوتی ہیں ان میں اس کی شرکت لازمی ہوتی ہے۔ یہاں کمیلا تقریبات میں چارلس کے ساتھ نظر آئی اور صاف لگ رہا تھا اس نے شہزادے کی بیوی کے فرائض سنبھال لیے ہیں۔ اسی سال اسے ملکہ الزبتھ دوم سے پہلی بار ملاقات کا موقع ملا اور یہ موقع یونان کے بادشاہ شاہ کونسٹنٹائن دوم کی ساٹھویں سالگرہ کا تھا۔ یہاں تقریباً پورا برطانوی شاہی خاندان موجود تھا۔

کمیلا مستقل چارلس کے ہمراہ سرکاری اور غیر سرکاری تقاریب میں نظر آرہی تھی۔ دوسری طرف چارلس شاہی خاندان اور خاص طور سے اپنی ماں پر واضح کر چکا تھا کہ ڈیانا ان کی پسند تھی اور انہوں نے اس کے ساتھ اپنی مرضی کا سلوک کرلیا تھا لیکن کمیلا اس کی پسند ہے اور اس کے ساتھ وہ وہی کریں جو چارلس کی مرضی ہوگی۔ چارلس اب پہلے کی طرح نرم نہیں رہا تھا بہت عرصے وہ ماں اور بہنوں کے ہاتھ میں کھیلتا رہا لیکن اس کی بہنوں نے جس طرح شاہی وقار کی دھجیاں اڑائی تھیں اور ان کا کردار کسی کال گرل سے مختلف نہیں تھا۔ اس کے بعد شہزادہ ان سے دل برداشتہ ہوگیا تھا اور دونوں بہنوں سے اس کے تعلقات خاصے عرصے سے کشیدہ چلے آرہے تھے۔ اس لیے ملکہ نے بہتر سمجھا کہ بیٹے کی پسند کو اپنی پسند بنا لے اور اس سے تعلق بہتر رکھے کیونکہ بہرحال اسے ہی برطانیہ کا اگلا شاہ بننا تھا۔ 2002 میں ملکہ الزبتھ دوم کی تخت نشینی کی پچاسویں سالگرہ تھی اور کمیلا اس میں خاص مہمان کی حیثیت سے مدعو تھی۔ سیانوں نے اسی وقت سمجھ لیا تھا کہ یہ ملکہ کی طرف سے شہزادے کو این او سی تھا کہ وہ کمیلا کو اپنی بیوی بنا سکتا ہے۔ اسی سال مادر ملکہ الزبتھ کا انتقال ہوا تھا اور کمیلا کو تدفین کی تقریب میں باقاعدہ شرکت کا دعوت نامہ ملا تھا۔

شاہی خاندان اور خاص طور سے ملکہ الزبتھ دوم کی جانب سے کمیلا کی منظوری کے بعد اس نے پوری طرح پرنسز آف ویلز کے فرائض سنبھال لیے تھے۔ وہ باری باری اپنے گھر اور لندن میں جیمس پیلس میں وقت گزارتی تھی۔ جیمس پیلس شہزادے کی رہائش گاہ بھی تھی۔ یہاں وہ ہر تقریب اور میٹنگ میں چارلس کے ساتھ ہوتی تھی۔ جیمس پیلس کا عملہ اسے سرکاری لقب ''میم'' سے پکارتا تھا حالانکہ یہ لقب صرف شہزادے کی بیوی کے لیے مخصوص تھا اور کمیلا ابھی چارلس کی بیوی نہیں بنی تھی۔ پھر کمیلا نے چارلس کے ساتھ کچھ ایسی خاندانی تقاریب میں شرکت کی جو صرف خاندان والوں کے لیے مخصوص تھیں۔ ان تقاریب میں کمیلا کی شرکت سے سب پر واضح ہوگیا کہ کمیلا اور چارلس شادی کا فیصلہ کر چکے ہیں اور جلد ہی سرکاری طور پر اس کا اعلان ہو جائے گا۔

10 فروری 2005 کی سرد صبح کلارنس ہاؤس سے ایک اعلامیہ جاری ہوا جس کے مطابق کمیلا اور چارلس نے منگنی کرلی تھی۔ منگنی کی انگوٹھی مادر ملکہ الزبتھ کی تھی جو اَب چارلس کے پاس آئی تھی اور اس نے روایتی طور پر گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے کمیلا سے شادی کی درخواست کی تھی اور اس کی طرف سے قبولیت کے بعد اسے یہ انگوٹھی پہنادی تھی۔ مستقبل کے بادشاہ اور چرچ آف انگلینڈ کے سربراہ کی حیثیت سے چارلس کا ایک طلاق یافتہ عورت سے شادی مشکلات کا باعث بن سکتا تھا لیکن ملکہ الزبتھ، پارلیمنٹ اور چرچ آف انگلینڈ کی طرف سے دونوں کو شادی کی اجازت دے دی گئی تھی۔ یوں تقریباً پینتیس برس کے طویل افیئر کے بعد بالآخر وہ دونوں اپنی منزل پانے میں کامیاب رہے تھے۔

9 اپریل 2005 کے دن شادی کی اصل تقریب روایتی طور پر ونڈسر کیسل میں ہوئی تھی۔ یہ ایک سیکولر تقریب تھی لیکن چرچ آف انگلینڈ کے آیندہ سربراہ کے لیے لازم تھا کہ وہ اپنی شادی کو کسی چیپل میں انجام دے اس لیے مذہبی تقریب سینٹ جارج چیپل میں ہوئی تھی۔ ونڈسر کیسل میں انہوں نے سول میرج کی قانونی کارروائی مکمل کی۔ چیپل میں ہونے والی تقریب ایک رسمی کارروائی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ کمیلا ذاتی طور پر سیکولر ہے اور وہ مذہب کو نہیں مانتی ہے۔ البتہ اس نے سینٹ جارج چیپل میں شادی کی مذہبی تقریب کی مخالفت نہیں کی۔ اس کے برعکس چارلس کے ذاتی خیالات مذہب کے بارے میں کچھ بھی ہوں لیکن ظاہری طور پر اسے مذہب پرست ہونا ہے اور ان تمام رسومات کی پابندی کرنی ہے جو اس پر اور اس سے پہلے چرچ آف انگلینڈ کے سربراہوں پر لازم ہوتی ہیں۔

ونڈسر کیسل کو سول شادیوں کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا ہے لیکن ایک سال کے لیے یہاں عوامی شادیوں کی خصوصی اجازت دی گئی اور ظاہر ہے ایسا چارلس اور کمیلا کی شادی کے لیے کیا گیا تھا۔ 4 اپریل کو اعلان کیا گیا کہ شادی کی تاریخ ایک دن آگے بڑھائی جا رہی ہے تاکہ شہزادہ چارلس" پوپ جان پال دوم کی آخری رسومات میں شریک ہو سکے۔ پہلے یہ 8 اپریل کو ہونا تھی۔ اس شادی میں ملکہ الزبتھ دوم شریک نہیں تھی کیونکہ وہ چرچ آف انگلینڈ کی سربراہ کی حیثیت سے کسی طلاق یافتہ عورت کی شادی میں شریک نہیں ہوسکتی تھی۔ اسی طرح کمیلا کے والد بھی اس شادی میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ کمیلا کا بیٹا ٹام اور شہزادہ ولیم اس شادی میں بہ طور گواہ شامل ہوئے تھے۔ البتہ ملکہ اور اس کے شوہر ڈیوک نے بعد میں دعائیہ تقریب میں شرکت کی تھی اور وہ نئے جوڑے کو الوداع کہنے کے موقع پر بھی موجود تھے۔ شادی کے فوراً بعد جوڑا اسکاٹ لینڈ پرنس آف ویلز کی رہائش گاہ برک ہال کی طرف روانہ ہوگیا تھا اور وہیں اپنے ہنی مون کے دوران انہوں نے اپنی اولین سرکاری ذمّے داریاں نبھائی تھیں۔ روایتی طور پر ہر پرنسز آف ویلز دوران ہنی مون اپنی سرکاری ذمّے داریاں نبھانا شروع کردیتی ہے۔

شادی سے پہلے ہی کمیلا نے واضح کردیا تھا کہ وہ مرحوم لیڈی ڈیانا کے احترام میں پرنسز آف ویلز کا لقب اختیار نہیں کرے گی۔ اس کے بجائے وہ ڈچز آف کارنیوال کا لقب اختیار کرے گی۔ پرنسز آف ویلز کا لقب بدستور مرحوم ڈیانا کے لیے مخصوص ہوگا۔ حتیٰ کہ چارلس شاہ نہیں بن جاتا اور اس کے بعد کا ولی عہد پرنس ولیم پرنس آف ویلز کا عہدہ سنبھالے گا اور اس کی بیوی پرنسز آف ویلز کہلائے گی۔ شاہی امور کے ماہر بعض افراد کا کہنا ہے کہ کمیلا نے ایسا ڈیانا کے احترام میں نہیں کیا ہے کیونکہ پرنس آف ویلز کا عہدہ ثانوی ہے وہ ڈچز آف کارنیوال بنتے ہی برطانوی قانون کے تحت ملکہ کے بعد ملک کی دوسری قابلِ احترام عورت بن گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ شاہی قوانین کی رُو سے ملکہ، ڈیوک آف ایڈنبرگ اور پرنس آف ویلز کے بعد چوتھی اہم ترین ہستی بن گئی ہے۔ اس لیے اسے پرنس آف ویلز کے ٹائٹل کی ایسی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ پھر یہ ٹائٹل پرنسز ڈیانا کے ساتھ ایسا جڑا ہے کہ اس کا نام لیتے ہی اسی کا تصور ذہن میں آتا ہے اس لیے کمیلا نے یہ ٹائٹل اختیار کرنے سے انکار کیا۔

برطانیہ میں اب ایک اور خدشہ بھی سامنے آرہا ہے کہ شاید شہزادہ چارلس اب بادشاہ نہیں بن سکے گا۔ وہ گزشتہ چالیس برس سے پرنس آف ویلز چلا آرہا ہے اور کسی بھی شہزادے نے ولی عہدی میں اتنا طویل عرصہ نہیں گزارہ ہے۔ وہ اکہتر برس کا ہوچکا ہے اور ملکہ الزبتھ دوم ابھی صحت مند اور کئی سال تک حکومت کرنے کے قابل ہے۔ اس لیے یہ تاثر عام ہورہا ہے کہ شاید جب چارلس کے تخت پر بیٹھنے کا وقت آئے تو وہ اتنا عمر رسیدہ ہوچکا ہو کہ اپنے بجائے یہ موقع وہ شہزادہ ولیم کو دے سکتا ہے۔ شاہی خاندان میں طویل عمری عام ہے خاص طور سے عورتیں لمبے عرصے زندہ رہتی ہیں۔ مگر اس کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کرے گا۔

رجحان ساز

ابنِ کبیر

اس نے ایک معمولی گھرانے میں جنم لیا مگر خداداد صلاحیتوں نے اسے بامِ عروج پر پہنچایا، وہ قلم کا بادشاہ کہلایا۔ اس نے معمولی معمولی واقعات کو اس انداز سے پیش کیا کہ لوگ چونک گئے۔ اس کے ناولز ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتے۔ ایک ناول نے تو پوری دنیا میں ہلچل مچادی تھی۔

ایک نابغہ روزگار ناول نویس کی زندگی کے اہم گوشے

جوں ہی اس کا نام پکارا گیا، ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ وہ کھڑا ہوا۔ عینک درست کی۔ اپنی بیوی کی سمت دیکھا۔ دھیرے سے مسکرایا اور اسٹیج کی طرف بڑھنے لگا جہاں تاریخِ ادب کا سب سے بڑا اعزاز اُس کا منتظر تھا۔

اس کے قدموں تلے سرخ رنگ کا دبیز قالین تھا جس کی نرمی نے اسے وہ دن یاد دلا دیے جب وہ تپتی دھوپ میں ننگے پاؤں پتھریلی زمین پر گھوما کرتا تھا۔ باڑے میں اپنے دادا کی مدد کیا کرتا اور حبس زدہ راتیں انجیر کے نیچے گزارا کرتا۔

ایک شخص نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور اس کے نفیس سوٹ کی تعریف کی۔ اُس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ بھولا نہیں تھا کہ ایک زمانے میں اس کا لباس پیوند سے بھرا ہوتا تھا اور ایک کوٹ وہ برسوں پہنا کرتا۔

سویڈن کے اس تاریخی ہال میں تالیاں گونج رہی تھیں۔ لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ اور یہ متوقع تھا۔ آج ایک ایسے ادیب کو نوبل انعام سے نوازا جارہا تھا جو اپنے جادوئی قلم، تصوراتی تمثیل اور دردمندی کے امتزاج سے قارئین کو گریزاں حقیقتوں کی گرفت میں مدد دیا کرتا تھا۔ جس کا قلم سامراج کے خلاف تلوار تھا۔

وہ ایک رجحان ساز ادیب تھا۔ ایسا ادیب، شہرت جس کی داسی بن گئی تھی۔

سویڈن سے میلوں دور اس کے آبائی وطن میں جسے چھوڑ کر اس نے خودساختہ جلاوطنی اختیار کرلی تھی، اس لمحے خوشی کا سماں تھا۔ لاکھوں افراد ٹی وی اسکرینوں کے سامنے بیٹھے تھے، جشن کی تیاری مکمل تھی۔

ہاں وہ لمحہ قیمتی تھا مگر ہوزے سارا ماگو اس لمحے میں نہیں تھا۔ تخیل اسے برسوں پیچھے... ایک چھوٹے سے گاؤں میں لے گیا۔ وہ گاؤں جہاں اس نے آنکھ کھولی تھی۔

وہ ازین یاگا میں رہتا تھا، جہاں اتنا پالا پڑتا کہ برتنوں میں رکھا ہوا پانی بھی جم جاتا۔ موسم کی شدت فاقوں کے اندیشے ساتھ لے کر آتی اور باڑے میں جانور دم توڑ دیتے۔

☆☆☆

ازین یاگا۔ پرتگالی دارالحکومت لزبن کے شمال میں دریا سے چند کوس دور ایک چھوٹا سا گاؤں، جہاں عسرت کے نشانات جابہ جا بکھرے تھے۔ جہاں ایک چھوٹا سا جھونپڑی نما مکان تھا، جس کی دیواریں ریت کی تھیں۔ اور چھت چکنی مٹی کی۔ گھر میں کوئی بیت الخلا نہیں تھا، حوائج ضروریہ کے لیے دیہاتی کھیتوں کا رخ کرتے۔

مکان کے ساتھ باڑا تھا جہاں یہ گھرانا سوروں کی افزائش کرتا۔ کچھ آگے کھیت تھے جو کچھ زیادہ زرخیز نہیں تھے۔

یہ جوزف اور جیرمی کی چھوٹی سی کائنات تھی، جہاں مشکلات کی فراوانی تھی۔ بڈھے بڑھیا، دونوں ہی ان پڑھ تھے مگر ان میں دیہی زندگی کی دانش کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ صبح اٹھ کر وہ کھیتوں میں نکل جاتے۔ گھر سے ملحقہ کیاریوں میں سبزی اگاتے۔ آگ جلانے کے لیے لکڑیاں کاٹتے۔ محلے کے کنویں سے پیٹھ پر پانی لاد کر لاتے۔ اِس کام میں ان کا بیٹا ڈی سوزا اور بہو ماریہ بھی مدد کرتے۔

یہ خاندان سارا ماگو کہلاتا تھا۔ سارا ماگو پرتگالی زبان میں ایک جنگلی جھاڑی کو کہتے ہیں جسے غریب افراد بہ طور غذا بھی استعمال کرتے۔

ازین یاگا میں زندگی کی رفتار انتہائی سست تھی جس سے اب نوجوان ڈی سوزا کو اکتاہٹ ہونے لگی۔ وہ گوری رنگت والا ایک دراز قد آدمی تھا۔ چند جماعتیں اس نے پڑھ رکھی تھیں۔ ملازمتوں کی تلاش میں بڑے شہروں میں بھی کچھ وقت گزار چکا تھا اور اسی تجربے نے دیہی زندگی سے اس کا دل اچاٹ کر دیا۔ خدا نے اُسے دو بیٹوں سے نوازا تھا۔ اس خاموش گاؤں میں اپنے بچوں کا مستقبل اسے اندیشوں میں گھرا دکھائی دیتا۔ بس ان ہی خیالات نے اسے رختِ سفر باندھنے کی تحریک دی۔

دوسرے بیٹے کی پیدائش کو چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ کہرے میں لپٹی ایک صبح اس نے کھانے کی میز پر لزبن جانے کا اعلان کر دیا۔ اس فیصلے کو قبول کرنا ماں باپ کے لیے سہل نہیں تھا، مگر انہوں نے رکاوٹ کھڑی نہیں کی۔ بڈھے بڑھیا کو بس اِس بات کا دکھ تھا کہ وہ اپنے پوتوں سے دور ہو رہے ہیں، خصوصاً چھوٹے پوتے سے، جس کی قلقاریاں اس خستہ حال مکان میں زندگی بھر دیا کرتی تھیں۔

ڈی سوزا نے گاؤں چھوڑ دیا۔ وہ بیوی بچوں کے ساتھ شہر چلا گیا، مگر گاؤں نے اُسے نہیں چھوڑا۔ یہ ہی قدرت کا فیصلہ تھا۔ اس خاندان کی تیسری نسل کو... بڈھے کے پوتے کو پھر اسی گاؤں کی سمت پلٹنا تھا۔ وہ ناقابلِ یقین کہانیاں بُننے کے لیے، جو پوری دنیا کو اپنے سحر میں لینے والی تھیں۔

یہ ہی قدرت کا فیصلہ تھا!

☆☆☆

وہاں گھٹن تھی، شور تھا۔ زندگی بہت بے آرام دہ تھی۔

16 نومبر 1922 کو پیدا ہونے والے ہوزے سارا ماگو نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو خود کو کرائے کے چھوٹے سے مکان میں پایا جہاں سہولیات کا فقدان تھا۔

باپ پولیس میں کانسٹیبل بھرتی ہوگیا تھا۔ اس زمانے میں پولیس میں ملازمت کے لیے فقط دو شرائط تھیں۔ آپ لکھ پڑھ جانتے ہوں اور جسمانی طور پر مضبوط ہوں۔ خوش قسمتی سے دیہی علاقے سے آنے والا اس کا باپ دونوں شرائط پر پورا اترتا تھا۔

اس دڑبے نما مکان کی دیوار پر ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر لگی تھی۔ تصویر میں اس کی خوبرو ماں چہرے پر سنجیدگی سجائے، ہاتھ میں پھول لیے ایک اسٹول پر بیٹھی تھی اور اُس کا محنت کش باپ ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا۔

اسی فریم کے ساتھ ایک اور تصویر ٹنگی تھی۔ ایک بچے کی تصویر۔ جو اس دڑبے میں گہری یاسیت کی علامت تھی۔

خاندان پر ایک سانحہ گزر چکا تھا۔ لزبن منتقل ہونے کے چند ہی ماہ بعد انہیں اپنے بڑے بیٹے فرانسسکو کی موت کا صدمہ سہنا پڑا جس نے برسوں انہیں بے کل رکھا۔ اس صدمے سے نبرد آزما ہونے کے لیے انہوں نے وہی کیا، جس کی توقع کی جاسکتی تھی۔

میاں بیوی نے کل محبت اپنے دوسرے بیٹے کے نام کر دی۔

وہ پیار سے اسے خاندانی نام یعنی سارا ماگو سے پکارتے۔ دراصل ماریہ اور ڈی سوزا کا یہ عمل اپنی زمین سے جُڑے رہنے کی کوشش تھی۔ یہ تو انہیں بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ لڑکا خود بھی زمین سے جڑنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔

ہوزے سانحے کے اثرات سے محفوظ رہا۔ اور یہ قابلِ فہم تھا۔ جب بڑے بھائی کی موت ہوئی، وہ بہت کم سن تھا۔ غم کیا ہے، ابھی نہیں جانتا تھا۔

تو اس نے ایک عام بچے کی طرح زندگی گزاری۔ شرارتیں کیں۔ فرمائشیں کی۔ فرمائش پوری نہیں ہوئی تو رو رو کر خود کو ہلکان کرلیا۔

بوائی کے موسم میں یہ خاندان چند روز کے لیے گاؤں چلا جاتا جہاں ہوزے خود کو ایک بوڑھے جوڑے کے روبرو پاتا، جن کی کٹیا کے باہر درختوں کی طویل قطار تھی جس کے پہلو میں کھیت تھے اور جہاں دسترخوان انتہائی مختصر ہوتا۔

جیسے جیسے وہ بڑا ہو رہا تھا، بڈھے بڑھیا کی محبت شدت اختیار کرتی جارہی تھی۔ وہ اسے کہانیاں سنانے لگے تھے۔ پریوں کی کہانیاں، نیک دل شہزادوں کے قصے، جنگ کی داستانیں، جو اتنی تحیر خیز اور دل چسپ ہوتیں کہ شہر میں ہوتے ہوئے اسے گاؤں کی یاد ستاتی۔ وہ بوائی کے موسم کا انتظار کرتا۔ گاؤں پہنچ کر خود کو پُرسکون محسوس کرتا۔ اور جب ڈی سوزا اور ماریہ لوٹنے کے لیے سامان باندھنے لگتے، اس کا دل اداس ہو جاتا۔

اس موقع پر بڈھا اس کی دل جوئی کرتا۔ ”کوئی مسئلہ نہیں۔ بس چند روز کی تو بات ہے۔“ جھریوں زدہ چہرے پر مسکراہٹ ہوتی۔ ”جیسے ہی تمہارے ڈیڈی کی چھٹیاں ہوں، چلے آنا۔ ہم تمہارا انتظار کریں گے۔“

بچے نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ ”جب میں بڑا ہو جاؤں گا نا، تو خود ہی بس پکڑ کر آجایا کروں گا۔“

بڈھا مسکرایا۔ ”ٹھیک ہے۔ پھر میں روز تمہیں کہانیاں سنایا کروں گا۔“

”وعدہ؟“ بچے نے ہاتھ آگے پھیلا دیا۔

”پکا وعدہ!“

اس کے چھوٹے سے ہاتھ پر ایک بوڑھا ہاتھ دھرا تھا۔ یہ ایک عہد تھا۔ ایک معصوم اور حسین عہد۔

☆☆☆

”نام: ہوزے ڈی سوزا سارا ماگو۔ ولدیت: ڈی سوزا سارا ماگو۔“

آدمی نے کاؤنٹر کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا۔ دوسری طرف بیٹھی عورت نے فارم پر قلم چلانا شروع کردیا اور بچے کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی۔

”ہوزے ڈی سوزا سارا ماگو؟“ اس نے سوال کیا۔ ”میرا نام تو سارا ماگو ہے۔“

”ہاں۔“ آدمی نے مسکراتے ہوئے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ ”مگر تمہارا پورا نام ہوزے ڈی سوزا سارا ماگو ہے۔ ہوزے ڈی سوزا میرا نام۔ اور سارا ماگو ہمارا خاندانی نام۔“

یہ اُس دوپہر کا ذکر ہے، جب کانسٹیبل اپنے سات سالہ بیٹے کو سرکاری اسکول میں داخل کروانے لے گیا جہاں بچے پر یہ انکشاف ہوا کہ اُس کا اپنا کوئی نام نہیں تھا۔

البتہ اس نے زیادہ سوچ بچار کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ زندگی معصوم تھی۔ اس میں خوشیاں تھیں۔ سادگی تھی۔ ماں باپ کا پیار تھا۔ گاؤں جانے کی خواہش تھی۔

یہ تو اسے کچھ برس بعد پتا چلا کہ اس کے نام کے مانند اس کی تاریخ پیدائش میں بھی تھوڑا مسئلہ ہے۔ پیدا وہ 16 نومبر کو ہوا مگر اس کے باپ نے محکمۂ بہبود میں دو روز بعد اندراج کروایا۔

1926 میں فوج کے برسرِاقتدار آنے کے بعد اس بابت سخت قوانین نافذ کردیے گئے تھے۔ یہ غلطی قابلِ گرفت تھی۔ خوش قسمتی سے ڈی سوزا کی چند فوجی افسران سے اچھی سلام دعا تھی۔ وہ جنگِ عظیم اول میں حصہ لے چکا تھا اور کچھ بااثر افراد کو جانتا تھا۔ تعلقات اور تھوڑی بہت رشوت سے بات بن گئی۔ یہ معاملہ دبا دیا گیا۔

ترقی پذیر ممالک میں ایسا ہی ہوتا ہے!

☆☆☆

وہاں کشادگی کا احساس تھا۔ پُرسکون خاموشی تھی۔ اور اپنا پن تھا۔

بلاشبہ وہ چھوٹا سا مکان تھا، مگر ڈی سوزا اور ماریہ کو یہ اطمینان تھا کہ یہ ان کی ملکیت تھی۔ ہر ماہ کرائے کی ادائیگی کا جھنجٹ نہیں۔ منہ پھٹ مالک مکان سے ملاقات کا اندیشہ نہیں۔ کوئی پریشانی نہیں۔

ہوزے اب تیرہ برس کا ہوگیا۔ اس سے قبل وہ دڑبے نما مکانات میں رہا کرتا تھا، جہاں گھٹن چھائی رہتی مگر اب یاسیت کا پردہ شق ہوگیا تھا۔ گہرے سانس لیے جاسکتے تھے کہ بڑا امکان میسر تھا۔

شرارتیں اب خاصی کم ہوگئی تھیں۔ اس کی کُلی توجہ پڑھائی پر مرکوز تھی۔ بہت اچھا طالب علم تھا وہ۔ دوسری ہی جماعت میں ہجے کی غلطی سے پاک چھوٹے چھوٹے جملے لکھنے کے قابل ہوگیا۔ ایک ہی برس میں دو کلاسیں عبور کرلیں اور چوتھے درجے میں پہنچ گیا۔ اُس کی قابلیت اور شوق دیکھتے ہوئے ڈی سوزا نے اسے سرکاری اسکول سے اٹھا کر گرامر اسکول میں داخل کروانے کا فیصلہ کرلیا۔

اور یہ ایک مشکل فیصلہ تھا۔ اگرچہ اس نے حالیہ برسوں میں ترقی کے مراحل طے کیے تھے، تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا مگر حکومت کے آمرانہ اقدامات کی وجہ سے پرتگال کی معیشت بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ مہنگائی آسمان پر پہنچ گئی۔ ایسے میں ایک غریب پولیس آفیسر کے لیے اپنے بیٹے کو انگلش اسکول میں پڑھنا آسان نہیں تھا، مگر فیصلہ ہوچکا تھا۔

نئے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ابتدائی امتحانات میں نتائج شان دار رہے۔ کھیل کے میدانوں میں بھی وہ خاصا فعال تھا۔ جلد وہ طلبا اور اساتذہ کا چہیتا بن گیا۔ جب اسٹوڈنٹس یونین کے انتخابات ہوئے تو اسے خزانچی چن لیا گیا۔

اِس عرصے میں اس کے فارغ اوقات کا بڑا حصہ گاؤں میں گزرا، اپنے دادا دادی کے پاس۔ گاؤں کے شدید موسموں سے وہ محبت کرنے لگا تھا۔

جوں ہی چھٹیاں ہوتیں، وہ سامان باندھ کر ازین یاگا کی سمت چل پڑتا۔ ماضی کے برعکس اب وہ شہری اور دیہی زندگی کا فرق سمجھنے لگا تھا۔ گاؤں میں داخل ہوتے وقت جس دھوئیں کا وہ سامنا کرتا، وہ شہر کی سڑکوں پر تیرتے دھوئیں سے یکسر مختلف تھا۔ وہاں ہوائیں بھی الگ ڈھب پر چلا کرتیں۔ سورج کے طلوع ہونے اور چاند کے ظاہر ہونے میں بھی خاصا فرق تھا۔

ہوزے جانتا تھا کہ اس کا دادا ایک غریب آدمی ہے جو چھوٹے سے گھر میں رہتا ہے، جس کی چھت مٹی کی ہے اور جہاں کوئی بیت الخلا نہیں۔ جہاں فصل کی بوائی اور کٹائی کے معاملے میں برتی جانے والی غفلت کا نتیجہ فاقوں کی صورت میں سامنے آتا۔

وہاں رہتے ہوئے اس نے خود بھی فاقوں کا تجربہ کیا، جس نے دیہی زندگی کے راز اس پر افشاں کیے اور اسے وہ لازوال طرزِ فکر بخشی جو برسوں بعد اس کی تحریروں میں ظاہر ہونے والی تھی۔

اس نے اپنے دادا کی مدد کرتے ہوئے گھر سے ملحق کیاریوں میں سبزی اگانے کے لیے کھدائی کی۔ آگ جلانے کے لیے لکڑیاں اکٹھی کیں۔ چوکیداروں سے نظر بچا کر دادی کے ساتھ بھٹے کے کھیت سے جانوروں کے لیے چارا کاٹا۔

اس کے دادا دادی بہت ہی رحم دل لوگ تھے، جو اس دور افتادہ مقام پر زندہ رہنے کے لیے خود کو کام کے سپرد کرچکے تھے۔ دن بھر وہ مصروف رہتے اور رات میں انجیر کے نیچے بستر لگا دیتے، جہاں لیٹ کر وہ آسمان میں، شاخوں سے پرے ستاروں کو تکتے تکتے سوجاتے۔

اور اگر نیند کی دیوی ناراض ہوتی تو بوڑھا جوزف اپنے پوتے کو کہانیاں سناتا۔ اس کام میں تو وہ ماہر تھا۔ پورا گاؤں اس کی صلاحیتوں کا معترف تھا۔ وہ ایک قصہ تمام کرتا، تو اس کی آخری سطر سے دوسری کہانی شروع کردیتا۔ اس کہانی کے اختتام سے ایک اور داستان پھوٹ پڑتی۔ یہ کہانیاں لاغیر مختتم جنگوں سے متعلق اور ان مہم جوؤں سے متعلق ہوتیں، جو کبھی دریا عبور کرنے کی سعی کرتے اور کبھی ریگستان پار کرنے کا ارادہ باندھتے۔

گو وہ اَن پڑھ تھا مگر نوجوانی کی دہلیز پر کھڑے ہوزے کے لیے تو وہ دنیا کا ذہین ترین انسان تھا جو اس وقت تک اپنے پوتے کو کہانیاں سناتا رہتا جب تک وہ نیند کی وادی میں نہیں اتر جاتا۔

سوتے ہوئے بھی یہ کہانیاں ہوزے کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ وہ اس کے خوابوں میں در آتیں۔ خواب... جو کبھی کبھار بہت ڈراؤنی شکل اختیار کرلیتے۔

گرمیوں میں صبح جلدی ہوجاتی۔ جب سورج کی تیز کرنوں سے اس کی آنکھ کھلتی، بڈھا مویشیوں کے ساتھ کھیتوں میں پہنچ چکا ہوتا۔

وہ اپنا بستر تہ کرکے باسی پانی کی چھینٹوں سے نیند بھگانے کی کوشش کرتا۔ پھر کچن میں پہنچ جاتا۔ بڑھیا پوتے کے سامنے گرم شوربے کا پیالا رکھ دیتی جس میں روٹی کی ٹکڑے تیر رہے ہوتے۔ ناشتے کے دوران وہ پوچھتی۔ ''کیا رات تم نے کوئی خواب دیکھا؟''

جب کبھی ہوزے اسے کوئی ڈراؤنا خواب سناتا تو وہ مسکراتے ہوئے یہی کہتی۔ ''پروا مت کرو، یہ سب تمہارے دادا کی کہانیوں کا نتیجہ ہے اور کچھ نہیں۔''

ناشتے سے فارغ ہوکر وہ باہر نکل جاتا۔ منزل کھیت ہوتے، مگر اس سے پہلے وہ گاؤں کا چکر لگاتا۔ وہاں کے باسیوں کی چال ڈھال، رہن سہن کا جائزہ لیتا جو اس کے نزدیک ایک سادہ مگر عجیب دنیا میں جی رہے تھے۔

ماحول اور رہن سہن کے فرق کے ساتھ ساتھ اب ہوزے پر شہری اور دیہی علاقوں کا لسانی فرق بھی واضح ہوتا جارہا تھا۔

چودہ سال کی عمر میں وہ یہ محسوس کرسکتا تھا کہ شہریوں کے برعکس دیہاتیوں کا ذخیرۂ الفاظ خاصا محدود ہوتا ہے۔ فقط چار پانچ سو الفاظ، بس! وہ فقط ان ہی الفاظ کو برتتے ہیں، جو ان کی زندگی میں شامل ہوتے۔ وہ کھانے پینے کی اشیاء، اوزاروں اور عام استعمال کی چیزوں کے نام جانتے تھے۔ مسلسل انہیں ہی دہراتے۔

ہوزے کے لیے گاؤں دلچسپ قصے کہانیوں سے بھرپور تھا۔ خصوصاً وہ روایت تو بہت ہی پُرتجسس تھی جسے سنتے ہوئے وہ بڑا ہوا۔

یہ روایت ایک دیو سے متعلق تھی، جو تاریک اور سرد راتوں میں اچانک ظاہر ہوتا اور گرجا جانے والی گاؤں کی اکلوتی پکی سڑک بند کردیتا۔ اوائل عمری میں تو اس طرح کی افواہیں اسے خوف زدہ کردیتیں۔ وہ اپنی دادی کی گود میں گھس جاتا مگر اب وہ اس روایت پر مسکرانے کا ہنر سیکھ گیا تھا۔

دادا کے مانند وہ اپنی دادی کو بہت چاہتا تھا۔ بوڑھی جو کسی زمانے میں بے حد حسین ہوا کرتی تھی۔ وہ زندگی سے عشق کرتی تھی۔ اکثر رات کو جب شمالی ستارہ بادلوں کے پیچھے چھپ جاتا، وہ سرد آہ بھر کر کہتی۔ ''یہ دنیا کتنی خوب صورت ہے کتنے افسوس کی بات ہے کہ میں ایک دن مرجاؤں گی۔''

''نہیں وہ موت سے خوف زدہ نہیں ہے۔'' بوڑھا اپنے پوتے سے کہتا۔ ''بس اسے افسوس ہے کہ اسے ایک دن مرنا پڑے گا۔''

وہ پیڑ تلے خاموش لیٹے آسمان تکتے رہتے۔ پھر بوڑھا کبھی کے بل ہوجاتا۔ ''کیا میں نے اس شخص کی کہانی سنائی، جس نے یہ گاؤں آباد کیا تھا۔ کمال کا شخص تھا وہ بھی...''

بوڑھا ایک غیر مختتم کہانی سنانے کے لیے تیار ہوجاتا۔ اور نوجوان بار بار یہ سوال پوچھنے کے لیے کہ ''پھر کیا ہوا؟''

رات بیتتی رہتی... اور کہانی جاری رہتی۔

☆☆☆

وحشت سی وحشت تھی۔

فسطائی حکومت نے معاشی امکانات کو نگل لیا۔ انتہا پسندانہ قوم پرستی نے پرتگال کو دنیا سے کاٹ دیا اور معاشی بحران نے گمبھیر شکل اختیار کرلی۔ نئے ٹیکس نافذ ہوگئے اور متوسط طبقہ غربت کی سمت سفر کرنے لگا۔

ڈی سوزا کے لیے صورتِ حال بے حد مشکل تھی۔ تنخواہ میں گزارہ نہیں ہوتا تھا، اوپر سے ہوزے کی بھاری فیس۔ چند ماہ تو اس نے صبر کیا، مگر جب حالات مزید بگڑ گئے تو بادلِ ناخواستہ بیٹے کو اسکول سے اٹھانا پڑا۔

نوجوان کے لیے یہ بھاری صدمہ تھا۔ وہ اسکول کے ماحول سے ہم آہنگ ہوگیا تھا۔ مستقبل کے حوالے سے سپنے بھی دیکھنے لگا تھا، مگر فسطائی حکومت کے ظالمانہ اقدامات نے تمام خواب بکھیر دیے۔ اسے ایک ٹیکنیکل اسکول میں ڈال دیا گیا، تاکہ وہ جلد از جلد گھر کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہوجائے۔

شروع شروع میں تو ہوزے کو بہت پریشانی ہوئی۔ انگریزی اسکول کے زرخیز ماحول کے برعکس یہاں اداسی اور خشکی چھائی ہوئی تھی۔ مشینوں کے پرزے اور اوزار زندگی سے محروم تھے۔ اسے اکتاہٹ محسوس ہونے لگی، مگر پھر اس نے ٹیکنیکل اسکول کے نصاب میں ایک ایسا پہلو دریافت کیا، جس نے اسے تجسس سے بھر دیا۔

حیرت انگیز طور پر فرانسیسی میں تحریر کردہ نصاب میں ادب کا مضمون شامل تھا۔

گو اسکول کی انتظامیہ اور طلبا اس مضمون کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے، مگر اس نے ہوزے کو نئی دنیا سے متعارف کروایا۔ ایسی دنیا، جو اس کے اندرون سے میل کھاتی تھی۔

اس نے چند بڑے ادیبوں کی کہانیاں پڑھیں، چند اچھے شعرا کے کلام سے حظ اٹھایا۔ سفر ناموں کا ذائقہ چکھا اور یہ سب اس کی یادوں کا حصہ بن گیا۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ مشینوں سے اس کی گاڑھی نہیں چھنتی تھی، مگر ادب کے چسکے نے اب تھوڑی

سہولت پیدا کردی۔

گھر میں کوئی کتاب نہیں تھی۔ فکرِ معاش میں الجھے ڈی سوزا اور ماریا کے پاس وقت ہی کہاں تھا۔ فقط چند درسی کتب ایک کونے میں خاموشی سے پڑی رہتیں۔ مگر اب اس گھر میں کتابوں کی آمد کا آغاز ہونے کو تھا، کیونکہ ان کے بیٹے کی ادب سے دوستی ہوگئی تھی۔ مگر کتاب خریدنا ہوزے کے لیے ایک مشکل امر تھا۔ جیب خالی تھی۔

اپنے مختصر سے جیب خرچ سے کچھ سکے بچالینا سہل نہیں تھا، مگر اس نے کوشش جاری رکھی۔ ایک دوست سے کچھ قرض بھی لیا تب کہیں جاکر اس نے زندگی کی پہلی کتاب خریدی۔

جب یہ اہم ترین واقعہ رونما ہوا، وہ زندگی کی انیس بہاریں دیکھ چکا تھا۔

وہ ایک پرتگالی شاعر کا کلام تھا اور یہ کتاب مرتے دم تک اس کے شیلف میں رہنے والی تھی۔

☆☆☆

وہ آنکھیں آسمان سی نیلی اور وسیع تھیں۔ چہرے کے گرد نور کا ہالا تھا۔ بدن انوکھے سانچے میں ڈھالا گیا تھا۔

ہاں وہ محبت کے قابل تھی اور نوجوان ہوزے محبت کے تجربے سے گزرنے کے لیے تیار۔

اس دوشیزہ کا نام ایلڈا ارلیس تھا۔ وہ ایک باصلاحیت آرٹسٹ تھی مگر اس وقت خود کو منوانے کی جدوجہد میں جتی تھی۔

ہوزے کی اس سے ملاقات ایک دوسرے درجے کی ایگزی بیشن میں ہوئی، جس کی انتظامیہ کو وہ لڑکی بہ مشکل اپنا ایک فن پارہ... آویزاں کرنے پر قائل کرسکی تھی... اور پوری نمائش کے دوران اس کے اردگرد منڈلاتی رہی، تاکہ اس میں دلچسپی لینے والوں سے خیالات کا تبادلہ کرسکے۔

وہاں آنے والے بیش تر افراد جلدی میں تھے۔ پھر بارش بھی ہو رہی تھی۔ فقط ایک نوجوان کی آنکھوں نے اسے چالیس سیکنڈ تک پرکھا اور یہ نوجوان ہوزے تھا۔

پہلی نظر کی محبت کے دونوں ہی قائل نہیں تھے، مگر پہلی ہی ملاقات کے بعد انہیں اپنے نظریات سے رجوع کرنا پڑا۔

انہیں ایک دوسرے سے محبت ہوگئی تھی۔

جیب دونوں کی خالی تھی۔ تحائف کے تبادلے اور اچھے ریسٹورنٹس میں کھانا کھانے کا امکان نہیں تھا۔ سو وہ ہر سہ پہر ایک پارک میں ملا کرتے۔

ایلڈا ایک چھوٹے سے آرٹ انسٹی ٹیوٹ کی طالبہ تھی، جب کہ ہوزے ٹیکنیکل اسکول کے آخری سال میں تھا۔ وہ گھنٹوں چھتنار درختوں کے نیچے، بینچ پر بیٹھے رہتے اور ان ملاقاتوں میں مستقبل کے سپنے بنے جاتے۔

شام آتی تو ایلڈا اپنے اپارٹمنٹ کی سمت چل پڑتی۔ مگر ہوزے گھر نہیں جاتا... اس کا رخ تو ایک نئی دنیا کی طرف ہوتا، جسے اس نے چند ماہ قبل دریافت کیا تھا۔

یہ لزبن کی مرکزی لائبریری تھی جو قسم قسم کی کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ ہوزے کو کوئی ایسا راہبر میسر نہیں تھا جو کتابوں کے انتخاب میں مدد کرسکتا۔ تو جو ہاتھ لگا، وہ پڑھتا گیا۔

تجسس اور شوق کے سہارے دھیرے دھیرے وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

لائبریری بند ہونے تک وہ وہیں بیٹھا رہتا۔ کوئی کتاب دیوانہ کردیتی تو ایشو کروالیتا۔

مطالعے کی عادت پختہ ہوتی گئی۔ اب اسے انتخاب کرنے کا ڈھنگ آگیا۔ سفرناموں، آپ بیتیوں اور مضامین کے برعکس شاعری اور فکشن اسے زیادہ بھاتے۔ طویل نظمیں، ضخیم ناول اچھے لگتے۔ بین الاقوامی ادب سے بھی وہیں دوستی ہوئی۔ روسی، فرانسیسی اور انگریزی ادیبوں سے رشتہ استوار ہوا۔

جلد ہی یہ ادیب اس کے خوابوں میں در آئے۔ اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگے، اسے تحریک دینے لگے کہ وہ اپنے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرے۔ قلم تھام لے۔

تو کیا وہ قلم تھامنے کے لیے تیار تھا؟

☆☆☆

وقت گزر رہا تھا۔ محبت اپنے جوبن پر تھی اور مالیاتی بحران گمبھیر شکل اختیار کرگیا تھا۔ جنگِ عظیم دوم شروع ہوچکی تھی۔

ٹیکنیکل اسکول سے نکلتے ہی ہوزے ایک گیراج میں داخل ہوگیا۔ گو تنخواہ معمولی تھی، بحران حالات میں غنیمت تھی۔ بے روزگاری کے عفریت نے پرتگال کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اگر وہ پولیس آفیسر کا بیٹا نہ ہوتا، تو اسے بھی ملازمت کے لیے دھکے کھانے پڑتے۔

اب وہ موٹر گاڑیوں کے انجنوں میں چھپے مسائل سلجھاتا۔ سخت گرمی میں گھنٹوں بونٹ کھولے کھڑا رہتا۔ کہنیوں تک ہاتھ گریس میں لتھڑ جاتے۔ کئی دوپہریں گاڑی کے نیچے اوزاروں کے ساتھ لیٹے گزر جاتیں۔ شام میں تھکا ہارا وہ گھر لوٹتا۔ کھانا کھاتے ہی باہر کی سمت دوڑ پڑتا۔ پارک میں ایلڈا منتظر ہوتی۔

ان کی محبت شدت اختیار کرگئی تھی۔ وہ جلد شادی کے بندھن میں بندھنے والے تھے۔

جب رات گہری ہوجاتی اور ایلڈا اپارٹمنٹ چلی جاتی تو وہ نئے امکانات کی سمت چل پڑتا۔

وہ انقلابیوں کا ایک گروہ تھا جو ساری ساری رات ان کتابوں اور نظریات کی بابت گفتگو کرتا جنہوں نے اس وقت دنیا کو حصار میں لے رکھا تھا۔

ہاں، یہاں ان ہی نظریات کا ذکر ہو رہا ہے، جنہیں کارل مارکس کے قلم کی جنبش نے جنم دیا، جنہوں نے دنیا میں ہلچل مچادی۔ تبدیلی کی ہوائیں چل پڑیں۔ باغی ایک پرچم تلے اکٹھے ہونے لگے، نتیجتاً روس میں زار کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور اشتراکی حکومت قائم ہوگئی۔

سوویت یونین کے قیام سے دنیا کے دیگر ممالک میں بسنے والے کمیونسٹ بھی پُرقوت ہوگئے۔ انہوں نے اپنے اپنے خطوں میں تحریکوں کا آغاز کردیا۔ جنگِ عظیم دوم نے آگ بھڑکادی۔ پرتگال میں بھی لگ بھگ یہ ہی صورتِ حال تھی۔ کمیونزم نوجوانوں میں تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہا تھا۔ ہوزے بھی اس فکر سے متاثر ہونے والوں میں شامل تھا۔

اب مارکس اور لینن کی کتابیں مطالعے میں رہنے لگیں۔ کمیونسٹ فکشن نگاروں کا سحر اس پر غالب آگیا۔ تبدیلی کا خواب اس نے آنکھوں میں سجالیا تھا۔

آنے والی زندگی میں وہ عملی سیاست میں بھی حصہ لینے والا تھا، تاہم اس وقت سیاست سے زیادہ ایک اور مسئلہ دردِ سر بنا ہوا تھا۔ اس کی شادی ہونے والی تھی۔

تنخواہ معمولی تھی۔ ایسے میں شادی کرنا دوراندیشی نہیں ہوتی۔ دوست متفق نہیں تھے۔ والدین بھی راضی نہیں تھے مگر وہ یہ فیصلہ کرچکا تھا اور اپنا ارادہ بدلنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

اسے ادراک تھا کہ مہنگائی اور مالیاتی بحران کے اس دور میں گیراج کی ملازمت کافی نہیں۔ اسے بہتر مواقع تلاش کرنے ہوں گے۔

ایک طریقہ تو یہ تھا کہ وہ اپنا گیراج کرلے۔ مگر یہ تجویز آغاز ہی میں رد کردی گئی کیونکہ اس کے لیے بھاری سرمائے کی ضرورت تھی اور جنگِ عظیم دوم نے عوام کی کمر توڑ دی تھی۔ دوسرا خیال یہ تھا کہ کسی اور محکمے میں ملازمت تلاش کی جائے۔

اس زمانے میں سوشل ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ میں اسامیوں کا اعلان ہوا۔ ہوزے فوجی حکومت کے دور میں سرکاری ادارے میں کام کرنے کے خلاف تھا مگر ایلڈا نے اسے قائل کرلیا۔ وہ خود بھی اپنا مصوری کا شوق عارضی طور پر تج کر ایک نجی ریلوے کمپنی میں ٹائپسٹ ہوگئی تھی۔

1944 میں بہ طور ایڈمنسٹریٹر سول سرونٹ اس نے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ اسی سال وہ دونوں ایک دوسرے سے منسوب ہوگئے۔

شادی کی تقریب سادگی سے منعقد کی گئی۔ ڈی سوزا اور ماریہ نے جوڑے کو دعائیں دیں۔ ہوزے کا دادا بیماری کے باوجود لزبن پہنچ گیا اور جب تک تقریب جاری رہی، اردگرد بیٹھے افراد کو اپنی شادی کے قصے مزے لے لے کر سناتا رہا۔

یہ آخری موقع تھا جب بڈھے نے اپنے پوتے کو کہانیاں سنائیں۔ اب اس کے سینے میں درد رہنے لگا تھا۔

☆☆☆

دروازے کی گھنٹی اندیشوں کو بڑھاوا دیتی تھی۔

ڈی سوزا نے دروازہ کھولا۔ سامنے ڈاکیا کھڑا تھا۔

”آپ کے نام ازین یاگا سے تار ہے جناب۔“

ڈی سوزا کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ تار پڑھتے ہی ہاتھ کانپ رہے تھے۔

کچھ دیر بعد ہوزے باپ کے سامنے موجود تھا جو سر جھکائے رنج والم کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔

”آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔“ اس نے ڈی سوزا کی ہمت بڑھائی۔ ”ہارٹ سرجری اب کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ ہم دادا کو لزبن لے آئیں گے۔ سب سے اچھے اسپتال میں ان کا آپریشن ہوگا۔ وہ جلد ٹھیک ہوجائیں گے۔“

باپ کھڑا ہوگیا۔ ”ہمیں ابھی نکلنا ہوگا۔“

چند گھنٹوں بعد باپ بیٹا اپنے گاؤں میں تھے، اس شخص کے سامنے جو اس خاندان کا مرکز تھا اور اس وقت مزے سے بیٹھا سگار پی رہا تھا۔

”کچھ نہیں ہوا۔ بس سینے میں درد اٹھا تھا۔ دوا لے لی ہے۔“ اس نے سگریٹ کا کش لیا۔ ”ایسے ہی انہوں نے تمہیں بلوالیا۔ اب سب ٹھیک ہے۔“

”کچھ ٹھیک نہیں۔“ ڈی سوزا چلّایا اور کاغذ کے چند پرزے اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائے۔ ”رپورٹ کے مطابق آپ کے دو وال بند ہوچکے ہیں۔ آپریشن لازمی ہے۔ ورنہ دل کا اگلا دورہ...“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”چھوڑو بھی۔“ بوڑھے نے قہقہہ لگایا۔ ”کیا میں نے تمہیں اس شخص کا قصہ سنایا جسے پانچ ہارٹ اٹیک ہوئے تھے۔ اسی گاؤں کا تھا وہ۔ ہمارے پڑوس میں...“

”دادا!“ ہوزے نے تیزی سے بات کاٹی۔ ”آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ ابھی، اسی وقت۔“

’’ٹھیک ہے۔‘‘ بوڑھے نے برا سامنہ بنایا۔

وہ کھڑا ہوا۔ اور تب ہوزے کو اندازہ ہوا کہ وہ کس قدر بوڑھا ہو چکا ہے۔

’’سامان کی ضرورت نہیں۔‘‘ ڈی سوا نے کہا۔ مگر بوڑھا جواب دیے بغیر باغیچے کی سمت بڑھنے لگا۔ ہوزے اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

اب وہ باغیچے میں تھے۔ وہاں چند زیتون کے درخت تھے، کچھ جھاڑیاں تھیں جن میں وہ جھاڑی بھی تھی، جسے سارا اما گو کہا جاتا ہے۔

بوڑھا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا ہر درخت تک جاتا۔ وہ درخت سے لپٹ جاتا اور انتہائی شدت کے ساتھ انھیں الوداع کہتا۔

’’میرے جانے کا وقت آگیا ہے دوستو۔‘‘ اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ ’’الوداع۔‘‘

’’آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔‘‘ ہوزے نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ ’’ابھی آپ بہت جئیں گے۔‘‘

’’نہیں، میں جانتا ہوں۔‘‘ بوڑھے نے آنسو پونچھے۔ ’’جینے کا وقت گزر گیا ہے۔‘‘

بوڑھا درست تھا۔

آپریشن ناکام گیا۔ جنگِ عظیم دوم کے خاتمے کے دو روز بعد بوڑھے نے دم توڑ دیا۔ موت کے وقت اس کے چہرے پر گہرا سکون تھا۔ وہ اپنی زندگی جی چکا تھا۔ دوستوں کو الوداع کہہ چکا تھا۔

اپنے عہد کا عظیم داستان گو رخصت ہوگیا۔ مگر اپنی وراثت چھوڑ گیا۔ اپنے پوتے کے لیے...

☆☆☆

حالات میں سدھار آنے لگا۔

پرتگال جنگِ عظیم کے زخموں سے ابھرنے لگا تھا۔ بے روزگاری کا عفریت سکڑ گیا۔ کمیونسٹ پارٹی کے شدید دباؤ پر حکومت بھی اصلاحات پر مجبور ہوگئی جس پر ہوزے اور اس کے دوستوں نے جشن منایا۔

اور پھر جشن منانے کا ایک اور موقع آیا۔ 1947 میں ایلڈا اور ہوزے کو خدا نے ایک بیٹی سے نوازا، جس کا نام وائیلیٹی رکھا گیا۔ یہ بچی آنے والے وقتوں میں سارا ما گو خاندان کا نام زندہ رکھنے والی تھی۔ وہ ہوزے کی اکلوتی اولاد تھی۔

ہوزے میں ایک بڑی تبدیلی ظاہر ہو چکی تھی۔ اس کا مطالعہ اب تحریروں کے قالب میں ڈھلنے لگا۔ ذہن کہانیاں گھڑ رہا تھا۔ نظمیں کہنے کی للک بھی بے کل رکھنے لگی تھی۔

کمیونسٹوں سے تعلق نے اُسے پرتگالی ادیبوں سے متعارف کروایا۔ سوشل ویلفیر ڈیپارٹمنٹ کی ملازمت نے بھی اس رشتے کو استحکام دیا — مختلف ادبی جرائد میں اس کی تخلیقات شائع ہونے لگیں۔

اور پھر اس نے ایک بڑا فیصلہ کیا۔ ناول لکھنے کا فیصلہ۔

دفتر سے لوٹتے ہی وہ گھر کے ایک کونے میں بیٹھ جاتا جہاں لکھنے کی میز تھی اور کاغذات کا پلندا تھا۔ اگلے دو گھنٹے لکھنے میں صرف ہوتے۔ آدھے گھنٹے وہ اپنی تحریر کا جائزہ لیتا۔ پھر بستر پہ چلا جاتا۔ یوں دھیرے دھیرے ایک ناول کی شبیہ ابھرنے لگی۔ اس نے ناول کا نام ’’دی ونڈو‘‘ یعنی کھڑکی رکھا تھا مگر جس پبلشر نے اسے چھاپنے کی ہامی بھری، اُسے یہ نام پسند نہیں آیا۔

’’Land of Sin زیادہ بہتر رہے گا۔‘‘ پبلشر نے تمباکو چباتے ہوئے کہا۔ ’’آپ نے گناہ سے پُر سرزمین کی کہانی بیان کی ہے ناں۔ اس مناسبت سے یہی نام ٹھیک ہے۔‘‘

ہوزے نے بحث نہیں کی۔ وہ ابھی نیا تھا اور ہر نئے لکھاری کی طرح اس کی اکلوتی خواہش اپنے ناول کی اشاعت تھی۔

موسم خزاں میں یہ ناول مارکیٹ میں آگیا اور... اگلے کئی برس کتب خانوں کے شیلف میں خاموش پڑا رہا۔ کسی نے اس کا نوٹس نہیں لیا۔

تاہم یہ صورتِ حال ہمیشہ نہیں رہنے والی تھی۔ کئی عشروں بعد اسے پڑھنے کی خواہش قارئین کے دل میں مچلنے والی تھی۔ واقعی بین الاقوامی شہرت سب کچھ بدل دیتی ہے۔ مگر اس کے حصول کے لیے اُسے ابھی انتظار کرنا تھا!

☆☆☆

پہلے ناول کی ناکامی دل برداشتہ کرنے کی قوت رکھتی تھی مگر ہوزے حالات کا مقابلہ کرنے کا ہنر جانتا تھا۔

وہ فوراً دوسرے ناول پر جت گیا، جس کی تکمیل میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ یہ پُراسراریت میں ملفوف ایک پیچیدہ کہانی تھی۔ اس میں ذاتی تجربات، مشاہدات اور وہ قصے شامل تھے جو اس کا دادا سنایا کرتا تھا۔

ناول مکمل کرتے ہی مسودہ پبلشر کو روانہ کر دیا اور مطمئن ہو کر بیٹھ گیا، مگر جلد ہی اُسے ایک انتہائی تکلیف دہ احساس نے گھیر لیا۔ اُسے لگا، جیسے اس کی دنیا لٹ گئی ہو۔ جیسے وہ خوشی کے عظیم احساس سے محروم ہوگیا ہو۔

دراصل یہ اس سرگرمی سے محرومی کا کرب تھا جس سے وہ محبت کرنے لگا تھا۔

اس کیفیت کا حل یہ نکلا کہ اگلے ہی روز اس نے ایک اور پلاٹ پر کام شروع کر دیا۔

پھر لکھنے کی میز کے سامنے بیٹھنے لگا۔ خیالات کو الفاظ میں سمونے لگا مگر چند صفحات لکھنے کے بعد ایک بھیانک انکشاف ہو۔

وہ خالی ہو چکا تھا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ہر خیال گم ہوگیا۔ ہر کردار مٹ گیا۔ اب فقط مایوس کن خاموشی تھی۔

اس انکشاف نے اسے گہرے صدمے سے دوچار کر دیا۔ وہ ٹوٹ سا گیا۔ لکھنے کی میز سے اٹھ کر گھر کے لان میں آگیا۔

ماحول حبس زدہ تھا۔ عجیب یاسیت اور گھٹن تھی۔ نہ جانے وہ کب تک لان میں بچھی کرسی پر بیٹھا رہا۔ اور وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے حبس زدہ، تاریک رات کو مصرعوں میں سمویا، جس نے جلد ایک نظم کی شکل اختیار کر لی۔

آسمان صاف تھا۔ تارے بجھ چکے تھے۔ ناول نگار خاموش گیا۔ اور وہ اگلے دو عشروں تک خاموش رہنے والا تھا۔

ایک شاعر اس کی روح میں تیر رہا تھا۔

☆☆☆

’’اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا!‘‘

سیاسی انتشار عروج پر پہنچ گیا۔ کمیونسٹوں کے خلاف کریک ڈاؤن شروع کر دیا گیا۔ کئی گرفتاریاں ہوئیں۔ سرکاری عہدوں پر بیٹھے سرخوں کو فارغ کر دیا گیا۔ ہوزے بھی اس آمرانہ اقدام کی لپیٹ میں آگیا۔ نظریات کی اسے بھاری قیمت چکانی پڑی۔

سوشل ویلفیر ڈیپارٹمنٹ کی نوکری ہاتھ سے گئی تو معاشی بحران نے سارا ما گو خاندان کو آلیا۔ ادب کو بھول کر ہوزے اس مسئلے کو سلجھانے میں الجھ گیا۔ اگلے چند روز پریشانیوں سے بھرپور تھے اور ان ہی دنوں میں اس نے خود میں خوابیدہ مستری کو دریافت کیا۔

ٹیکنیکل اسکول کی تربیت کام آئی اور اسے ایک میٹل کمپنی میں بہ طور منیجر ملازمت مل گئی۔ گو تنخواہ کم تھی مگر وہ مطمئن تھا۔ سرکاری ملازمت ویسے بھی مزاج سے میل نہیں کھاتی تھی۔ اور ادوں میں گھرے رہنا زیادہ اطمینان بخش تھا۔ پھر یہاں کوئی اس کے نظریات پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ سیاسی سرگرمیوں میں بھی وہ آزادی سے حصہ لے سکتا تھا اب۔

ایک سال وہ اس ادارے میں رہا اور اس عرصے میں اپنے اندر کے شاعر کو اظہار کی تحریک دیتا رہا جو اَب تھوڑی بہت نظمیں کہنے لگا تھا۔ وہ پھر کھڑکی کے سامنے بچھی لکھنے کی اس میز کے سامنے بیٹھنے لگا جس پر ایک ادھورے ناول کا مسودہ رکھا تھا۔ ساتھ ہی اُس ناول کی ایک کاپی بھی رکھی تھی جو اس نے ڈیڑھ برس قبل پبلشر کو روانہ کیا تھا جس نے جواب دینے کی قطعی ضرورت محسوس نہیں کی۔

جس وقت وہ میز پر بیٹھا ہوتا، ساتھ والے کمرے میں اس کی بیوی کینوس کے سامنے... برش تھامے کھڑی ہوتی۔ شہرت ان دونوں کی قسمت میں لکھی تھی مگر اس کے لیے تھوڑا انتظار کرنا تھا۔

زندگی اپنی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی کہ ایک روشن صبح کی آمد ہوئی جو ساتھ ایک خوش خبری لائی۔ لزبن کے ایک بڑے پبلشنگ ہاؤس کو پروڈکشن منیجر کی ضرورت تھی اور انتظامیہ کا خیال تھا کہ سوشل ویلفیر ڈیپارٹمنٹ سے نکالا جانے والا یہ شخص اس کام کی قابلیت رکھتا ہے۔ انھیں اس بات کا قطعی اندازہ نہیں تھا کہ یہ آدمی لکھنے کا فن بھی جانتا ہے۔ وہاں ملازم ہونے کے بعد ہوزے نے بھی کسی کو اس کی بھنک نہیں پڑنے دی۔

آنے والے چند برس خاموشی سے گزرے۔

اس نے چند نظمیں کہیں جو اس نے کسی کو نہیں دکھائیں۔ کہیں شائع بھی نہیں کروائیں۔ ادبی دنیا سے وہ کوسوں دور تھا اور کسی کو اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ بیش تر ادیب تو اُس دراز قد، تیکھے نین نقش والے نوجوان کو بھول چکے تھے جو چند برس قبل ان کے حلقے میں بیٹھا کرتا تھا اور یہ قابلِ فہم بھی تھا۔ حالات خاصے بدل چکے تھے۔ کئی بحران آئے، سیاسی انتشار نے عجیب و غریب واقعات کو جنم دیا۔ رہی سہی کسر جنگِ عظیم دوم نے پوری کر دی تھی۔

تو سب بھول چکے تھے کہ ہوزے سارا ما گو نامی کوئی ادیب کچھ برس قبل ہوا کرتا تھا جس کا ایک ناول کتب خانوں کے شیلف میں پڑا ہے اور دوسرا ناول کوئی پبلشر اپنی میز کی دراز میں رکھ کر بھول گیا ہے۔

واقعی، اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔

البتہ اس زمانے میں چند قابلِ ذکر واقعات بھی ہوئے۔

ایک بڑے پبلشنگ ہاؤس کے پروڈکشن منیجر ہونے

کے ناتے اُسے ایک بار پھر کئی ادیبوں سے ملنے کا، ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ ان غیر رسمی ملاقاتوں نے اسے ادیبوں کی زندگی میں جھانکنے، انہیں اُن کی تخلیقات سے الگ کرکے دیکھنے کے نادر مواقع فراہم کیے۔ اس تجربے نے اسے کھرے کھوٹے کی پہچان کرنے کی قابلیت بخشی جو آنے والے برسوں میں خوب کام آئی۔

تراجم کا سلسلہ بھی اُسی زمانے میں شروع ہوا جس کا سبب اس نے ذرائع آمدن میں اضافہ کی فطری خواہش کو قرار دیا مگر اس کا سبب اپنے اندر کے فکشن نگار کی تسکین تھی جو بین الاقوامی ادب سے محبت کرتا تھا۔

ٹالسٹائی، ہیگل، او ہنری اور فیلکنر سمیت کئی تخلیق کاروں کے شاہ کار اس نے پرتگالی زبان میں ڈھالے اور یہ عمل اس نے اگلے کئی برس جاری رکھا۔

جب تراجم کو مثبت ردِعمل ملا تو وہ مختلف جرائد میں تنقیدی مضامین بھی لکھنے لگا۔ وقت نے اس کی تنقیدی بصیرت کو پختگی بخشی اور اس کی تحریر کو اہمیت دی جانے لگی۔

اس وقت کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ مترجم اور نقاد کچھ برس بعد خود بین الاقوامی ادب کا حصہ بن جائے گا۔

☆☆☆

بالآخر وہ لمحہ آن پہنچا۔ ہوزے بھرپور قوت کے ساتھ ادبی دنیا میں پلٹ آیا تھا۔

یہ 1966 کا ذکر ہے، جب اس کی طویل اور پیچیدہ اسلوب کی حامل نظموں کا مجموعہ Possible Poems منظرِ عام پر آیا۔

ایک ناکام ناول نگار کے پُرفکر مصرعوں نے ناقدین کو چونکا دیا۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کتاب نے تہلکا مچا دیا... مگر اس سے تھوڑی ہلچل ضرور پیدا ہوئی۔ ایک نقاد نے اس کی شاعری کو "جدید فکر کا پیچیدہ" اظہار قرار دیا۔ دوسرے نے "نثر کو نظم کرنے کی کامیاب کوشش" کہا۔

خیر، اب ہوزے دوبارہ ادبی حلقوں میں اٹھنے بیٹھنے لگا تھا اور اسی سلسلے نے اسے ان سرخوں سے جوڑ دیا جن کے ساتھ وہ کبھی انقلاب کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ یہ خواب ہنوز اس کی آنکھوں میں تھا۔ خواب، جو اَب اُسے عملی سیاست میں لانے والا تھا۔

کمیونسٹوں سے رشتے کی تجدید کے بعد اس کی نظموں پر سرخ رنگ غالب آ گیا جو تواتر سے اخبارات اور جرائد میں شائع ہو رہی تھیں۔ 1970 میں اپنی نظموں کے دوسرے مجموعے Probably Joy کی اشاعت سے ٹھیک ایک سال قبل... وہ کمیونسٹ پارٹی آف پرتگال کا حصہ بن چکا تھا۔

کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا۔

1971 میں This World and the Other اور 1973 میں The Traveller's Baggage کی آمد ہوئی، جو ان برسوں میں شائع ہونے والے اس کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ تھیں۔

☆☆☆

موسم سرد تھا اور ایک کھڑکی کھلی رہ گئی تھی جس سے در آنے والی برفیلی ہوا نے اس کے جسم کو کاٹ ڈالا۔

ہاں، وہ ادبی میدان میں تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا مگر نئی مصروفیات نے اسے ازدواجی زندگی سے غافل کر دیا اور اس غفلت سے زندگی میں ایک ایسا در کھل گیا جس سے اذیت کی منہ زور ہوا اندر داخل ہوئی اور اس پر حملہ آور ہو گئی۔

ہوزے اور ایلڈا کے رشتے میں سرد مہری کا جنم ہو چکا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے دور جا رہے تھے... اور دونوں ہی ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہراتے تھے۔

ایلڈا کا خیال تھا کہ ہوزے اسے نظر انداز کرنے لگا ہے اور ہوزے سوچتا تھا کہ اس کی بیوی کسی اور کے عشق میں مبتلا ہو گئی ہے۔

اب اس کا فلیٹ بکھرا بکھرا رہتا۔ بجلی اور گیس کے بل وقت پر ادا نہیں ہو پاتے۔ بیٹی بھی زیادہ وقت اپنے نانا نانی کے گھر گزارنے لگی تھی۔ اسکول میں اس کے گریڈ گر رہے تھے۔

اس بگاڑ نے ہوزے کو چڑچڑا بنا دیا۔ وہ اس کا سبب اپنی بیوی کو خیال کرتا جسے مصوری سے وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ اب وہ مشہور جو ہو گئی تھی۔

"شوق نے تمہیں گھر سے بیگانہ کر دیا ہے۔" وہ ہر صبح ناشتے کی میز پر یہ جملہ بڑبڑاتا اور بڑبڑاہٹ میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

رات گئے جب وہ گھر میں داخل ہوتا اور اپنے کمرے میں بے ترتیبی کے نشانات دیکھتا، تو بہ آوازِ بلند اپنی بیوی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیتا جو اس وقت اپنے چھوٹے سے اسٹوڈیو میں کینوس کے سامنے کھڑی ہوتی اور اپنے غصے کو دبائے برش چلاتی رہتی۔

ایک رات جب وہ گھر لوٹا تو فلیٹ کو مقفل پایا۔ ایلڈا گھر پر نہیں تھی۔ وہ اپنی تصاویر کی نمائش میں شرکت کے لیے گئی ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے ہوزے چابی لے جانا بھول گیا تھا، اس

لیے ڈھائی گھنٹے اسے سیڑھیوں ہی پر انتظار کرنا پڑا۔

جونہی اس کی بیوی زینے پر ظاہر ہوئی، وہ زور سے دہاڑا۔ اس نے انتہائی سخت الفاظ استعمال کیے۔ یہاں تک کہ اس پر دھوکا دہی کا الزام عائد کر دیا۔

شور سے پڑوسی جاگ گئے اور دروازوں پر کھڑے ہو کر یہ تماشا دیکھنے لگے۔

ایلڈا کے لیے صورتِ حال برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔ اس نے اگلی صبح فلیٹ چھوڑ دیا اور اپنے ماں باپ کے ہاں چلی گئی۔ چند روز بعد ہوزے کو طلاق کا نوٹس مل گیا جسے وصول کرتے ہی وہ جذباتی طوفانوں میں گھر گیا۔ صدمے سے نڈھال ہو گیا اور خود کو اس کرسی کے حوالے کر دیا جو کھڑکی کے سامنے بچھی تھی۔

اب یاسیت زدہ وقت تھا اور وہ تھا۔

ہر شے بکھر گئی۔ بجلی اور گیس کے بلوں کی ادائیگی کی تاریخ نکل گئی۔ گندے کپڑوں کا ڈھیر لگ گیا۔ باورچی خانے کا شیلف خالی ہو گیا۔ اور اس خرابے میں ہوزے تنہا تھا۔

نوٹس وصول ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا اور تب سے وہ فلیٹ سے نہیں نکلا تھا۔ اس نے کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ کچھ لکھا بھی نہیں تھا۔ زندگی روٹھ گئی تھی۔

مگر پھر... ایک شام زندگی نے دروازے پر دستک دی۔

ہوزے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دستک پھر ہوئی۔ ہوزے خاموش رہا۔

"ٹک ٹک..." زندگی ہار ماننے والی نہیں تھی۔

"کون ہے؟" اُسے اپنی آواز کھوکھلی معلوم ہوئی۔

"میں ہوں۔" ایک مانوس لہجہ۔

"کون؟" اس نے دھیرے سے کہا۔

"ڈیل ریو۔" زندگی نے جواب دیا۔

اس نے دروازہ کھول دیا۔ زندگی سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں نیلی، گہری اور حسین تھیں۔ ٹھیک اس عورت کی آنکھوں کی طرح جس سے اس نے کبھی محبت کی تھی۔

"ہوزے سارا ماگو۔" ڈیل ریو نے اُس کی خستہ حالی کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"میں پلیر ڈیل ریو ہوں۔ دا یار یو دی لزبن کی ایڈیٹر۔" اس نے شام کے ایک مشہور پرچے کا نام لیا۔ لہجے میں بلا کی خود اعتمادی تھی۔ "ہمیں آپ کی صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔"

"مگر میں..." وہ بوکھلا گیا۔ "میں صحافی نہیں۔"

"میں جانتی ہوں۔" وہ مسکرائی۔ ایک قدم آگے بڑھی۔ دروازے سے اندر داخل ہوئی اور فلیٹ میں روشنی پھیل گئی۔

"مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ صحافی نہ ہونے کے باوجود آپ کی صلاحیتیں کس قدر اہم ہیں۔"

دوشیزہ نے بات جاری رکھی۔ "میں نے کئی بار فون کیا مگر آپ سے بات نہیں ہو سکی۔ آپ کے دوستوں سے بھی ملی۔ ان سے آپ کا پتا لیا اور پھر یہاں چلی آئی۔ کیا آپ... کل شام ہمارے دفتر آ سکتے ہیں۔ وہیں بیٹھ کر ہم کاغذی کارروائی کر لیں گے۔"

"مگر..." ہوزے کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر ڈیل ریو نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کل شام ملتے ہیں۔"

وہ چلی گئی اور ہوزے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ حسین تھی۔ پُراعتماد تھی۔

یہی وہ عورت تھی جو اسے یاسیت کے بھنور سے نکال کر دنیا کے سامنے پیش کرنے والی تھی۔ یہی وہ عورت تھی جو مرتے دم تک اس کا ساتھ نبھانے والی تھی۔

☆☆☆

"ہوزے اور ایڈیٹر؟ کمال ہے!"

لزبن کے علمی و ادبی حلقوں نے اس خبر پر ملا جلا ردِعمل ظاہر کیا۔ کچھ کا خیال تھا کہ وہ انتظامی امور کا اچھا تجربہ رکھتا ہے جو اخبار کی سرکولیشن میں اضافے کا موجب بن سکتا ہے۔ جب کہ کچھ کا کہنا تھا کہ ایک مارکسی ادیب کے لیے صحافت کا پیشہ ناقص انتخاب تھا۔

ہوزے دونوں ہی قسم کی آرا سے بے پروا تھا۔ اس اخبار سے اپنی وابستگی کا سبب وہ بہ خوبی جانتا تھا۔

اس کا سبب وہ خوب رُو عورت تھی، جس نے ایک اداس شام اس کے دروازے پر دستک دی تھی اور اسے گھسیٹ کر زندگی کی سمت لے آئی تھی۔

ہاں ترتیب لوٹ آئی۔ بکھری ہوئی اشیا نے اپنی جگہ سنبھال لی۔ بجلی اور گیس کے بل وقت پر ادا ہونے لگے۔ مطالعے کا عمل پھر شروع ہو گیا اور لکھنے کی للک پھر میز تک لے گئی۔

ڈیل ریو کی آمد نے سب کچھ بدل دیا۔

دن بھر وہ دفتر میں مصروف رہتا جہاں ڈیل ریو کی موجودگی میں زندگی رواں دواں رہتی۔ گھر لوٹنے کے بعد وہ اس کے خیالوں میں گم رہتا۔ جب نظم کہتا تو اس حسینہ کا پیکر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا۔

روحانیت کا درک رکھنے والے کہتے ہیں، جب کوئی خیال آپ کے تخیل پر غالب آجائے، تو یقین رکھیے، ایک نہ ایک دن وہ حقیقی دنیا میں بھی ظاہر ہو جائے گا۔

اور ڈیل ریو اس کے تخیل پر حاوی تھی!

اس شام جب فلیٹ کے دروازے پر دستک ہوئی اور اس نے ایک حسینہ کو اپنے رُوبرو پایا، تو اندازہ ہی نہیں لگا سکا کہ وہ اس کا تخیل ہے یا حقیقت۔

"کیسے ہو۔" اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس کا لمس جادوئی تھا۔ "یہاں سے گزر رہی تھی، تو سوچا تمہارے ساتھ ایک کپ کافی پی لوں۔ کافی بنانا آتی ہے ناں؟" اس کی روشن آنکھیں چمک رہی تھی۔

"ہاں، بالکل۔" اس نے دروازے سے ہٹتے ہوئے اُسے جگہ دی۔

"میں نے سوچا کہ تم سے چند نظمیں بھی سن لوں گی... کل ہی کوئی مجھے بتا رہا تھا کہ تم نے ایک ناول بھی لکھا ہے۔ کیا اس کی ایک کاپی مجھے مل سکتی ہے؟" ڈیل ریو فلیٹ میں داخل ہوئی۔ اس فلیٹ میں جو اس کی خوشبو سے پہلے ہی مہک رہا تھا۔

وہ کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ باہر لزبن کی روشنیاں تھیں اور پورا چاند تھا۔

وہ ایک پُراسرار رات تھی۔ ایک غیر مختتم کہانی کا آغاز ہونے کو تھا۔

☆☆☆

1975 میں ڈیل ریو ملازمت چھوڑ کر ایک نئے اخبار کا حصہ بن گئی۔ جاتے ہوئے وہ دفتر سے تمام ذاتی اشیا لے گئی، جن میں... ہوزے بھی شامل تھا۔

استعفٰی دے کر وہ بھی اپنی جواں سال محبوبہ کے ساتھ ہولیا تھا۔

اسی برس اس کی طویل نظم "1993 کا سال" شائع ہوئی جو گزشتہ کئی برسوں سے انتشار کے شکار پرتگال کی منظر کشی کرتی تھی۔ ساتھ ہی اُس میں ہوزے کے اشتراکی خیالات کی بھی واضح جھلک تھی۔

اس نظم پر خاصی لے دے ہوئی۔ مسندِ اقتدار پر... براجمان افراد کو یہ انتہائی ناگوار گزری۔ اخبار کے گروپ ایڈیٹر کو دھمکی آمیز فون کال موصول ہوئی جس کے بعد ہوزے کے ہاتھ میں رخصتی کا پروانہ تھما دیا گیا۔

ڈیل ریو نے اس واقعہ کا جشن منانے کا فیصلہ کیا۔

"ان احمقوں نے تمہاری اس نظم کو امر کر دیا ہے۔" اس نے ڈرنکس بناتے ہوئے کہا۔ "جلد ہی اس کے مصرعے زبان زدِ خاص و عام ہو جائیں گے۔ تم پرتگالی ادب میں اپنی جگہ بنا چکے ہو۔"

ڈیل ریو کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ اس نظم کا بہت شہرہ ہوا۔ چند تو جوان فن کاروں نے اُس کے مصرعوں کو اپنی مصوری کا بھی موضوع بنایا۔

ڈیل ریو ہی کے مشورے پر اس نے ایک ناول لکھنے کا ارادہ باندھا، جسے اُس نے "یادداشتیں" کا نام دیا۔ نظم کی شہرت نے ساتھ دیا۔ ماضی میں تحریر کردہ ناول کے برعکس اس کتاب کی پزیرائی ہوئی۔ کچھ کے نزدیک یہ ناول تھا، کچھ کا کہنا ہے کہ یہ اخبار سے وابستگی کے زمانے میں لکھے مضامین کی ایک شکل ہے۔ البتہ ایک بات پر سب متفق تھے کہ یہ کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ چند اچھے ناقدین نے اس پر مضامین بھی لکھے جن میں ہوزے کو مزید لکھنے کا مشورہ دیا گیا۔

ڈیل ریو کا بھی یہی خیال تھا کہ اُسے جم کر ناول لکھنے چاہئیں۔

"میں نے تمہارا پہلا ناول پڑھا ہے۔ سچ کہوں تو تم اب خاصا سفر طے کر چکے ہو۔" اُس نے کافی کا مگ تھام رکھا تھا۔ وہ ابھی ابھی نہا کر نکلی تھی اور انتہائی دل کش لگ رہی تھی۔ "تمہارا اسلوب پختہ ہو گیا ہے۔ بہتر ہے کہ تم اس صنف پر توجہ مرکوز کرو۔"

"تمہارے ہوتے ہوئے کسی اور شے پر توجہ مرکوز کرنا لگ بھگ ناممکن ہے۔" ہوزے نے آنکھ ماری۔

جواب میں فلیٹ نُقرئی قہقہے سے بھر گیا۔ بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے اور ہر قطرے میں ایک کہانی تھی۔ اور اس کا عاشق.. ہوزے ساراماگو یہ کہانی بیان کرنے کے لیے تیار تھا۔ اور اس کا سبب فقط اس کی محبوبہ کا حسن نہیں تھا، بلکہ بے روزگاری کا المیہ بھی تھا جس سے نبردآزما ہونے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ وہ تسلسل لکھتا رہے۔ اِس سے ذہنی پراگندگی سے بھی محفوظ رہتا اور تھوڑی بہت آمدنی بھی ہو جاتی۔

دو برس بعد اس کی کہانیوں کا مجموعہ "اشیا میں پیوست زندگی" منظرِ عام پر آیا، جس کا انتساب اس نے ایک ایسی عورت کے نام کیا جسے وہ ٹوٹ کر چاہتا تھا۔

جب ڈیل ریو نے کتاب دیکھی تو ہنستے ہوئے کہا۔ "بہتر تھا کہ تم اس کا انتساب کمیونزم کے نام کر دیتے۔ مارکسی نقاد خوش ہو جاتے۔"

جواب میں ہوزے دھیرے سے مسکرایا۔ دونوں کے درمیان خاموشی در آئی۔

چند ساعت ڈیل ریو اسے دیکھتی رہی۔ پھر چہکی۔ "پیارے ناول نگار... تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"ہوں؟ اوہ ہاں میں..." وہ چونکا، مگر جلد خود کو سنبھال لیا۔ "میں یہ کہنا چاہتا ہوں حسین صحافی کہ..." اس نے ایک لمحہ کا توقف کیا۔ "ناول نگار کا فلیٹ کشادہ ہے، پر اس میں ویرانی ہے۔ اسے قہقہوں کی ضرورت ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ تم اپنے کرائے کے اپارٹمنٹ سے جان چھڑا لو۔"

ڈیل ریو نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ اس بارے میں سنجیدگی سے سوچوں گی پیارے ناول نگار۔"

☆☆☆

دریا سے چند کوس دور وہ گاؤں تھا۔

عسرت کے نشانات جا بہ جا بکھرے تھے۔ تمام مکانات انتہائی خستہ حال تھے جن کی دیواریں کچی تھیں۔ ہر مکان کے ساتھ ایک باڑا تھا جس سے پرے کھیت۔

نہیں، یہ ازنیں یا گا نہیں تھا۔ یہ لیوری نامی ایک گاؤں تھا جو ہوزے کے آبائی گاؤں سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ ویسا ہی ماحول، ویسے ہی لوگ۔

وہاں اسے کئی ایسے بوڑھے دکھائی دیے، جو تاریک راتوں میں اپنے پوتے کو کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ غیر مختتم کہانیاں۔

"پرتگال کے دیہات آج بھی ویسے ہی ہیں، جیسے میرے بچپن میں ہوا کرتے تھے۔" اس نے خود سے کہا۔

اور اس ایک مختصر سے جملے نے اُسے ایک کہانی گھڑنے کا امکان فراہم کر دیا۔

مشاہدات اور تجربات سے لیس جب وہ لزبن لوٹا تو ناول لکھنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

اس ناول کی تکمیل میں دو برس لگے۔ محنت رائگاں نہیں گئی۔ جب 1980 میں Risen from the Ground شائع ہوا، تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ناقدین نے ناول کو دیہی اور شہری تفریق بیان کرنے کی شان دار کوشش قرار دیا۔ تکنیک اور کردار نگاری کی بھی تعریف کی گئی۔

اس ناول کی رائلٹی کی مد میں بھی اُسے اچھی رقم ملی۔ مگر اہم ترین واقعہ یہ تھا کہ ڈیل ریو سامان سمیٹ کر اس کے فلیٹ میں منتقل ہو گئی۔

فلیٹ... نُقرئی قہقہوں سے بھر گیا تھا۔

☆☆☆

تخیل کو پر لگ گئے۔ قلم کی جنبش شاہکار تخلیق کرنے کو تھی... اور پبلشر اس کی کتابیں چھاپنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔

1981 میں اس نے پرتگال کے دور دراز قصبوں کا رخ کیا۔ اُس تجربے کو Journey to Portugal نامی کتاب میں سمویا گیا۔ سفرنامے فکشن کی صنف میں نہیں آتے مگر اس سفرنامے پر فکشن کا رنگ اس حد تک غالب تھا کہ ناولز کے قارئین نے اسے بڑی دلچسپی سے پڑھا۔

اب اُس کے تخیل نے جست لگائی اور 18 صدی میں سرایت کر گیا جہاں اس کی ملاقات دو ایسے پرتگالی کرداروں سے ہوئی، جو ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ہوزے نے ان کرداروں کے طفیل اپنے ناول Baltasar and Blimunda میں اس عہد کی اس پختگی سے منظر کشی کی کہ پڑھنے والے اش اش کر اٹھے۔ کہنے والوں نے کہا "تاریخ اور تخیل کو سمو کر ایک نئی وضع کا ناول تخلیق کیا ہے ہوزے ساراماگو نے۔"

اب اُس نے معروف پرتگالی شاعر اور ادیب فرنانڈو پسوا کے مشہورِ زمانہ کردار Ricardo Reis کا تعاقب شروع کیا۔ اور اپنی زرخیز تخلیقی قوت کے سہارے The Year of the Death of Ricardo Reis نامی ناول لکھا، جسے نہ صرف ہوزے کے مداحوں نے بلکہ پسوا کے چاہنے والوں نے بھی بڑی دل چسپی سے پڑھا۔

کچھ برس بعد یہی ناول اسے بین الاقوامی شہرت عطا کرنے والا تھا مگر اس وقت ہوزے اس بابت نہیں سوچ رہا تھا.. اس نے کُلی طور پر خود کو لکھنے کے لیے وقف کر دیا تھا۔

صبح وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ ناشتا کرتا۔ ڈیل ریو دفتر چلی جاتی اور وہ میز کے سامنے جا بیٹھتا۔ قلم تھامتے ہی وہ وقت سے ماورا ہو جاتا۔ دیوانوں کی طرح لکھتا۔ اگر ضرورت پیش آتی تو میز سے اٹھ کر لائبریری میں چلا جاتا جہاں وہ مختلف کتابوں کا جائزہ لیتا۔ نوٹس بناتا اور پھر اپنی میز تک لوٹ آتا۔ وہ اس وقت تک لکھتا رہتا، جب تک ڈیل ریو گھر نہیں لوٹ آتی۔ جس کے بعد وہ لکھنا ترک کر دیتا۔ اگلے چند گھنٹے وہ ساتھ گزارتے۔

1986 میں اس کا ناول The Stone Raft شائع ہوا، جس میں اس نے جزیرہ نما آئبیریا کو موضوع بنایا

تھا جو پُراسرار حالات کا شکار ہو کر یورپ سے الگ ہو گیا اور اب آزادی سے سمندر میں تیر رہا ہے۔

ناول میں ہوزے نے اپنا تخیل ایسی مہارت سے استعمال کیا... اپنے کاٹ دار اسلوب کو اس چابکدستی سے برتا کہ پڑھنے والے حیرت کے سمندر میں اتر گئے۔

اس عجیب و غریب ناول نے اُسے پرتگال کے نامور ناول نگاروں کی فہرست میں لا کھڑا کیا۔ اور اُسی برس اس کی زندگی میں ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔

ڈیل ریو اور ہوزے نے اپنے رشتے کو قانونی حیثیت دے دی۔ انہوں نے شادی کر لی اور یہ عہد کیا کہ وہ مرتے دم تک ساتھ رہیں گے۔

اور دونوں ہی نے اپنا عہد نبھایا۔

☆☆☆

برسوں سے آتش فشاں خاموش کھڑا تھا۔

وہاں کا موسم صحت بخش تھا۔ ماحول میں سکون تیرتا رہتا۔ ہریالی کے درمیان سرمستی کا احساس حرکت کرتا۔ ساحل پر لہریں لازوال گیت تخلیق کرتیں جنہیں سننے کے لیے سیاح میلوں دور سے کھنچے چلے آتے۔

یہ بحر اوقیانوس میں واقع ہسپانوی جزیرے لانزارڈی کا تذکرہ ہے، جہاں کی راتیں جادو بھری ہوتیں، جس کے آسمان پر ستارے پوری قوت سے دمکتے۔

ہوزے اپنا وطن چھوڑ کر اس جزیرے پر آن بسا تھا مگر اس کا سبب جزیرے کا دلکش ساحل نہیں تھا بلکہ وہ زخم تھا جو پرتگال نے اسے عطا کیا۔ وہ قدغن تھی جو اس کے تخیل پر لگانے کی کوشش کی گئی۔ وہ قانون تھا جس نے اس کے قلم کو قید کرنے کا ارادہ باندھا۔

دل برداشتہ ہو کر اس نے خود ساختہ جلاوطنی اختیار کر لی اور اپنی بیوی کے ساتھ اس چھوٹے سے جزیرے پر آن بسا۔

اس پریشان کن واقعے کا سبب 90ء میں جنم لینے والا ایک انوکھا خیال تھا جس نے ناول کی شکل اختیار کرتے ہی تنازع کھڑا کر دیا۔

The Gospel According to Jesus Christ میں ہوزے نے اس خیال کا تعاقب کرنے کی کوشش کہ اگر یسوع مسیح نے خود انجیل لکھی ہوتی تو وہ کیسی ہوتی۔

واضح رہے کہ عہد نامہ جدید میں شامل اناجیل اربعہ یسوع مسیح کے حواریوں کی لکھی ہوئی ہیں۔

اس انوکھے خیال کا پیچھا کرتے ہوئے اسے نئے نئے تجربات کرنے اور مذاہب سے متعلق اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کرنے کا موقع ملا۔

ناول شائع ہوتے ہی پورے پرتگال میں ہلچل مچ گئی۔

ایک جانب جہاں ادبی حلقوں میں اس کا انوکھا پن زیرِ بحث رہا، وہیں روایت پسندوں نے اسے مسیحی مذہب کی توہین قرار دیتے ہوئے ہوزے مخالف تحریک شروع کر دی۔

مذہبی جماعتیں سڑکوں پر نکل آئیں۔ ہوزے کے پُتلے جلائے گئے۔ لزبن کی دیواریں اس کے خلاف نعروں سے بھر گئیں۔ اُسے زود رنج انسان قرار دیا گیا۔ یہ الزام بھی عائد کیا گیا کہ اس نے بین الاقوامی دنیا کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے یہ متنازعہ اور شرمناک ناول لکھا ہے۔

عوامی ردِعمل کے برعکس ادبی حلقوں نے اسے سراہا اور وفاقی محکمۂ ثقافت و ادب ..... کی جانب سے اسے یورپی یونین لٹریری پرائز کے لیے نامزد کر دیا گیا۔

اس فیصلے نے مخالفین کو برانگیختہ کر دیا۔ کیتھولک حرکت میں آ گئے۔ ویٹی کن سے رابطہ کیا گیا جہاں سے ہوزے کی مخالفت میں ایک کاٹ دار بیان جاری ہو گیا جس میں اسے ملحد قرار دیتے ہوئے شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

پرتگال حکومت پر دباؤ بڑھنے لگا۔ یہ مسئلہ پارلیمنٹ میں بھی زیرِ بحث آیا جہاں رجعت پسند اکثریت میں تھے۔

بالآخر سرکار نے مذکورہ ایوارڈ کے لیے اس ناول کی نامزدگی واپس لینے کا اعلان کر دیا۔

اس واقعے سے ہوزے کو شدید صدمہ پہنچا۔ وہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔

"پرتگال مذہبی انتہا پسندوں کی چنگل میں پھنس چکا ہے۔" وہ دہاڑا۔ "یہ سب سامراج کے غلام ہیں۔ یہاں تخلیق کار کی کوئی عزت نہیں۔ میں ایک منٹ بھی اس دوغلے معاشرے میں نہیں رہنا چاہتا۔"

ڈیل ریو خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی۔ وہ اس امید پر خاموش رہی کہ شاید ہوزے اپنا خیال بدل لے مگر وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

93ء کے موسم بہار میں اس نے پرتگال چھوڑنے کا اعلان کر دیا۔ اپنے آخری بیان میں اس نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ آمریت ختم ہو گئی ہے۔ مگر یہاں آج بھی اظہارِ رائے کی آزادی نہیں۔ تف ہے۔"

وہاں ایک آتش فشاں تھا... ایک حسین ساحل تھا۔ اور وہاں

ایک ادیب تھا۔

بین الاقوامی دنیا اس کی جانب متوجہ ہو چکی تھی۔

☆☆☆

موسم بدل رہا تھا۔ نمی بڑھ گئی۔ راتیں ٹھنڈی ہو گئیں اور دن سکڑنے لگے۔

اس کے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے ساحل دکھائی دیتا تھا۔ خاموش ساحل۔ انتہائی پُراسرار۔ انتہائی حسین۔

اپارٹمنٹ میں پُرسکون چپ تیرتی رہتی۔ وہ ادب تخلیق کر رہا تھا اور اس کی بیوی، جو ہسپانوی زبان پر گہری گرفت رکھتی تھی، ہوزے کی تخلیقات کا اپنی مادری زبان میں ترجمہ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اور یہ فیصلہ اُسے مستقبل میں فقط ہوزے سارا ماگو کی بیوی کے طور پر نہیں، بلکہ ایک اچھی مترجم کے طور پر دنیائے ادب میں زندہ رکھنے والا تھا۔

بہ طور تخلیق کار ہوزے کے خیالات میں تغیر آ رہا تھا۔ تنہائی نے اُسے اپنے خیالات اور نظریات کا جائزہ لینے کی راہ سجھائی۔ اب وہ آفاقی مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے سامراجی نظام کے نقائص عیاں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے موضوعات اور زبان میں تبدیلی آ گئی۔ وہ ایسے ناول لکھنے کا خواہش مند تھا جو پرتگال تک محدود نہ ہوں، جن سے بین الاقوامی قارئین خود کو جوڑ سکیں۔ ماضی کے بجائے مستقبل سے متعلق ہوں۔

ہاں، ہوزے انٹرنیشنل کیریئر کا خواہش مند تھا اور ہسپانوی جزیرے کا ماحول سازگار تھا۔

نئی زمین پر قدم رکھنے کے بعد اس نے ناول کے بجائے ایک ڈراما لکھنے کا ارادہ باندھا۔ یہ ڈراما جرمنی میں پیش کیا گیا۔ کئی اہم ادبی شخصیات نے اس میں شرکت کی اور اُسے دل کھول کر سراہا۔

ڈرامے کی کامیابی کے بعد بھی وہ ناول کی جانب نہیں پلٹا۔ اس نے ایک انوکھا فیصلہ کیا۔ وہ کام کرنے کا فیصلہ جو اس نے زندگی بھر نہیں کیا تھا۔

اب وہ ڈائری لکھ رہا تھا۔

ہر شام وہ اپنے خیالات کو الفاظ کے پیراہن میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتا۔ روزنامچہ عام طور سے اس کے خیالات پر مشتمل ہوتا۔ مگر اس میں پرتگال اور وہاں کے سیاسی حالات کا بھی تذکرہ آتا۔

جب پرتگال کے ایک انگریزی اخبار کے پبلشر کو ان روزنامچوں کی اطلاع ملی تو اس نے ہوزے سے رابطہ کیا۔

"اگر تم انہیں چھاپ کر کیا کرو گے؟" ہوزے کے لہجے میں حیرت تھی۔ "اور جہاں تک میں نے سنا ہے، تم مجھے بڑا ادیب بھی نہیں مانتے۔"

"بالکل۔" پبلشر نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "میں آپ کا مداح نہیں ہوں جناب۔ مجھے آپ کے ناول بالکل پسند نہیں۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ آپ جیسے تجربہ کار آدمی کے روزنامچے قارئین ضرور پڑھنا چاہئیں گے۔"

"چلو دیکھتے ہیں۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

اِن روزنامچوں کا ردِعمل حیران کن رہا۔ پرتگال کے ساتھ ساتھ دیگر ممالک کے اخبارات میں بھی ان کی اشاعت کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ آخر کار ہوزے اب ایک متنازعہ اور مقبول شخص تھا۔

جس زمانے میں یہ روزنامچے شائع ہو رہے تھے، ہوزے نے اندھے پن کا تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہاں بات ہو رہی ہے 1995 میں شائع اس کے لازوال ناول "اندھے پن" (Blindness) کی، جس نے قارئین کو تاریکی کی بھیانک دنیا سے متعارف کروایا۔

اس عجیب و غریب اور تحیر خیز ناول کا شمار عہدِ حاضر کی اہم ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ اور بلاشبہ اسے ہوزے کی بہترین تخلیق تصور کیا جاتا ہے۔

"اندھے پن" کی اشاعت کے ساتھ ہی یہ خیال زور پکڑنے لگا کہ یہ پرتگالی شخص نوبل انعام کے بے حد نزدیک پہنچ گیا ہے۔ ایک صحافی نے ہوزے سے اس متعلق سوال کیا تو اس نے کاندھے اچکا کر کہا۔ "اعزازات کسے اچھے نہیں لگتے۔ لیکن میرے لیے سب سے بڑا اعزاز یہ جلاوطنی ہے، جو شاید موت تک میرے ساتھ رہے۔"

نوبل تو اس برس ہوزے کے حصے میں نہیں آیا مگر اسے پرتگالی زبان کے عظیم شاعر لوئیس کاموس کے نام سے موسوم ادبی ایوارڈ سے ضرور نوازا گیا۔

پرتگال کی نیشنل لائبریری فاؤنڈیشن کی جانب سے دیا جانے والا یہ ایوارڈ وصول کرتے ہوئے اُس نے کہا تھا۔ "گو اب میں 73 برس کا ہو گیا ہوں... اور اس عمر میں اعزازات اپنی اہمیت کھو بیٹھتے ہیں، مگر یہ ایوارڈ وصول کرنا اچھا لگا۔"

☆☆☆

وہ ایک شانت شہر کا سینٹرل رجسٹری ڈیپارٹمنٹ تھا۔

پچاس سالہ سین ہور اُس خشک اور خاموش محکمے میں گزشتہ بیس برس سے ملازم تھا۔ یہ محکمہ اس شہر کے باسیوں سے متعلق فائلوں سے بھرا تھا۔ فائلیں... جن میں ان کی تاریخ

پیدائش، رہائش، شادی کی تاریخ اور اموات کا سن درج تھا۔

سین ہور کے لیے یہ کام دل چسپی سے خالی تھا۔ وہ اس سے اوب چکا تھا، مگر اس عمر میں نئی ملازمت کی تلاش سہل نہیں تھی، اس لیے وہ روز صبح دفتر پہنچ جاتا اور بوسیدہ فائلوں سے بھرے کمرے میں بیٹھا اونگھتا رہتا۔

ایک دن اکتا کر اُس نے سوچا، کیوں نہ شہر کی مشہور شخصیات کے ریکارڈز تک رسائی حاصل کی جائے۔ کچھ عرصے بعد یہ خواہش اتنی شدید ہوگئی کہ اُس نے ریکارڈ روم میں نقب لگانے کا فیصلہ کرلیا۔

اِس عمل کے دوران اس کے ہاتھ ایک ایسی عورت کی فائل لگی جو غیر معروف تھی۔ گم نام تھی۔

اور ٹھیک اس لمحے... جب وہ فائل پڑھ رہا تھا، کچھ انوکھا وقوع پذیر ہوا۔ سین ہور کے من میں دل چسپی کے دیوتا کا جنم ہوا اور اس نے اُس نامعلوم عورت کے بارے میں معلومات کھوجنی شروع کردی۔ اِس عمل نے اُس کی پیشہ ورانہ ذمے داریوں پر انتہائی منفی اثرات مرتب کیے اور...

یہ ہوزے سارا ماگو کے تازہ ناول All the Names کا پلاٹ تھا، جو 1997 میں منظرِ عام پر آیا۔ ایک نامعلوم عورت کے مرکزی کردار کی شخصیت پر اثرات کو قلم بند کرنے کی اِس کامیاب کوشش کی بہت پزیرائی ہوئی۔

نوجوان ترک ادیب اورخان پامک نے اس ناول کو بہت سراہا۔ ہوزے کو ایک عقیدت بھرا خط لکھا، جس میں اُسے پیرو مرشد قرار دیا۔ لازوال لاطینی امریکی ادیب گیبریل گارسیا مارکیز نے بھی اِس تخلیق کو شان دار انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

مارکیز کا خط پڑھنے کے بعد ہوزے نے اپنی بیوی سے کہا: ”اسے سنبھال کر رکھنا۔ یہ نوبل انعام سے کم نہیں۔“

یہ 1998 کا سال تھا، جب ایک ایسے ادیب کو نوبل انعام سے نوازا گیا، جس کے وسیلے پرتگالی ادب دنیا بھر کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔

اس تقریب کے دوسرے روز ایک سینئر ادبی نقاد نے تبصرہ کیا۔ ”نوبل انعام خوش نصیب تھا کہ ہوزے نے اسے قبول کرلیا۔ اگر وہ وصول کرنے سے انکار کردیتا اور دور افتادہ جزیرے میں بیٹھا رہتا تو کوئی اس کا کیا بگاڑ لیتا۔“

☆☆☆

ایک دھماکا ہوا اور پورا اسرائیل لرز اٹھا۔

جابر اسرائیلی حکمرانوں کے وجود پر ہیبت طاری ہوگئی۔

اُس کے ظالم فوجی صدمے سے زمین پر گر پڑے۔

یہ 2002 کا تذکرہ ہے، جب امن کے پرد... میں ہونے والی قتل و غارت گری اور مظالم کے خلاف فلسطی... اٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنا حق لینے کے لیے سڑکوں پر نکل آئے۔

تحریک دبانے کے لیے اسرائیل نے نہتے فلسطینیوں پر جدید اسلحے سے یلغار کردی جس کے نتیجے میں تین ہزار سے زائد مظلوم زندگی کی بازی ہار گئے۔

اور پھر... فلسطین کی تحریکِ خود ارادیت کے دوران ایک زوردار دھماکا ہوا جس کی گونج سے اسرائیلیوں کے چہروں کا رنگ فق ہوگیا۔

مگر یہ کوئی بم دھماکا نہیں تھا بلکہ ایک دانشور کا بیان تھا... اُن دنوں رملہ ... کے دورے پر آیا ہوا تھا۔

وہ ایک ادیب تھا۔ ایک بوڑھا ادیب۔ مگر اُس کا قلم انتہائی پُرقوت تھا۔ اُس کا اسلوب کاٹ دار تھا اور وہ سچ کا علم بردار تھا۔

یہ ہوزے سارا ماگو کا بیان تھا۔

یوں تو اُس نے ہمیشہ ہی سامراجی ہتھکنڈوں کی کھل کر مخالفت کی مگر اسرائیل کے خلاف دیا جانے والا بیان زیادہ اہم تھا کہ اُس وقت وہ خود فلسطین میں موجود تھا۔

جب ایک صحافی نے اس کے مشاہدات کی بابت پوچھا تو اُس نے دوٹوک لہجے میں کہا:

”جو کچھ فلسطین میں ہو رہا ہے، وہ جنگی جرائم کے زمرے میں آتا ہے۔ اِس مقدس سرزمین پر اسرائیل وہی گھناؤنا کھیل کھیل رہا ہے، جو نازی فوج نے پولینڈ میں واقع اپنے بدنام زمانہ آشوٹز ارتکازی کیمپ میں کھیلا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ مظلوم فلسطینیوں سے ہولوکاسٹ کا بدلہ لے رہا ہے۔“

اِس بیان کی کاٹ نے اسرائیلی حکمرانوں کو چھیل دیا۔ صورتِ حال اُس وقت مزید گمبھیر ہوگئی، جب چوٹی کے ادیبوں اور دانشوروں نے ہوزے کے بیان کی حمایت کردی۔

تلملا کر اسرائیلی حکومت اور امریکا میں اعلیٰ عہدوں پر فائز متعصب یہودیوں نے ہوزے کی ذات پر انتہائی گھٹیا حملے شروع کردیے۔ اُسے داخلیت اور قنوطیت کا شکار قرار دیتے ہوئے شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ شہرت کا بھوکا اور مذہب دشمن کہا گیا۔

دبے دبے الفاظ میں اسے دھمکی بھی دے ڈالی گئی، مگر ہوزے ان بدمعاشوں کو خاطر میں نہیں لایا۔ جو شخص برسوں سے کیتھولک چرچ اور سامراج سے جنگ لڑ رہا ہو، اُس کے لیے اسرائیل کی دھمکیاں کیا معنی رکھتی تھیں۔

چھ ماہ بعد جب ایک اور صحافی نے اُس بیان کے حوالے سے سوال کیا تو اس نے کہا:

”اگر میں کہتا..... کہ ہمیں اسرائیل کی مذمت کرنی چاہیے، فلسطینیوں کو ان کا حق ملنا چاہیے، تو آپ کے خیال میں کوئی میری باتوں پر کان دھرتا؟ قطعی نہیں۔ یہ سب باتیں تو برسوں سے ہو رہی ہیں۔ کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں، جو آپ کو حواس باختہ کر دیتے ہیں۔ اور آشوٹز کا ارتکازی کیمپ ایسا ہی لفظ تھا جس نے اسرائیل کو آگ بگولا کردیا اور انہوں نے مجھے قتل کرنے کی دھمکی دے ڈالی۔ میں جانتا تھا کہ اُن کے وجود کا کمزور ترین حصہ کون سا ہے اور میں نے وہیں وار کیا۔“

واقعی اُس نے کاری حملہ کیا تھا۔ نتیجتاً اسرائیل میں اس کی کتابوں پر پابندی عائد کردی گئی جو اگلے کئی برس تک برقرار رہی۔

☆☆☆

وہ خوابوں کی دنیا میں تھا، جہاں قلم کی حرکت پُراسرار سرسراہٹ کو جنم دے رہی تھی۔

ہر خواب ایک سا تھا۔ وہ مسلسل لکھ رہا تھا اور رکنا نہیں چاہتا تھا۔

آنے والے برسوں میں تواتر سے اس کے ناول شائع ہوئے۔ اس زودنویسی کے دو اسباب تھے۔ ایک وجہ تو دنیا بھر میں پھیلے وہ لاکھوں قارئین تھے جو اس کی تخلیقات کے سحر میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اور دوسری وجہ... وہ سرگوشیاں تھیں، جو گھر میں چلتے پھرتے اُسے یہ احساس دلاتیں کہ بہت سی زندگی بیت چکی ہے۔ بس تھوڑا وقت باقی ہے۔

کبھی کبھار وہ ہنستے ہوئے کہا کرتا کہ اِس زودنویسی کا ایک سبب اسرائیل ہے جس کے کارندے نہ جانے کب مجھے قتل کردیں۔

2000 میں اس کا انوکھا ناول ”غار“ شائع ہوا، جس میں اس نے ایک بوڑھے کمہار کا قصہ بیان کیا۔ اِس علامتی ناول کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ پھر ”اندھے پن“ سے مماثل ایک ناول ”بینائی“ منظرِ عام پر آیا۔ توقع کے عین مطابق اسے بہت سراہا گیا۔

وہ مسلسل لکھ رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک شاہکار تخلیق ہو رہے تھے۔

یوں تو ہر ناول منفرد تھا، مگر 2008 میں شائع ہونے والے The Elephant's Journey کو اس کی اہم ترین تصنیف قرار دیا گیا جس میں سترہویں صدی میں افریقا سے یورپ لائے جانے والے ایک ہاتھی کے سفر کو بنیاد بنا کر انوکھی کہانی بیان کی گئی تھی۔

سرگوشیاں جاری رہیں... اِس ناول کی اشاعت کے فوراً بعد وہ اگلے ناول Cain کی تکمیل میں جٹ گیا۔

”قابیل“ اِس ناول کا مرکزی کردار تھا۔ ہوزے نے ناول میں انجیل میں بیان کردہ قصے کو روایات سے الگ کر کے ایک نئے طریقے سے بیان کرنے کی کوشش کی۔

2009 میں منصۂ شہود پر آنے والے اس ناول کی تکمیل کے ٹھیک دو دن بعد... جب وہ ایک اور ناول لکھنے کا ارادہ باندھ رہا تھا، 86 سالہ ہوزے نے ایک پیچیدہ تجربہ کیا۔

یہ تجربہ اس تجربے سے انتہائی حد تک مماثلت رکھتا تھا جو اس نے کئی دہائیوں قبل کیا تھا جب اس نے ناول لکھنے کے لیے قلم اٹھایا اور یہ انکشاف اس پر ہوا کہ وہ خالی ہو چکا ہے۔ اب اس کے پاس لکھنے کے لیے کچھ نہیں بچا!

اس نے قلم رکھ دیا اور آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ایک بوڑھا اس کے رُوبرو تھا جو اس شخص سے مشابہ تھا جو بچپن میں اسے کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ جنگوں کی، مہم جوؤں کی، قحط کی کہانیاں۔

ہاں، آئینے میں اس کے دادا کا عکس تھا۔ آئینے والا بوڑھا مسکرا رہا تھا۔ دوسری طرف کھڑے بوڑھے کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

وقت آن پہنچا تھا۔

☆☆☆

وہ 18 جون 2010 کی صبح تھی۔

بیدار ہونے کے بعد بوڑھے نے خود کو حیران کن حد تک توانا محسوس کیا۔ ڈائننگ ہال میں سنہری دھوپ پھیلی تھی۔ آج جمعے کا دن تھا۔ اُس کی بیوی کھانے کی میز کے پاس کھڑی تھی۔ وہ انتہائی حسین تھی۔

عورت نے مسکرا کر اپنے شوہر کا استقبال کیا۔ جواب میں بوڑھا مسکرایا۔

”یہ صبح لازوال ہے۔“ اُسے خود میں ایک بے نام قوت دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔

ناشتا کر کے وہ اپارٹمنٹ سے باہر آگیا۔ سامنے حسین ساحل پھیلا تھا، جو نغمے گا رہا تھا۔

بوڑھا بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس نے ساحل کی سمت دیکھا۔ سرد آہ بھری۔

"زندگی کس قدر حسین ہے۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ "افسوس مجھے ایک دن مرنا پڑے گا۔"

اچانک اسے محسوس ہوا کہ یہ جملہ وہ پہلے بھی کہیں سن چکا ہے۔ مگر کہاں؟ کسی فلم میں؟ کسی اسٹیج پلے میں؟ یا اپنے ہی کسی ناول میں؟

نہیں، یہ جملہ اس نے ایک عورت کی زبان سے سنا تھا جو دنیا کی شفیق ترین عورت تھی۔ اُس کی دادی۔

بوڑھے کا دل مسرت سے بھر گیا۔ دائرہ مکمل ہو چکا تھا۔ وقت آن پہنچا تھا۔ وہ واپس اپارٹمنٹ میں آیا۔ اپنے بستر تک گیا، جہاں اُس نے خاموشی اور سکون سے دم توڑ دیا۔

یہ 18 جون 2010 کی دوپہر تھی... عہدِ حاضر کا اہم ترین تخلیق کار جہانِ فانی سے کوچ کر چکا تھا۔

☆☆☆

پرتگال غم زدہ تھا اور یہ غم اتنا شدید تھا کہ دائیں بازو کی حکومت کو بادلِ ناخواستہ دو روزہ سوگ کا اعلان کرنا پڑا۔

20 جون کو جب لزبن میں ہوزے کی آخری رسومات ادا کی گئیں، بیس ہزار سے زائد افراد موجود تھے۔ وہ غم سے نڈھال تھے۔ کئی افراد سیکڑوں کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے وہاں پہنچے تھے۔ کئی دانشور اور فنکار بھی سوگ میں شریک تھے۔ البتہ پرتگال کے رجعت پسند وزیر اعظم کیوا کو سلوا نے تقریب میں شرکت نہیں کی۔

اس متعصبانہ اقدام کو نہ صرف پرتگال بلکہ دنیا بھر کے دانشوروں کی جانب سے تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ مگر ہوزے کو اس کی پروا نہیں تھی... وہ جا چکا تھا!

وصیت کے مطابق ہوزے کی راکھ کو اُس کے آبائی گاؤں کی فضاؤں میں بکھیر دیا گیا۔ اُسی گاؤں میں جہاں اپنے عہد کا عظیم داستان گو دفن تھا۔ اس کا دادا!

☆☆☆

"اگر مجھے نوبل نہیں ملا ہوتا، اگر مجھے دنیا بھر میں نہیں پڑھا گیا ہوتا، تب بھی میں وہ ہی کچھ لکھتا، جو اَب لکھ رہا ہوں۔ کیونکہ میں ایسا ہی ہوں!"

ہاں ہوزے سارا ماگو، کاشت کار جوزف کا پوتا، پولیس افسر ڈی سوزا کا بیٹا، مارکسی نظریات پر کامل یقین رکھنے والا ہوزے سارا ماگو ایسا ہی تھا۔ اب سے نصف صدی قبل دنیا پرتگالی ادب کو لگ بھگ بھول چکی تھی، مگر اُس نے اپنے جادوئی اسلوب سے اس میں نئی روح پھونک دی۔ خود کو اس بلند ترین مقام پر لا کھڑا کیا کہ اُس سے پہلے گزرے ہوئے تخلیق کاروں کی چمک ماند پڑ گئی اور بعد میں آنے والوں کے سر اس کے سامنے جھک گئے۔

منفرد تخلیقی بصیرت، پیچ دار اسلوب اور بے لاگ رائے کے لیے شہرت رکھنے والے ہوزے کو آج ایک دانشور کے طور پر بھی دیکھا جاتا ہے، جس نے مطلق العنان رویّوں کو تنقید کا نشانہ بنایا اور عالم گیریت کو مطلق العنانی کی کریہہ شکل قرار دیا۔

طبعی نقطۂ نگاہ سے تو ہوزے مر چکا ہے، مگر ادبی دنیا میں وہ ہنوز زندہ ہے۔ اس کا ثبوت ہوزے کے وہ حیران ناولز ہیں، جن کا تواتر سے ترجمہ ہو رہا ہے۔ ساتھ ایک "گم شدہ ناول" بھی اُس کی اثر پزیری کی جانب اشارہ کرتا ہے، جو 2011 میں شائع ہوا۔ یہ وہی ناول تھا، جو اُس نے نصف صدی قبل ایک پبلشر کو بھیجا تھا، جسے پبلشر دراز میں رکھ کر بھول گیا تھا۔

اعداد و شمار کے مطابق ہوزے کے ناولز کی اب تک دو کروڑ کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ 25 زبانوں میں اس کے کام کا ترجمہ ہو چکا ہے اور تراجم کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

ادب تخلیق کرنے کے ساتھ ہوزے نے پرتگال کی سیاست پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس نے کمیونسٹ پارٹی کی جانب سے 1989 کے بلدیاتی انتخابات میں حصہ لیا اور کامیابی اپنے نام کی۔ بعد کے برسوں میں بھی وہ خاصا فعال رہا۔ جلاوطنی کے بعد عملی سیاست سے تو کنارہ کش ہو گیا، مگر اس کا کاٹ دار قلم خاموش نہیں ہوا۔ اس نے سرمایہ دارانہ نظام کی توسیع کے لیے سرگرم اداروں کو تنقید کا نشانہ بنانا جاری رکھا۔ شاید اسی لیے چند نقاد اس کے ناولز اور تحریروں کو مارکسی نظریے کی نئی روح قرار دیتے ہیں۔

ساٹھ برس کی عمر تک گم نام رہنے والے ہوزے سارا ماگو کا ایک بڑا کارنامہ "دی یورپین رائٹرز پارلیمنٹ" کا قیام تھا۔ ادبی تاریخ کی اس اہم ترین تنظیم کے قیام کے لیے ہوزے اور ترک ادیب اورخان پامک نے طویل جدوجہد کی۔

2010 میں تخلیق کاروں کی اس انجمن کا پہلا اجلاس ہوا۔ ہوزے کو افتتاحی خطبہ دینا تھا، مگر زندگی نے ساتھ نہیں دیا۔ پارلیمنٹ کے پہلے اجلاس میں ہم عصروں پر اس کی جدائی کا غم چھایا رہا۔

اندھاپن

ہوزے سارا ماگو

اس شہر میں ایک عجیب و غریب وبا پھیل گئی تھی، لوگ اچھے بھلے گھر سے نکلتے تھے، بازار میں خرید و فروخت کر رہے ہوتے کہ اس بیماری کا شکار ہو جاتے۔ بیماری بھی کتنی عجیب، جس کا ذکر کسی طبی کتب میں نظر نہ آئے۔

دنیا کا سب سے بڑا ادبی انعام حاصل کرنے والے ناول کی تلخیص

کہانی کا آغاز شہر کی ایک مصروف شاہراہ سے ہوتا ہے۔ سگنل کی سرخ بتی روشن ہے۔ گاڑیاں رکی ہوئی ہیں۔ چند لمحوں بعد سبز بتی روشن ہو گئی۔ ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھنے لگا۔ گاڑیاں سرکنے لگیں کہ اچانک ڈرائیوروں کو اس احساس نے آن جکڑا کہ درمیانی لین کی سرے والی گاڑی رکی ہوئی ہے۔

ان کا پہلا دھیان تکنیکی خرابی کی جانب گیا۔ پھر یہ خیال ذہنوں میں در آیا کہ شاید اس گاڑی کا پیٹرول ختم ہو گیا ہے۔

ہارن بج رہے ہیں۔ لوگوں کا اضطراب بڑھ رہا ہے اور پیدل چلنے والے حیرت سے اس رکی ہوئی گاڑی کے ڈرائیور کو دیکھ رہے ہیں جو تیزی سے اپنے بازو ہلا رہا ہے۔

کچھ لوگ اس گاڑی کو دھکیل کر راستے سے ہٹانے کے لیے اپنی گاڑیوں سے باہر آ گئے۔ دوسری جانب گاڑی کا ڈرائیور کبھی ایک جانب اور کبھی دوسری جانب دیکھ رہا ہے۔ وہ مسلسل چلّا رہا ہے۔ ہونٹوں کی حرکت اشارہ کر رہی ہے کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مگر کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے اس لیے آواز باہر نہیں آ رہی تھی۔ یہ عجیب و غریب صورت حال تھی۔

ایک شخص نے کسی نہ کسی طرح اس گاڑی کا دروازہ کھول لیا... تب وہاں موجود افراد کے کانوں سے تین

پُراسرار الفاظ ٹکرائے۔

”میں اندھا ہوں!“

☆☆☆

یہ ایک خوفناک تجربہ ہے جس سے نجات کے لیے وہ مظلوم کسی نہ کسی طرح اپنے گھر پہنچنا چاہتا ہے۔

گاڑی کے اردگرد ایک ہجوم ہے۔ چند افراد اِس بدنصیب شخص کے اندھے پن کو اعصابی صدمے کا شاخسانہ قرار دے رہے ہیں۔ ایسے میں ایک عورت ایمبولنس بلانے کا خیال پیش کرتی ہے۔ اندھا شخص اِس رائے کو فوراً رد کردیتا ہے۔ اس کی خواہش فقط اتنی ہے کہ کوئی اس بلڈنگ تک ساتھ چلنے کے لیے راضی ہوجائے جہاں اس کی رہائش ہے۔

وہ ان الفاظ میں اپنی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ ”بلڈنگ یہاں قریب ہی ہے اور مجھ پر اس سے بڑھ کر اور کوئی عنایت نہیں ہوگی۔“

بالآخر ایک شخص نے ہامی بھرلی۔ اس نے اندھے شخص کو ساتھ والی سیٹ بٹھایا۔ انجن اسٹارٹ کیا اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر گاڑی ڈال دی۔

اب گاڑی سڑک پر رواں دواں ہے .... تب اندھے شخص کو یہ عجیب وغریب احساس آلیتا ہے کہ عام اندھوں کے برعکس وہ تاریکی کا تجربہ نہیں کررہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تو سفیدی چھائی ہے۔

ایک ایک لمحہ صدی کے مانند تھا۔ بالآخر گاڑی اُس مقام تک پہنچ گئی، جہاں اُس کا گھر تھا۔ گاڑیاں قطار میں کھڑی تھیں۔ پارکنگ کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ ڈرائیور نے اسے سڑک پر اتار دیا اور گاڑی ساتھ والی گلی میں کھڑی کرنے چلا گیا۔

تنہائی کے اس لمحے نے اندھے شخص کو خوف سے بھر دیا۔ اُسے زمین پیروں تلے سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

یہ خوف اُس وقت کچھ گھٹا، جب ایک ہاتھ نے اُس کا بازو چھوا۔ اور اسی شخص کی آواز سنائی دی جس سے وہ چند لمحات قبل محوِ گفتگو تھا۔

وہ شخص اُسے اُس کے فلیٹ تک لے گیا۔ اِس دوران اندھا شخص بار بار اُس کا شکریہ ادا کرتا رہا۔ مدد کرنے والے نے جواب میں یہی کہا کہ شکریے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ”آج تمہاری باری ہے، کل میری ہوسکتی ہے۔“

بصارت سے محروم ہونے والے شخص کی بیوی گھر پر نہیں تھی۔ اس کے مددگار نے ایک نیک دل انسان کے مانند اس کی بیوی کی واپسی تک وہاں رکنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور یہی وہ لمحہ تھا، جب اندھے شخص کے دل میں اندیشے نے سر اٹھایا۔

لمحے کے ہزارویں حصے میں اسے اپنے مددگار کے پُرخلوص لہجے سے .... شک کی بو آنے لگی۔ اس نے سوچا۔ ”یہ میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔ تنہائی کا فائدہ اٹھا کر مجھے قابو کرکے گھر کا صفایا کرسکتا ہے۔“

مددگار کی پیشکش اس نے بڑی محبت سے رد کردی۔

چند پلوں بعد اُسے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی، پھر لفٹ چلنے کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔ احتیاط کے پیش نظر وہ دروازے تک گیا اور باہر جھانکا۔ مگر اسے کچھ نظر نہیں آیا، ماسوائے سفیدی کے۔

اب وہ گھر میں تنہا تھا۔ ایسا گھر جس کے چپے چپے سے وہ واقف تھا مگر قدم اٹھاتے ہوئے وہ ہچکچاہٹ کا شکار ہوگیا۔ اندھے پن نے گھر سے اس کی آشنائی چھین لی ہے۔

وہ چند قدم آگے بڑھا۔ یکدم کسی چیز سے ٹکرایا۔ گلدان زمین پر گرا اور چھن سے ٹوٹ گیا۔ افسوس کے ایک لمحے نے اسے آلیا۔ وہ کرچیاں اٹھانے کے لیے جھکا اور تب... اندھے پن کا پہلا تحفہ اسے ملا۔ ایک کرچی نے اس کی انگلی زخمی کردی۔

اندھے شخص کے لیے وہ انتہائی پیچیدہ صورتِ حال تھی... اپنے گھر میں تھا، بینائی سے محروم زخمی۔

وہ ٹٹولتا ہوا صوفے تک پہنچا جہاں اس نے خود کو ڈھیر کردیا اور جیب سے رومال نکال کر انگلی پر باندھ لیا۔

وہ سخت افسردہ تھا۔ تھکن سے چور اور یہ خوابناکی کی کیفیت تھی۔

بالآخر غم کے زیرِ اثر اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

اور تب اس کی بیوی کمرے میں داخل ہوئی جو اس کی کیفیت سے انجان، اس بات پر بڑبڑا رہی تھی کہ اُس نے نہ صرف گلدان توڑ دیا، بلکہ فرش پر پھیلے پانی کو صاف کرنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔

وہ ایک شکست زدہ شخص کے مانند خاموش بیٹھا رہا۔ بالآخر فرش کی صفائی کے بعد بیوی اس کی جانب پلٹی۔ اس کا زخم دیکھ کر عورت کا دل نرم پڑ گیا۔ وہ اس کے قریب آئی اور تب بدنصیب شخص نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنا المیہ بیان کیا۔ ”میں اندھا ہوگیا ہوں۔“

یہ بات سن کر عورت کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ یقین ہو چلا کہ اُس کا شوہر کوئی بھونڈا کھیل کھیل رہا ہے مگر پھر اپنے شوہر کی بے بسی دیکھ کر یہ پریشان کن خیال ذہن میں آیا کہ وہ بدنصیب واقعی کسی المیے کا شکار ہوگیا ہے۔

عورت نے ٹیلی فون ڈائریکٹری سے فوراً قریب ترین کلینک کا نمبر تلاش کیا۔ گو وہ آپریٹر کو اپنی بات پوری طرح نہیں سمجھا سکی مگر ماہرِ چشم سے اپائنٹمنٹ لینے میں کامیاب رہی۔

جس لمحے وہ کلینک کے لیے روانہ ہونے کو تھے، ایک مسئلہ سامنے آن کھڑا ہوا۔

جو نیک طینت شخص اندھے کو گھر تک چھوڑنے آیا تھا، اس نے جاتے ہوئے گاڑی کی چابیاں اُس کے حوالے نہیں کی تھیں۔

ابتدا میں میاں بیوی اِس عمل کو مددگار کی غفلت سمجھے مگر جلد یہ عقدہ کھل گیا کہ ”نیک شخص“ اُن کی گاڑی لے اُڑا ہے۔

☆☆☆

ناول کے اِس حصے تک پہنچ کر قاری کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہونے لگتا ہے کہ یہ ایک اندھے شخص کی کہانی ہے جو اُس کا المیہ بیان کرتی ہے، مگر حقیقتاً ایسا نہیں... کہانی میں ایک ڈرامائی موڑ آنے کو ہے۔

اب اندھا شخص اپنی بیوی کے ساتھ ایک کلینک میں موجود ہے۔ یہ خیال اس کے دل میں پنپ رہا ہے کہ ڈاکٹر جتنی دیر اُس کا معائنہ کرنے میں لگائے گا، اتنا ہی اس کا مرض پیچیدگی اختیار کرتا جائے گا۔

اس کی بیوی کی خصوصی درخواست پر ماہرِ چشم نے انتظار گاہ میں موجود دیگر مریضوں پر اندھے شخص کو ترجیح دینے کا فیصلہ کیا، جس پر وہاں موجود افراد کی جانب سے ہلکا سا احتجاج کیا گیا۔

مریض کی بیوی کی زبان سے ادا ہونے والی کہانی ڈاکٹر کے لیے ناقابلِ فہم تھی۔ اس نے اندھے پن کی شکایت کرنے والے شخص کا معائنہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر عمل کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ مریض کی آنکھیں بالکل ٹھیک تھیں۔

صورتِ حال نے توقع کے عین مطابق ڈاکٹر کو پریشان کردیا۔ وہ ایک قابل شخص تھا، اپنے شعبے سے متعلق وسیع مطالعے کا حامل مگر اس نے اپنی زندگی میں ایک بھی ایسا کیس نہیں دیکھا تھا۔

اس نے تسلی کے چند جملے کہے، چند رپورٹس لکھیں اور پریشان حال میاں بیوی کو رخصت کردیا۔

اس مقام پر ناول کا مصنف ہوزے سارا ما گو کہانی کا رخ اس چور کی جانب موڑتا ہے جو اندھے ہونے والے کی گاڑی لے اُڑا تھا۔

چور گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود ہے، پوری طرح چوکس۔ اسے ادراک ہے کہ کسی بھی وقت کوئی پولیس والا اُسے روک کر اس کے کاغذات چیک کرسکتا ہے۔

یہ ایک معمولی اندیشہ تھا مگر نہ جانے کیوں چند ہی لمحوں میں اس اندیشے نے اضطراب کی شکل اختیار کرلی جسے احساسِ گناہ نے مہمیز کیا اور چور کا دم گھٹنے لگا۔ بالآخر اس نے گاڑی روک دی اور تازہ ہوا کے لیے باہر نکل آیا اور تب... کہانی میں ایک پُراسرار موڑ آیا۔

چور چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ اندھا پن کسی آسیب کے مانند اس پر سوار ہوگیا۔ ایک سیکنڈ سے دوسرے سیکنڈ میں داخل ہوتے ہوئے اس کی بینائی قصۂ پارینہ بن گئی۔

دوسری جانب ڈاکٹر تمام مریض بھگتا چکا تھا اور اب بیٹھا اس عجیب وغریب مریض کی فائل دیکھ رہا تھا جس سے چند گھنٹے قبل اس کی ملاقات ہوئی تھی۔

اس نے اِس پُراسرار سفید اندھے پن سے متعلق اپنے ایک ہم پیشہ سے مشورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر کوشش لاحاصل ثابت ہوئی۔ اس کا ہم پیشہ اس کیس پر کوئی تبصرہ نہیں کرسکا۔ بلاشبہ اچانک ایسی تاریکی میں اتر جانا جو سفید ہو، تاریخ کا انوکھا ترین واقعہ تھا۔

گھر پہنچنے کے بعد بھی مریض اس کے اعصاب پر سوار رہا۔ ڈنر کے بعد اس نے اپنی بیوی سے اس متعلق گفتگو کی پھر وہ اپنی اسٹڈی کی جانب بڑھنے لگا جہاں کتابیں منتظر تھیں۔

اگلے چند گھنٹے کتابوں کے مطالعے میں صرف ہوئے، جن سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ تھکن اور اکتاہٹ کے ان لمحات میں اچانک ڈاکٹر کے ذہن میں ایک پُراسرار خیال نے جنم لیا۔ ”اگر میں اچانک اندھا ہوگیا تو کیا ہوگا؟“

اس لمحے تو ایسا نہیں ہوا مگر جب وہ کتابیں رکھنے کے لیے اٹھ رہا تھا، ایک منحوس لمحے کا جنم ہوا۔

اندھا پن اُسے اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔

☆☆☆

اِس پُراسرار بیماری کا شکار ہونے والا اگلا کردار سیاہ عینک والی ایک پیشہ ور جسم فروش ہے۔ یہ لڑکی ڈاکٹر ہی کی مریضہ ہے۔

یہ لڑکی ایک خاص لمحے، ہوٹل کے ایک کمرے میں اچانک اندھی ہوگئی۔ اس کیفیت نے اس پر وحشت طاری کردی۔ ہوٹل اس کی چیخوں سے گونج اٹھا۔

دوسری جانب رات کے اس لمحے ڈاکٹر مایوسی میں گھر چکا ہے۔ اس کے ذہن میں ہومر کی نظم ایلیڈ کے مصرعے گونج رہے ہیں۔ ایک ایسے شاعر کے مصرعے ...جو خود بھی اندھا تھا۔

کسی نہ کسی طرح اس نے خود پر قابو پالیا۔ اسٹڈی سے نکلا۔ ٹٹولتا ہوا بستر تک گیا اور خاموشی سے اپنی بیوی کے پہلو میں لیٹ گیا۔

وہ دکھی شخص طلوعِ آفتاب تک یونہی لیٹا رہا۔

جب اُس کی بیوی اُسے بیدار کرنے کے ارادے سے آئی، تب ڈاکٹر نے دھیمی آواز میں اپنا المیہ بیان کیا جس نے توقع کے عین مطابق اس کی بیوی کو حیرت کی کھائی میں دھکیل دیا۔

ڈاکٹر ایک دیانت دار آدمی تھا۔ اپنی پریشانی سے زیادہ اسے یہ بات ہلکان کیے جارہی تھی کہ کہیں یہ بیماری وبائی شکل نہ اختیار کرلے۔ اس نے محکمۂ صحت کو مطلع کرنے کا فیصلہ کیا مگر باوجود کوشش کے وہ افسرِ اعلیٰ سے بات نہیں کرسکا۔

مایوسی کی اس حالت میں اس نے اپنے اسپتال کے ڈائریکٹر کا نمبر ڈائل کیا۔

ڈائریکٹر کے لیے اس بات پر یقین کرنا خاصا مشکل تھا کہ اس کا قابل ماتحت ایک ایسے پُراسرار مرض میں مبتلا ہوچکا ہے، جس کی طبی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اور یہ بات تو مزید حیرت ناک تھی کہ جس تکلیف سے ڈاکٹر خود گزر رہا ہے، کل شام اُس نے اِسی میں مبتلا ایک شخص کا معائنہ کیا تھا۔

اس نے ڈاکٹر کو پُرسکون رہنے کی ہدایت کی۔ ”تم فکر مت کرو، میں اس معاملے کا جائزہ لیتا ہوں۔“

آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر کو اسپتال کے ڈائریکٹر کی پریشان کن فون کال موصول ہوئی۔ ”ابھی ابھی ایک لڑکا یہاں آیا ہے اور وہ بھی اچانک بصارت کھودینے کی شکایت کررہا ہے۔“

حیرت انگیز طور پر یہ لڑکا بھی ڈاکٹر کے مریضوں کی فہرست میں شامل تھا۔ کل شام ہی معائنے کے لیے وہ اپنی ماں کے ساتھ کلینک آیا تھا۔

”یعنی اس پُراسرار بیماری کے پہلے مریض کے قریب آنے والا ہر شخص اندھے پن کی لپیٹ میں آنے والا ہے۔“ ڈاکٹر بڑبڑایا۔

یہ گمبھیر صورتِ حال تھی۔ اسپتال کے ڈائریکٹر نے فوراً محکمۂ صحت کو اطلاع پہنچائی۔

شاید اعلیٰ افسران اسے سنجیدگی سے نہیں لیتے مگر اگلے چند گھنٹوں میں مزید دو آدمیوں کے اندھے ہونے کی اطلاع نے انتظامیہ میں سراسیمگی پھیلا دی۔ فوراً اِس پُراسرار مرض کے شکار ہونے والوں کو عام شہریوں سے دور رکھنے کا فیصلہ صادر ہوگیا۔

خوف زدہ سرکاری اہل کاروں کے ساتھ سائرن بجاتی ہوئی ایک ایمبولینس ڈاکٹر کو بھی لینے پہنچ گئی۔

جب اندھا ڈاکٹر ایمبولینس میں سوار ہورہا تھا، اچانک اُس کی بیوی بھی گاڑی میں سوار ہوگئی۔

ڈرائیور نے احتجاج کیا۔ ”آپ کو نیچے اترنا ہوگا۔“

عورت نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”تمھیں مجھے بھی ساتھ لے جانا ہوگا۔ میں ابھی ابھی اندھی ہوگئی ہوں۔“

☆☆☆

ناول کے اگلے حصے میں حکومت کے بے حس اعلیٰ افسران کی منظر کشی کی گئی ہے جو مریضوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے نجات حاصل کرنے کے لیے انھیں شہر سے دور ایک دماغی اسپتال میں منتقل کرنے کا فیصلہ کرلیتے ہیں۔

یہ دماغی اسپتال ایک وحشت ناک جگہ ہے، کسی پاگل خانے کے مانند۔ سب سے پہلے ڈاکٹر اور اس کی بیوی یہاں پہنچتے ہیں۔ انھیں وارڈ نما ایک طویل کمرے میں دھکیل دیا جاتا ہے۔

وہ دونوں وہاں تنہا ہوتے ہیں اور تب قاری پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ڈاکٹر کی بیوی اندھی نہیں ہے۔ فقط اپنے شوہر کی حفاظت کی غرض سے وہ ساتھ چلی آئی۔

ڈاکٹر کی بیوی ہی درحقیقت اس ناول کا اہم ترین کردار ہے۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر اور اس کی بیوی کو قدموں کی آواز سنائی دی۔ چند اور اندھوں کو کمرے میں دھکیلا گیا۔ اس گروہ میں پُراسرار سفیدی کا شکار بننے والا پہلا شخص بھی شامل تھا۔ چور اور سیاہ عینک والی لڑکی بھی ساتھ ہی آئے۔

نئے آنے والے انتہائی خوفزدہ تھے۔ گھبراہٹ چہروں سے عیاں تھی، جسے فقط ڈاکٹر کی بیوی دیکھ سکتی تھی، باقی بدنصیب تو اندھے تھے۔

کچھ دیر بعد لاؤڈ اسپیکر سے ایک آواز بلند ہوئی جو ایک ایسے شخص کے حلق سے برآمد ہورہی ہوتی ہے جو حکم جاری کرنے کا عادی تھا۔

آواز نے انھیں یہاں لانے کا سبب بیان کیا۔ چند احکامات جاری کیے، جن میں چھپی سخت گیری اس جانب اشارہ تھی کہ یہاں آنے والے زندگی سے کٹ چکے ہیں۔ اب وہ قیدی ہیں۔

لاؤڈ اسپیکر سے بلند ہونے والی آواز کے خاموش ہونے کے بعد... وارڈ میں بھی خاموشی چھاگئی۔ سفید خاموشی!

☆☆☆

اگلے ابواب اسی دماغی اسپتال یا پاگل خانے کے گرد گھومتے ہیں۔

چونکہ یہاں آنے والے پہلے گروہ کے افراد کسی نہ کسی صورت ایک دوسرے کو جانتے ہیں سو اُن میں اختلافات بھی جنم لیتے ہیں۔ وہ اپنی بدبختی کے لیے ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ خصوصاً پہلا اندھا چور کو اپنی بدنصیبی کا موجب قرار دیتا ہے۔ بستر کے انتخاب کا معاملہ بھی نزاعی صورت اختیار کرلیتا۔

اِسی دوران چور زخمی ہوجاتا ہے۔

وہاں... اُس پاگل خانے میں اندھا ہی سہی مگر ایک ڈاکٹر ہے، البتہ علاج معالجے کی کوئی سہولت نہیں۔ کیونکہ معتوب ٹھہرائے جانے والوں کے کوئی حقوق نہیں ہوتے۔

مصنف ڈاکٹر کی بیوی کے وسیلے قاری کو اسپتال کے طول و عرض سے آگاہ کرتا ہے۔ تنگ راہداریاں، وحشت ناک بیت الخلا، ماحول میں بسی بساند۔

ابتدا میں اسپتال میں فقط پانچ افراد ہوتے ہیں، مگر دھیرے دھیرے تعداد بڑھنے لگتی ہے۔ مزید اندھوں کو بھی وہاں دھکیل دیا جاتا ہے۔

توقع کے عین مطابق نیا گروہ بھی شدید اضطراب کا شکار ہے، مگر دھیرے دھیرے ہی سہی، وہ حالات کے جبر سے سمجھوتا کرلیتا ہے۔

مجبوری سے سمجھوتا کرنے کے عمل کی ناول نگار نے بڑی چابک دستی سے منظر کشی کی ہے۔ یہ صورتِ حال نابینا افراد کی سائیکی سے بھی قاری کو آگاہ کرتی ہے جو کسی نہ کسی طرح خود کو حالات کے قالب میں ڈھال ہی لیتے ہیں۔

☆☆☆

کہانی میں اُس وقت ایک پریشان کن موڑ آیا جب اسپتال سے فرار کی کوشش کرنے والے ایک اندھے شخص کو نگرانی پر مامور سپاہی کی فائرنگ نے موت کی وادی میں دھکیل دیا۔

اس واقعے نے انتہائی پیچیدہ صورتِ حال تخلیق کی۔ فرار کی کوشش کرنے والا مقتول ایک فطری خواہش کا تعاقب کررہا تھا۔ دوسری جانب گولیاں برسانے والا سپاہی فقط احکامات کی تعمیل کررہا تھا۔ ایسے احکامات جنھیں اس کا دل پوری طرح قبول تو نہیں کررہا مگر سفید خطرہ کہلانے والے مرض کا خوف اُسے ہانکے لیے جارہا ہے۔

فائرنگ کے اس واقعے کے بعد اسپتال میں قید اندھوں پر یہ واضح ہوگیا کہ وہ بہ طور فرد اپنے تمام حقوق کھوچکے ہیں۔ اب وہ فقط قیدی ہیں۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا، مایوسی کے در و دیوار میں قید اندھوں کی چھٹی حس بیدار ہوتی گئی۔ وہ چھوٹی چھوٹی حرکات جن کا اندازہ وہ بینا ہوتے ہوئے کبھی نہیں کرسکے، اب اُنھیں ان کا ادراک ہونے لگا، جس میں یہ احساس بھی شامل تھا کہ اسپتال دھیرے دھیرے بھر رہا ہے۔ بھانت بھانت کے لوگ وہاں آرہے ہیں، جن میں سے ہر ایک یہی کہانی سناتا ہے کہ اندھے پن کے اِس پُراسرار مرض نے ایک وبا کی شکل اختیار کرلی ہے... یہ تیزی سے پھیل رہا ہے، جس کی وجہ سے انتظامیہ سراسیمہ دکھائی دیتی ہے۔

اگلے چند روز میں کچھ اور اندھوں نے بھی فرار کی کوشش کی، مگر وہ بدبختی کے حصار سے نہیں نکل سکے۔ اُن کا انجام بھی وہی ہوا جو کھلی فضا میں سانس لینے کے خواہش مند پہلے اندھا شخص کا ہوا تھا... انھیں گولیوں سے بھون دیا گیا۔

فائرنگ کا تازہ واقعہ اس بات کا عکاس تھا کہ اب اسپتال میں قید افراد بدترین آمریت کے زیرِ اثر ہیں۔ ایسی آمریت جو ان کی طرح اندھی ہے۔

انسانی جذبے کے زیرِ اثر اندھوں نے اپنے مرنے والے ساتھیوں کو دفنانے کا فیصلہ کیا، مگر نیک نیتی سے شروع کیا جانے والا یہ عمل انتہائی دشوار ثابت ہوا۔ اُن کے پاس تدفین کے عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے درکار سامان نہیں تھا، جس کی وجہ سے یہ محنت طلب عمل ایک جھگڑے کی شکل اختیار کرگیا۔

ناول کے مصنف نے بھوک کا تجربہ بھی بڑی مہارت سے بیان کیا۔

اندھوں کو ملنے والی خوراک زیادہ نہیں۔ پھر وہ انھیں راس بھی نہیں آتی۔ ڈبوں میں بند خوراک عجیب ڈھنگ سے ان کے حوالے کی جاتی ہے، جس سے ہاضمہ خراب ہوجاتا ہے۔ وہ بیت الخلا کا رخ کرتے ہیں، جہاں جلد ہی گندگی کا ڈھیر لگ گیا اور فضا تعفن سے اٹ گئی۔

آمریت کی تاریکی میں، بھوک کے ہاتھوں یرغمال بنے اندھوں میں پہلی بار چور جنم لیتے ہیں۔ خوراک کے چور۔

اسپتال کی نگرانی پر تعینات محافظ کیونکہ اندھوں کے قریب آنے سے کتراتے ہیں، اِس لیے کھانے کی تقسیم کے عمل میں بگاڑ آنے لگتا ہے۔ جس کے ہاتھ جتنے ڈبے آتے ہیں، وہ انھیں سمیٹ لیتا ہے۔

اس عمل سے اختلافات جنم لیتے ہیں، شدید اختلافات۔ جس سے واضح ہوجاتا ہے کہ انسان سب کچھ برداشت کرسکتا ہے مگر بھوک کے سامنے وہ اپنی تہذیب، اپنی تربیت سب بھلا بیٹھتا ہے۔ چاہے وہ بینا ہو یا نابینا!

☆☆☆

اب تک تو عام افراد ہی اندھے پن کا شکار ہوئے تھے، مگر تمام تر احتیاط کے باوجود حکومتی اور فوجی افسران میں بھی یہ مرض ظاہر ہونے لگا۔

یہ صورتِ حال انتہائی گمبھیر تھی۔ حکومتی ڈھانچے میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ دوسری جانب پاگل خانے میں ایک انوکھے مسئلے نے جنم لیا۔

اندھوں میں، جن کا دُکھ سانجھا تھا، ڈکیتوں کا ایک ظالم گروہ پیدا ہوا۔ جو طاقت کے زور پر جیل انتظامیہ کی جانب سے ملنے والے کھانے پر قابض ہوگیا۔ اس گروہ کا تقاضا تھا کہ جس کسی کو کھانا چاہیے، وہ اِس کی قیمت ادا کرے۔

چند غنڈوں پر مشتمل یہ گروہ جلد ہی اسپتال کا حاکم بن گیا۔ یوں تو ان کے پاس پسٹل بھی تھی، مگر جارحیت ان کا اصل ہتھیار تھا۔ پھر انہیں ایک ایسے شخص کا ساتھ بھی حاصل تھا جو پیدائشی اندھا تھا۔ اس کی چھٹی حس اُن افراد سے کئی گنا بلند تھی جو تازہ تازہ اندھے ہوئے تھے۔

اِن بدمعاشوں کے شر سے بچنے کے لیے اندھے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوئے گئے۔ انہوں نے کئی طرح کی حکمتِ عملیاں اپنائیں، مگر سب لاحاصل رہا۔

بدمعاش اندھوں کے سامنے شریف اندھے ہار گئے۔

چاروناچار انہیں ان کے مطالبات پورے کرنے پڑے۔

اندھوں میں ایک مطلق العنان حکومت نے جنم لیا۔ مظلوموں ہی میں ظالم پیدا ہوگئے۔ پسے ہوئے طبقے میں آمریت کا آغاز ہوا۔

اِس صورتِ حال میں ڈاکٹر کی بیوی کی حیثیت دوچند ہوجاتی ہے، کیونکہ سیکڑوں اندھوں میں وہ ہی ایک بینا ہے، جو دیکھ سکتی ہے۔

غنڈوں کا لیڈر ڈاکٹر کی بیوی ہی کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا۔ اس واقعے سے دیگر بدمعاشوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ وہ پسپا ہونے لگے۔ خود کو ایک وارڈ تک محدود کرلیا۔

ڈاکٹر کی بیوی ہی کی تحریک پر دیگر اندھوں نے اکٹھے ہو کر بدمعاشوں کے وارڈ پر حملہ کردیا۔ اِس طویل جنگ کا انجام بدمعاشوں کی شکست پر ہوا مگر اِس دوران اندھوں کو بھی شدید نقصان اٹھانا پڑا۔

اِسی مقابلے کے دوران اسپتال میں شعلے بھڑک اٹھے۔ ظالم آگ نے جلد ہی بستروں اور دیگر اشیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تنگ راہداریاں سیاہ دھوئیں سے بھر گئیں۔ موت پھنکارنے لگی۔

خوف سے لرزتے اندھے جان بچانے کے لیے باہر کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ یہ بھی بھول گئے کہ باہر بندوق بردار اُن کے منتظر ہیں۔ مگر کھلی فضا تک رسائی کے بعد ان پر انکشاف ہوا کہ نگرانی پر تعیناتی افسران اور اہل کار وہاں موجود نہیں۔ وہ بھی اندھے پن کا شکار ہوچکے تھے۔

☆☆☆

ہوزے سارا ماگو کے اِس عجیب و غریب ناول میں آگے کئی موڑ آتے ہیں۔

اسپتال سے راہِ فرار اختیار کرنے والے اندھے شہر کی سمت جاتے ہیں، جہاں اُن پر یہ حیران کن انکشاف ہوتا ہے کہ پورا شہر ہی اندھا ہوچکا ہے۔

مگر اس سے بھی بڑا انکشاف یہ ہے کہ اندھوں نے کسی نہ کسی طرح زندگی گزارنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔ انہوں نے مختلف مقامات پر ڈیرے ڈال لیے ہیں۔ یعنی قیام کا انتظام لگ بھگ ہوچکا ہے کہ شہر بہت بڑا ہے، مگر طعام کا مسئلہ وبالِ جان بنا ہوا ہے۔ جس نے اندھوں کے درمیان مقابلے کی فضا پیدا کردی ہے۔

ناول کا یہ حصہ انتہائی اہم ہے۔ کیونکہ یہاں کامل اندھے پن کو قبول کرنے کا تصور پیش کیا گیا ہے۔

شہری زندگی اسپتال سے فرار ہونے والے اندھوں کو دھیرے دھیرے معمول کی طرف واپس لے آئی۔ وہ ٹٹولتے ہوئے اپنے اپنے گھر پہنچنے لگے۔

ڈاکٹر کی بیوی کی بینائی نے اس کے گروہ کی غذائی ذخیرے تک رسائی بھی آسان بنادی۔ انہوں نے ٹھکانے بھی ڈھونڈ لیے، جہاں اُنہوں نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔

جب کہانی اپنے اختتامی حصے میں پہنچتی ہے تو ٹھیک ابتدائی حصے کے مانند کچھ عجیب رونما ہوتا ہے... جس طرح شہر کے باسی ایک ایک کرکے، بغیر کسی وجہ کے اندھے ہوگئے تھے، ٹھیک اِسی طرح ایک ایک کرکے اُن کی آنکھوں کے سامنے سے چھائی سفید تاریکی چھٹنے لگتی ہے اور آخرکار ان کی بینائی لوٹ آتی ہے۔

ناول کی آخری سطریں اِس پورے ماجرے کا ماخذ ہیں، جہاں ڈاکٹر کے پوچھنے پر... ''ہم اندھے کیوں ہوئے تھے؟'' اُس کی بیوی کہتی ہے۔ ''میرا نہیں خیال ہے کہ ہم کبھی اندھے ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اندھے ہیں۔ اندھے لوگ جو دیکھ سکتے ہیں، لیکن نہیں دیکھتے!''

ترکی نمی دانم

علی سُفیان آفاقی

سرگزشت کا خاصّہ ہے کہ دلچسپ اور انفرادیت کے حامل سفرنامے پیش کرتا ہے۔ جو صرف سفرنامہ نہیں معلومات کا خزانہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ سرگزشت کے مستقل قلمکاروں میں علی سفیان آفاقی جیسے کہنہ مشق قلمکار بھی ہیں۔ عرصے سے قارئین اصرار کناں تھے کہ ان کے سفرنامے دوبارہ پیش کیے جائیں۔ پاک فلم نگری کو جب عروج حاصل تھا اور علی سفیان آفاقی فلم یونٹ کے ساتھ ملکوں ملکوں جایا کرتے تھے اس دور کے قصے تو وہ بیان کرہی چکے ہیں لیکن جب جب سفر برائے شوق کیا اس دور کے قصے بھی کم دلچسپ نہیں' وہی کچھ وہ سنا رہے ہیں۔ الفاظ کی نشست وبرخواست، جملوں کی خوبصورت ادائیگی اور روانی بہت کچھ آپ اس سفر کہانی میں پائیں گے۔

ترکی کے سفر کی دلچسپ روداد، سفر کہانی کی آٹھویں کڑی

سارے پروگراموں سے فارغ ہوکر ہم نے اپنے ہوٹل کا رخ کیا اور مرزا مشرف بھی اجازت حاصل کرکے رخصت ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد خان صاحب نے کہا۔ ''شکریہ تو ہمیں ان کا ادا کرنا چاہیے۔''

بٹ صاحب کو اعتراض تھا۔ ''انہوں نے ایسا کون سا تیر مارا ہے جس کے لیے ہم ان کا شکریہ ادا کریں؟ ہم نے ان کی خاطرداری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔''

''بٹ صاحب احسان فراموشی نہ کرو۔ وہ بے چارہ

اپنے سارے کام چھوڑ کر صبح سے رات تک ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ ہمارے لیے مترجم کے فرائض ادا کرتا ہے۔ وہ ہمارا گائیڈ بھی ہے جتنی معلومات ہم نے اس سے حاصل کی ہیں وہ تو شاید گائیڈ سے بھی حاصل نہ ہوتیں۔"

بٹ صاحب اپنی ناک کھجاتے ہوئے بولے۔ "یہ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

"بتانے کی کیا بات ہے۔ اللہ نے تمہیں بھی آنکھیں اور کان دیئے ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "مگر دماغ نہیں دیا۔"

بٹ صاحب گھور کر رہ گئے۔ بولے کچھ نہیں۔

اپنے ہوٹل پہنچے تو چند آنے جانے والے مسافر کاؤنٹر پر کھڑے تھے ہم بھی ان کے پیچھے کھڑے ہوگئے کیونکہ یہاں قطار بندی اور اخلاقی اصولوں کی پابندی کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر آپ قطار میں کھڑے نہ ہوں گے اور سب کے آگے جانے کی کوشش کریں گے تو قطار میں کھڑے ہوئے لوگ آپ سے تو کچھ نہیں کہیں گے مگر ان کے چہروں پر ناراضی کے آثار نظر آجائیں گے۔ اس کے علاوہ کاؤنٹر پر موجود خاتون یا مرد آپ کو اشارے سے کہیں گے کہ پیچھے اپنی قطار میں کھڑے ہوں مگر ساتھ ہی "پلیز" بھی کہیں گے۔

استنبول میں ہم نے انگریزی جاننے والے بہت کم بلکہ برائے نام ہی ترک دیکھے۔ ان کی انگریزی یس سر، نو سر، پلیز، تھینک یو، چار الفاظ پر ہی مشتمل ہوتی ہے۔

اس قطار میں کھڑے ہوئے لوگوں کو بھی سب سے زیادہ مشکل یہی پیش آرہی تھی کہ کاؤنٹر پر جو طرح دار... خاتون تشریف فرما تھیں وہ دوسری تمام زبانوں سے ناواقف تھیں اور سوائے ترکی کے کوئی اور زبان نہیں بول سکتی تھیں۔ اپنی مدد کے لیے انہوں نے ایک اور خاتون کو بلایا تھا جو سر پر اسکارف لپیٹے ہوئے تھیں مگر ان کی انگریزی بھی بس "کام چلاؤ" تھی۔ یعنی بات سن کر اس کا خلاصہ کاؤنٹر والی کو بتاتیں۔ اور پھر ان کے جواب سے مسافر کو مطلع کرتیں۔ مسافروں کی تعداد تو زیادہ نہیں تھی مگر ہمیں ایسا لگا کہ ان سب کے فارغ ہونے میں بہت دیر لگ جائے گی۔

خان صاحب نے ہمیں مشورہ دیا کہ ہمیں تو صرف کمروں کی چابیاں ہی لینی ہیں اس لیے بائیں جانب کے کاؤنٹر سے جا کر کمروں کی چابیاں لے لیں۔ اس کاؤنٹر پر ایک خاصی عمر کی بزرگ خاتون تشریف فرما تھیں۔ ان پر نظر پڑتے ہی بٹ صاحب نے مشورہ دیا کہ ہمیں ریسپشن پر ہی چلنا چاہیے تاکہ وہاں سے استنبول کے قابلِ دید مقامات کے بارے میں معلومات حاصل کرلیں۔"

خان صاحب نے کہا۔ "بٹ صاحب بہانہ بنانے کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہے جو غالباً آپ کے پاس نہیں ہے۔ جب مرزا اشرف جیسا گائیڈ ہمارے ساتھ ہے تو پھر ہوٹل والوں سے دریافت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

بٹ صاحب چپ ہوگئے۔

ہم بڑی بی کے پاس گئے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ استقبالیہ انداز میں مسکرائیں اور پھر بولیں۔ "یس پلیز!"

ہم نے اپنے کمروں کے نمبر بتا کر چابیوں کا مطالبہ کیا۔

انہوں نے چابیاں ہمارے حوالے کیں اور مسکرا کر کہا "تھینک یو پلیز۔"

جواب میں ہم نے بھی ان کو تھینک یو پلیز کہہ کر شب بخیر کا اضافہ کردیا... اور اپنے اپنے کمروں کی طرف چل پڑے۔ بٹ صاحب کا تقاضا تھا کہ کچھ دیر ان کے کمرے میں بیٹھ کر گپ شپ کریں اور کل کا پروگرام بھی بنالیں لیکن ہم سب تھکے ہوئے تھے۔ خان صاحب نے اضافہ کیا "پروگرام کل صبح بنالیں گے۔"

بٹ صاحب نے صبر کا مظاہرہ کیا اور "خدا حافظ" کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

اگلے دن ہم لوگ ناشتا کر کے تیار ہوئے اور لاؤنج میں جا کر بیٹھ گئے۔ لاؤنج میں بیٹھنے کا مشورہ بٹ صاحب کا تھا۔ وہاں بیٹھ کر انہیں "لاحول" پڑھنے کا موقع مل سکتا تھا۔

لاؤنج میں گئے تو حسبِ معمول آنے جانے والے مسافروں کی قطاریں بنی ہوئی تھیں۔ چابیاں دینے گئے تو وہاں بڑی بی کی جگہ ایک نوجوان خاتون بیٹھی نظر آئیں۔ بٹ صاحب کے ساتھ ہم سب بھی حیران ہوئے۔

بٹ صاحب نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ شب بھر میں کیا ماجرا ہوگیا
کہ جنگل کا جنگل ہرا ہوگیا"

بہرحال ان خاتون کے حوالے اپنی چابیاں کیں تو انہوں نے صرف تھنک یو ہی نہیں کہا بلکہ انگریزی میں کہا "ہیوائے گڈ ٹائم۔"

بٹ صاحب نے بھی انگریزی میں ان سے مزید باتیں کرنی چاہیں مگر ہم انہیں پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔

کچھ دیر بعد مرزا اشرف نمودار ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک ترک نوجوان بھی تھا۔

خان صاحب نے تبصرہ کیا "آج تو یہ اپنے ساتھ اپنے اسسٹنٹ کو بھی لے کر آئے ہیں۔"

مرزا اشرف نے علیک سلیک کے بعد نوجوان کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ سلیم آغلو ہیں۔ میرے پڑوس میں رہتے ہیں۔ انہیں آپ پاکستانیوں کو دیکھنے اور آپ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔" مرزا صاحب نے بتایا کہ استنبول ہی میں پیدا ہوئے اور استنبول سے کبھی باہر نہیں گئے۔ انگریزی میں انہوں نے ہم سب کو خوش آمدید بھی کہا اور بولے۔ "آج کا دن تو بہت اچھا ہے۔ مجھے ایک ہی وقت میں چار پاکستانیوں سے ملنے کا موقع ملا ہے مجھے بہت خوشی ہورہی ہے۔ آپ لوگ ہمارے مسلمان بھائی اور پردیسی ہیں اس لیے میں بہت خوش نصیب ہوں اور چاہتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ ... وقت آپ کے ساتھ گزاروں۔"

خان صاحب نے کہا۔ "کیا آپ کو کوئی اور کام نہیں ہے؟"

"جی میں ایک کمپنی میں ملازم ہوں مگر میں ان سے ایک دن کی چھٹی لے سکتا ہوں۔"

"ہمیں آپ کے ساتھ گھومتے ہوئے بہت خوشی ہوگی۔" بٹ صاحب بولے۔

خان صاحب نے آہستہ سے اردو میں کہا۔ "گھومنے سے آپ کا کیا مطلب ہے، یہ کہیں کہ استنبول کی سیر کرنے میں آپ کا ساتھ خوشی کا باعث ہوگا۔"

بٹ صاحب نے بھی اردو میں کہا۔ "زبان کی غلطیاں نکالنے کی کیا ضرورت ہے۔ بھئی ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق بات کرتا ہے۔"

آغلو صاحب اس دوران میں خاموش کھڑے رہے۔

"آپ کافی پینا پسند کریں گے؟"

"جی شکریہ۔ آپ کو بہت سی جگہیں دیکھنی ہیں اور وقت کم ہے۔"

مرزا اشرف نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

ہم لوگ ہوٹل سے نکل کر ٹیکسی کو بلانے والے تھے کہ آغلو [illegible] "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنی کار لے کر آیا ہوں۔ ویسے بھی یہاں ایک ٹیکسی میں چار سے زیادہ افراد کے بیٹھنے کی پابندی ہے۔ اس خیال سے میں اپنی [illegible] آیا ہوں۔"

ان کی کار کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ یہ سبز رنگ کی کار تھی۔

اوغلو نے کہا۔ "ہرا رنگ پاکستان کے جھنڈے میں بھی شامل ہے۔ اسی لیے میں نے یہ رنگ پسند کیا ہے۔"

ہم ان کی پاکستان سے محبت پہ حیران رہ گئے۔

کار کے پاس پہنچنے سے پہلے بٹ صاحب نے کہا۔ "پوچھ لو کہ ان کے پاس لائسنس بھی ہے یا نہیں؟"

"فضول، جاہلوں جیسی باتیں نہ کرو۔ یہاں لائسنس کے بغیر کوئی کار نہیں چلا سکتا اور لائسنس بھی بہت سے ٹیسٹ لینے کے بعد ہی ملتا ہے۔ تمہاری طرح نہیں کہ بالکل اناڑی ہو مگر رشوت دے کر گھر بیٹھے لائسنس بنوالیا۔"

خان صاحب برہم ہوگئے تھے مگر بٹ صاحب پر کوئی اثر نہ ہوا۔

"بھائی رشوت دے کر نہیں ایک جاننے والے کی سفارش سے بنوایا ہے۔"

مرزا اشرف نے کہا۔ "اگر آپ لوگوں کی محبت بھری گفتگو ختم ہوگئی ہو تو چلنے کا پروگرام بنائیں ورنہ اس بحث میں تو یہاں فٹ پاتھ پر ہی رات ہوجائے گی۔"

مرزا اشرف نے اوغلو صاحب کو مطلع کیا۔ "بس اب چلتے ہیں مگر جائیں گے کہاں؟ پروگرام کیا ہے؟"

اس نے کہا.... "پہلے تو میں انہیں استنبول کی مشہور سڑکوں کی سیر کراؤں گا پہلے اسپائس بازار چلیں۔"

مرزا صاحب نے اس کو بتایا کہ ہم وہاں ہو آئے ہیں۔

"کیا سارے بازار میں شروع سے آخر تک گھومے ہیں۔"

مرزا نے کہا۔ "اس پورے بازار میں گھومنے کے لیے ایک دن کیا کئی دن لگ سکتے ہیں۔"

مرزا صاحب اس تمام گفتگو سے ہمیں آگاہ کرتے جارہے تھے۔ مرزا صاحب نے اس کو یہ بھی بتادیا کہ ہم ٹوپ کوپی پیلس، ایا صوفیہ اور نیلی مسجد بھی دیکھ چکے ہیں۔

اوغلو نے کہا۔ "آپ مسجد کے اندر بھی گئے ہیں؟"

"جی ہاں۔ اور انہوں نے تو وہاں نماز بھی پڑھی تھی۔" انہوں نے بٹ صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ماشاءاللہ!" اوغلو خوش ہوگیا۔ "اچھا ہم سڑکوں کا چکر لگاتے ہیں۔ اور مختلف طرزِ تعمیر کی خوبصورت عمارتیں دیکھتے ہیں۔"

کار چل پڑی۔ وہاں سڑکوں پر کوئی پیدل نہیں چلتا۔

اس کے لیے چوڑے چوڑے فٹ پاتھ بنے ہوئے ہیں جن پر لوگ باتیں کرتے یا اپنی دھن میں مگن چلے جارہے تھے۔ لڑکیاں ہنستی بولتی جینز اور بلاؤز میں ملبوس گزرتی ہوئی دیکھیں تو بٹ خوش ہوگئے۔ بعض نوجوان اور بوڑھے جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈالے ہنستے اور باتیں کرتے ہوئے جارہے تھے۔

اوغلو نے ہم سب کو مطلع کیا۔ ”یہ تو آپ کو کسی نے بتایا ہی ہوگا کہ استنبول تین ہزار سال پرانا شہر ہے۔“

بٹ صاحب بولے۔ ”گپ لگارہا ہے۔ ہمارے ہاں تو تین ہزار سال پرانے شہر کھنڈر بن گئے ہیں یا پھر صفحہ ہستی سے ہی مٹ گئے ہیں۔ موہن جوداڑو کو دیکھ لو۔“

ہم نے بتایا ”موہن جوداڑو تین ہزار سال پرانا نہیں پانچ ہزار سال پرانا ہے۔“

”اسی لیے تو یہ حالت ہوگئی ہے اس کی۔“

اوغلو کو ہماری باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں اس لیے وہ بدستور ہماری اطلاعات میں اضافہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

استنبول اس لیے بھی ایک یادگار شہر ہے کہ یہاں تین قوموں نے حکومت کی ہے اور اپنی طرزِ تعمیر کے آثار چھوڑے ہیں۔ اس شہر میں آپ کو رومی، بازنطینی، اور عثمانی حکومت کے دور کی عمارتیں نظر آتی ہیں جنہیں اتنی اچھی حالت میں رکھا گیا ہے جیسے کہ ابھی ابھی تعمیر کی گئی ہیں۔ ترک ہماری طرح ماضی کی یادگاروں کو کھنڈر اور ملبے کا ڈھیر نہیں بناتے۔ وہ ان کو اپنا فخر سمجھتے ہیں اور انہیں بڑے لاڈ اور پیار سے سنبھال کر رکھتے ہیں جیسے وہ ان کے قیمتی خزانے ہوں۔ اس زمانے کی ہر چیز کو وہ بہت عزیز رکھتے ہیں حالانکہ دوسرے ملکوں میں یہ قیمتی یادگاریں نہیں صرف ان کی نشانیاں باقی رہ گئی ہیں۔ ہپوڈوم 203 عیسوی بنایا گیا تھا۔ ایا صوفیہ 325 عیسوی میں تعمیر کی گئی تھی۔ ٹوپ کوپی بھی جو کہ اب دنیا کا انوکھا اور عظیم ترین میوزیم بن چکا ہے لیکن کسی جگہ سے بھی دیکھیے آپ کو یوں لگے گا جیسے یہ سب کچھ حالیہ دور میں تعمیر کیا گیا۔

قسطنطنیہ میں نئی اور خوبصورت عمارتیں اور دکانیں بھی ہیں جنہیں دیکھ کر آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں لیکن ان کی دلکشی پرانی عمارتوں کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ اوغلو گزرتے ہوئے ان عمارتوں اور مخصوص سڑکوں کے بارے میں ہمیں بتاتے جارہے تھے، اس طرح کہ وہ ترکی میں کمنٹری کررہے تھے اور مرزا صاحب ہمیں اردو میں ان باتوں کا ترجمہ کرکے بتارہے تھے۔ یہ تو آپ کو بتایا جاچکا ہے کہ عیسائی دورِ حکومت میں یہ گرجا تھا لیکن ترکوں نے اس شہر کو فتح کرنے کے بعد اس کو مسجد نہیں بنایا بلکہ ایک میوزیم بنادیا تاکہ ساری دنیا کے لوگ اس خوبصورت عمارت کو دیکھ کر لطف اندوز ہوسکیں۔ اس عمارت کو اندر سے دیکھ کر ہی اس کے حسن و جمال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یوں تو مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے ملکوں خصوصاً مصر، اردن، شام اور عراق میں بھی پرانی تاریخی یادگاریں نظر آتی ہیں لیکن انہیں اس طرح سنبھال کر نہیں رکھا گیا جس طرح ترکوں نے اپنی پرانی یادگاروں کو رکھا۔

بٹ صاحب پوچھ رہے تھے کہ اس کا نام ایا صوفیہ کیوں رکھا گیا ہے۔ نام سے تو یوں لگتا ہے جیسے کسی عورت کے نام پر یہ نام رکھا گیا۔

ایا صوفیہ بازنطینی دورِ حکومت میں ملک کا سب سے بڑا گرجا گھر تھا اور اس کو بہت مقدس اور متبرک خیال کیا جاتا تھا۔ سلطان احمد کی بنائی ہوئی نیلی مسجد جو چار سو سال قبل تعمیر کی گئی تھی آج بھی اپنی دلکشی کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔

اوغلو کے سوال کے جواب میں ہم نے کہہ تو دیا کہ ہاں، ہم نے یہ مسجد دیکھی ہے لیکن اوغلو کا کہنا تھا کہ جب میں آپ کو وہاں لے جاؤں گا اس وقت آپ پر اس عمارت کی خوبیوں کا علم ہوسکے گا۔

بٹ صاحب نے مرزا مشرف سے پوچھا۔ ”کیا یہ ہمیں مسجد کو دیکھنے کے لیے کسی خاص قسم کی عینکیں دے گا جس طرح تھری ڈی فلمیں دیکھنے کے لیے خاص قسم کی عینکیں دی جاتی ہیں۔“

مرزا صاحب اس بچکانہ سوال پر مسکرائے اور کہا کہ بٹ صاحب یہ شخص اس شہر میں پیدا ہوا ہے اور اس کے بارے میں ایک عام ترک بھی زیادہ جانتا ہے۔ یہ اس کا شوق اور مشغلہ بھی ہے۔ ”یہ تقسیم چوک ہے۔“ اوغلو نے ہمیں اطلاع دی۔ بہت صاف ستھرا اور وسیع چوک ہے۔ اس کے اطراف میں خوبصورت جدید اور پرانی طرز کی دکانیں ہیں۔ شیورما اور ڈونر کباب ہمارے بہت پسندیدہ کھانے ہیں۔ یہاں اس کی خوشبو اور مہک فضا میں پھیلی ہوئی ہے اور اس کی خوشبو سونگھ کر ہی بھوک لگنے لگتی ہے۔ یہ خاصا وسیع اور پختہ فرش کا چوک ہے جس پر کاروں کی آمدورفت پر پابندی ہے اور یہ صرف پیدل گھومنے والوں کے لیے وقف ہے لیکن درمیان میں بسوں کا ایک بہت بڑا سا اسٹاپ ہے۔ استنبول کی سڑکوں پر ہم نے پولیس والے بہت کم دیکھے۔ وہ گشت کرتے ہوئے نظر نہیں آتے البتہ تقسیم چوک کے ایک کونے میں ہم نے ایک پولیس کار کھڑی دیکھی، اس میں دو پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے ہمارے پولیس والوں کی طرح۔ ترکی اور یورپ کے دوسرے شہروں کے پولیس والے ہمارے سپاہیوں کی طرح مریل، تھکے ہوئے اور میلی یونیفارم پہنے نظر نہیں آتے۔ وہ بہت اسمارٹ ہوتے ہیں۔ گرمی میں ان کا لباس نیلی پتلون اور سفید قمیص پر مشتمل ہوتا ہے۔ سردی میں ایک بہت اچھا اوورکوٹ ان کے جسم پر خوب بجتا ہے۔ غنیمت ہے کہ جب سے لاہور میں وارڈنز نے پولیس کے سپاہیوں کی جگہ لی ہے ان کی نیلی وردیاں اور نوجوان شگفتہ چہرے دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ یہ تعلیم یافتہ اسمارٹ اور خوش اخلاق ہوتے ہیں لیکن اب ان کے طور طریقوں اور رویوں میں بھی تبدیلی نظر آنے لگی ہے وجہ وہی احتساب نہ ہونا اور جواب طلبی کی کمی ہے۔

لندن میں تو بوبی (پولیس والوں کو وہاں بوبی کہا جاتا ہے) دن کے وقت بھی فٹ پاتھوں پر گشت کرتے ہوئے یا ایک طرف سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑے نظر آتے ہیں لیکن ان کی نظریں ہر طرف کا جائزہ لیتی رہتی ہیں۔ یہ بہت ہمدرد اور خوش اخلاق ہوتے ہیں۔ آپ ان سے کسی جگہ کا پتا پوچھیں تو وہ جیب سے لندن کا نقشہ نکال کر آپ کو فوراً بتادیں گے۔ راستہ دریافت کریں تو وہ اس طرح سمجھائیں گے کہ کندذہن لوگ بھی سمجھ لیتے ہیں۔ یہ ہر وقت مسکراتے رہتے ہیں۔ لندن کے لوگ ”بوبی“ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ کرسمس کے موقع پر بچے، جوان اور بوڑھے ان کے لیے تحائف کے ڈھیر لگادیتے ہیں۔ ہر ”بوبی“ کی ڈیوٹی عموماً کسی رہائش کے علاقے میں ہوتی ہے۔ اس کا یہ فائدہ ہے کہ وہ علاقے کے سب لوگوں کو جانتے ہیں۔

استنبول میں ہمیں پولیس والے خال خال ہی نظر آئے۔ پیدل پولیس والا تو ہم نے دیکھا ہی نہیں۔ عموماً یہ پولیس کار میں ہی نظر آتے ہیں۔ پولیس کے ہر جگہ تعینات نہ ہونے کے باوجود ان کی ہر ایک پر نظر ہوتی ہے۔ ایک بار ہم اپنے ہوٹل سے دور کسی علاقے میں فلم دیکھنے کے بعد ڈونر کباب کھانے گئے۔ اس وقت کھانے پینے کی اشیا کے سوا تمام دکانیں بند ہوتی ہیں۔ صرف کھانے پینے کے ریسٹورانوں میں ہی رونق نظر آتی ہے۔

میزان

ایک اصطلاح جو اسلام میں روزِ محشر اعمال کی جانچ کے بارے میں استعمال ہوتی ہے۔ وہ پیمانے جن پر اعمالِ انسان کو تولا جائے گا اور اس کے مطابق لوگوں کو جزا و سزا دی جائے گی۔ مفسرین اس بارے میں اختلافی رائے دیتے ہیں، یعنی آیا کہ واقعی ترازو گی ہے یا یہ محض استعارتاً استعمال ہوا ہے اور اس کا مفہوم جانچ ہے۔ سورۃ الانبیاء ، 47 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو کھڑی کریں گے، تو کسی شخص کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔ اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی (کسی کا عمل) ہوگا، تو ہم اس کو وہ موجود کریں گے اور ہم حساب کرنے کو کافی ہیں۔“ عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک بار حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ یوم القیامت کو تمام انسانوں کی موجودگی میں مسلمانوں کے سامنے امین 90 بھاری کتب لائے گا۔ ہر کتاب اتنی طویل ہوگی کہ حدِ نظر تک نظر آنے گی۔ پھر خدا کہے گا، کیا تم ان میں کسی بات سے انکار کرتے ہو۔ کیا میری طرف سے لکھنے والوں نے تمہیں نقصان پہنچایا؟ مسلمان جواب دے گا: ”اے میرے خدا، میں ان میں کسی بات سے انکار نہیں کرتا، تو خدا پوچھے گا، کیا تمہیں کوئی شکایت ہے، تو وہ کہے گا: نہیں میرے رب، خدا جواب دے گا کہ میرے پاس تمہارے لیے نیک چیزیں ہیں اور اس دن کوئی امتحان نہیں ہوگا۔ اس کے بعد خدا اپنے سامنے کاغذ کا ایک ٹکڑا لائے گا، جس پر لکھا ہوگا: میں گواہی دیتا ہوں کہ دنیا میں تیرے سوا کوئی رب نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ تیرے بندے اور رسول ہیں۔ پھر خدا کہے گا، جاؤ اپنے اعمال تولو، انسان جواب دے گا کہ اتنی بڑی نوے کتابوں کے سامنے اس کی کیا وقعت ہے۔ پھر خدا کہے گا، یہ بھاری ہے، اسے تولو، پھر کتابیں اور پرچہ دو اطراف میں میزان کے ڈالے جائیں گے، اور کتابیں ہلکی ہوں گی۔ مفسر کہتے ہیں کہ میزان جبرئیلؑ تھامے ہوگا، اور یہ بہت بڑی ہوگی۔ اس کا ایک پلڑا جنت پر اور دوسرا جہنم پر ہوگا۔ جس کے اچھے اعمال بھاری ہوں گے، وہ بچالیا جائے گا، اور برے اعمال والا سزاوار ہوگا۔

مرسلہ: نیاز احمد، ملتان

ہم نے کبابوں کا آرڈر دیا۔فوراً ہی ایک اسمارٹ، خوش پوش نوجوان ہماری میز پر مکھن اور ترکش نان کے کٹے ہوئے ٹکڑے رکھ گیا۔ان کے لیے اضافی رقم چارج نہیں کی جاتی۔ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ آپ کے کھانے تیار ہونے تک روٹی اور مکھن سے دل بہلاتے رہیں، یہ روٹی کے خوبصورتی سے کٹے ہوئے ٹکڑے ایک چھوٹی سی ٹوکری میں رکھے ہوتے ہیں۔ مکھن لگا کر کھاؤ تو بہت ہی لذیذ ہوتے ہیں۔شروع شروع میں بٹ صاحب کو یہ معلوم ہی نہ ہوا کہ یہ محض وقت پاس کرنے کے لیے رکھی گئی ہے۔ انہوں نے کچھ ہی دیر میں روٹی کی ساری ٹوکری ختم کردی۔ ہم نے کہا''بٹ صاحب، آپ تو ساری روٹی کھا گئے۔''

بولے''بہت ہی مزیدار تھی۔''

''تو پھر آپ کھانا کیسے کھائیں گے؟''

''کیا مطلب! بھئی اس طرح کھائیں گے جیسے سب کھاتے ہیں۔''

خان صاحب نے کہا۔''بٹ صاحب، ان کا مطلب یہ ہے کہ جب روٹی سے ہی آپ نے اپنا پیٹ بھرلیا تو کباب کیسے کھائیں گے؟''

بولے''کون کہتا ہے کہ میں نے پیٹ بھرلیا ہے۔ ابھی تو میں روٹی کی چار ٹوکریاں اور کھا سکتا ہوں۔''

''اور کباب کون کھائے گا۔''

''وہ بھی میں ہی کھاؤں گا۔ یار تم نے سنا نہیں کہ اللہ میاں نے پیٹ میں ہر چیز کا خانہ الگ رکھا ہے۔ اگر روٹی والا خانہ بھر گیا تو کیا ہوا۔ باقی سب خانے تو خالی ہیں۔''

خان صاحب نے کہا''بٹ صاحب آپ کی اس خوبی کا پہلی بار علم ہوا۔ آپ تو بلانوش ہیں۔''

اتنی دیر میں کباب بھی آگئے۔ کبابوں کا انداز یہ ہے کہ ایک پلیٹ میں پوری روٹی رکھی ہوتی ہے۔ اس پر کباب رکھے جاتے ہیں۔ دراصل یہ روٹی کبابوں کے ساتھ کھانے کے لیے ہوتی ہے۔ پہلے ٹوکری میں جو روٹی کے ٹکڑے پیش کیے جاتے ہیں وہ محض چکھنے کے لیے ہوتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ آپ کبابوں کے انتظار میں بیٹھے بور نہ ہوجائیں۔

اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ یہ کوئی بڑی شاہراہ نہیں تھی۔ اس کے باوجود ساری سڑک روشنی سے جگمگا رہی تھی۔ ہم جس کھلے ریستوران میں بیٹھے تھے اس کے آس پاس کی تمام دکانیں بند تھیں۔ سڑک بالکل سنسان پڑی تھی۔ ٹریفک بھی نہیں تھا۔

ہم لوگوں نے کباب کھانے شروع کیے۔ کچھ دیر بعد دیکھا کہ سائیڈ والی سڑک سے ایک پولیس کار بہت کم رفتار سے چلتی ہوئی ہماری سڑک پر داخل ہوئی۔ اس میں دو اسمارٹ پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے جو عقابی نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لے رہے تھے۔ نہایت کم رفتار سے رینگتی ہوئی یہ کار ہمارے سامنے سے گزر کر بائیں جانب چلی گئی۔

بٹ صاحب بولے۔''یار ان پولیس والوں کو رات کے دو بجے بھی چین نہیں ہے۔''

خان صاحب بولے''بٹ صاحب یہ ان کی ڈیوٹی ہے۔''

''ڈیوٹی تو ہمارے پولیس والوں کی بھی ہوتی ہے مگر وہ اپنی دلچسپیوں میں مصروف ہوتے ہیں اس لیے سڑکوں پر رات کے وقت کار میں گشت کرتے نظر نہیں آتے۔''

چند منٹ بعد کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی۔ یہ کسی کے قدموں اور جوتوں کی آواز تھی۔ اسی سڑک پر دائیں جانب سے ایک نوجوان تنہا لڑکی جینز اور قمیص پہنے ہوئے چلی آرہی تھی۔ یہ اس کی جوتی کی ایڑیوں کی آواز تھی۔

لڑکی خاموشی سے چلتی ہوئی ہمارے سامنے سے گزر گئی۔

ہم لوگ حیران ہوکر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ آخر خان صاحب سے نہ رہا گیا۔''بھئی کمال ہے! ایک تنہا خوبصورت لڑکی رات کو دو بجے مزے سے اکیلی سڑک پر چل پڑی۔''

''اس لیے کہ اسے اپنے تحفظ کا یقین ہے۔''

''مگر یار پھر بھی ذرا سوچو، کتنی ہمت والی بہادر لڑکی ہے۔''

لڑکی کے جوتوں کی آواز معدوم ہوگئی۔ خدا جانے کہاں سے آئی تھی اور کہاں جارہی تھی۔

ابھی چند ہی منٹ گزرے تھے کہ ایک دوسری سائیڈ روڈ سے ایک پولیس کار آہستگی سے رینگتی ہوئی نمودار ہوئی اور چیونٹی کی چال سے چلتی ہوئی ہمارے سامنے سے گزر گئی۔

ہم نے کہا۔''دیکھا آپ نے وہ لڑکی اکیلی اتنی رات گئے کیوں پیدل جارہی تھی؟ اس لیے کہ اسے کسی قسم کا خوف نہیں ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اس کے محافظ ہر جگہ موجود ہیں۔''

استنبول کا یہ واقعہ ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا۔ وہاں پولیس ہر جگہ نظر نہیں آتی لیکن ضرورت کے وقت الہ دین کے جن کی

طرح اچانک نمودار ہوجاتے ہیں۔ آپ رات گئے سنسان سڑک پر کار میں جارہے ہیں۔ دور دور تک کوئی کار یا پیدل راہ گیر نظر نہیں آرہا۔ نہ کوئی ٹریفک ہے۔ آپ نے پاکستانیوں کی عادت کے مطابق موقع پاکر سرخ سگنل کی خلاف ورزی کردی اور بہت خوش ہوئے کہ کسی نے آپ کو ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ لیکن اچانک کسی درخت کے سائے میں کھڑی ہوئی ایک پولیس کار جو آپ نہیں دیکھ سکے تھے نکل کر آئی اور سرخ بتی جلاتی ہوئی آپ کی کار کی طرف بڑھی۔ آپ نے اپنی کار روک دی۔ پولیس کار سے ایک پولیس والا نکل کر آیا۔

کھڑکی کے پاس آکر بہت اخلاق کے ساتھ گڈ ایوننگ کہا اور پوچھا''سر آپ کو معلوم ہے کہ آپ نے ریڈ سگنل کی خلاف ورزی کی ہے؟''

''جی ہاں۔ مگر وہاں تو کوئی ٹریفک نہیں تھا۔''

''پھر بھی ریڈ سگنل تو تھا۔ میں آپ کا لائسنس دیکھ سکتا ہوں؟''

لائسنس دیکھنے کے بعد وہ مسکرایا اور بولا۔''آیندہ خیال رکھیے گا۔ ٹریفک کے قواعد کی پابندی ہر ایک شہری کا فرض ہے۔'' لائسنس واپس دیتے ہوئے اس نے مسکرا کر''گڈ نائٹ'' کہا اور اپنی پولیس کار کی طرف چلا گیا۔

یا اللہ کیا کبھی ہمارے ملک میں بھی ایسے پولیس والے ہوں گے جو ہم جیسے بے پروا اور غیر ذمے دار شہریوں کو قانون کا پابند بنائیں گے؟

اوغلو کی کار میں استنبول کی سیر کرتے ہوئے پولیس اور ٹریفک کے نظام کا تذکرہ درمیان میں آگیا۔ آئیے دوبارہ اوغلو صاحب کے ساتھ چلتے ہیں...... انہیں شاید یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ استنبول کی تاریخی یادگاروں کو ہم دیکھ چکے ہیں اسی لیے وہ کار چلاتے ہوئے ٹیپ ریکارڈ کی طرح مسلسل بول رہے تھے۔ ہمارے پلے تو کچھ نہیں پڑا لیکن مرزا اشرف ہمیں صرف وہ باتیں بتاتے رہے جن سے ہم ناواقف تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ہر جگہ صاف شفاف تھی۔ دکانداروں نے اپنی دکانوں میں خوبصورت ٹائیلز لگائے تھے۔ ان کی دکانوں کے سامنے والے حصے ٹائیلوں سے سجے ہوئے ہیں۔ دکاندار خوش پوش اور خوش اخلاق ہیں۔ وہ خریدار کو مسکرا کر خوش آمدید کہتے ہیں اور اپنی دکان میں موجود تمام اشیا خریدار کی فرمائش پر اس کے سامنے پیش کردی جاتی ہیں۔ اگر آپ کو کچھ پسند نہ آئے اور آپ خریداری کیے بغیر دکان سے رخصت ہوں تو بھی دکاندار مسکرا کر آپ کو اللہ حافظ کہتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ امید ہے کہ آپ آیندہ بھی تشریف لائیں گے۔ اس کے برعکس ہمارے ملک میں دکاندار کا رویہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اول تو وہ خریدار کو آتے ہوئے دیکھ کر بھی اپنی جگہ سے نہیں اٹھتا بلکہ سیلز مین کو اشارہ کردیتا ہے کہ بھئی تم ہی ان سے نمٹ لو۔

سیلز مین آپ کی فرمائش پر سامان دکھا تو دیتا ہے لیکن چہرے پر بیزاری کے آثار صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ اگر چند چیزیں دیکھنے کے بعد آپ کچھ خریدے بغیر جائیں تو سیلز مین بہت غصے سے آپ کو دیکھتا ہے اور شاید دل ہی دل میں خریدار کو برا بھلا بھی کہتا ہوگا

ٹوپ کوپی۔ گرینڈ بازار، ایا صوفیہ، سلطان احمد مسجد ہم دیکھ چکے تھے لیکن اوغلو صاحب نے باہر سے ان کا بھی نظارہ کرادیا اور ان کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کیں۔ انہیں روکنے اور ٹوکنے کی نوبت نہیں آئی کیونکہ وہ مسلسل بولے جارہے تھے۔ نہ کہیں وقفہ، نہ کوما، نہ فل اسٹاپ۔ اس لیے ہم لوگ صبر و تحمل کے ساتھ بیٹھے ان کی کمنٹری سنتے رہے۔

ایک جگہ انہوں نے اچانک کار روک دی۔ ہم نے چاروں طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ اوغلو صاحب ہمیں مختلف جگہوں سے گھماتے ہوئے تقسیم چوک پہنچ گئے تھے۔ شکر ہے کہ یہاں اوغلو صاحب کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئے۔ شاید وہ تھک گئے تھے، یا پھر ہم لوگوں کے کانوں کو آرام دینا چاہتے تھے۔

ہم نے کہا۔''بھئی یہ اوغلو صاحب بھی آٹو میٹک مشین کی طرح جب اسٹارٹ ہوتے ہیں تو بند ہونے کا نام نہیں لیتے۔''

مرزا اشرف بولے۔''ایک تو وہ بے چارہ سارے کام چھوڑ کر ہمیں اپنی کار میں سارا استنبول دکھا رہا ہے اور آپ شکر گزار ہونے کی بجائے شکایت کر رہے ہیں۔''

ہم نے کہا۔''بھائی ہم شکایت نہیں کر رہے۔ اس بات کا شکوہ کر رہے ہیں کہ وہ دوسروں کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔ پہلے وہ بولتے ہیں پھر آپ اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد پھر وہ بولنا شروع کرتے ہیں اور آپ ترجمہ شروع کردیتے ہیں۔ ہمارے کانوں کو تو آرام ہی نہیں ملتا۔''

اوغلو صاحب پھر ترکی زبان میں شروع ہو گئے۔
دراصل وہ یہ کہہ رہے تھے کہ یہاں سے سات سڑکیں سات مختلف سمتوں میں جاتی ہیں۔ آپ کس سڑک پر جانا پسند کریں گے؟
بٹ صاحب چپ نہ رہ سکے۔ بولے۔ "یار یہ اوغلو بھی عجب آدمی ہے۔ بھئی ہمیں کیا خبر کہ کون سی سڑک کہاں جاتی ہے اور ہمیں کہاں جانا چاہیے۔"
مرزا صاحب نے اوغلو صاحب سے کہا۔ "یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ہم تو کچھ جانتے نہیں آپ جہاں مناسب سمجھیں ہمیں لے جائیں۔"
یہ سن کر اوغلو صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ وہ کار کے اسٹیرنگ پر انگلیاں مارتے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے۔
خان صاحب نے پوچھا۔ "کیا ہوا اپنے اسٹیرنگ سے مشورہ لے رہے ہیں؟"
"نہیں بھئی، یہ سوچ رہے ہیں، یہ جب سوچتے ہیں تو کسی بھی چیز پر انگلیاں مارنے لگتے ہیں۔"
بٹ صاحب بولے۔ "مطلب یہ کہ ان کا دماغ ان کی انگلیوں میں ہے۔ فرض کیجیے کہ اگر کوئی انہیں انگلیاں استعمال کرنے سے روک دے تو کیا کریں گے؟"
"اللہ جانتا ہے۔ میں ایسے مشکل سوالات کا جواب نہیں دے سکتا۔" مرزا اشرف تنگ آ کر بولے۔ "کچھ دیر خاموش رہو۔ یہ شخص ضرور کوئی اچھی بات ہی سوچے گا۔"
بٹ صاحب نے کہا۔ "ہمیں تو خوشی اس بات کی ہے کہ اتنی دیر یہ چپ رہیں گے۔"
اچانک اوغلو صاحب کی انگلیاں چلنی بند ہو گئیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے کچھ سوچ لیا ہے۔
"کیا سوچ لیا ہے؟" ہم سب نے بے چینی سے پوچھا۔
مرزا صاحب کے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ اب ہم لوگ "استقلال کیڈیسی اسٹریٹ چل رہے ہیں۔"
"وہ کیا جگہ ہے؟"
"اس کو انڈی پنڈنٹ ایونیو کہتے ہیں۔ یہ انوکھا بازار ہے مگر ہمیں پیدل چلنا ہوگا۔"
"کیوں؟ کیا آگے خندق یا کھائی ہے۔"
"نہیں بھئی، یہ صرف پیدل چلنے والوں کی سڑک ہے۔ ٹریفک کے لیے یہ بند ہے۔"

"تو پھر یہ اپنی کار کیا ہمارے سروں پر رکھ کر لے جائیں گے۔"
"ارے بھئی پارکنگ کس لیے ہوتی ہے۔ گاڑی کو وہاں پارک کر کے ہم لوگ پیدل ہی جائیں گے۔"
اوغلو صاحب کار پارکنگ میں کار کھڑی کر کے واپس آئے تو ہانپ رہے تھے۔
بٹ صاحب نے پوچھا۔ "کیا پارکنگ بہت دور ہے اور یہ بھاگتے ہوئے آئے ہیں؟"
"نہیں، یہ جب ایکسائٹڈ ہوتے ہیں تو اسی طرح ہانپنے لگتے ہیں۔"
بٹ صاحب نے ہمارے کان میں کہا۔ "انہیں کسی دن دل کا دورہ ہی نہ پڑ جائے ایکسائٹ منٹ کی وجہ سے۔"
اوغلو صاحب ہمارے آگے آگے اور ہم ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ اسٹریٹ کے نزدیک پہنچے تو قسم قسم کی خوشبوؤں نے ہمارا استقبال کیا۔ کہیں مونگ پھلی کی قسم کے دانے بھونے جا رہے ہیں۔ کہیں کبابوں کی خوشبو سے منہ میں پانی بھرا آ رہا ہے۔ ٹرکش میوزک کی آوازیں گونج رہی ہیں۔
انڈی پنڈنٹ ایونیو یا گلو کے علاقے میں واقع ہے۔ جیسے ہی سڑک میں داخل ہوئے تو ہاکرز اور سیلز مینوں کی آوازوں نے ہمیں گھیر لیا۔ مختلف ریستورانوں کے نمائندے سیاہ سوٹ اور سیاہ بو ٹائی لگائے آپ کو اپنے اپنے ریستوران میں آنے کی دعوت دے رہے تھے۔
"کم سر، کم! ہمارا بہترین کھانا ہے۔ تازہ مچھلی، تلی ہوئی، بھنی ہوئی، ابھی ابھی سمندر سے نکالی ہوئی، ایسی لذیذ مچھلی آپ کو کہیں اور نہیں ملے گی، یہ سب باتیں وہ ترکی اور انگریزی کی ملی جلی زبان میں کر رہے تھے کیونکہ انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم لوگ ترک نہیں، غیر ملکی ہیں۔ ہر سیلز مین کے ہاتھ میں مینو کارڈ بھی تھا۔
"ایک نظر مینو پر ڈالیے۔ پڑھ کر ہی دل خوش ہو جائے گا۔"
یہ تقریباً وہی منظر تھا جو ہم نے پیرس میں دیکھا تھا۔ یہاں ریستوران والے تھے تو وہاں نائٹ کلب والے اپنے اپنے کلب کی خوبیاں بیان کر رہے تھے اور اعلان کر رہے تھے کہ داخلہ فیس صرف دو ڈالر، وہ تو راہ گیروں کا ہاتھ بھی تھام لیتے تھے مگر یہاں کے سیلز مین مہذب تھے۔ صرف زبان ہی استعمال کر رہے تھے۔ رکیے جناب ذرا مینو پر ایک نظر تو ڈالیے۔"
ہم ان سب سے بچ کر پُرہجوم سڑک پر آگے بڑھ رہے تھے۔ ان صاحب نے بتایا کہ یہ استنبول کا ماڈرن حصہ ہے۔ کسی زمانے میں یہاں ٹرام بھی چلتی تھی، حکومت دوبارہ ٹرام چلانے والی ہے جو بالکل ماڈرن ٹرام ہوگی۔ اس کی ایک جھلک آپ آگے چل کر دیکھیں گے۔
اس سڑک پر خدا جانے کتنے ریستوران ہیں کیونکہ ہر قدم پر ایک کالے سوٹ والا سیلز مین مینو کارڈ ہاتھ میں تھامے آپ کو مینو پڑھانے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک تو پُرہجوم سڑک اس پر جگہ جگہ سیلز مین۔
خان صاحب بولے۔ "کتنا ہجوم ہے اس سڑک پر چلنا بھی مشکل ہے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔"
بٹ صاحب فوراً بول پڑے۔ "مگر میرا کھوا تو کسی کے کھوے سے نہیں چھوا۔"
"تم خود ہی کسی سے ٹکرا جاؤ۔ بلکہ ہر خاتون سے ضرور ٹکراؤ۔"
"پٹ جاؤ گے۔ یہ تمہیں مار کھانے کا بہت اچھا مشورہ دیا ہے خان صاحب نے۔"
"مار کھانے کی کیا بات ہے۔ بہانہ بنا دینا کہ تم اندھے ہو، اور یہ کالی عینک لگا لو۔ پھر کسی کو اعتراض بھی نہیں ہوگا۔"
"مگر تم نے یہ کالی عینک کیوں رکھ چھوڑی ہے۔"
"اسی لیے۔ ضرورت کے وقت کام آ جاتی ہے۔"
ہم نے کہا۔ "دیکھو بٹ صاحب، ایسی حماقت نہ کرنا خوامخواہ تماشا بن جائے گا۔"
"ارے یار میں پاگل تو نہیں ہوں۔ بس یوں ہی مذاق کر رہا تھا۔"
کچھ دور چل کر ہمیں ٹرام بھی نظر آ گئی۔ ابھی یہ ٹرائل کے طور پر ایک مختصر سے حصے میں چلائی گئی ہے۔ کچھ عرصے بعد سارے شہر میں یہ ٹرام نظر آئے گی۔ ہم نے دیکھا کہ یہ جدید ترین قسم کی خوبصورت ٹرام تھی جو ہم نے جنیوا میں بھی دیکھی تھی۔ بلکہ یہ اس سے بھی زیادہ خوبصورت تھی۔ لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے ٹرام وقتاً فوقتاً سیٹی بھی بجا رہی تھی۔ سڑک پر ایک عجیب منظر تھا۔ لوگوں کا ہجوم۔ ریستورانوں کے سیلز مینوں کی رکاوٹیں۔ سڑک کے ہجوم سے بچنے کے لیے اوغلو ہمیں ایک سائیڈ روڈ پر لے گئے تاکہ ہجوم اور کھانوں کی خوشبو سے محفوظ رہ سکیں۔ مختلف قسم کے کھانوں کی خوشبوؤں

دھوپ چھاؤں
خوابوں میں جب اچانک بن موسم پھول کھل جائے ...... اور کڑکتی دھوپ میں برسات ہو جائے تو اسے مقدر کی مہربانی کہتے ہیں ...... آخری صفحات پر **ڈاکٹر ساجد امجد** کے قلم کی پھوار
لذت آشنائی
مہاراجا رنجیت سنگھ ...... جس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی مگر اس نے جب عشق کیا تو ہر ایک وار کو دل پہ سہہ لیا ...... تاریخ کا ایک انوکھا کردار **الیاس سیتاپوری** کے قلم کی روانی
کشکول
قدم قدم پر خطرات سے کھیلتے ہوئے منزل مقصود کی جانب رواں دواں ......
انوار صدیقی کے قلم سے ایک پراسرار سلسلے کا احوال
تحفہ
عبد جاضر کی ستم ظریفیاں ...... رشتوں کے ایسے بندھن جو رفتہ رفتہ پیروں کی زنجیر بن کر مقید ہو جانے کا احساس دلاتے ہیں ...... محبوب قلم کار **طاہر جاوید مغل** کا دلچسپ انداز
ماروی
دلربا انداز، رنگین و سنگین لمحات اور حالات کی کشمکش کی روداد ......
محی الدین نواب کے قلم سے نئی طویل داستان کا آغاز
اس کے علاوہ
منظر امام، تنویر ریاض، امجد رئیس، سلیم انور کی تحاریر

میمونہؓ

نبی کریمؐ کی زوجہ محترمہ۔ آپ قبیلہ ہوازن کے الحارث کی صاحبزادی اور حضرت عباسؓ کے رشتے کی بہن تھیں۔ آپ اپنے شوہر ابورہم کی وفات کے بعد مکہ میں رہنے لگیں جہاں سرورِ مقبولؐ سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ رسول کریمؐ سے آپ کی شادی مکہ کے شمال مغربی گاؤں سیرف میں ہوئی، یہاں ولی کے طور پر آپ کے بھائی حضرت عباسؓ پیش ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ 500 درہم شادی کا تحفہ تھا۔ آپ نے 61ھ 681ء میں سیرف ہی میں انتقال فرمایا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کا مدفن عین اس جگہ ہے جہاں آپ کی شادی ہوئی۔

مرسلہ: نورین، کوٹ ادو

نے ہم سب کی اشتہا بڑھا دی تھی اس لیے سوچا کہ کہیں بیٹھ کر کھانا کھایا جائے۔ یہ سائیڈ روڈ زیادہ پُر رونق نہیں تھی نہ ہی نیون سائن کی جگمگاہٹ تھی۔

یہاں بھی ریسٹوران تھے مگر کم۔ ایک کالے سوٹ والا سیلز مین مینو کارڈ لے کر ہم لوگوں کی طرف بڑھا تو ہم خود ہی اس کے پاس پہنچ گئے۔ اس نے خوش ہوکر مینو کارڈ بٹ صاحب کی طرف بڑھایا۔

انہوں نے کارڈ لے کر بغور اس کا مطالعہ کیا پھر بولے۔ ''یہ تو ترکی زبان میں ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ کیا منگائیں یا الابلا کھائیں۔''

خان صاحب نے ان کے ہاتھ سے مینو لے کر اوغلو کے حوالے کردیا اور بٹ صاحب سے کہا۔

''بٹ صاحب، جب جانتے نہیں تو ہر کام میں ٹانگ کیوں اڑاتے ہو؟''

''میں نے تو ٹانگ نہیں اڑائی۔ اس نے خود ہی میرے ہاتھ میں مینو دے دیا۔''

''مگر تمہیں پڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''اگر نہ پڑھتا تو وہ مجھے ان پڑھ سمجھتا۔''

اس گلی نما سڑک کے ایک ٹرکش ریسٹوران میں داخل ہوکر ہم لوگ اطمینان سے صوفوں پر بیٹھے ہی تھے کہ اچانک بھیانک آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ ہم سب نے پریشان ہوکر ایک دوسرے کو دیکھا۔ اسی وقت ویٹر نمودار ہوا۔ اس نے ترکی میں کہا ''پریشانی کی بات نہیں ہے سر! یہاں ہی سمندر ہے جہاں سے جہاز گزرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ اونچی آواز میں ہارن بھی بجادیتے ہیں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اوغلو نے یہ تفصیل مرزا صاحب کو سنادی جنہوں نے ہم سب کو ترجمہ کرکے بتادیا۔

اب سوال یہ تھا کہ کھائیں کیا۔ مینو میں جو ترکی کھانے درج تھے ان میں سے بہت سے کھانوں کے بارے میں مرزا صاحب بھی نہیں جانتے تھے۔

''تو پھر آپ کھاتے کیا تھے؟''

''بس کباب، مختلف قسم کے کباب۔ کباب کھا کھا کر مجھے تو کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے میں بھی کباب بن گیا ہوں۔''

''اور میں اپنے آپ کو نان سمجھنے لگا ہوں۔ کیونکہ ہم نے بھی یہاں نان کباب کے سوا کچھ نہیں کھایا۔''

''ویسے ایک بات بتاؤں۔'' مرزا صاحب بولے۔ ''ترکی کھانے بہت مزیدار ہوتے ہیں، کچھ کھانے تو ہمارے پاکستانی کھانوں کی طرح ہوتے ہیں۔''

''تو پھر آپ نے کھائے کبھی نہیں؟''

''بس کیا بتاؤں، کبابوں کی ایسی عادت پڑگئی ہے کہ کچھ اور کھانے کو جی نہیں چاہتا۔''

ہم نے کہا۔ ''یہاں کباب بھی تو کتنی قسموں کے ہوتے ہیں۔ ڈونر کباب، غازی کباب......''

''بس بس۔ فہرست گنوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم خود بھی ڈونر کباب ہی کھاتے ہیں۔ عادت ہی پڑگئی ہے۔ ڈونر کے سوا کچھ اور اچھا ہی نہیں لگتا۔''

ہم سب نے ویٹر کو کھانے کا آرڈر دے دیا۔ ہمارے لیے ڈونر کباب، خان صاحب کے لیے اسکندر کباب، اوغلو صاحب کے لیے غازی کباب، مرزا مشرف سوچ میں پڑگئے۔ پھر بولے۔ ''میرے لیے بھی ڈونر کباب اور چپا بریڈ منگالیں۔''

کباب بے حد لذیذ تھے۔ ڈونر کباب ہر جگہ مل جاتے ہیں مگر بعض جگہ ان کی لذت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ ایک سائیڈ گلی کا ریسٹوران تھا مگر سچ پوچھیے تو کباب کھا کر لطف آگیا۔

کباب کھا کر پھر انڈی پینڈنٹ ایونیو سے گزرنا پڑا اگر کیونکہ پیٹ بھرا ہوا تھا اس لیے مختلف کھانوں کی خوشبوئیں اتنی بھلی نہیں لگ رہی تھیں۔

جاری ہے

جاسوس ادارے

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

کہتے ہیں کہ سیاست داں ہی سیاست کرتے ہیں لیکن بنظرِ غور دیکھیں تو اصل سیاست جاسوس ادارے کرتے ہیں خاص طور پر امریکی سی آئی اے اور روسی کے جی بی' اسرائیلی موساد ' انڈین را یہ سب کس طرح امنِ عالم کو تباہ کرتے ہیں ' پر امن ممالک میں کشت و خوں کا بازار گرم کرتے ہیں اسے سمجھنے کے لیے سی آئی اے کی دو بڑی کارگزاری ہی کافی ہے ۔ صدر کینیڈی اور مارٹن لوتھر کنگ کا الزام قتل بھی انہی کے سر ہے۔

ایک مختصر سا جائزہ' اختصار میں خزانہ

سپر طاقت کا تصور زیادہ پرانا نہیں ہے' دوسری عالمی جنگ کے بعد خیال پیش ہوا۔ اس وقت جب امریکا نے جاپان کے دو شہروں کو ملیا میٹ کردیا۔ ایٹم بم گرا کر جنگ کا پانسا پلٹ دیا۔ اس کامیابی کے بعد تمام چھوٹی بڑی طاقتیں مرعوب ہوگئیں۔ امریکا سے دبنے لگیں لیکن ایک ایسی قوت بھی تھی جو جنگ میں... امریکا کی ہامی تو تھی لیکن اس کی معاشی، ثقافتی اور سیاسی اندازِ فکر جدا تھی' وہ امریکا سے الگ فلسفہ رکھتی تھی۔ وہ سوویت یونین تھا۔ اس نے

میقات

حرم کعبہ کے وہ مقامات جہاں سے ہر حاجی کے لیے احرام باندھنا ضروری ہوتا ہے، اس کے بغیر حج نہیں ہوتا۔ حضرت محمدؐ کے زمانے میں یہ پانچ ہوتے تھے، بعد میں سہولت کے لیے ایک کا اضافہ کردیا گیا۔ یمن کی طرف سے حج کو جانے والے یلملم کے مقام پر احرام باندھتے ہیں۔ مدینہ منورہ سے آنے والوں کے لیے ذوالحلیفہ، نجد سے آنے والوں کے لیے قرن، شام اور مصر سے آنے والوں کے لیے جحفہ اور عراق کی طرف سے آنے والوں کے لیے اور مشرق کی طرف سے حاجیوں کے لیے ابراہیم المرشیہ مقامات میقات ہیں۔ یہ حدودِ میقات صرف ایامِ حج یعنی دو مہینے دس دن کے لیے ہے۔ 6 شوال سے ذوالحج کے ابتدائی دس دن تک ان حدود کے باہر جو لوگ آتے ہیں، وہ آفاقی کہلاتے ہیں۔ ہر حدود میقات اور حرم شریف کے درمیان رہنے والے اہل حل کہلاتے ہیں۔ ان کو یہیں سے احرام باندھنا پڑتا ہے۔ یعنی اہلِ حل اور اہل میقات کے لیے حل کی ساری زمین میقات ہے۔ اور اہالیانِ مکہ کے لیے حرم کی ساری زمین میقات ہے۔ احرام کی فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے محسنِ کائنات نے ایک روایت کے مطابق فرمایا: جو کوئی بھی حج وغیرہ کی غرض سے مسجد الاقصیٰ سے مسجد الحرام تک احرام باندھے گا، اس کے ماضی و مستقبل کے گناہ بخشے جائیں گے۔

میقات

مقررہ ''درست وقت'' اس معنی میں یہ اصطلاح سورۂ اعراف 155,142 سورۂ شعراء 38 میں آئی ہے۔ اسلامی فقہ اور قرآن عظیم میں نمازوں کے اوقات کے معنوں میں ہی آتی ہے۔ سورۃ البقرہ 238، سورۂ ہود 40، سورۃ النور 58 وغیرہ مختلف نمازوں کے اوقات ولوازمات کا تعین کرتی ہیں۔ مگر پھر بھی نمازوں کے اوقات حتمی طور پر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پہلے دس برس میں مکمل ہوسکے۔

پہلے ظہر کی نماز دوپہر کے وقت پڑھی جاتی تھی۔ عصر کی ظہر کے کچھ دیر بعد۔ مغرب کی نماز، سورج غروب ہونے کے فوراً بعد۔

4۔ نماز عشا، روشنی غائب ہونے کے بعد۔

5۔ فجر، سورج نکلتے وقت۔

بعد میں ان کے اوقات بدل گئے، اور

1۔ ظہر، دوپہر کے وقت۔

2۔ عصر، تقریباً تیسرے پہر۔

3۔ مغرب، سورج کے دھندلکے خاتمے کے بعد۔

4۔ عشا، رات کے پہلے پہر کے گزرنے کے بعد۔

5۔ فجر، تقریباً سورج نکلتے وقت۔

اب فقہ نے جو اوقات مقرر کیے ہیں، وہ یوں ہیں:

ظہر: جب سورج غروب ہونا شروع کرتا ہے، سے لے کر اس وقت تک، جب تک اشیا کے سائے اپنی اشیا کے برابر بنتے ہیں۔

عصر: ظہر کے آخری وقت سے سورج غروب ہونے تک۔

مغرب: سورج کے غروب ہونے کے بعد سے آسمان کی سرخی و پیلاہٹ ختم ہونے تک۔

عشا: مغرب کی نماز کے آخری وقت سے آدھی رات، صبح صادق تک بھی پڑھی جاسکتی ہے۔

فجر: صبح صادق سے دن چڑھنے تک۔

اقتباس: اسلامی انسائیکلوپیڈیا۔ مرسلہ: کائنات فاطمہ، کراچی

امریکا کی اتھارٹی کو چیلنج کردیا اس طرح سرد جنگ کا آغاز ہوگیا۔

سرد جنگ کی شروعات کے بعد طویل عرصہ تک امریکا اور سوویت یونین سپر طاقت کی حیثیت سے دنیا پر چھائے رہے لیکن ان دونوں طاقتوں کے درمیان خفیہ ایجنسیاں بھی تھیں جو دنیا بھر میں ایک متوازی نظام رکھتی ہیں۔ اپنے مقاصد کے لیے بھاری رقوم خرچ کرتی ہیں۔ مذہبی اور سیاسی جماعتوں کو خریدتی ہیں۔ ان خفیہ ایجنسیوں کے پاس بے شمار وسائل ہیں، طاقت ہے۔ خفیہ ایجنسیوں کے عہدیدار اور تنخواہ دار ایجنٹ دنیا کی ہر حکومت میں موجود ہیں۔ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد ان ایجنسیوں کا کردار پہلے سے کم ہوگیا ہے لیکن ختم نہیں ہوا۔

جارج واشنگٹن پہلا امریکی صدر تھا جو ایسی سرگرمیوں سے خائف تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ خفیہ ادارے حکومتیں الٹ دیتے ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم برپا ہونے میں ایک جاسوس کا کردار بہت اہم تھا۔ اس جاسوس نے 1914 میں آسٹریا کے پرنس فریڈرک پر گولی چلائی تھی۔ گولی کے داغنے سے پورا یورپ جل اٹھا۔ جنگ کے شعلوں نے اسے لپیٹ میں لے لیا۔ اسی طرح حال ہی میں امریکا کا جاسوس طیارہ پکڑا گیا۔ اس طیارے کی وجہ سے عالمی سطح پر کشیدگی پھیل گئی مگر امریکی حکومت نے اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے تائیوان میں جاسوسی سرگرمیوں کو مزید تیز کردیا۔ اس واقعہ کے بعد ایک اور ہٹ دھرمی سامنے آگئی۔ امریکی وزیر دفاع ڈونالڈ رمز فیلڈ نے چین کے ساتھ فوجی تعلقات منقطع کرنے کی دھمکی دے دی چین نے امریکا کا جاسوسی طیارہ پکڑ تو لیا مگر لوگ اندازہ لگا چکے تھے کہ چین بھی امریکا کی خفیہ معلومات چراتا رہا ہے۔ اس کا انکشاف اس وقت ہوا جب چین کے جاسوس امریکا کا ایٹمی راز چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے۔

امریکا نے ان جاسوسوں کو سخت پہرے میں رکھا تھا مگر چین بھی کم نہیں۔

اس کے جاسوسوں نے کامیاب آپریشن کیا اور جیل توڑ کر اپنے ساتھیوں کو رہا کرالیا۔ امریکا کے جاسوس ادارے چین کو ''بے نام دشمن'' کا نام دیتے ہیں۔ چین میں 1949ء کمیونسٹ انقلاب کے بعد امریکا کو چین کی فکر میں اس وقت لاحق ہوئی تھی جب تائیوان قانونی طور پر

چین کا حصہ تسلیم کرلیا گیا۔ سی آئی اے اس وقت سے ہی چین کے خلاف سرگرمِ عمل ہے۔

1950ء میں کوریا کی جنگ کے وقت خفیہ طریقے سے چینی قوم پرستوں کو چین کے خلاف استعمال کیا گیا۔ قوم پرستوں کو سی آئی آئی کے ایجنٹوں کی حیثیت سے تربیت دے کر اتارا جاتا اور چین کی کمیونسٹ حکومت جس کی آزادی کو بہ مشکل دو سال ہی ہوئے تھے ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس زمانے میں سی آئی اے کے دو ایجنٹ، جان ڈونی اور رچرڈ فیکٹن پکڑے گئے۔ چین کے سراغ رساں ادارے نے ان دونوں جاسوسوں کو قید کردیا اور ان سے چین میں انتشار پھیلانے کا مکمل پلان حاصل کرلیا اور ملک کے گرد ایسا دفاعی حصار کھینچ دیا کہ سی آئی اے اور امریکا طویل عرصہ تک چین کے اندر جھانکنے کی جرأت نہ کرسکا۔

سی آئی اے چین کی ایٹمی ترقی سے بھی خوف زدہ تھا۔ یکم اپریل 2001ء کو 36 ملین امریکی ڈالر کی لاگت سے تیار کردہ امریکی جاسوس طیارے EP-3-ARIES اور اس کے عملے کی گرفتاری نے امریکا کو مزید خوفزدہ کردیا کیونکہ یہ چین کے کامیاب نظامِ جاسوسی کا عملاً رعب ثابت ہوا تھا۔

ستمبر 1983ء میں یہ انکشاف ہوا تھا کہ آسٹریلیا کا ایک وزیراعظم چین کو ایسی خفیہ معلومات فراہم کررہا تھا جس نے امریکا اور سی آئی اے کے مفادات کو نقصان پہنچایا۔ تقریباً نصف صدی تک دنیا بھر کی کمیونسٹ قیادت سی آئی ئی کی کارروائیوں کا شکار رہی۔ خفیہ اداروں نے ہمیشہ ہر دور میں اپنے اپنے ملک کی خدمت کی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جرمن کے ایک جاسوس کا بڑا چرچا تھا جس کا نام سیرو تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ خطرناک جاسوس کون ہے۔ جس نے جرمنوں کو اتحادیوں کے خفیہ راز دیئے تھے۔ ان ...اطلاعات نے جنگِ عظیم میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

1945ء میں جرمن نے ایک جاسوس کپتان ان ٹیلسن کے ذریعے بڑی کامیابی حاصل کی لیکن اس کی خدماتِ بھی جنگِ عظیم میں جرمن کو واضح کامیابی نہ دلاسکی۔ یہ خود بھی بہت بڑا تخریب کار تھا۔ اس نے امریکا سے اتحادیوں کے لیے جانے والے گولہ بارود کو کئی بار تخریب کاری کا نشانہ بنایا۔ امریکا میں جرمن کا سفارتخانہ اس کی تخریبی سرگرمیوں کو پسند نہیں کرتا تھا اور اسے حکم ملا کہ

وہ نورڈیم نامی جہاز سے جرمنی آجائے لیکن جیسے ہی یہ جہاز برطانیہ کی بحری حدود میں داخل ہوا تو امریکا میں جرمن سفارت خانے کے ایک ڈبل ایجنٹ نے اس کی اطلاع برطانیہ کی خفیہ ایجنسی کو دے دی۔ اس طرح ان ٹیلسن گرفتار ہوا اور اسے چار سال کی سزا ہوئی۔ وہ 1920ء میں جب جرمنی پہنچا تو اہلِ برلن اس کو اور اس کی خدمات کو بھول چکے تھے۔

برطانیہ کا نظامِ جاسوسی جرمن کے مقابلے میں بہت دقیانوس تھا اور برطانوی حکومت نے بھی اسے ترقی نہیں دی تھی۔ جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ تقریباً سو سال تک برطانیہ نے کسی بڑی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا۔

1900ء میں ”امپیریل ڈیفنس کمیٹی“ نے تجویز پیش کی کہ فوج میں سراغ رسانی کی شاخ قائم کی جائے جس کا کام مخالف ملک کی جاسوس سرگرمیوں کا سراغ لگانا تھا۔ کپتان وانن کیل...... کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ ایم آئی 5 کو منظم کرے کیونکہ برطانیہ کے 1889ء کے قانون کی رو سے زمانہ امن میں جاسوسی کوئی جرم نہیں تھا۔ کیل کا یہ کارنامہ تھا کہ اس کی کوششوں سے 1914ء تک جرمنی کا نظامِ جاسوسی برطانیہ سے ختم کر دیا گیا۔

عالمی جاسوس کے حوالے سے عربوں میں انتشار اور افتراق پیدا کرنے کے لیے لارنس آف عربیہ نے جاسوسی کے ذریعے تاج برطانیہ کے اقتدار کی وسعت کے منصوبے پر کام کیا۔ وہ برطانوی سراغ رساں افسر ہوگرتھ کی تربیت اور زیرِ اثر آنے کے بعد خاصا خوفناک ہوگیا تھا۔ اس نے آثارِ قدیمہ کے ماہر کی حیثیت سے ترکی میں قدم رکھا تو اسے بہت پذیرائی ملی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جرمنوں اور ترکوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھی جائے۔ اس نے خود کو کامیاب بنانے کے لیے بول چال، لب و لہجہ، عادات و اطوار سب کچھ عربوں جیسا بنالیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران برطانوی جنرل آئزن ہاور کی سفارش پر امریکی صدر روز ویلٹ نے ایک منظم اور باقاعدہ محکمہ انٹیلی جنس کی بنیاد رکھی۔ ابتدائی طور پر اس کا نام ”آفس آف اسٹریٹجک سروسز“ رکھا گیا۔

جنگِ عظیم کے خاتمہ کے بعد اس ادارے کی افادیت نہ رہی، جس کی وجہ سے ستمبر 1945ء میں اسے توڑ دیا گیا۔ روس نے منظم منصوبہ بندی کے تحت اپنی طاقت اور اثر و رسوخ کو پھیلانا شروع کیا تو یہ بات امریکا کے لیے انتہائی پریشانی کا پیغام تھی جس کی وجہ سے جنوری 1946ء میں ایک نیا ادارہ سینٹرل انٹیلی جنس گروپ (سی آئی جی) ظہور میں آیا۔ جسے مختلف النواع کی معلومات کو مربوط کرنے کی ذمے داری سونپی گئی بعد ازاں اس کے نام میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے سینٹرل انٹیلی جنس ایجنسی (سی آئی اے) رکھ دیا گیا۔ اس ادارے کی افادیت کو دیکھتے اور اسے قانونی شکل دیتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ اس ادارہ کا ڈائریکٹر صرف نیشنل سیکورٹی کونسل اور امریکی صدر کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ 1953ء سے 1961ء تک ایلن ڈلس جو جان فاسٹر ڈلس کا بھائی تھا سی آئی اے کا ڈائریکٹر رہا۔ اس نے اس ادارے کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے بجائے ذاتی پبلسٹی پر توجہ دی۔ ایلن ڈلس کا انحطاط ”بے آف پگز“ کے ناکام منصوبے کے ساتھ ہی شروع ہوا۔ کیوبا پر حملے میں امریکا کی فوجی اور اخلاقی طور پر شکست ہوئی، جس کی وجہ سے امریکی صدر سی آئی اے کے خلاف ہوگیا اور اس نے ایلن ڈلس کو ریٹائر کر دیا۔ ایلن کے ساتھ ہی امریکی صدر جان ایف کنیڈی نے ان کی اہم مہمات کو بھی چلتا کر دیا۔ ان تبدیلیوں کے بعد سی آئی اے کی مہم جوئی کا کام کافی ٹھنڈا پڑ گیا۔

☆☆☆

امریکی صدر جان ایف کنیڈی اور سیاہ فام لیڈر مارٹن لوتھر کنگ کے قتل کے بارے میں انکشاف ہوا کہ اس میں سی آئی اے نے اہم کردار ادا کیا۔ امریکی صدر کا قتل کوئی عام آدمی کا قتل نہ تھا۔ یہ امریکا کے 34 ویں صدر کا قتل تھا۔ اس کے ”ڈانڈے“ سی آئی اے کی طرف موڑے گئے۔ سی آئی اے اور ایف بی آئی کو کنیڈی خاندان سے نفرت تھی اور ان کے قتل کے حوالے سے جو راز فاش ہوئے وہ چونکا دینے والے تھے۔ اس کے باوجود امریکا کے طاقتور صدور بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ امریکا کا ایک صدر جارج بش سی آئی اے کا ڈائریکٹر رہا ہے۔ ایف بی آئی کے سربراہ جے ایڈگر ہوور کو ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ سے ذاتی مخاصمت تھی۔ جان ایف کنیڈی نے جس طرح سی آئی اے کے افسر کو نکالا تھا اور ایلن ڈلس سے جس طرح استعفیٰ لیا تھا، یہ باتیں خفیہ اداروں کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔ جان ایف کنیڈی کا بھائی رابرٹ کنیڈی جو کہ اٹارنی جنرل تھا نے جس طرح جرائم پیشہ تنظیموں کے خلاف جنگ شروع کر رکھی تھی اس سے سی آئی اے کے مفادات پر براہِ راست

زد پڑتی تھی۔ کیونکہ مافیا اور جرائم پیشہ تنظیموں کو سی آئی اے کی حمایت حاصل تھی۔ جان ایف کنیڈی کے قتل کے بعد مارٹن لوتھر کنگ پھر رابرٹ کنیڈی قتل ہوئے، قاتلوں نے رابرٹ کنیڈی کو واضح طور پر متنبہ کی تھی کہ وہ امریکی صدارت کے انتخابات میں حصہ نہ لیں۔ مارٹن لوتھر کو صرف اس لیے قربانی کا بکرا بنایا گیا کہ رابرٹ کنیڈی کو یہ احساس ہوجائے کہ قاتل اپنی دھمکی میں پوری طرح سنجیدہ ہیں۔ جان ایف کنیڈی کے قتل کے کچھ عرصہ بعد اس کے جانشین امریکی صدر جانسن نے چیف جسٹس ارل وارن کی سربراہی میں جو تحقیقاتی کمیشن (وارن کمیشن) قائم کیا تھا اس نے نو ماہ کی تحقیق کے بعد وہی رائے پیش کی جو اس نے پہلے دن قائم کرلی تھی کہ قاتل نے کنیڈی کو ذاتی ارادے سے قتل کیا۔ اس میں کسی منصوبہ بندی کی کوئی گنجائش نہ تھی حالانکہ قاتل سی آئی اے سے قریبی رابطہ رکھتا تھا۔ سی آئی اے نے اپنی اغراض کے لیے 1960ء میں اوسوالڈ سے رابطہ قائم کیا تھا اور اس کی باقاعدہ فائل بنی تھی مگر ایلن ڈلس کی خفیہ ہدایت پر سی آئی اے کے ڈائریکٹر ہیلمز نے ”وارن کمیشن“ کے روبرو حلفاً یہ بیان دیا کہ سی آئی اے کی فائلوں میں ایسا کوئی مواد نہیں ہے جس سے اوسوالڈ کے سی آئی اے کے ساتھ روابط ثابت ہوں۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی تحقیق سے ثابت کیا کہ اوسوالڈ ڈبل ایجنٹ تھا اور وہ کے جی بی کے لیے کام کرتا تھا۔

امریکی ہاؤس کمیٹی نے ہاؤس سلیکٹ کمیٹی تشکیل دی جس کا کام کنیڈی اور ڈاکٹر مارٹن لوتھر کے قاتلوں کا سراغ لگانا تھا۔ ڈیموکریٹک رکن کانگریس تھامس ڈاؤننگ نے اس کمیٹی کے قیام میں حصہ لیا۔ اسے جان ایف کنیڈی کی تحقیقات کرنے والے وارن کمیشن سے اتفاق تھا مگر جب اس نے ایک ایسی فلم دیکھی جو کسی سیاح نے محض اتفاقاً بنالی جو وہاں سے گزر رہا تھا کہ اس نے ”وارن کمیشن“ کے فیصلے سے اختلاف کیا کہ کنیڈی کے قتل کا فیصلہ ذاتی تھا۔ اس نے کہا کہ اس سے ایک اور قاتل کی نشاندہی ہوتی ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ صدر کنیڈی کے قتل سے پہلے قاتل اوسوالڈ نے ایف بی آئی کے چند ایجنٹوں سے خفیہ ملاقاتیں کی تھیں۔ یہ ہیں دنیا کی مشہور خفیہ ایجنسیوں کے کارنامے کہ اپنے ہی صدر کو قتل کراتی ہیں۔ صرف ایجنسی کی بقا کے لیے۔

مینار

مخروطی شکل کا بلند ستون یا عمارت۔ شکل میں مخروطی بلند اور کم چوڑائی کی ہوتی ہے۔ موذن کے اذان کہنے کے لیے ہر مسجد کے ساتھ بنائے جاتے ہیں۔ کبھی مسجد کے اندر اور کبھی چاروں سمت میں۔ ابتداً مسجد کے ساتھ بلند عمارت یا ستون نہیں ہوا کرتا تھا۔ حضرت بلالؓ جو ابتدائی موذنوں میں سے ہیں، مسجد نبویؐ کے قریب سب سے اونچے مکان پر چڑھ کر اذان کہا کرتے تھے۔ فتح مکہ کے دن انہوں نے خانہ کعبہ کی چھت سے اذان کہی۔ مینار سازی کا رواج بنوامیہ کے زمانے سے شروع ہوا۔ خلیفہ ولید نے اکثر مقامات پر مینار تعمیر کروائے۔ پہلے ان کی تعداد دو یا تین ہوتی تھی۔ بعد میں مسجد کی حسن و دلکشی کے باعث چاروں کونوں پر میناروں کی روایت پڑ گئی۔ ابتدائی میناروں میں زینہ باہر کی طرف ہوتا تھا۔ مگر اب اندر کی طرف تعمیر ہوتا ہے۔ مسجد کے علاوہ تاریخ میں اور بہت سے قدیم میناروں کی باقیات ملتی ہیں۔ دہلی کا قطب مینار، شیخوپورہ کے قریب ہرن مینار، مقبرۂ جہانگیر کے مینار، فنِ تعمیر اور اسلامی تاریخ کا اہم باب ہیں۔ لوہاری دروازہ کے باہر مسجد پر ایک بلند مینار تعمیر کیا گیا ہے جو اس نسبت سے ”مسجدِ مینار“ کہلواتا ہے۔ یادگاروں اور مقبروں پر میناروں کی تعمیر کو مغل تعمیرات نے بڑی تقویت پہنچائی تھی۔ قراردادِ پاکستان کی یاد میں ”مینارِ پاکستان“ تعمیر کیا گیا۔ اس طرح سب سے بڑی اسلامی کانفرنس، دوسری اسلامی کانفرنس کے بعد اس کی شان میں اسمبلی ہال کے سامنے ایک بلند مینار تعمیر کیا گیا۔ اس کے اردگرد قرآنی آیات کندہ ہیں۔ یہ ”سمٹ مینار“ کہلاتا ہے اور اس کی تعمیر نیم سرکاری کمپنی نے کی۔

مرسلہ: فوزیہ اکبر، خان

سراب

راوی : شہبازملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط:80

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزرتی اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت سویرا میرے بھائی کا مقدر بنا دی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادر علی سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ میں دوبارہ وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومت چین کا ایک بریف کیس آ گیا جو شہلا کے ہاتھ لگ گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کر لوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلا لیا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے۔ میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے ای میل بھیج کر ایمن کو بھی بلوا لیا۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی مار دی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا "نارتھ...... بگسٹ" دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی۔ تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے۔ تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم چنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کر دیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنا دی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں ٹھہرے تھے اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کے تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زرو تکی نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا۔ کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادر کی کوٹھی کی جانب توجہ دی تبھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جا رہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ کچھ کے ذمے کام یہ لگایا کہ وہ صابر کو پکڑ لیں۔ صابر تو پکڑ میں آ گیا مگر شہلا نکل گئی۔ صابر نے بتایا کہ شہلا کالی کوٹھی میں ملے گی۔ ہم وہاں پہنچے تو شہلا آخری سانسیں لے رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سونا وغیرہ کو حویلی بھیج دیا جائے۔ ہیلی کاپٹر ہائر کیا۔ جیسے ہی چوپر بلند ہوا اس پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ یہ کام فاضلی کا تھا، ہم نے اسے اغوا کر لیا۔ میں عبداللہ سے ملنے جا رہا تھا کہ ڈی ایس پی اکرم چشتی نے مجھے گرفتار کیا اور بے پناہ تشدد کے بعد مرشد کے ہاں پہنچا دیا۔ میں نے مرشد کو یرغمال بنا کر وہاں سے نکلنا چاہا تھا کہ فاضلی نمودار ہوا اور اس نے میرے سر پر وار کر دیا۔ چوٹ کی وجہ سے میرا سر گھوم رہا تھا۔ مجھے جو عقل سے عاری بنانے کا انجکشن لگا تھا وہ بے اثر ثابت ہوا مگر میں نے عقل سے عاری بنے رہنے کی اداکاری شروع کر دی۔ فاضلی نے مجھے اور ایک لیڈی ڈاکٹر کو قید کر لیا تاکہ وہ مجھ پر نظر رکھ سکے۔ میں وہاں سے فرار ہونے لگا تو لیڈی ڈاکٹر ماری گئی۔ میں نے فاضلی کو زخمی کر دیا پھر بھی میرا پیچھا کرتا ہوا آیا تھا کہ کچھ لوگوں نے اس پر فائرنگ کر دی۔ میں کسی طرح سڑک تک پہنچ گیا اور گاڑی لانے کے لیے فون کر دیا۔ پھر ہم نے ساتھیوں کی مدد سے اکرم چشتی کو اغوا کر لیا۔ اسے ہم ایذا دے رہے تھے کہ باہر سے آواز آئی "پولیس"۔ ہم نے خفیہ کیمروں سے پولیس کی پوزیشن دیکھی پھر اکرم چشتی کی آنکھوں اور کان میں کیمیکل ڈال کر چپکا دیا اور وہاں سے نکل گئے۔ پولیس نے نادر اور چشتی کو اس گھر سے برآمد کر لیا راستے میں عبداللہ کے آدمیوں نے پولیس پر حملہ کر کے نادر کو دوبارہ حاصل کر لیا۔ ہم اس گھر سے نکل کر مانسہرہ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی سہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرو تکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرو تکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پا لیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کر لیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آ گئے۔ سفیر کو دبئی بھیجا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کر کے آ رہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی کی تھی۔ میں نے ایک بار اس کی مدد کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ ممتاز حسن ہمیں کسی سے ملوانا چاہتا تھا۔ ہیلی کاپٹر پر جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہو گیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے جا رہے تھے راستے میں بی ایس ایف والوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ حیات اتر کر گیا اور کچھ ایسا کہا کہ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ وہاں اندرونی سازش عروج پر تھی۔ چھوٹے ٹھاکر نے سازش کر کے بانو کو اپنے بیڈروم میں بے ہوشی کی حالت میں بلوا لیا اور مجھ سے کہا کہ اگر تم نے اوشا کے ساتھ رات گزار لی۔ تو بانو رہا ہو جائے گی۔

میں نے رامن پر حملہ کر دیا۔ وہ مجھ پر قابو پاتا کہ ٹھشی دل آ گیا اور اس نے رامن کو پستول کے نشانے پر لے کر اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ بانو کو میرے پاس بھیج دیا گیا۔ کئی روز کے بعد مجھے کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی گئی جس کا اثر نہیں ہوا۔ نائیک اور رامن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پا لیا پھر راج کنور پر قابو پا لیا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا "شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آ جاؤں۔" میں نے بروقت راج کنور کے ہاتھ پر وار کیا پستول نکل کر دور جا گرا پھر وہاں سے نکل کر راستے میں شیام اور رینا کی گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کنور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ شملہ پہنچ کر راجا صاحب سے بات کی۔ انہوں نے ہوٹل میں کمرا دلوا دیا۔ میں راج کنور کو یرغمال بنا کر پاکستان پہنچنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسپتال جہاں کنور کو رکھا گیا تھا وہاں سے نکل رہا تھا کہ پستول کی نال میری گردن پر آ گئی اور رامن کی آواز ابھری۔ "ہلنا مت شہباز۔"

اب آگے پڑھیں

جس وقت رامن نے پستول میری گردن سے لگایا میں دروازہ بند کر رہا تھا۔ میں اور دروازہ دونوں حرکت میں تھے۔ یہ دھاتی سوئنگ ڈور تھا جو اندر باہر یکساں کھلتا تھا اور بند ہونے کے بعد خود بہ خود لاک ہو جاتا تھا۔ اندر سے یہ صرف ہینڈل گھمانے سے کھلتا تھا مگر باہر سے کھولنے کے لیے چابی کی ضرورت پڑتی تھی۔ میں اسے باہر کی طرف کھولتے ہوئے نکل رہا تھا جب رامن نے پستول کی نال میری گردن سے لگائی۔ میں نے کنور پیلس میں قید کے دن بہت صبر سے اس اُمید پر گزارے کہ قدرت مجھے موقع دے گی اور میں آزادی حاصل کر سکوں گا۔ میری اُمید پوری ہوئی اور میں کنوروں کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب رہا۔ ایک بار آزاد ہونے کے بعد میرے ذہن کے گوشوں میں یہ بات تھی کہ یہ شاید آخری موقع ہے اور میں دوبارہ کسی صورت ان لوگوں کی قید میں نہیں جانا چاہتا تھا جو دونوں لحاظ سے میرے لہو کے پیاسے تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ایسا کوئی موقع آیا تو میں آخری حد تک لڑوں گا۔ ایک لمحہ زندگی کے چانس پر بھی رسک لوں گا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ ابھی رامن کا جملہ منہ میں تھا کہ میں نے شاید اپنی زندگی کا سب سے بڑا رسک لیا۔ باہر آتے آتے میں اسپرنگ کی سی تیزی سے واپس گیا اور ساتھ ہی دروازہ پوری قوت سے کھولا۔ رامن دروازے کے پیچھے تھا۔ ٹھک کی ہلکی سی آواز آئی اور دروازہ پوری قوت سے رامن کو لگا تھا۔ گولی میرے چہرے کے پاس سے گزری تھی اور اس کی تپش اور رفتار میں نے اپنے چہرے پر محسوس کی تھی۔ آڑ میں آتے ہی میں نے واپس آنے والے دروازے کو پھر دھکیلا اور اس بار اپنے جسم کی پوری قوت کو استعمال کیا۔ رامن دیوار سے ٹکرایا اور کسی مرتے بھینسے کی طرح ڈکرایا۔ دوسری بار دروازہ اسے لگا تو وہ چلا اٹھا تھا۔ اب وہ دروازے اور دیوار کے درمیان پھنسا ہوا تھا مگر وہ مسلح تھا اور دروازے کے دوسری طرف سے بھی فائر کر سکتا تھا۔ کسی قدر موٹے المونیم سے بنا یہ دروازہ یقیناً گولی نہیں روک سکتا تھا اس لیے میں رامن کو دروازے اور دیوار کے درمیان دبائے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا، ساتھ ہی اپنا پستول بھی نکالنا چاہتا تھا۔

رامن نے اچانک اپنی طاقت کو استعمال کیا اور دروازے کو اتنی قوت سے دھکیلا کہ میں لڑکھڑا کر پیچھے آیا اور سنبھلنے کی کوشش میں گرا تھا۔ مگر اس دوران میں پستول نکال چکا تھا۔ دروازے کی رکاوٹ ہٹتے ہی رامن نے اپنا پستول میری طرف کیا تھا۔ یہ چھوٹا پستول تھا جس کی نال پر بڑا سائلنسر عجیب لگ رہا تھا اور شاید اسی وجہ سے رامن دروازے کے پیچھے سے اسے استعمال نہیں کر سکا تھا۔ اس کی لمبائی قریب پون فٹ ہو گئی تھی دوسری صورت میں پستول صرف چار انچ لمبا تھا اور آسانی سے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ میرے پستول کا رخ اس کی طرف تھا اور میری نظر رامن کے پستول پر جمی ہوئی تھی۔ اگر وہ فائر کرنے کے لیے لبلبی دباتا تو میں بھی پوری طرح تیار تھا۔ ہمارے درمیان مشکل سے سات آٹھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ کسی کا نشانہ مشکل سے ہی خطا ہوتا۔ یہ بات رامن نے بھی محسوس کر لی اور فوری گولی چلانے سے گریز کیا۔ اس کی نظر بھی یقیناً میرے پستول پر تھی۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"شہباز پستول پھینک دو۔ میں تمہیں ماروں گا نہیں۔"

"یہی پیشکش میری بھی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم بچ نہیں سکتے میرے اور آدمی بھی ہیں یہاں۔"

"ضرور ان کو بھی بلا لو۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمہیں کوئی بچا نہیں سکے گا۔"

اس کے چہرے پر فکر کے آثار دکھائی دیے۔ "شہباز تم کیا چاہتے ہو؟"

"ایک موقع...." میں نے کہا۔ "ہم دونوں کے لیے برابر کا۔"

"کیا مطلب؟"

"اگر تم پستول استعمال کرنا چاہتے ہو تو میرا جواب

بھی گولی ہوگی۔ اس تبادلہ میں نہ جانے کون بچے اور کون مارا جائے، ہوسکتا ہے دونوں مارے جائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ زندگی وموت کا فیصلہ کیوں نہ ہم اپنے زورِ بازو پر کرلیں۔"

رامن کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ "تم مجھ سے مقابلہ کرنا چاہتے ہو؟"

"ایک بار تم نے کہا تھا کہ تم سے واسطہ پڑا تو تم بتادو گے کہ تم نائیک نہیں ہو۔ اگر تمہارا چیلنج برقرار ہے تو....."

ہم دونوں ہی ایک بند گلی میں پھنس گئے تھے اور اس سے نکلنے کا یہ خیال الہام کی طرح میرے ذہن میں نازل ہوا تھا۔ رامن بھی اس بات کو سمجھ رہا تھا اور بالآخر اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے، تم پستول پھینک دو۔"

"پہلے تم۔"

اس کے تیور خطرناک ہوئے، ایسا لگا کہ وہ گولی چلا دے گا مگر پھر اس نے اپنا پستول ایک طرف پھینک دیا۔ میں کھڑا ہوگیا اور اپنا پستول مخالف سمت میں تقریباً اتنے ہی فاصلے پر پھینک دیا جتنا رامن نے پھینکا تھا۔ اس نے جینز کے ساتھ خاکی شرٹ پہن رکھی تھی اور اس کے بازو پر زخم تھا۔ اگرچہ اس بات کو کئی دن گزر گئے تھے مگر مجھے امید تھی کہ اس کا زخم ابھی بھرا نہیں ہوگا۔ یہ ایک کمزور پہلو تھا اس کا۔ اس نے پیروں میں سخت لیدر شوز پہن رکھے تھے جب کہ میرے پیروں میں جوگرز تھے۔ موومنٹ کے لحاظ سے میں بہتر پوزیشن میں تھا لیکن اس کے جوتے زیادہ سخت ہتھیار ثابت ہو سکتے تھے۔ اس لحاظ سے وہ بہتر پوزیشن میں تھا۔ میں نے پی کیپ بھی اتار کر ایک طرف اچھال دی۔

"رامن تم نے اتنی تیزی سے قلابازیاں کھائی ہیں کہ کیا کوئی لنگور کھاتا ہوگا۔"

"تمہارا اشارہ وفاداریاں بدلنے کی طرف ہے تو یہ سارا مفاد کا کھیل ہے۔" وہ نیم دائرے میں گھومنے لگا۔ میں فاصلہ برقرار رکھے ہوئے تھا۔ مجھے بھی اس کے ساتھ گھومنا پڑ رہا تھا۔

"پیلس میں پانسا کیسے پلٹا؟"

"یہ منشی کی حماقت تھی، میں نے کہا بھی تھا کہ سانپ قابو میں ہے اس کا پھن کچل دو۔" وہ صاف گوئی سے بولا غالباً اسے کوئی خطرہ نہیں تھا کہ اس کی گفتگو بڑے کنور تک پہنچ سکے گی، اس کا اشارہ یقیناً بڑے کنور کی طرف ہی تھا۔ "مگر منشی لمبے چکر میں تھا۔"

"جاگیر پر قبضے کے چکر میں؟"

اس نے حیرت سے کہا۔ "تم جانتے ہو؟"

"میں اس سے بھی زیادہ جانتا ہوں۔"

"تمہیں راج نے بتایا ہوگا۔" اس نے کہا اور اچانک تیزی سے آگے آیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے مجھ پر گھونسے بازی کی مشق کرنا چاہتا ہو لیکن یہ دھوکا تھا اس نے میرے گھٹنے پر ٹھوکر ماری تھی اور اگر یہ ضرب صحیح جگہ لگ جاتی تو میرا گھٹنا بھی ٹوٹ سکتا تھا مگر میں نے بروقت پاؤں موڑتے ہوئے یہ وار پنڈلی پر روکا۔ وار سخت تھا اور درد کی لہر اٹھی تھی لیکن میں نے برداشت کرتے ہوئے جوابی ٹھوکر ماری۔ وہ آرام سے میری زد سے نکل گیا۔ وہ یقیناً مارشل آرٹ کا ماہر تھا۔

"راج نے بھی بتایا ہے اور میری معلومات کے کچھ ذرائع اور بھی ہیں۔" میں نے پیچھے ہوتے ہوئے کہا۔ "بڑے کنور نے اقتدار دوبارہ حاصل کرنے کے بعد تمہیں کیوں بخش دیا۔ بغاوت میں تم برابر کے شریک تھے۔"

اس نے بھیڑیے کی طرح دانت نکالے۔ "میں صرف ان لوگوں کا نمک خوار نہیں ہوں، میری ایک حیثیت اور بھی ہے۔"

"را کے ایجنٹ کی۔"

اس بار اس نے سچ مچ دانت پیسے تھے۔ "راج کنور....."

میں ہنسا۔ "وہ بے چارہ مجبور تھا۔ جیسے اب مجبور ہے۔"

"بس کچھ دن کی بات ہے پھر میں اس شخص کو اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا۔"

"یہ شاید اتنا آسان نہ ہو۔" میں نے کہا اور اس کی طرف بڑھا۔ وہ وار روکنے کے لیے ہوشیار ہوگیا۔ میں نے اچانک گھوم کر لات چلائی۔ وہ مار کھا گیا۔ لات اوپر سے نیچے آئی تھی۔ کنور پیلس میں باتو سے لڑائی کی مشق میں، میں نے اس وار کی بہت پریکٹس کی تھی۔ راؤنڈ کک کے مقابلے میں یہ زیادہ خطرناک وار ہے کیونکہ اوپر سے نیچے آتی جسم کے کسی نہ کسی حصے پر لگتی ہے اور اس کی قوت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ رامن کے پاس پیچھے ہٹنے کا وقت نہیں تھا اس نے بہ مشکل ہاتھ اوپر کرتے ہوئے وار روکا اور لڑکھڑا کر پیچھے گیا تھا۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں حیرت دکھائی دی جیسے وہ مجھ سے اس وار کی توقع نہیں کررہا تھا۔ اس کے لڑکھڑانے کے دوران میں نے سینے پر ایڑی مارنا چاہی لیکن اس نے ہاتھ سے روک کر یہ وار بھی ناکام بنادیا مگر میرا پاؤں پکڑنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔

اب تک وہ محتاط تھا لیکن اس بار اس نے احتیاط بالائے طاق رکھ کر مجھ پر کئی حملے کیے۔ وہ جس طرح سے ہاتھوں، ٹھوکروں اور کہنیوں کا استعمال کررہا تھا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کنگ فو جانتا ہے۔ اس میں دشمن کے پاس رہتے ہوئے مہلک وار کیے جاتے ہیں۔ مگر ماہرِ فن ہونا شرط ہے ورنہ دشمن اس قربت کا فائدہ اٹھا سکتا ہے جیسا کہ میں نے اٹھایا اور ایک گھونسے نے اس کا جبڑا ہلا دیا تھا۔ میری کوشش تھی کہ وہ اشتعال میں آئے اور اندھا دھند کارروائی کرے لیکن گھونسا کھا کر وہ پیچھے گیا اور اس نے دوبارہ فاصلہ کرلیا تھا۔ اس دوران میں اس کی ایک کہنی میری پسلیوں میں اور ایک شانے پر لگی تھی۔ دونوں وار مہلک تھے لیکن میں نے ناکام بنائے اس کے باوجود اچھی خاصی چوٹ لگی تھی۔ رامن خطرناک لڑاکا تھا اور یقیناً ان چند اچھے لڑنے والوں میں سے تھا جن سے میرا مقابلہ ہوا تھا۔ مجھے جسمانی مقابلوں کے مواقع کم ہی ملتے تھے اور ان میں زیادہ تر میرا پلہ بھاری رہا تھا۔ صرف ایک بار ایسا ہوا تھا کہ ڈولڈ شاکے کے گرگے مارشل نے مجھے اپنی مہارت سے شکست ماننے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں لڑاکا تھا۔ رامن اس کے پائے کا نہیں تھا مگر وہ بھی اسی میدان کا مرد تھا۔ اس نے پیچھے ہوکر تھوکا تو منہ سے خون نکلا تھا۔ یک لخت اس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں اور چہرے سے وحشیانہ تاثرات جھلکنے لگے تھے۔

"بڑے کنور نے میرے بارے میں کیا حکم دیا ہے؟"

"تمہیں تلاش کرنے کا۔"

"تم نے اسے بتایا نہیں کہ میں یہاں ہوں؟"

اس نے سر ہلایا۔ "بتایا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ تم دستور یہاں ہو۔ میں نے خیال ظاہر کیا کہ تم یہاں سے جا چکے ہو۔"

"بڑے کنور نے تمہاری بات کا یقین کرلیا؟"

اس سوال کے جواب میں اس نے حملہ کیا اور اس کا وار غضب ناک تھا اس لیے میں نے آسانی سے اس کا وار ناکام بنادیا اور اس کے ماتھے پر ایک عدد نیل کا اضافہ ہو گیا۔ وہ پیچھے گیا اور دانت پیسنے لگا پھر اس نے کہا۔ "بڑا کنور جائے بھاڑ میں، میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"کیوں نہیں۔" میں ہنسا۔ "ویسے تم نائیک کی نقل کرنے کی کوشش کررہے ہو۔"

اس طعنے نے اسے آتش زیرِ پا کردیا۔ اس بار اس نے سچ مچ بہت خطرناک حملے کیے، میں نے بہ مشکل خود کو بچایا اور چوٹیں کھائیں۔ اس بار میرا ہونٹ پھٹ گیا اور بازو پر لگنے والی ضرب نے تڑپا دیا تھا۔ پیروں اور سینے پر بھی کئی ضربیں لگیں۔ مگر اس کا ناک منہ بھی برابر ہوگیا تھا۔ وہ یوں پیچھے ہٹا جیسے مجھ پر دوبارہ حملے کی تیاری کررہا ہو لیکن یہ اس کی عیاری تھی۔ وہ اچانک اپنے پستول کی طرف جھپٹا۔ اتفاق سے میں بھی اپنے پستول سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم دونوں تقریباً ایک ساتھ اپنے ہتھیار اٹھا سکتے تھے لیکن اس کے بعد کون کامیاب ہوتا اور کون ناکام، یہ کہنا مشکل تھا۔ میں نے چانس مول لیا اور پستول کے بجائے رامن کی طرف جھپٹا۔ وہ پستول اٹھا چکا تھا اور میری طرف گھوم رہا تھا کہ میں نے بلاتکلف لات ماری اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

اس کے ہاتھ پر سخت چوٹ آئی تھی۔ اس نے گالی دی۔ جواب میں اسے دوسری ٹھوکر کولہے پر لگی۔ اس نے بچنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا توازن بگڑا تھا۔ اگلی ضرب اس کے گھٹنے کے جوڑ پر اندر کی طرف سے لگی اور وہ زمین پر گرا۔ پھر میرے پاؤں مشینی انداز میں چلنے لگے۔ چند ٹھوکروں تک اس نے مزاحمت کی اس کے بعد اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس کے بازو کا زخم ہرا ہوگیا تھا جہاں گولی لگی تھی اور رہی سہی کسر اب میں پوری کررہا تھا۔ آخری ٹھوکر اس کے منہ پر ماری اور وہ الٹ کر دیوار سے ٹکرایا اور ساکت ہوگیا۔ اس کا سر خاصی قوت سے لگا تھا اور مجھے امید تھی کہ وہ کئی گھنٹے تک ہوش میں نہیں آئے گا۔ میں مطمئن ہوکر پیچھے ہٹا اور اس کا گرا پستول اٹھالیا۔ یہ اچھا ہتھیار تھا سائلنسر لگا ہوا۔ جب رامن نے گولی چلائی تو بہت معمولی سی آواز پیدا ہوئی تھی۔

جس دوران میں یہ سب ہوا... یہاں کوئی اور نہیں آیا تھا اس لیے کسی نے یہ منظر نہیں دیکھا۔ مگر اس بات کا خطرہ تھا کہ اچانک اندر سے اسپتال کا کوئی فرد آجائے۔ دروازہ بند ہوگیا تھا اور اب اسے اندر سے ہی کھولا جاسکتا تھا۔ حفظ ماتقدم میں نے وہاں موجود ایک وائپر اٹھا کر دروازے کے ہینڈل کے نیچے رکھ دیا اب اسے اندر سے بھی کوئی کھول نہیں سکتا تھا، جب تک وائپر نہ ہٹایا جاتا دروازہ نہیں کھل سکتا تھا۔ میں نے رامن کا پستول اس کی طرف کیا۔ میں نے

سوچ لیا تھا کہ جب اس شخص پر قابو پایا اسے دنیا سے رخصت کر دوں گا۔ بہت کم لوگوں کے لیے میرے دل میں رحم نہیں تھا اور رامن ان میں سے ایک تھا۔ مگر جب میں نے گولی چلانے کا ارادہ کیا تو اندر سے کمزور پڑنے لگا۔ میرا ضمیر مجھے ایک بے بس اور بے ہوش پڑے دشمن کو مارنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ میں نے ضمیر کو یاد دلایا کہ یہ شخص ایک موذی سانپ ہے اور اس کی ڈسنے کی فطرت اور زہر کبھی ختم نہیں ہوگا اس لیے اس کا ختم ہو جانا لازمی ہے۔ بالآخر ضمیر کمزور پڑ گیا اور میرا ارادہ جیتنے لگا۔

مگر جو چند لمحے میں نے ضمیر سے بحث میں ضائع کیے وہی رامن کی زندگی کی وجہ بن گئے۔ اچانک اسپتال کے آگے کی طرف سے آنے والے راستے سے سنتوش نمودار ہوا۔ اس نے پستول اٹھا رکھا تھا اور اس پر بھی سائلنسر تھا اس لیے اس نے بلاتکلف فائر کیا مگر اسے دیکھتے ہی میں حرکت میں آ چکا تھا۔ میں شیڈ کی طرف بھاگا جہاں اسپتال کا عملہ صفائی کا سامان اور دوسری فالتو چیزیں رکھتا تھا۔ کچرا بھی یہیں پیک کر کے رکھا جاتا تھا تاکہ بدبو نہ پھیلے۔ سنتوش نے دو تین فائر کیے اور تمام گولیاں میرے آس پاس سے گزر گئیں۔ میں نے جوابی فائر کیا تو وہ بدحواس ہو کر جلدی سے عمارت کی آڑ میں ہو گیا۔ میں شیڈ میں گھسا۔ یہ خاصا بڑا شیڈ تھا اور مجھے امید تھی کہ یہاں کوئی راستہ عقبی سمت میں نکلتا ہوگا۔ جہاں سے کچرا لینے والی گاڑی یہاں کا... کچرا لے جاتی ہوگی۔۔ میرا اندازہ درست نکلا عقبی حصے میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا لیکن وہ بند تھا۔ اس پر اندر کی طرف تالا لگا تھا۔

یقیناً سنتوش کو علم تھا کہ رامن یہاں کیا کر رہا ہے اور شاید اسے آگے کی طرف لگایا تھا کہ میں وہاں سے فرار کی کوشش کروں تو وہ مجھے روکے لیکن جب رامن نے آنے میں دیر کی تو وہ خود صورت حال دیکھنے کے لیے چلا آیا۔ اس کی بروقت آمد سے رامن بچ گیا۔ اب وہ میری تاک میں تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا سنتوش شیڈ کے باہر کہیں موجود تھا لیکن اس نے اندر گھسنے کی جرأت نہیں کی تھی یہاں نیم تاریکی تھی اور میں آسانی سے اسے نشانہ بنا سکتا تھا۔ غالباً اسے علم نہیں تھا کہ یہاں ایک دروازہ ہے۔ ورنہ شاید وہ اندر آ جاتا اور شاید نہ آتا کیونکہ اس کی اور میری کوئی ذاتی دشمنی تو تھی نہیں اور کچھ رقم کی خاطر اپنی جان کو داؤ پر کیوں لگاتا؟ میں نے تالے پر فائر کیا اور اس کے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے۔ اگر سنتوش نے یہ آواز سنی بھی تھی تو یہاں آئے بغیر وہ حقیقت حال سے واقف نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسرے لمحے میں باہر تھا۔ یہ عقبی گلی تھی جسے عرف عام میں گندی گلی کہتے ہیں۔

سنتوش کی آمد کے علاوہ رامن کی جان بچنے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ میں لاشعوری طور پر محسوس کر رہا تھا مگر اس وقت سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ جب اسپتال سے نکلنے لگا تب مجھ میں آیا کہ اگر رامن مارا جاتا تو بڑا کنور شاید راج کنور کو فوری بلا لیتا یا اس پر ایسے پہرے لگا دیتا کہ میرے لیے اس تک رسائی بہت مشکل ہو جاتی اور میرا پلان فیل ہو سکتا تھا۔ اس لیے رامن کا فی الحال زندہ رہنا ضروری تھا۔ وہ دُہرا کھیل کھیل رہا تھا۔ اس نے یقیناً بڑے کنور کو میرے بارے میں غلط بتایا ہوگا کیونکہ بڑے کنور کا پہلا حکم یہ تھا کہ مجھے زندہ رکھ کر اس کے پاس لایا جائے اور رامن پہلی فرصت میں مجھے دنیا سے رخصت کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے گھوم کر اسپتال کے سامنے آنے کی کوشش نہیں کی بلکہ گلیوں اور چھوٹی سڑکوں سے ہوتا ہوا اسپتال سے دور نکل گیا تھا۔ رامن کا سائلنسر لگا پستول کارآمد چیز تھی اس کی مہربانی سے میرے اسلحہ خانے میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پہلے بھی دو عدد پستول ہاتھ لگے تھے اور یہ تیسرا تھا۔ ایک جگہ سے ٹیکسی لی اور ہوٹل پہنچا۔

پہلے اپنے کمرے میں آیا۔ گرم پانی سے غسل کیا تو چوٹوں کو خاصا آرام ملا تھا۔ کوئی چوٹ ایسی نہیں تھی جس کا ظاہری اثر نظر آتا۔ بس کسی قدر ہونٹ کا گوشہ سوجا ہوا تھا اور وہ بھی غور سے دیکھنے پر پتا چل رہا تھا۔ غسل سے فارغ ہو کر روم سروس کو کافی اور کسی نارمل پین کلر کا کہا۔ دونوں چیزیں کچھ دیر میں پہنچ گئیں۔ اس دوران میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے پاکستان والوں سے رابطے کے لیے کوئی محفوظ ذریعہ تلاش کرنا چاہیے اور اس کا سب سے محفوظ ذریعہ انٹرنیٹ ہو سکتا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ خود مارکیٹ میں گھومنے کے بجائے یہ کام ہوٹل والوں سے لوں جو راؤ وِیاس کی وجہ سے میرے خادم بنے ہوئے تھے۔ میں نیچے منیجر کے پاس آیا اس نے گرم جوشی سے استقبال کیا۔ "کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟"

"آپ پہلے ہی بہت خدمت کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے ایک اچھا لیپ ٹاپ انٹرنیٹ کے ساتھ چاہیے۔"

"یعنی آپ کو صرف لیپ ٹاپ چاہیے کیونکہ ہوٹل میں ہمارے کسٹمرز کے لیے وائی فائی ہے۔"

"نہیں مجھے الگ سے انٹرنیٹ چاہیے۔ اگر یو ایس بی ڈیوائس ہو تو سب سے بہتر ہے۔"

"ویسے ہمارا وائی فائی بھی سو فیصد محفوظ ہے لیکن جیسے آپ حکم کریں۔ آپ ماڈل بتا دیں میں ابھی منگوا دیتا ہوں۔"

"ماڈل کیسے بتاؤں؟"

منیجر نے اپنے کمپیوٹر پر لیپ ٹاپ سے متعلق ایک سائٹ کھولی اس میں وہ سارے ماڈلز تھے جو انڈیا میں دستیاب تھے۔ میں نے سونی کا ایک چھوٹا لیپ ٹاپ پسند کیا۔ اس کا سائز مختصر تھا اور وزن بھی کم تھا اسے یہ آسانی کہیں بھی لے جایا جا سکتا تھا اور یہ کارکردگی میں کسی دوسرے لیپ ٹاپ سے کم نہیں تھا۔ مہنگا تھا مگر رقم کا مسئلہ نہیں تھا میں نے انڈین روپے میں اس کی قیمت دیکھی اور رقم منیجر کے سامنے رکھی۔ "یہ منگوا دیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "پلیز ہمیں رانا صاحب کی طرف سے سختی سے حکم ہے کہ آپ سے کوئی چارج نہ کیا جائے اور آپ جو سہولت چاہیں وہ آپ کو فراہم کی جائے۔"

"یہ میری ذاتی ضرورت ہے۔" میں نے کہا لیکن منیجر نہیں مانا تھا مجبوراً مجھے رقم واپس اٹھانا پڑی۔ اس نے کہا۔

"ایک گھنٹے کے اندر دونوں چیزیں آپ کے پاس پہنچ جائیں گی اور اگر کوئی مدد درکار ہوگی تو ہمارا آئی ٹی کا آدمی موجود ہے۔"

اس کا شکریہ ادا کر کے میں اوپر آیا۔ بانو شاید میری منتظر تھی کیونکہ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو اس نے بھی اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور مجھے دیکھ کر بولی۔ "آپ آ گئے میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "تمہارا ابھی کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔"

وہ ہنسی اور دروازہ بند کر کے میرے کمرے میں آ گئی۔ "مجھ سے آپ اتنی آسانی سے جان نہیں چھڑا سکتے جیسے اوشا سے چھڑا لی ہے۔"

"تمہارے ساتھ مجھے ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" میں نے سرسری سے انداز میں کہا۔ "تم جانتی ہو اوشا کی چکر میں تھی اور میں اسے ساری عمر کے لیے گلے کا طوق نہیں بنا سکتا...... دوسرے وہ اسی ملک کی رہنے والی ہے جب کہ تم میری ہم وطن اور ہم مذہب ہو۔ اوشا میری عارضی ذمے داری تھی لیکن تم میری مستقل ذمے داری ہو جب تک تم سیٹل نہ جاؤ۔"

"میں نے آج ہوٹل کے جم میں ایکسرسائز کی ہے۔ وہاں لیڈیز کے لیے الگ جگہ ہے۔"

"ابھی تمہیں احتیاط کی ضرورت ہے۔"

"میں نے رک رک کر ایکسرسائز کی اور زیادہ مشکل والی نہیں۔ اصل میں، میں ایکسرسائز کی عادی ہو گئی ہوں جب تک نہ کر لوں بے چینی رہتی ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ ویسے تم فٹ ہو لیکن میں چاہتا ہوں کہ مکمل فٹ ہو جاؤ۔" میں نے کہا۔

"اسپتال میں کیا رہا... راج کنور سے ملاقات ہوئی؟"

"راج کنور سے بھی ہوئی اور اس کے سابق گرگے رامن سے بھی ہوئی۔ وہ بھی کیا یاد کرے گا جب مجھ سے ملتا ہے کچھ ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے اس کی۔"

بانو فکر مند ہو گئی۔ "آپ کا اس سے جھگڑا ہوا؟"

"اس نے تو مارنے کی کوشش کی تھی۔" میں نے کہا اور بانو کو تفصیل سے اسپتال میں پیش آنے والا واقعہ سنایا۔ اس نے جھرجھری لی۔

"آپ نے بہت بڑا خطرہ مول لیا۔"

"اب تو عادت ہو گئی ہے اور بہت مواقعوں پر اس طرح بچا ہوں کہ اس معاملے میں دل پکا ہو گیا ہے کہ موت سے پہلے مروں گا نہیں اور جب وقت آئے گا تو جی نہیں سکوں گا۔"

"آپ نے اسے زندہ چھوڑ کر اچھا نہیں کیا اس جیسے موذی کا سر فوراً کچل دینا چاہیے تھا۔ آپ نے دیر کی اور اس کا آدمی آ گیا۔"

"سوچا تو میں نے بھی یہی تھا لیکن ایک تو بے بس آدمی پر ہاتھ نہیں اٹھا۔ دوسرے اس کے مرنے سے میرے آئندہ کا پلان متاثر ہوتا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ اچھا ہی ہوا۔"

"کیسا پلان؟"

"یہاں سے واپسی کا۔"

بانو سنجیدہ ہو گئی۔ "شہباز صاحب، کیا ہمیں یہاں سے فوراً نہیں چلے جانا چاہیے۔ ہمارے لیے خطرات بڑھتے جا رہے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں لیکن یہاں ہم محفوظ ہیں اور اگر تم سمجھ رہی ہو کہ واپس جانا آسان ہے تو تم غلطی پر ہو۔ انڈیا

کی طرف سے چھپ کر سرحد عبور کرنا مشکل ترین کام ہے۔ اس پوری سرحد پر انڈین سیکورٹی فورس اور پولیس نے اس طرح پہرہ لگا رکھا ہے کہ چڑیا کا بچہ بھی ان سے چھپ کر نہیں جاسکتا۔"

"لیکن سرحد کے دونوں طرف اسمگلنگ تو ہوتی ہے۔"

"وہ باہمی رضا مندی سے ہوتی ہے۔ لیکن میرا معاملہ دوسرا ہے۔ میں بھارت کو مطلوب ہوں اور یقیناً بھارت نے اسمگلروں میں اپنے ایجنٹ چھوڑ رکھے ہوں گے۔ حکومت کو اسمگلنگ پر اعتراض نہیں ہوگا لیکن اگر اس کی آڑ میں ملک کے خلاف کچھ ہو یا ان کے مطلوبہ افراد سرحد پار آئیں جائیں تو وہ اس سے نمٹنے کے لیے یقیناً تیار ہوں گے۔ فرض کرو ہم کسی اسمگلر سے رابطہ کرتے ہیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ بھارتی ایجنٹ نہیں ہوگا۔ اول تو ایسا اسمگلر تلاش کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ ہم یہاں کسی کو نہیں جانتے.... اور اپنے بل بوتے پر سرحد پار کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ خاص طور سے تمہارے ہوتے ہوئے میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔"

"آپ رانا ویاس سے مدد نہیں لے سکتے؟"

"رانا ویاس کا حلقۂ اثر بنگال ہے۔ یہ جگہ وہاں سے بہت دور ہے، وہ اپنا سرکاری اثر و رسوخ بھی استعمال نہیں کر سکتا.... پچھلی بار وہ میری وجہ سے حکومت کی نظر میں مشکوک بن گیا تھا۔ جب اس نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو پناہ دی تھی۔ وہ اس طرح سے مدد کر سکتا ہے لیکن سرحد پار کرانا دوسرا مسئلہ ہے۔ اس میں وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتا ہے۔"

"پھر بھی آپ اس سے بات تو کر کے دیکھیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ جب میری اس سے بات ہوئی اور اسے پتا چلا کہ میں انڈیا کی سرزمین پر ہوں تو اس نے مجھے اپنے پاس بلانے یا واپسی میں مدد کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اس کا واضح مطلب ہے کہ وہ اس معاملے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، اتنا تو رانا ویاس بھی سمجھتا ہوگا کہ آپ کا سب سے بڑا مسئلہ انڈیا سے واپس جانا ہے اور اس نے کوئی پیشکش نہیں کی۔" وہ قائل ہوگئی۔

"میرا سب سے بڑا سہارا اللہ ہے اور مجھے بھروسا ہے کہ میں واپس جاسکتا ہوں۔"

شام قریب تھی بانو نے روم سروس کو کال کر کے چائے اور ریفریشمنٹ کا کہا۔ بیس منٹ بعد ان چیزوں کے ساتھ منیجر کا آدمی لیپ ٹاپ اور یو ایس بی انٹرنیٹ ڈیوائس بھی لے آیا۔ اس نے تعارف کرایا۔ "میں سومترنجن ہوں سر، نوٹ بک میں تمام ضروری سوفٹ ویئر انسٹال ہیں پھر بھی کسی سافٹ ویئر کی ضرورت ہو تو مجھے طلب کر لیجیے گا۔ انٹرنیٹ ڈیوائس بھی ریڈی ہے۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے رخصت کر دیا۔ بانو چائے تیار کر رہی تھی، اس نے دل چسپی سے پوچھا۔ "اس سے آپ پاکستان رابطہ کریں گے؟"

"ہاں ارادہ تو یہی ہے۔" میں نے کہا۔ میں نے ایڈاپٹر لگا کر لیپ ٹاپ کھول کر آن کیا اور اسے چیک کرنے لگا۔ ابھی اس کی بیٹری پوری طرح چارج نہیں تھی۔ اس میں واقعی کام کے سارے سافٹ ویئرز انسٹال تھے۔ میں نے یو ایس بی لگائی۔ یہ پلگ اینڈ پلے تھی۔ انٹرنیٹ اسپیڈ بھی اچھی تھی۔ اس دوران میں چیزوں کے ساتھ چائے بھی لیتا رہا۔ مجھے مانی کا انٹرنیٹ اکاؤنٹ یاد تھا جس سے کسی موبائل یا فکسڈ فون پر کال کی جاسکتی۔ میں نے اسے آن کیا۔ مگر جب میں نے یوزر آئی ڈی اور پاس ورڈ ڈالا تو سرور نے اسے مسترد کر دیا۔ میں نے دوبارہ کوشش کی اس بار بھی یہی نتیجہ نکلا۔ اس کا مطلب تھا کہ مانی نے پاس ورڈ چینج کر دیا تھا۔ میں نے مایوس ہو کر سائٹ بند کر دی۔ اس مسئلے کا حل تو میں نے نیٹ پر سرچ کیا اور کچھ ایسے میسنجر نکال لیے جن پر کریڈٹ کی مدد سے دنیا میں کسی بھی فون نمبر پر کال کی جاسکتی تھی۔ ان میسنجرز کی تعداد درجنوں میں تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ خود آزمانے کے بجائے سومترنجن سے مشورہ کر لوں۔ میں نے آپریٹر سے اسے ملانے کو کہا۔ وہ لائن پر آیا تو میں نے میسنجرز کے بارے میں مشورہ کیا اس نے کہا۔

"آپ اسکائپ کر لیں یہ نیا آیا ہے لیکن اس کی کارکردگی بہت اچھی ہے۔"

"مجھے فون پر کال کرنی ہے۔"

"آپ اس کا کریڈٹ لے کر کال کر سکتے ہیں۔"

"کریڈٹ کہاں سے ملے گا؟"

"آپ کی اجازت ہو تو میں آکر کر دیتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"کیوں نہیں فوراً آجاؤ۔" میں نے جواب دیا۔

پندرہ منٹ بعد آیا۔ اس وقت تک میں نے اپنی آئی ڈی بنالی تھی۔ اس نے آکر کسی ایسے اکاؤنٹ کی مدد سے مجھے اسکائپ کریڈٹ دیا جو انٹرنیٹ کے ذریعے ادائیگی کر سکتا تھا۔ اس نے کہا۔

"میں نے ہزار منٹ کر دیے ہیں اگر آپ کو مزید ضرورت ہو تو مجھے طلب کر لیجیے گا۔"

سومترنجن کام کا آدمی ثابت ہوا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اسکائپ کی مدد سے عبداللہ کا نمبر ملایا۔ اپنے ساتھیوں میں مجھے اسی کا نمبر یاد تھا۔ یا پھر حویلی کا اور سویرا کا نمبر یاد تھا۔ عبداللہ نے کچھ دیر بعد کال ریسیو کی اور محتاط انداز میں بولا۔ "ہیلو....."

"عبداللہ۔" میں نے کہا تو وہ چلا اٹھا تھا۔

"شہباز صاحب آپ؟" نوٹ بک کے اسپیکر سے عبداللہ کی تیز آواز آئی۔ "میرا خدا آپ کہاں ہیں؟"

"اسی دنیا میں ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں چند دن پہلے تم کو کال کر رہا تھا لیکن تم اٹھا نہیں رہے تھے اس لیے پھر میں نے سویرا کو کال کی۔"

"جی انہوں نے بتا دیا تھا۔ یہاں سگنل پرابلم تھی اس لیے مجھے پتا نہیں چلا۔" عبداللہ نے کہا۔ "ہم سب آپ کے لیے پریشان تھے وہ تو بیتو ممتاز کی قید سے بھاگ کر آیا تو ہمیں پتا چلا کہ آپ کہاں تھے؟ وسیم اور سفیر لاہور گئے تھے مگر پتا چلا کہ آپ وہاں بھی نہیں ہیں۔"

"ممتاز نے کیا جواب دیا؟"

"اس کا کہنا ہے کہ آپ اس کے گھر دو افراد کو قتل کر کے فرار ہو گئے۔"

"وہ ٹھیک کہتا ہے، کیونکہ اصل حقیقت اسے بھی نہیں معلوم ہے۔ مگر مجھے قید رکھنے کا ذمے دار وہی تھا۔" میں نے کہا اور مختصراً عبداللہ کو اپنی سرگزشت سنائی۔ وہ دنگ رہ گیا

"حرامزادہ.... معصوم بن رہا تھا۔" اس نے ممتاز کی شان میں گستاخی کی۔ "وسیم ٹھیک کہہ رہا تھا کہ آپ کی گمشدگی میں اسی کا ہاتھ ہے۔ وہ تو مرنے مارنے پر تلا ہوا تھا بڑی مشکل سے میں نے اور سفیر نے اسے روکا۔"

"تم لوگوں نے ٹھیک کیا۔" میں نے کہا۔ "ممتاز بہت طاقتور سیاست دان ہے اور اس سے مخاصمت ہمارے لیے مشکلات کھڑی کر سکتی ہے کبھی فرصت ملی تو اسے بھی دیکھ لیں گے۔"

"آپ کہاں ہیں؟"

"انڈیا کے شمال میں ایک ریاست ہے ہماچل پردیش، میں اس کے دارالحکومت شملہ میں ہوں۔ بڑی خوب صورت جگہ ہے۔" میں نے کہا۔ "تم اسکائپ پر آسکتے ہو؟ میں باقی سب سے بھی بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں آسکتا ہوں، سفیر اور بیتو باہر گئے ہیں۔ وسیم ہے۔"

"بس تو اسکائپ پر آجاؤ۔ میں دس منٹ میں لاگ ان ہوتا ہوں۔" میں نے عبداللہ کو اپنی اسکائپ آئی ڈی بتائی اور کال کاٹ دی۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں اس قسم کی کالز بھی چیک نہ ہوتی ہوں کیونکہ ان کی تعداد محدود ہوتی ہے اس کے مقابلے میں میسنجر پر بات کرنا زیادہ محفوظ تھا اس پر بیک وقت لاکھوں کروڑوں لوگ بات کرتے ہیں اور سب کی نگرانی بہت مشکل کام ہے۔ میں نے کال کاٹ کر سومترنجن سے رابطہ کیا۔ "مجھے ایک اچھا ہیڈ فون مائیک درکار ہے۔"

"میں بھجواتا ہوں سر۔"

بانو خاموشی سے سن اور دیکھ رہی تھی اس نے کہا۔ "آپ اپنے ساتھیوں کو میرے بارے میں کیا بتائیں گے؟"

"جو سچ ہے۔" میں نے کہا۔

وہ جھینپی۔ "کہیں وہ غلط نہ سمجھیں۔"

"اگر انہوں نے غلط سمجھا تو میں سمجھوں گا کہ میں نے ان کو غلط سمجھا تھا ویسے فکر مت کرو وہ بالکل بھی غلط نہیں سمجھیں گے۔"

چند منٹ بعد ایک ویٹر ڈبا پیک ہیڈ فون مائیک دے گیا۔ میں نے اسے لگا کر اسکائپ پر لاگ ان کیا۔ عبداللہ کی ریکوئسٹ آگئی تھی اسے قبول کیا۔ وہ آن لائن تھا۔ میں نے ویڈیو کال کی۔ فوراً ہی اسکرین پر عبداللہ اور اس کے ساتھ سر گھسائے وسیم کی تصویر آئی اسی طرح بانو میرے عقب میں تھی اور وہ بھی ویب کیم میں دکھائی دے رہی تھی۔ اس سے پہلے میں کچھ کہتا عبداللہ نے دل چسپی سے کہا۔ "یہ آپ کے پیچھے کون ہیں۔"

"بانو۔" میں نے تعارف کرایا۔ "ممتاز کی بیٹی بنٹی کی سیکریٹری تھی۔"

عبداللہ اور وسیم اچھل پڑے۔ "اور یہ آپ کے ساتھ ہے؟"

"ہاں، کیونکہ اب یہ ہمارے ساتھ ہے۔" میں نے

جواب دیا۔ ”ویسے میرا خیال تھا کہ پہلے تم لوگ میرا احوال دریافت کرو گے۔“

”سوری۔“ وسیم شرمندہ ہوگیا۔ ”آپ کیسے ہیں؟“

”تمہارے سامنے ہوں۔“ میں نے کہا۔ وہ دونوں بے چین تھے کہ میں جلد از جلد انہیں اپنی روداد سناؤں۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ بیتو اور سفیر بھی آجائیں تو ایک ساتھ ہی سنا دوں ورنہ دوبارہ سنانی پڑتی۔ عبداللہ نے سفیر کو کال کر دی تھی اور وہ گھر کی طرف آرہے تھے۔ کیونکہ ہیڈ فون سے صرف میں سن سکتا تھا اس لیے میں نے ہیڈ فون اتار دیا تاکہ بانو بھی سن سکے ویسے بھی لیپ ٹاپ کے اسپیکر خاصے طاقتور تھے۔ وقت گزاری کے لیے پہلے عبداللہ نے بتایا۔

”آپ نے جب لاہور سے رابطہ نہیں کیا تو میں پریشان ہوگیا۔ آپ سب کے نمبر بند جارہے تھے۔“

”بس یار ممتاز کی دختر نے ایسے چکر دیے کہ اب تک چکر آرہے ہیں۔ وہ مجھے مہمان بنا کر لے گئی تھی لیکن اس کے باپ نے قیدی بنا لیا۔ کنور خاندان سے اس کے کچھ تعلقات ہیں انہوں نے ممتاز سے درخواست کی تھی کہ مجھے تلاش کیا جائے۔ ممتاز ایک لحاظ سے میرا احسان مند تھا کہ میں نے اسے بدنامی سے بچایا تھا۔ یہ قصہ تو تم لوگوں کے علم میں ہے۔“ میں نے بانو کی موجودگی میں تفصیل میں جانے سے گریز کیا۔ ”اس لیے اس نے قید تو کر لیا لیکن مجھے کنوروں کے حوالے نہیں کیا۔“ میں نے بتایا کہ ممتاز نے کیا درمیانی راستہ نکالا تھا۔

”پھر آپ انڈیا کیسے پہنچے؟“

”بدقسمتی سے یہاں ایک ملازم انڈین اور کنور خاندان کا ایجنٹ تھا اسی نے سازش کی۔ پہلے میرا خون بہت زیادہ مقدار میں لیا جانے لگا جب مجھے شک ہوا اور میں نے طریقۂ واردات پکڑ لیا تو مجھے بے ہوش کر کے انڈیا منتقل کر دیا۔ اس وقت بھی مجھے علم نہیں ہوا تھا کہ میں انڈیا میں ہوں۔ جب سکھوں کو دیکھا تو پتا چلا۔“ باتوں باتوں میں نہ چاہتے ہوئے بھی میں خاصا کچھ بتا گیا تھا۔ ”تم لوگ اس دوران میں کیا کرتے رہے؟“

”جب مجھے پتا چلا تو میں حویلی سے یہاں آگیا۔“

”اس کا زخم ٹھیک نہیں تھا لیکن یہ رکنے کے لیے تیار نہیں تھا۔“ عبداللہ نے انکشاف کیا۔ ”بڑی مشکل سے سفیر کے واپس آنے تک روکا۔“

”پھر میں اور سفیر لاہور روانہ ہوئے۔ ہمیں ایک خطرہ یہ تھا کہ کہیں آپ پرانے دشمنوں کے ہتھے نہ چڑھ گئے ہوں جن میں شاہنواز کے گروہ کے لوگ تھے۔ وہ ابھی سرگرم ہیں لیکن جب میں نے اپنے ذرائع سے معلوم کیا تو ان میں سے کوئی بھی ملوث نہیں نکلا۔ پھر ہم نے تھانوں میں معلوم کیا، ہر اس جگہ گئے جہاں آپ کے اور بیتو کے پائے جانے کا امکان ہو سکتا تھا۔ مگر آپ کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔“

”تم لوگوں نے اس گاڑی والے کو نہیں تلاش کیا جسے ہم لے گئے تھے؟“

”وہ بہت مشکل سے ملا۔ اتفاق سے اس کا نمبر بھی سفیر سے مس ہوگیا تھا۔ اس نے صرف اتنا بتایا کہ ایک لڑکی نما عورت آپ کو لے گئی تھی اور وہ بہت دولت مند اور اونچے خاندان کی لگ رہی تھی۔ اس کے بعد ہم اس کھوج میں پڑ گئے کہ ایسی کون سی بہت دولت مند اور اونچے خاندان کی لڑکی نما خاتون ہے جس کے ساتھ آپ راضی بہ رضا اور خوش خوش چلے جائیں اور پھر غائب ہو جائیں۔“

”دوسرے لفظوں میں تم لوگ ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے۔“

”جب تک بیتو نہیں ملا۔“ وسیم نے اعتراف کیا۔

”کارنامہ تو اس کے بعد بھی کوئی انجام نہیں دیا تھا۔“ عبداللہ نے دبے لفظوں میں کہا تو وسیم بھنا گیا۔

”تم لوگوں نے میری ٹانگ پکڑ رکھی تھی ورنہ میں ممتاز کو اس کی اوقات بتاتا۔“

”عبداللہ نے ٹھیک کیا، ممتاز سے الجھنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ اس سے مجھ پر کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔ یہ چکر ہی دوسرا تھا میرے سرحد پار دشمن پوری طرح حرکت میں آگئے ہیں۔“

وسیم فکرمند ہوگیا۔ ”یہ تو پرانی صورت حال ہو گئی ہے۔ پہلے بھی ہم کتنی مشکلات سے نکلے تھے۔“

”مشکلات اب بھی ہیں۔“

اسی اثنا میں سفیر اور بیتو آگئے۔ بیتو آگے تھا اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ویب کیم سے گھس کر میرے پاس پہنچ جائے۔ وہ جذباتی ہو کر تقریباً رونے لگا تھا اور جب اسے معلوم ہوا کہ میں کہاں ہوں تو اس نے کہا۔ ”ہم بھی وہاں آئے گا۔“

”کوئی نہیں آئے گا۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”میں خود یہاں سے نکلنے کی فکر میں ہوں۔“

سفیر نے حسب معمول گالیاں دیں اور پھر

منظر میں موجود بانو کو دیکھ کر اس کی زبان کو بریک لگ گئی۔ میں نے کہا۔ ”بیٹے تم گئے تھے دبئی مزے کرنے اور ہمیں دشمن لے گئے۔“

”مزے تو تمہارے بھی کم نہیں تھے۔“ اس نے بھنا کر کہا۔ ”ملا تھا ان خاتون سے... وہ کسی کو بھی اغوا کر کے جا سکتی ہے۔“ اس کا اشارہ بنٹی کی طرف تھا۔ ”میں نے وسیم سے کہا کہ اسے اٹھا لیتے ہیں، اس کا باپ بھی شہباز کو واپس کرے گا۔“

”یہ تجویز مونا نے ویٹو کر دی ہوگی۔“

”مونا سے پہلے سادی۔“ وسیم نے کہا۔ ”شادی کے بعد یہ خواتین ہمارے پیشہ ورانہ امور میں بھی مداخلت کرتی ہیں۔“

”شوبی ان کی باتوں میں مت آنا۔“ بیتو نے خبردار کیا۔ ”یہ آپ کو شادی کے خلاف بہکاتا ہے۔“

”بہکاتے نہیں خبردار کرتے ہیں کہ بعد میں نہ پچھتائے۔“ سفیر بولا۔

”تم فکر مت کرو یار، میں بھی شادی کے بعد پچھتا لوں گا۔“

”سویرا دیدی بہت اچھا ہے، ان کی بیویوں کی طرح نہیں ہے۔“ بیتو نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔ سفیر نے اس کی گردن دبوچی اور وسیم نے اس کا ساتھ دیا، بڑی مشکل سے عبداللہ نے اسے چھڑایا۔ ایک منٹ کے لیے اچھا خاصا ہنگامہ ہوا تھا۔ بیتو نے اپنی گردن سہلاتے ہوئے خفگی سے کہا۔ ”آپ لوگ خود صبح سے شام تک ان کے بارے میں کیا کیا بولتا ہے میں نے کبھی گردن پکڑا۔“

”وہ ہماری بیویاں ہیں۔“ سفیر غرایا۔ ”کسی کے منہ سے ہم ان کے بارے میں ایک لفظ نہیں سن سکتے۔“

”ہاں ایک لفظ تو ان کے لیے بہت کم ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”کم سے کم ایک پیراگراف تو ہو۔“

”بیٹے تم دور بیٹھے ہو اس لیے بول سکتے ہو۔“ سفیر نے گھورا۔ بانو مسلسل ہنس رہی تھی۔ ”ان خاتون کو بہت ہنسی آرہی ہے۔“

”حالانکہ رونے کا مقام ہے۔“

”میرا نام بانو ہے۔“ بانو بولی۔ ”آپ بار بار خاتون نہ کہیں۔“

”ٹھیک ہے نہیں کہتے۔“ سفیر نے سرد آہ بھری۔ ”یہ

میواڑ

راجپوت ریاستوں کا اہم شہر۔ 728 میں بپار اول نے آباد کیا۔ مسلمان فاتح اس پر شدت سے حملہ آور ہوتے رہے۔ ان کے حملوں کو روکنے کے لیے وہاں کے راجوں مہاراجوں نے بھی بندوقوں کا ساتھ دیا۔ بعد میں مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس وقت یہاں سلطان ہمیر کی حکومت تھی۔ اس کے بعد حکومت اس کے خاندان کے دوسرے افراد میں منتقل ہوتی رہی۔ ایک حکمران لکش رانا دوسرے راجپوتوں کو شکست دیتا ہوا ”گیا“ تک اپنی سلطنت بڑھانے میں کامیاب ہوگیا۔ بعد کے اہم حکمرانوں میں رانا کمپاہ یا کمبھ کرنا 1433-1468ء کا نام آتا ہے۔ جس نے مالوہ اور گجرات کے حکمرانوں کو شکست دی اور گرفتار کر کے چتوڑ لے آیا۔ اس فتح کی خوشی میں اس مقام پر اس نے ”مینارِ فتح“ تعمیر کرایا۔ 1527ء، 1508ء تک اس پر رانا سنگھ کی حکومت رہی۔ جس کی زندگی جنگ وجدل میں گزری۔ بابر اور لودھی کی جنگ میں اس نے بابر کی حمایت کی۔ وہ سمجھتا تھا کہ بابر لودھی سے جنگ جیت کر یہاں سے چلا جائے گا۔ جب اس نے دیکھا کہ بابر کا ملک چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تو اسّی ہزار گھوڑوں، پانچ سو ہاتھیوں اور پٹھان اور میواتی راجپوتوں پر مشتمل کثیر فوج کے ساتھ بابر کو چیلنج کر دیا۔ فتح پور سیکری کے قریب ”قامو“ کے مقام پر دونوں میں جنگ ہوئی۔ بابر جنگ جیت گیا اور ان کو فرار ہی میں عافیت محسوس ہوئی۔ جنگ کے بعد وہ جلد ہی چل بسا۔ تاہم یہاں کے راجوں نے شکست تسلیم نہ کی۔ راجا پرتاپ چند 1597-1572ء اور راجا امر سنگھ 1620-1547ء مغلوں کے خلاف رہے۔ لیکن 1615ء میں ان کا جہانگیر سے معاہدہ ہوگیا۔ مالوہ حکومت کے انتشار کے بعد میواڑ کی مصوری بہت مشہور ہوئی جس میں مالوہ مصوری کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

مرسلہ: نعیم الدین، سیالکوٹ

شہباز بھی قسمت کا دھنی ہے۔"

"کوئی فضول بات نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "بانو نے یہاں بہت کڑے وقت میں میرا جس طرح ساتھ دیا ہے شاید تم لوگ بھی نہ دے پاتے۔"

"ظاہر ہے ہم کیسے دے سکتے ہیں۔" سفیر بدمعاشی پر آمادہ تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اب اصل موضوع پر آجاؤں۔

"اگر تم لوگ شرافت سے سننے کے موڈ میں ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں اسکائپ بند کر رہا ہوں۔"

اس پر وہ فوراً شریف بن گیا۔ بانو نے آہستہ سے میرے کان میں کہا۔ "یہ چھچھورے آدمی ہیں۔"

"ٹھیک پہچانا تم نے۔" میں ہنسا تو وہ سب چونک گئے۔

"میرے بارے میں کچھ کہا ہے۔" سفیر نے شک سے کہا۔

"نہیں تمہارے کان بج رہے ہیں۔" میں بولا۔ اتنے عرصے بعد اپنوں سے ہلکی پھلکی باتوں نے مجھے تازہ دم کر دیا تھا۔ میرے اندر ایک کہر سی جم گئی تھی۔ اس مختصر سی گفتگو نے وہ کہر پگھلا دی تھی۔ بانو نے کیتلی میں موجود چائے نکالی۔ یہ مخصوص میٹریل سے بنی کیتلی تھی جس میں چائے بہت دیر تک گرم رہتی تھی پھر میں نے اپنی داستان شروع کی۔ وہ سب ہمہ تن گوش ہو گئے تھے۔ درمیان میں سوالات بھی ہوتے رہے۔ پھر بات سے بات نکلتی رہی اور اکثر داستان ٹریک سے اتر کر آس پاس گھومنے لگتی تھی، اسے دوبارہ ٹریک پر لانا پڑتا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ یہ جلد ختم ہو جائے مگر بات مکمل ہوتے ہوتے بھی تین گھنٹے گزر گئے تھے۔ اس دوران میں بانو اپنے کمرے میں چلی گئی، وہ یہ سب جانتی تھی۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر کچھ ایسی باتیں کیں جو اس کی موجودگی میں نہیں کر سکتا تھا خاص طور سے سفیر کو خبردار کیا۔

"یار یہ بالکل مختلف مزاج کی لڑکی ہے۔ آج کا دور ایسا ہے کہ صرف لڑکے ہی نہیں لڑکیاں بھی جنس زدہ ہو گئی ہیں جہاں انہیں کسی مرد کے نزدیک آنے کا موقع ملتا ہے وہ خود کو اس سے وابستہ کر لیتی ہیں۔ مگر بانو اس معاملے میں بہت پختہ کردار کی لڑکی ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ میں نے اسے بہن بنالیا ہے یا وہ مجھے بھائی سمجھتی ہے لیکن ہمارے درمیان بہت صاف اور شفاف تعلق ہے۔ بہت دنوں سے وہ میرے ساتھ ہے لیکن میرے ساتھ اس کے رویے میں روزِ اوّل جیسی احتیاط ہے۔"

"سمجھ گیا یار، میں مذاق کر رہا تھا۔" سفیر بولا۔

"یار تیرا مذاق میں سمجھتا ہوں ہر ایک نہیں۔"

"شہباز صاحب یہاں آنے کے بعد وہ ہمارے ساتھ رہے گی؟" عبداللہ نے سوال کیا۔

"یا اسے بھی پناہ گزین کیمپ بھیج دیا جائے گا؟" وسیم نے لقمہ دیا، اس کا اشارہ حویلی کی طرف تھا۔

"پہلے واپس تو آلینے دو۔" میں نے کہا۔

"وہاں کے حالات سمجھ میں آگئے ہیں۔" وسیم نے کہا۔ "لیکن آپ واپسی کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں آپ نے بتایا نہیں۔"

"میں راج کنور کو استعمال کرنے کا سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس کے پاس ذریعہ ہے، وہ ہیلی کاپٹر میں سرحد پار آتا جاتا رہا ہے۔"

"اس پر بھروسا کرنا خطرناک ہوگا۔" سفیر نے اعتراض کیا۔ "وسیم کا سالا سخت ناقابلِ اعتبار شخص ہے۔"

"وہ میرا سالا نہیں ہے۔" وسیم بولا۔

"جورو کا بھائی اور کیا کہلائے گا۔" سفیر نے وسیم کا اعتراض مسترد کر دیا۔

"وسیم بھائی کا سالا صرف ہم ہے۔" بیتو نے صرف سفیر کی بات کی نفی کے لیے سالا ہونے کا دعویٰ کیا۔

"ہاں بیٹے تم شکل سے پیدائشی سالے لگتے ہو۔" سفیر نے اسے گھورا۔

"سیز فائر..... بہت دیر ہو گئی ہے۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "ابھی مجھے فائیو اسٹار ڈنر بھی کرنا ہے۔"

"مزے ہیں تیرے۔" سفیر نے رشک سے کہا۔ "کمرا تو بڑا شاندار نظر آرہا ہے۔"

"یہ شاید سیون اسٹار ہوٹل ہے لیکن رانا ویاس کی مہربانی ہے۔"

وسیم نے کہا۔ "شہباز صاحب میرا خیال ہے کہ آپ کسی پر زیادہ بھروسا نہ کریں۔ رانا ویاس مخلص آدمی ہے لیکن اس کے آس پاس دوسرے لوگوں کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے ان میں سے کوئی سرکاری ایجنٹ ہوا تو آپ مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں کوشش کر رہا ہوں جلد از جلد یہاں سے نکل جاؤں۔" میں نے کہا۔ "ایک دو اور

میں اپنے پلان کو حتمی صورت دے کر میں تمہیں بتاتا ہوں۔"

"شہباز صاحب لیپ ٹاپ اور انٹرنیٹ آپ کا ہے؟" عبداللہ نے سوال کیا۔

"ہاں میرا ہے۔"

"تب آپ اسکائپ آن رکھیں اس سے رابطے میں آسانی رہے گی۔"

"ٹھیک ہے میں آن رکھوں گا۔"

"کاش میں آپ کے پاس آسکتا۔" وسیم نے سرد آہ بھری۔

"ہم بھی جائے گا۔" بیتو نے فوراً مطالبہ کیا۔

"بیٹے یہ کسی اور چکر میں جا رہا ہے۔" سفیر نے حسبِ معمول شرارت کی۔ "شہباز کا تو صرف بہانہ ہے۔"

"بچے کو مس گائیڈ مت کرو۔" وسیم نے اسے گھورا۔

"ہم مس کیسے ہو سکتا ہے۔" بیتو نے اعتراض کیا۔ "ہم کو معلوم ہے مس لڑکی کو کہتے ہیں۔"

"مانی، ایاز اور دوسرے لوگ کہاں ہیں؟"

"مانی اور ایاز بھگوال والی حویلی میں ہیں۔" عبداللہ نے بتایا۔ "مانی وہاں کام کر رہا ہے۔"

"یہاں کوئی دوسرا ٹھکانا دیکھا؟"

"نہیں، فی الحال اسی کوٹھی میں ہیں لیکن مانی نے یہاں بہت اچھی ای سیکیورٹی کر دی ہے۔"

"یعنی کام جاری ہے، دشمنوں کا کیا احوال ہے۔ مرشد نے مزید کوئی گند تو نہیں کی؟"

"نہیں، ان دنوں بالکل سدھرا ہوا ہے۔ تیرے کیس پر کام جاری ہے، پرسوں پیشی ہے شاید اس میں کوئی پیش رفت ہو لیکن ندیم مطمئن ہے۔ وہ تیرے یہاں جانے سے خوش ہے۔ اس کا کہنا ہے تو بے شک جہنم میں رہ لیکن ابھی یہاں مت آنا۔"

"اس کی خواہش تقریباً پوری ہوئی، یہ سارا عرصہ میں نے جہنم جیسی قید میں ہی گزارا ہے۔"

کچھ دیر ان لوگوں سے بات کر کے میں کال ختم کرنے والا تھا کہ سفیر کو خیال آیا۔ "یار اب حویلی میں بھی انٹرنیٹ لگ گیا ہے۔ مانی نے وہاں فون لائن ڈی ایس ایل کرائی تھی اور ایک عدد لیپ ٹاپ بھی چھوڑ آیا ہے۔ ہم لوگ بھی اسکائپ پر بات کر لیتے ہیں۔"

"یہ تو اچھا ہے۔" میں خوش ہو گیا۔ "بہت دن ہو گئے سب کو دیکھے ہوئے۔"

میمن جماعت

اہلِ سنت کی تبلیغی جماعت، جس نے زیادہ تر کاٹھیاواڑ میں کام کیا۔ اہلِ میمن کا بیان ہے کہ حضرت عبدالقادر شاہ جیلانی نے اپنے بیٹے تاج الدین کو سندھ جا کر تبلیغ کرنے کو کہا۔ وہ خود ایسا نہ کر سکے۔ ان کی نسلوں نے یہ فرائض پورے کیے۔ اور ایک بزرگ سید یوسف الدین قادری 1421ء میں سراق سے سندھ آئے اور ٹھٹھہ کو، جو اُن دنوں صدر مقام تھا اپنا مسکن بنایا۔ جلد ہی لوہانہ خاندان کو اسلام کی جانب مائل کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس جماعت کو آج بھی لوہانہ ذاتوں میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ سندھ کے ہندو تجارت پیشہ افراد بھی اسلام پر ایمان لائے۔ میمن انہی کی نسلوں سے ہیں۔ سید یوسف الدین کے واپس سراق چلے جانے پر ان کے جانشینوں نے مندرہ کو اپنا مرکز بنایا۔ یہ پیش کش انہیں کاٹھیاواڑ کے راجا نے کی تھی۔

مرسلہ: نعیم الدین، سیالکوٹ

"سب کو یا اُن کو؟" سفیر نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "سنا ہے وہ بھی بہت بے چین ہیں۔"

سفیر کی بات کا جواب میں نے کال کاٹ کر دیا اور بانو کے کمرے تک آیا۔ دستک کے جواب میں اس نے دروازہ کھولا تو اس کا چہرہ دھلا ہوا لگا اور آنکھوں میں بھی ہلکی سی نمی کی جھلک تھی۔ میں اندر آیا۔ "تم روئی ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔ "ہاں....."

"سفیر کی بات پر؟"

اس نے پھر سر ہلایا۔ "ہاں....."

"بانو میں اس کا دفاع نہیں کروں گا، اس کی زبان ایسی ہی بے قابو ہے ورنہ وہ دل کا برا نہیں ہے۔"

"یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ لیکن شہباز صاحب آپ کے لیے میرے دل میں جتنی عزت ہے۔ اس کے بعد کوئی آپ کے اور میرے تعلق کے بارے میں ذرا سی بات کرے تو مجھے بہت فیل ہوگا۔"

وہ اوپر سے بہت مضبوط ہوئی تھی اور اس نے حالات کا مقابلہ بھی کیا تھا، کسی موقع پر کمزوری نہیں دکھائی تھی لیکن اندر سے وہ کمزور سی لڑکی ہی تھی جسے ذرا سی بات رلا دیتی

ہے۔ ”میں سفیر کی طرف سے سوری کرتا ہوں۔“

”نہیں ..... نہیں مجھے ان سے بھی کوئی شکوہ نہیں ہے۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”پلیز آپ ایسا نہ کہیں۔ آپ مجھے ڈانٹ سکتے ہیں، مار سکتے ہیں لیکن سوری نہیں کہہ سکتے۔“

”اچھا بابا نہیں کہوں گا لیکن اب مسکراؤ۔ مجھ سے تمہاری سنجیدہ صورت برداشت نہیں ہو رہی۔“

وہ مسکرانے لگی پھر سنجیدہ ہو گئی۔ ”شہباز صاحب میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے آپ سے ملوایا اور آپ نے مجھے سہارا دیا۔“

”سب اللہ کا احسان ہے۔“ میں نے کہا۔ ”صرف میں تمہارا سہارا نہیں بنا بلکہ تم بھی میرا سہارا بنی ہو۔ اگر تم نہ ہوتیں تو شاید میں کنوروں کی قید سے آزاد نہ ہو پاتا۔“

”اس کے برعکس مجھے لگتا ہے جیسے آپ کو کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے اور آپ اکیلے ہی سب کر سکتے ہیں۔“

”ایسا نہیں ہے، میں ایک عام انسان ہوں اور ہر انسان کو دوسرے انسان کی مدد کی ضرورت رہتی ہے۔“ میں نے کہا اور موضوع بدل دیا۔ ”ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”نیک خیال ہے کیونکہ مجھے زور سے بھوک لگی ہے آج بہت دنوں بعد ایسی بھوک لگ رہی ہے۔“

”یہ جم جانے کا نتیجہ ہے اور بی بی اب ذرا احتیاط کرو۔ بعد میں تمہارا ہونے والا مجازی خدا مجھے کوسے گا کہ گل بانو کو گل خان بنا دیا۔“

وہ شرمائی۔ ”اب ایسا بھی نہیں ہے۔“

”اس کا پتا تو مجھے اس وقت چلا جب تمہیں پہاڑ کے اوپر سے اٹھا کر نیچے لایا تھا۔ یقین کرو آخر میں میری ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں اور سانس قابو میں نہیں رہا تھا۔“

”سچ میں بہت وزنی ہو گئی ہوں؟“ اس نے بے یقینی سے کہا۔ ”مجھے تو اپنا وزن زیادہ نہیں لگتا ہے۔“

”کل جم میں ویٹ کرنا، میرا اندازہ ہے تمہارا وزن پینسٹھ کے جی کے آس پاس ہوگا۔“

”لیکن اب مجھے ایسے اچھا لگتا ہے۔“ وہ انٹر کام اٹھاتے ہوئے بولی۔ اس نے روم سروس سے رابطہ کیا اور پھر مجھ سے پوچھ کر ڈشز لکھواتی رہی۔ انٹر کام رکھ کر اس نے کہا۔ ”بلکہ میں سوچتی ہوں کہ مزید مضبوط ہو جاؤں۔ جب ہم واپس جائیں گے اور میں اپنے بل بوتے پر زندگی گزاروں گی تب مجھے آسانی رہے گی۔“

”وہ بعد کی بات ہے اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو میرا تعاون ہمیشہ تمہیں حاصل رہے گا۔“

”شہباز صاحب میں جانتی ہوں اپنے ملک میں بھی آپ کی زندگی آسان نہیں ہے۔ وہاں بھی آپ کو دشمنوں سے اسی طرح چھپ کر رہنا پڑتا ہے۔ جب تک آپ اپنی معمول کی زندگی کی طرف نہیں آجاتے میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔“

میں نے انکار کیا۔ ”میں تمہیں مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔“

”پلیز۔“ اس نے اصرار کیا۔

”اچھا، اسے دیکھیں گے۔ میں بھی تمہیں ایسے ہی نہیں چھوڑ دوں گا جب تک مجھے اطمینان نہیں ہوگا تم میری ذمے داری رہو گی۔“

وہ خوش ہو گئی۔ ”یہ تو میں کہہ رہی ہوں میں آپ کی ذمے داری ہوں گی اور مددگار بھی۔“

روم سروس کے ویٹرز ڈنر لے آئے تھے۔ میں نے وسیم سے ایسے ہی کہا تھا کہ ڈنر فائیو اسٹار ہوگا یہ سچ مچ تقریباً فائیو اسٹار ڈنر ہی تھا۔ اس میں سترہ تو نہیں لیکن اچھی خاصی ڈشز ضرور تھیں۔ ویٹرز کے جانے کے بعد میں نے بانو کو گھورا۔ ”مال مفت دل بے رحم.....“

”رانا صاحب جتنے دولت مند ہیں ان کو کیا فرق پڑے گا۔“

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ کھانے کے دوران میں اسے بتاتا رہا کہ اسکائپ پر مزید کیا گفتگو ہوئی۔ حویلی کے ذکر پر اس نے تجسس سے پوچھا کہ وہاں کون کون تھا۔ اسے حویلی اور اس کے موجودہ مکینوں کے بارے میں بتایا۔ سویرا کے نام پر اس نے پوچھا۔ ”یہ کون ہیں؟“

”میرے بھائی کی بیوہ اور جب میں واپس جاؤں گا تو اس سے شادی کروں گا۔“

وہ تجسس میں پڑ گئی۔ ”کیا یہ آپ کی روایت ہے؟“

میں ہچکچایا۔ ”نہیں..... میں سویرا کو پسند کرتا ہوں۔“

”پہلے سے؟“ وہ سمجھ گئی تھی۔ میں نے گہری سانس لی اور پھر اسے اپنے اور سویرا کے تعلق کے بارے میں بتایا۔ وہ افسردہ ہو گئی۔ ”بہت سیڈ اسٹوری ہے۔ پہلے آپ کی محبت نہ مل سکی اور پھر بھائی نہ رہا۔“

”انسان کے مقدر میں جو ہوتا ہے وہی اسے ملتا ہے۔“ میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ میری بھوک ختم ہو گئی تھی۔

”کھائیں نا؟“

”نہیں بس کھا لیا۔“ میں نے ٹشو سے ہاتھ صاف کیا اور پھر واش روم کا رخ کیا۔ واپس آیا تو بانو بھی کھا چکی تھی اس نے روم سروس کو برتن لے جانے اور چائے کافی لانے کو کہا۔ میں نے اپنے لیے کافی کا کہا تھا۔ بانو نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”اگر سویرا کو پتا چلے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں تو وہ فیل نہیں کریں گی۔“

”وہ شک نہیں کرے گی کیونکہ مجھ پر اعتماد کرتی ہے۔“

”لیکن تم خود عورت ہو اور اچھی طرح جانتی ہو عورت حاسد ہوتی ہے۔ جسے چاہتی ہے اس کے آس پاس کسی کو برداشت نہیں کرتی ہے۔“

”میں سمجھتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

کافی کے بعد میں آرام کا کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ بانو خود بھی آرام کے موڈ میں تھی۔ میرا ارادہ حویلی بات کرنے کا تھا۔ میں نے اسکائپ آن کیا اور سویرا کا موبائل نمبر ملایا۔ رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے اور اس وقت حویلی میں سناٹا ہو جاتا تھا سب اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے تھے۔ پھر جس نے جاگنا ہوتا تھا وہ اپنے کمرے میں جاگتا لیکن محفل لگا کر رت جگا نہیں کیا جاتا تھا۔ سویرا اپنے کمرے میں تھی لیکن اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ پورا گینگ تھا۔ یعنی مونا، سادی، شمی اور شازیہ۔ سویرا نے محتاط انداز میں ہیلو کہا اور پھر میری آواز سن کر ذرا نارمل لہجے میں خیر خیریت پوچھی تو میں سمجھ گیا۔ ”تم اکیلی نہیں ہو؟“

”ہاں سب ہیں۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔ ایسا کرو اسکائپ پر آجاؤ۔“ میں نے کہا اور اسے اپنی آئی ڈی بتائی۔ اس نے کہا۔

”میں آپ کو ایڈ کرتی ہوں۔“

اس دوران میں پیچھے سے مونا، شمی اور سادی کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ پوچھ رہی تھیں کہ کون ہے شاید انہیں شک ہو گیا تھا کہ میں ہی ہوں۔ میں نے کال کٹ دی۔ چند منٹ بعد مجھے سویرا کی طرف سے ریکوئسٹ آئی۔ میں نے اسے قبول کیا اور پھر ویڈیو کال کرنے لگا۔ کمرے میں اکیلا تھا اس لیے ہیڈ فون مائیک لگا لیا۔ جیسے ہی کنکٹ ہو کر آئی۔ بیک وقت مونا، سادی اور شمی کے چہرے

میمون بن مہران

40-117ھ

کوفہ کی ایک ازدی عورت کے غلام تھے۔ بعد میں اس نے آپ کو آزاد کر دیا۔ عرصہ تک کوفہ میں رہے مگر 180ھ میں عبدالرحمن بن اشعث کی شورشوں سے تنگ آکر جزیرہ چلے گئے اور وہیں رہائش اختیار کی۔ محمد بن مروان کے زمانے میں خراسان کے بیت المال کے نگران تھے۔ بعد میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے انہیں جزیرہ کے خراج کا عامل بنا دیا۔ بعد میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات پر انہوں نے بھی استعفیٰ دے دیا۔ حدیث کے حافظ تھے، فقہ اور عمل و فعل میں بھی بہت ممتاز تھے۔

مرسلہ: ارشد عزیز، ساہیوال

نمودار ہوئے۔ میں نے ہڑبڑانے کی اداکاری کی۔ ”لاحول ولا..... کیا صورتیں ہیں۔“

”اچھا جی ہماری صورتیں پسند نہیں ہیں۔“ مونا چلائی۔

”ظاہر ہے انہیں تو ایک ہی صورت پسند ہو گی۔“ سادی بولی۔

”شوبی آپ کیسے ہیں۔“ شمی نے پوچھا۔ ”اللہ کتنا خوب صورت کمرا ہے۔ آپ کہاں ہیں؟“

”ایک سپر اسٹار ہوٹل میں جس کا سارا عملہ میرے آگے پیچھے ہوتا ہے۔ ان چڑیلوں سے بولو پیچھے ہٹیں۔ ان کی صورتیں دیکھنے والے آگئے ہیں اس لیے دوسروں کو نہ ڈرائیں۔“

”ہم تو نہیں ہٹیں گے۔“ مونا نے ڈھٹائی سے کہا۔

”ہم چڑیلیں ہیں۔“ سادی خفا ہو گئی۔ ”ٹھیک ہے جا رہے ہیں۔“

”کوئی نہیں جائے گا۔“ شمی نے اسے ڈانٹا۔ ”یاد نہیں کیا طے ہوا تھا؟“

کچھ دیر کی چھیڑ چھاڑ کے بعد وہ سب نارمل ہو گئیں اور پھر سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ ابھی میں ایک سوال کا جواب دے رہا ہوتا تھا کہ دوسرا سوال سامنے آجاتا۔ خدا

خدا خدا کر کے سوالات کا یہ سلسلہ ختم ہوا۔ پھر شازیہ نے مجھ سے سلام دعا کی، میں نے اس کے باپ کی تعزیت کی۔ وہ افسردگی سے بولی۔ ”پاپا نے جو کیا اس کا خمیازہ ہم نے بھی بھگتا اور انہوں نے بھی۔“

سویرا نے کہا۔ ”ماضی میں جو ہوا اسے بھول جاؤ، آنے والا کل اللہ نے چاہا تو ضرور اچھا ہوگا۔“

”اب تم ہماری ذمے داری ہو۔“ میں نے لقمہ دیا۔

”سنا ہے ایک ذمے داری وہاں بھی ہے۔“ مونا نے شرارت سے آنکھیں گھمائیں۔ وہ بانو کا ذکر کر رہی تھی اور یقیناً سفیر نے اسے بتا دیا تھا۔ وہ پیٹ کا ہلکا تھا اور مونا سے کوئی بات نہیں چھپا سکتا تھا۔ میں نے ان کو بانو کے بارے میں بتایا۔ سادی نے اعتراض کیا۔

”پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟“

”تاکہ تم لوگ میرا ناک میں دم نہ کر سکو۔ ایک ساتھ لا کر پیش کر دیتا تو تم لوگ خود ہی سب پوچھ لیتے اس سے۔“

”سن رہی ہو تم، حویلی تک لانے کا ارادہ ہے۔“ مونا نے سویرا سے کہا۔ وہ مسکرائی۔

”حویلی تک تو تم سب بھی آئی ہو۔“

”جی نہیں، ہماری بات دوسری ہے۔“ سادی تڑخ کر بولی۔ ”ہم شوبی کے کچھ لگتے ہیں۔“

”اپنی باتوں سے تو دشمن لگ رہی ہو۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”وہ کیا کہا ہے شاعر نے... ہوئے تم جس کے دوست....“

”آپ باتیں ٹالیں نہیں ان صاحبہ کے بارے میں بتائیں۔“ مونا بولی۔

”تم لوگ بولنے کا موقع دو تو بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا اور انہیں بانو کے بارے میں بتایا۔ جیسے جیسے میں بتا رہا تھا ان کا رویہ اور انداز بدلتا جا رہا تھا اور آخر میں وہ پرجوش ہو گئی تھیں کہ جلد از جلد بانو سے بات کرائیں۔ ”ابھی میں اپنے کمرے میں ہوں وہ بھی سو گئی ہوگی صبح بات کر لینا۔“

مونا کی صحت ٹھیک تھی اور سادی ذرا صحت مند ہو رہی تھی۔ وہ جس مرحلے سے گزر رہی تھی اس میں صحت بہتر ہو جاتی ہے۔ شازیہ بھی ٹھیک تھی۔ سب سے پہلے وہ رخصت ہوئی۔ اس کے بعد شمی گئی۔ وہ بابا، ماں جی اور دوسروں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ آپا بھی سو رہی تھیں اس لیے طے ہوا کہ ان سے صبح بات کی جائے گی۔ سویرا گفتگو میں شریک تھی لیکن اکا دکا باتیں کر رہی تھی۔ بالآخر ان دونوں کو بھی خیال آیا اور مونا نے کہا۔ ”چلو جی اب ان سے ہم برداشت نہیں ہو رہے ہیں۔“

”کہا تو تم نے ٹھیک ہے لیکن میں مروت میں خاموش ہوں۔“

سادی کچھ دیر سے چپ چپ تھی اس نے مونا کی بات سنی تھی لیکن اٹھنے کے بجائے جھجکتے ہوئے بولی۔ ”شہباز بھائی.... بڑے کنور کیسے ہیں؟“

میں نے گہری سانس لی۔ ”ان کی حالت پہلے سے خراب ہوئی ہے۔ میں نے بتایا نا کہ یہاں سازشیں چل رہی ہیں۔ صرف راج کنور ہی نہیں بلکہ منشی دل جی بھی سازش کر رہے ہیں۔ میری اطلاعات کے مطابق بڑے کنور نے فی الحال سب پر قابو پا لیا ہے اور راج کنور اسپتال میں ہے۔ آگے دیکھو کیا ہوتا ہے؟“

”بڑے کنور راج بھیا کو جاگیر سے نکال دیں، اس مسئلے کا یہی حل ہے۔“

”ہو سکتا ہے لیکن مجھے یہ معاملہ اتنا آسان نہیں لگتا ہے۔ شروع میں ایسا لگ رہا تھا کہ دونوں بھائی ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے ہیں مگر پہلے راج نے بڑے کنور کو رعایت دی اور اس کے بعد بڑے کنور نے راج کنور کو چھوٹ دی اگر وہ نہ چاہتا تو راج کنور اس حادثے میں مر بھی سکتا تھا۔ صحت یاب ہونے کے بعد اسے دوبارہ پولیس لے جایا جائے گا۔ سننے میں یہ آیا ہے کہ راج کنور کے پاس جاگیر اور اس سے وابستہ کاروبار کے کچھ اہم کاغذات ہیں۔“

سادی نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ ”میں سب جانتی ہوں۔ لیکن شہباز بھائی آپ سب چیزوں پر لعنت بھیج کر وہاں سے نکل آئیں۔ آپ جانتے ہیں اب آپ ہی میرے باپ بھائی ہیں۔ میں ماضی سے سارے ناتے توڑ کر آئی ہوں۔“

”میں جانتا ہوں، لیکن کبھی کبھی ماضی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ جتنی جلد ہو سکے یہاں سے نکل جاؤں۔“ میں نے کہا لیکن سادی یا ان میں سے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ میں کس طرح سے یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ مونا اور سادی بھی اٹھ گئیں۔ ان کے جاتے ہی سویرا لپک کر لیپ ٹاپ کے پاس آئی تھی۔ اس نے دھانی رنگ کی لان کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا جو اس پر اچھا لگ رہا تھا۔ پہلے کے مقابلے میں اس کی صحت بھی بہتر ہوئی تھی جب

میں نے اسے شاہد بھائی کے انتقال کے بعد دیکھا تھا تو وہ کمزور ہو رہی تھی۔ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

”آپ کیسے ہیں؟“

میں نے شرارت کی۔ ”ایسے نہیں ویسے ہی پوچھو جیسے فون پر پوچھا تھا۔“

”تب کیسے پوچھ سکتی تھی۔“ وہ محجوب ہو گئی۔ ”تب سب یہاں موجود تھے۔“

”میں کیسا لگ رہا ہوں؟“

”پیچھے ہٹ کر دکھائیں۔“ اس نے فرمائش کی اور میں نے تعمیل کی۔ ”صحت تو ٹھیک لگ رہی ہے لیکن یہ ہونٹ کے گوشے پر سوجن کیوں ہے؟“

کسی نے نوٹ نہیں کیا لیکن اس نے کر لیا تھا۔ ”چوٹ لگی تھی؟“

”کسی سے لڑائی ہوئی تھی؟“

”تم جانتی ہو میری زندگی ہی مار دھاڑ میں گزر رہی ہے۔“

”پلیز آپ جلد واپس آجائیں، انڈیا پاکستانیوں کے لیے بہت خطرناک ملک ہے، وہاں تو بے گناہ پاکستانی بھی سالوں جیل میں سڑتے رہتے ہیں۔“

”میں کوشش کر رہا ہوں۔“

وہ خود پر قابو پانے لگی پھر آہستہ سے پوچھا۔ ”مجھے یاد کرتے ہیں؟“

”سویرا! تمہاری یاد میرے وجود میں سانس اور دل کی دھڑکن کی طرح ہے۔ کوئی انسان ان دونوں چیزوں کے بغیر رہ سکتا ہے۔“

”نہیں۔“ وہ شرمائی تو اس کے چہرے پر رنگ بکھر گئے تھے۔ میں دنگ رہ گیا، کیا کوئی اتنا خوب صورت بھی ہو سکتا ہے؟ شاید میرا خیال غلط تھا، اصل خیال یہ ہونا چاہیے تھا کہ کیا اتنا خوب صورت بھی لگ سکتا ہے۔ وہ آج بھی ویسی ہی معصوم اور شفاف سی سویرا تھی۔ میں نے شوق سے کہا۔

”تم بھی تو خود کو دکھاؤ کیسی ہو رہی ہو آج کل۔“

”جی نہیں۔“

”پلیز۔“ میں نے التجا کی تو وہ شرماتے ہوئے پیچھے ہوئی اور دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے سیدھی کھڑی ہو گئی۔ پھر جلدی سے واپس آگئی۔ ”بھئی مجھے شرم آرہی ہے ایسی فرمائشیں مت کیا کریں۔“

”پہلے کب کی ہیں۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”کاش وہ وقت جلدی سے آئے جب تم میری کسی فرمائش سے انکار نہ کر سکو۔“

اس کے چہرے پر پھر گلال بکھرا تھا۔ اس نے جلدی سے موضوع بدل دیا اور حویلی کے حالات بتانے لگی۔ شجاع بھائی اور بھابی پچھلے دنوں آئے تھے اور دو دن حویلی میں رک کر گئے تھے۔ بانی حویلی کی سیکیورٹی کر گیا تھا اور اب تین گارڈز بہت آسانی سے پوری حویلی اور اس کے آس پاس کی نگرانی کر سکتے تھے۔ گارڈز کے لیے علیحدہ سیٹ اپ بنا دیا گیا تھا۔ بابا نے نئی زمین پر جن لوگوں کو آباد کیا تھا وہ بھی حویلی کے محافظوں میں شامل تھے۔ کسی بھی ناگہانی حملے کی صورت میں درجن بھر مسلح افراد پانچ منٹ سے پہلے مدد کو آسکتے تھے۔ سویرا یہ سب بتا رہی تھی کہ اچانک اس نے کہا۔ ”اوہ، میں ایک اہم بات بتانا بھول گئی۔ حویلی کے نمبر پر فتح خان کی کال آئی تھی وہ آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ بابا نے بتایا کہ آپ لاپتا ہیں لیکن وہ نہیں مانا۔ اس نے ذرا دھمکی آمیز انداز میں کہا کہ بہتر ہوگا آپ اس سے رابطہ کر لیں ورنہ آپ کا بہت بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔“

میں فکر مند ہو گیا۔ فتح خان ایسا شخص نہیں تھا جسے آسانی سے نظر انداز کیا جاتا۔ ”اور کیا کہا اس نے؟“

”بس یہی بات کی۔“ سویرا بولی۔ ”ممکن ہے کچھ اور بھی کہا ہو تو آپ بابا سے پوچھ لیجیے گا۔ انہوں نے اتنا ہی بتایا ہے۔“

”اس نے دوبارہ کال کی؟“

”یہ بھی نہیں معلوم، لیکن بابا نے اس کال کے بعد گارڈز کو چوکس کر دیا تھا۔ اب وہ رات کو کئی بار خود بھی چکر لگاتے ہیں۔“

”میں بابا سے بات کروں گا۔“

ابھی میں سویرا سے بات کرنا چاہ رہا تھا مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ ہچکچا رہی تھی۔ ”کیا بات ہے کوئی مسئلہ، تم ٹھیک سے بات نہیں کر رہی ہو؟“

اس نے گہری سانس لی۔ ”شہباز آپ میرا مزاج سمجھتے ہیں اور میری پوزیشن بھی جانتے ہیں۔ مجھے مناسب نہیں لگ رہا ہے کہ اس طرح آپ سے بات کروں جب کہ دوسروں کو بھی پتا ہو۔“

”یہ لیپ ٹاپ کس کے پاس ہوتا ہے۔“

”ہوتا تو میرے پاس ہی ہے لیکن کوئی بھی استعمال کر سکتا ہے۔“

"جب تم مجھ سے بات نہیں کرو گی تب بھی دوسرے ایسا ہی سمجھیں گے۔"

"نہیں، میں شمی کے پاس جاؤں گی۔ اسے مہندی لگوانی تھی۔ وہ لگاؤں گی۔"

"مہندی؟ خیریت؟"

"کل عتیق آ رہا ہے صحت یاب ہونے کے بعد وہ پہلی بار حویلی آئے گا۔"

"اچھا تو اس کی تیاری ہو رہی ہے۔" میں ہنسا۔ "لیکن دیکھو اسے تو کوئی خوف نہیں ہے کہ وہ عتیق کے آنے پر مہندی لگا رہی ہے اور اسے کوئی کچھ کہے گا۔"

"شمی کا حق ہے۔"

"حق تو تمہارا بھی ہے۔"

"ہاں لیکن میں اسے ایک بار استعمال کر چکی ہوں۔ پھر میرا امزاج بھی اس سے مختلف ہے۔"

"چلو پھر ٹھیک ہے تم جا کر اسے مہندی لگاؤ۔"

"آپ ناراض تو نہیں ہیں نا۔" وہ پریشان ہو گئی۔

"تم پاگل ہو..... بھلا کوئی خود سے بھی ناراض ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اچھا اللہ حافظ، ان شاء اللہ صبح دس بجے کے بعد کسی وقت کال کروں گا۔ اسکائپ آن رکھنا۔"

رات کے دو بج رہے تھے جب میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو حیران ہوا تھا، اتنی لمبی بات ہوئی تھی اور وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ مجھے اوشا کا خیال آیا کہ وہ اب تک رانا ویاس کے محل میں پہنچ گئی ہو گی۔ لیکن ہوٹل منیجر کی طرف سے اس کی تصدیق نہیں ہوئی تھی۔ میں نے منیجر کو کال کی، وہ ڈیوٹی سے آف ہو گیا تھا لیکن اس کا نائب موجود تھا میں نے اس سے پوچھا۔ "میری ساتھی اپنی منزل پر پہنچ گئی ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں ہے میں کنفرم کر کے بتاتا ہوں۔" اس نے کہا۔ اس نے پانچ منٹ بعد کال کی۔ "جی سر، وہ اپنی منزل پر پہنچ گئی ہیں۔"

میں نے شکریہ ادا کیا اور پھر آپریٹر سے رانا ویاس کے ایک نمبر پر کال ملانے کو کہا۔ اس کے سیکریٹری نے کال ریسیو کی۔ رانا ویاس کا پہلا سیکریٹری جو مسلمان تھا اور میرے ساتھ سفر کرتے ہوئے مارا گیا تھا، اس کے بعد رانا نے دوسرا سیکریٹری بھی مسلمان ہی رکھا تھا۔ وہ غیر متعصب اور کھلے ذہن کا شخص تھا۔ راجا عمر دراز سے دوستی اس بات کا ثبوت تھی۔ میں نے اپنا نام لیے بغیر سیکریٹری سے اوشا کے بارے میں پوچھا، اس نے محتاط انداز میں بتایا کہ اوشا خیریت سے وہاں پہنچ گئی تھی اور اس کا مکمل خیال رکھا جا رہا تھا۔ رانا صاحب اسے میرے لحاظ سے ٹریٹ کریں گے۔ میں نے اطمینان محسوس کیا اور اس کا شکریہ ادا کر کے فون رکھنے لگا تھا کہ اس نے کہا۔

"آپ کے لیے ایک مشورہ ہے، اب محل کے کسی نمبر پر کال مت کیجیے گا۔"

میں چونکا۔ "اگر رابطہ کرنا ہو تو؟"

"منیجر سے بات کر لیجیے گا وہ گائیڈ کرے گا۔"

یقیناً کسی وجہ سے رانا ویاس بہت محتاط ہو رہا تھا۔ شاید اسی وجہ سے محل کی طرف سے مجھ سے براہ راست رابطہ نہیں کیا جا رہا تھا۔ اب میں نے بھی محتاط رہنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اٹھ کر گرم پانی سے غسل کیا اور پھر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ میں نے صبح چھ بجے کا الارم لگایا تھا۔ الارم سے ہی آنکھ کھلی۔ منہ ہاتھ دھو کر میں نے ایکسر سائز کی اور نہا کر کپڑے بدلے۔ بانو سو رہی تھی میں نیچے ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر کے پاس آیا۔ یہ رات کو موجود ہوتا تھا، وہ مجھے دیکھ کر مستعد ہو گیا۔ "مجھے طلب کر لیا ہوتا سر۔"

"کوئی بات نہیں میں آ گیا۔"

"حکم کریں اور کیا پیش کروں؟"

"کافی منگوا لیں، آپ کے ہوٹل کی کافی لاجواب ہے۔"

وہ خوش ہو گیا۔ "برازیل کے ایک خاص فارم سے براہ راست ہمارے پاس آتی ہے اور یہ کافی صرف ہمالیہ ہوٹل چین کے لیے مخصوص ہے۔"

"مجھے کرائے پر ہیلی کاپٹر درکار ہے۔"

وہ حیران ہوا شاید یہ فرمائش اس کے لیے کچھ زیادہ تھی۔ مگر فوراً اس نے اپنے تاثرات پر قابو پا لیا۔ "کیوں نہیں سر..... یہاں شملہ میں کئی فلائنگ کلب ہیں جہاں سے ہیلی کاپٹرز اور چھوٹے طیارے چارٹرڈ کرائے جا سکتے ہیں۔"

"میں کسی ایسے ہیلی کاپٹر کو ترجیح دوں گا جو لمبی پرواز کرنے کی سکت رکھتا ہو اور کسی کمپنی کی ملکیت نہ ہو۔ کسی ایک فرد سے معاملہ طے ہو جائے۔"

"اس کے لیے معلومات حاصل کرنا پڑیں گی۔" اس نے کہا۔

"تب آپ معلومات حاصل کریں لیکن بغیر کسی

ریفرنس کے، میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟"

"جی سر بالکل سمجھ رہا ہوں۔ ہمالیہ ہوٹل یا آپ کا نام نہیں آئے گا۔"

"آپ مناسب سمجھیں تو دو تین نام ریفر کر دیں، میں ان سے خود بات کر لوں گا۔"

"ابھی ارلی مورننگ ہے میرا خیال ہے میں دس بجے تک معلومات حاصل کر لوں گا۔"

"مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "ہاں ایک کام اور ہے۔ تندور ما اسپتال میں ایک ڈاکٹر امرتسر ہے مجھے اس کا پرائیویٹ کو نٹیکٹ نمبر چاہیے۔"

وہ پھر حیران ہوا مگر مستعدی سے کہا۔ "یہ بھی مل جائے گا سر۔"

اس دوران میں کافی آ گئی تھی۔ میں نے کافی نوشی کے دوران ہمالیہ ہوٹل کے معیار اور یہاں کی سروس کی تعریف کی۔ وہ خوش ہو گیا۔ "سر، ہم آپ کی خدمت کے لیے بیٹھے ہیں۔"

وہ خدمت کے لیے نہیں بلکہ کمانے کے لیے بیٹھے تھے۔ یقیناً وہ رانا ویاس سے لاکھوں کا بل وصول کرتے اور کوئی تعجب نہیں ہوتا اگر بل کی رقم سات ہندسوں میں چلی جاتی۔ میں نے جو کافی پی تھی اس کی قیمت میں کسی اچھے ریسٹورنٹ میں فیملی ڈنر کیا جا سکتا ہو گا۔ اس سے بات کر کے میں اوپر آیا۔ آٹھ بج رہے تھے، میں نے بانو کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ جاگ گئی تھی اور ایکسر سائز کر رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو اس کی سانس تیز تھی اور چہرے پر پسینا چمک رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "بس کرو بی بی اور تیار ہو کر میرے کمرے میں آ جاؤ ناشتے کے لیے۔"

"آپ کہہ دیں میں بیس منٹ میں آتی ہوں اور ہاں، ناشتا دیسی اسٹائل کا ہو۔"

"یعنی انڈہ پراٹھا، حلوہ پوری بھاجی اور چنوں کا سالن۔"

"بالکل۔"

"یہ ہمالیہ ہوٹل ہے۔"

"اگر یہ سب نہ ملا تو پھر فائدہ ہمالیہ ہوٹل کا، اس سے اچھا تو لاہور کا کمالیہ ہوٹل ہے وہاں یہ سب ملتا ہے۔"

"کیا یاد دلا دیا۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "کبھی ہم بھی لاہور جاتے تھے اور وہاں کے پکوان کھاتے تھے۔ اچھا کوشش کرتا ہوں۔"

میں حیران ہوا جب روم سروس نے بلا حجت میرا آرڈر نوٹ کر لیا اور جب تک بانو تیار ہو کر آئی ناشتا آ چکا تھا۔ وہ خوش ہو گئی۔ ہمیں نہ صرف اپنی پسند کا ملا تھا بلکہ اسی معیار کا تھا۔ ڈٹ کر ناشتے کے بعد بانو کی فرمائش پر چائے یا کافی کے بجائے لسی نوش کی گئی۔ میں نے بانو کو بتایا کہ گزشتہ رات میں نے حویلی بات کی تھی اور تمام خواتین اس سے بات کرنے کے لیے بے تاب تھیں۔ اس نے سر ہلایا۔ "مجھے خیال تھا کہ آپ حویلی بات کریں گے۔"

"تمہیں اس لیے شامل نہیں کیا کہ پھر کوئی ایسی بات نہ ہو جو تمہارے دل کو لگے۔ تمہارے بارے میں بتایا ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ تم واپس جا کر ان کے پاس حویلی میں رکو۔"

وہ ہچکچائی۔ "کیا یہ مناسب ہو گا؟"

"کیوں نہیں..... دیکھو، میرا مونا اور سادی کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن ہمارے درمیان تعلق بہت مضبوط ہے۔ ایک حیران کن حقیقت تو میں نے تمہیں بتائی نہیں۔ کنور پیلس میں منہ سے نہیں نکال سکتا تھا اور وہاں سے نکلنے کے بعد حالات تیزی سے بدلتے رہے۔ کبھی وقت نہیں ہوتا تھا اور کبھی ذہن میں نہیں ہوتا تھا، سچی بات ہے خود میرے ذہن میں بھی یہ بات تھوڑی تھوڑی محو ہوتی جا رہی ہے۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ سعدیہ عرف سادی اور سابق سادھنا کنوروں کی بہن ہے۔"

بانو سچ مچ حیران رہ گئی تھی۔ "رئیلی..... میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا۔"

"کنور برادرز اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ جب قبائلیوں نے پیلس پر حملہ کیا تو افراتفری میں وہ لوگ سعدیہ کو نہیں لے جا سکے اور قبائلی اسے بھی عام ملازمہ سمجھ کر ساتھ لے گئے۔ میں اسے جانتا تھا پھر میں نے اسے تحفظ دیا کیونکہ وہ سچ مچ بہت معصوم لڑکی تھی، اپنے بھائیوں کے جرائم سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ قبائلیوں کے سردار کمار سے وابستہ ہو گئی۔ انہوں نے شادی کر لی تھی مگر پھر کمار ہیپاٹائٹس کا شکار ہو گیا اور سعدیہ دوبارہ میری ذمے داری بن گئی۔ میں اسے یہاں سے نکال کر لے گیا۔ پھر میرے ساتھی وسیم نے سعدیہ کے زخم پر مرہم رکھا اور اسے اپنا لیا۔ اب وہ سعدیہ ہے۔ اگر کنور برادران کو اس کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ سعدیہ کو واپس حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"اب میری سمجھ میں آیا کہ آپ ان لوگوں کو چھوٹ

کیوں دیتے رہے ہیں یقیناً اس کی ایک وجہ سعدیہ بھی ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اس نے ماضی سے سارے تعلق توڑ لیے ہیں مگر وہ اس کے بھائی ہیں اسے یاد آتے ہوں گے۔"

"آپ نے اچھا کیا بتادیا اب میں گفتگو میں کنوروں کو برا بھلا نہیں کہوں گی۔"

ناشتے کے بعد گپ شپ میں دس بج گئے تھے۔ میں نے اسکائپ آن کیا اور کال کی۔ شمی لیپ ٹاپ لے کر ماں جی کے پاس بیٹھی تھی۔ اسکرین پر میری ویڈیو نمودار ہوتے ہی وہ تڑپ کر پاس آئی تھیں۔ "شہباز... پتر۔"

"ماں جی۔" میری آواز بھی گلے میں پھنسنے لگی۔ وہ رو رہی تھیں اور میں انہیں دلاسا دے رہا تھا۔ وہ اسکرین چھو چھو کر دیکھ رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے وہ بات کرنے کے قابل ہوئیں۔ ان کی گفتگو کا ہر دوسرا جملہ یہی ہوتا تھا کہ پتر شہباز واپس آجا۔ اس دوران میں دوسرے بھی آگئے تھے۔ بانو نے ماں جی اور دوسروں سے سلام دعا کی پھر بابا آگئے تو سب پیچھے ہٹ گئے۔ خلاف توقع بابا سلام دعا کے بعد لیپ ٹاپ اپنے کمرے میں لے گئے، وہ مجھ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتے تھے۔ یقیناً کوئی ایسی بات تھی جو وہ سب کے سامنے نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اپنے کمرے میں آنے کے بعد انہوں نے کہا۔

"شہباز حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ تمہیں پتا چل گیا ہوگا فتح خان کی کال آئی تھی۔"

"جی بابا۔"

"میں نے گھر میں پوری بات نہیں بتائی۔" بابا تفکر آمیز لہجے میں بولے۔ "پہلی بات تو یہ کہ فتح خان جانتا ہے کہ تم انڈیا میں ہو۔"

میں حیران ہوا۔ "اس نے اپنی سورس بتائی؟"

"میرا خیال ہے ڈیوڈ شا نامی بندہ ہے۔ کیونکہ فتح خان نے اس کے حوالے سے بھی بات کی تھی۔"

یک لخت میرے چاروں طرف خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں اور میں جو خود کو اس عالی شان ہوٹل میں محفوظ سمجھ رہا تھا۔ یہ احساس آن واحد میں اڑ گیا۔ "بابا مجھے تفصیل سے بتائیں، فتح خان نے کیا کہا تھا؟"

"اس نے پہلے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں تم سے بات کراؤں لیکن جب میں نے کہا کہ تم لاپتا ہو تو اس نے کہا کہ وہ جانتا ہے کہ تم انڈیا میں ہو اور شہباز کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ ڈیوڈ شا سے رابطہ کرلے ورنہ وہ بہت بڑے خسارے میں رہے گا۔"

"اس نے کوئی دھمکی بھی دی؟"

"نہیں بس یہی دھمکی تھی۔"

"میں ڈیوڈ شا سے کیسے رابطہ کرسکتا ہوں۔"

"اس نے کچھ نمبرز دیے ہیں جن پر تم رابطہ کرسکتے ہو۔ میں نے نوٹ کرلیے تھے۔" بابا نے کہا۔ "تم لکھ لو۔"

میں نے نوٹ پیڈ اور پین اٹھالیا۔ بابا نے تین نمبرز لکھوائے جو میں نے کاغذ پر اتار لیے۔ "بابا آپ بہت محتاط رہیں، فتح خان بہت موذی شخص ہے۔ وہ مسلسل میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔"

"میں محتاط ہوں بیٹا، لیکن ایسا کب تک چلے گا؟"

میں نے سرد آہ بھری۔ "بابا اگر یہ سب میرے اختیار میں ہوتا تو کب کا ختم کرچکا ہوتا۔ آپ جانتے ہیں میں بے بس ہوں۔"

بابا کچھ دیر خاموش رہے پھر انہوں نے آہستہ سے کہا۔ "شہباز میں اور تمہاری ماں اپنی زندگی گزار چکے ہیں اب ہمیں تمہاری اور سویرا کی فکر ہے۔"

"میں جانتا ہوں بابا لیکن میرے لیے اصل اہمیت آپ کی اور ماں جی کی ہے، آپ کے بغیر ہم اور ہماری ہر خوشی ادھوری ہے۔"

"شہباز کیا ڈیوڈ شا سے بات کرکے تم دشمنی کے اس چکر کو ختم کرسکتے ہو؟"

"ڈیوڈ شا ایک ناقابل اعتبار آدمی ہے۔ وہ اثر و رسوخ کا حامل ہے اور بہ ظاہر مرشد جیسا شخص بھی اس کی جی حضوری کرتا ہے۔ اسی طرح فتح خان اس کا ملازم ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے مرشد کے معاملے میں اس کی ضمانت پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا ہے؟"

"بالکل اور ایک بار ایسا ہو بھی چکا ہے جب مرشد نے ڈیوڈ شا کی ضمانت کے باوجود میرے خلاف کارروائی کی تھی۔"

"ڈیوڈ شا تم سے کیا چاہتا ہے؟"

"وہ ہمالیائی وادی تک کے سفر میں مجھے لے جانا چاہتا ہے کیونکہ اسے اور راجا عمر دراز دونوں کو یقین ہے کہ اس وادی میں میرے بغیر داخلہ ممکن نہیں ہے۔"

"یہ احمقانہ بات ہے۔" بابا نے ناگواری سے کہا۔

"میں بھی یہی سمجھتا ہوں لیکن یہ دونوں اسے پوری طرح حقیقت سمجھتے ہیں۔"

"اب تم کیا کروگے ڈیوڈ شا سے رابطہ؟"

"ابھی سوچا نہیں ہے فی الحال تو میں واپس آنے کی کوشش کررہا ہوں۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں تمہیں جو کرنا ہے واپس آکر کرو وہاں تمہارے لیے خطرات بہت زیادہ ہیں۔"

"لگتا ہے آپ کو میرے بارے میں بریفنگ ملی ہے؟" میں نے دبی زبان میں کہا تو بابا نے سر ہلایا۔

"شجاع نے بہت کچھ بتایا ہے اس کے پاس تمہاری فائل آئی تھی۔"

"بابا کیا شجاع بھائی اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتے۔"

"وہ کوشش کررہا ہے لیکن اس کی ایک حد ہے۔ معاملات دونوں طرف سے ہی سیٹل ہوسکتے ہیں۔"

"ندیم کوشش کررہا ہے کہ میرے خلاف کیسز ختم کردیے جائیں۔"

"مجھے معلوم ہے تمہاری مرشد سے کوئی ڈیل چل رہی ہے۔"

"جی بابا یہ اسی کا نتیجہ ہے۔" میں نے کہا اور اس سے مجھے خیال آیا کہ میں نے عبداللہ اور وسیم سے نادر کے بارے میں پوچھا نہیں تھا کہ اس کی کیا حالت تھی۔ یقیناً وہ پہلے جیسا تھا اگر کوئی تبدیلی آتی تو وہ خود مجھے بتاتے۔ کچھ دیر بابا سے بات ہوئی پھر انہوں نے لیپ ٹاپ شمی کے حوالے کردیا۔ خواتین سے میری بات ہوچکی تھی اس لیے میں نے اب ہیڈ فون بانو کے سپرد کردیا۔ گیارہ بج رہے تھے اور اسسٹنٹ منیجر نے دس بجے تک کا وقت دیا تھا ابھی میں اسے کال کرنے کا سوچ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا ایک ویٹر سنہری طشتری میں ایک سیل لفافہ لیے کھڑا تھا۔ میں نے لفافہ لیا اور اسے ٹپ دے کر اندر آیا۔ لفافے پر ہوٹل کا مونوگرام تھا۔ یہ خود بہ خود بند ہوجانے والا لفافہ تھا جسے پھر پھاڑ کر ہی کھولا جاسکتا تھا۔ میں نے اسے پھاڑا اندر سے ایک چھوٹا سا پرنٹ آؤٹ نکلا۔ اس پر تین افراد کے نام اور ان کے کونٹیکٹ نمبرز لکھے تھے۔ دو نام انجانے تھے البتہ تیسرا نام ڈاکٹر امر تسر سنگھ کا تھا۔ میں نے ہوٹل کے آپریٹر سے اس کا نمبر ملوایا۔ کچھ دیر بعد وہ لائن پر تھا۔

"سردار جی میں شیام بات کررہا ہوں۔ رینا کا بھائی۔" میں نے آہستہ سے کہا، بانو کمرے کے دوسرے

ناستک

اس شخص کو کہتے ہیں جو نہ خدائی ہستی کا قائل ہو اور نہ ہی منکر، یہ نہ تو دہریا ہوتا ہے اور نہ ہی توحید کا پرستار، دہریے ہستی خدا کی نفی کرتے ہوئے مادّہ ہی کو سب کچھ تصور کرتے ہیں مگر یہ خدا سے انکار نہیں کرتے۔ اس لیے دہریوں سے ذرا بلند مقام پر ہیں۔

نافع بن ازرق

یونانی نسل کے ایک آزاد کردہ غلام۔ پہلے عبداللہ بن زبیر کے ہمراہ مکہ میں رہے۔ وہاں سے یہ بصرہ چلے گئے۔ المہلب نے انہیں وہاں سے پارس کی طرف پہنچادیا۔ یہ لوگ پارس سے آہواز چلے گئے اور اپنے عقائد کے مطابق تبلیغ شروع کی۔ اس کے عقائد یوں تھے: 1۔ دشمن کے بیوی بچوں کو قتل کردیا جائے۔ 2۔ جو یہاں سے ہجرت نہ کریں، انہیں کفار میں شامل کیا جائے۔ 3۔ جو ان کے لشکر میں شامل ہونا چاہیں، ان کا امتحان لیا جائے۔ سن 683ء یا 684ء میں مسلمانوں کے خلاف دولب کی خونی جنگ میں مارا گیا 63 یا 64 برس کی عمر پائی۔ اس کی آنے والی نسلیں اس نسبت سے ازرقی کہلائیں۔

نافع بن کائوس

حضرت عبداللہ بن عمر کے غلام "امام العلم"، المتوفی 117ھ۔ آپ نے انہی کی 30 برس خدمت کرکے حدیث کا علم حاصل کیا۔ امام زہریؒ امام اوزاعیؒ اور امام مالکؒ آپ کے شاگردوں میں آتے تھے۔ بڑے بڑے فضلاً آپ کی شاگردی پر فخر کرتے۔ سارا مدینہ آپ کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

مرسلہ: سلطان محمد، جہلم

کونے میں تھی اور مجھے امید تھی کہ وہاں تک میری آواز نہیں جائے گی۔

”حکم کرو جی، کاکی نوں کوئی مسئلہ ہے؟“

”کاکی ٹھیک ہے پر ایک بندہ اور ہے آپ کے اسپتال میں، مجھے آپ سے اس کے بارے میں بات کرنی ہے اگر آپ میرے لیے تھوڑا وقت نکالیں تو.....“

”وقت ہی وقت ہے جی آپ جب چاہے آجاؤ۔ پر ابھی میں گھر پر ہوں۔ آپ کو یہاں آنا ہوگا۔“

میں نے اس سے پتا لیا اور بانو کو اشاروں میں اپنی روانگی کا کہہ کر نکل آیا۔ ایک ٹیکسی نے مجھے شہر کے نچلے حصے میں اس متوسط کالونی تک پہنچایا۔ میں چاہتا تو ہوٹل کی کار میں آسکتا تھا لیکن اس پر ہوٹل کا نام اور مونوگرام تھا بلا وجہ تشہیر ہوتی۔ میں نے ٹیکسی والے کو روک لیا اور خود اتر کر ڈاکٹر امرتسر کے مکان کی طرف بڑھا، یہ خوبصورت پھولدار بیلوں اور پودوں سے سجا ہوا مکان تھا۔ سامنے برآمدے میں ایک چھوٹا سا کتا بہ طور کال بیل موجود تھا۔ میں نے دروازے پر ہاتھ رکھا تھا کہ اس نے بھونکنا شروع کر دیا فوراً ہی اندر سے ڈاکٹر امرتسر نکل آیا۔ اس نے گاؤن پہن رکھا تھا۔ وہ مجھے چھوٹے سے لان پر موجود چیئرز تک لایا۔ ”معاف کرنا شیام جی میری بیوی میکے گئی ہوئی ہے اس لیے چائے کافی نہیں کر سکوں گا ہاں سافٹ اور ہارڈ ڈرنک ہے۔“

”فی الحال کچھ نہیں۔“ میں نے شکریے کے ساتھ کہا۔

”حکم کرو جی۔“

”سردار جی آپ کے اسپتال میں راج کنور نامی ایک بندہ داخل ہے۔“

اس نے داڑھی میں خلال کرتے ہوئے سر ہلایا۔ ”وی آئی پی بندہ ہے اس پر دو بندے لگے ہوئے ہیں۔“

”وہ زیرِ نگرانی ہے۔“ میں نے کہا تو امرتسر حیران ہوا۔

”وہ کیوں جی؟“

”یہ خاندانی جاگیر اور دولت کا چکر ہے۔ بہر حال امرتسر جی بات یہ ہے کہ اس پر نگرانی میری وجہ سے ہے کہ میں اس سے ملاقات نہ کر سکوں۔“

”آپ سے کیوں نہ ملے جی؟“

”سردار جی کچھ معاملات ہیں ایسے، قصہ مختصر میں راج کنور سے ملنا چاہتا ہوں لیکن اسپتال جائے بغیر۔“

وہ بھونچکا رہ گیا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے؟“

”بالکل ممکن ہے اگر آپ میری اس سے موبائل پر بات کرا دیں۔“

امرتسر سنگھ سادہ آدمی تھا لیکن اتنا سادہ بھی نہیں تھا کہ معاملے کو شریفانہ سمجھ لیتا اس نے گڑبڑ محسوس کر لی تھی اور انکار کی تمہید باندھنے لگا۔ ”دیکھیں شیام جی..... بات یہ ہے کہ.....“

میں تیار ہو کر آیا تھا میں نے پانچ سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھ دی اور اس کا جملہ منہ میں ادھورا رہ گیا۔ اس کی نظریں گڈی پر جم گئی تھیں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”سردار جی یہ پچاس ہزار ہیں، آپ کو بہت چھوٹا سا کام کرنا ہے کہ جب میں کہوں اس سے میری موبائل پر بات کرا دیں۔ بے شک اپنے موبائل سے کرا دیں اس طرح آپ پر کوئی الزام بھی نہیں آئے گا۔“

”الزام تو آئے گا۔“

”میرا مطلب ہے کہ آپ اسے کوئی موبائل دیں گے تو آپ پر الزام آئے گا۔ اپنا موبائل تو آدمی دس لوگوں کو استعمال کے لیے دیتا ہے۔“

”میں نہیں دیتا۔“ اس نے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا۔ ”اپنی بیوی کو بھی نہیں دیتا۔“

”کوئی بات نہیں اب دیدیں اور پچاس ہزار کے بدلے یہ سودا برا نہیں ہے۔“

وہ لالچ میں پڑ گیا تھا۔ ”کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟“

”سردار جی کوئی گڑبڑ والا کام ہوتا تو میں اسپتال کے کسی معمولی ملازم کو پکڑتا اور وہ ہزار روپے میں یہ کام کر دیتا۔“

”تو آپ نے کیوں نہیں کرایا؟“

”بات ساری رازداری کی ہے۔ معمولی ملازم نہ تو عقل استعمال کرتا اور نہ اتنی احتیاط کرتا۔ راج کنور کی نگرانی کرنے والے اسے پکڑ لیتے تو پھر میں اس سے بات نہیں کر پاتا۔ اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ ہوشیار آدمی ہیں اور پھر ڈاکٹر ہیں جتنی بار بھی چاہیں راج کنور کے کمرے میں جا سکتے ہیں۔“

سکھ عقل مندی کی سند پا کر خوش ہوا تھا۔ وہ سچ مچ سادہ آدمی تھا اسی لیے میری حد درجے سادہ وضاحت سے

مطمئن ہو گیا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو دس سوال کرتا اور پھر بھی مطمئن نہ ہوتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی آمادگی میں زیادہ زور پچاس ہزار روپے کا ہو۔ اس نے گڈی اٹھا لی۔ ”آپ کا کام ہو جائے گا۔ میری ڈیوٹی شام سات سے صبح سات تک ہے۔“

”بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی، یہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہے تو پر کیا کریں تنخواہ اچھی ملتی ہے اور کام بھی زیادہ نہیں ہے۔“

”سردار جی آپ نے ایک چیز کا خیال اور رکھنا ہے اگر راج کنور کو اچانک ڈسچارج کرایا جائے تو اس کی اطلاع مجھے فوراً دیں۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس کا گھٹنے کا جوڑ ہلا ہوا ہے اور کم سے کم دو دن اور رکنا ہو۔ ایکسرے کے بعد دیکھا جائے گا کہ جوڑ ٹھیک ہو رہا ہے تبھی اسے جانے کی اجازت دی جائے گی۔“

”یہ تو آپ کی رائے ہے، ہو سکتا ہے اس کے نگرانوں کی رائے کچھ ہو اور اگر گھر والے اپنے بندے کو لے جانے پر اصرار کریں تو آپ زبردستی تو نہیں روک سکتے۔“

”ایہہ ٹھیک کہا۔“ امرتسر سنگھ نے سر ہلایا۔ ”پر میں آپ کو بتاؤں گا کیسے؟“

”میں ہمالیہ ہوٹل میں مقیم ہوں آپ کمرا نمبر چار سو دو کہہ کر ملوا لینا مگر نام مت لینا۔“

میری بات پر وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا لیکن کچھ کہا نہیں۔ رامن والا واقعہ شاید کسی کے علم میں نہیں تھا اس لیے امرتسر سنگھ نے اس کا حوالہ نہیں دیا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ رامن اور شش کو راج کنور کے نگرانوں کی حیثیت سے جانتا ہو گا میں نے سرسری سے انداز میں پوچھا کہ راج کنور کی نگرانی پر کتنے لوگ ہیں اس نے بتایا کہ فی الحال ایک ہے دوسرا کل سے غائب ہے۔ رامن کہیں اپنی مرہم پٹی کرا رہا ہوگا۔ میں نے امرتسر سنگھ سے اس کا موبائل نمبر لیا اور وہاں سے نکل آیا۔ ٹیکسی والا منتظر تھا میرے بیٹھنے پر اس نے کہا۔ ”اب کدھر جانا ہے سر؟“

”کسی اچھے پی سی او چلو مجھے کچھ کالز کرنی ہیں۔“

ٹیکسی والا لوئر شملہ کی ایک کمرشل اسٹریٹ پر لے آیا یہاں سیاحوں اور خریداروں کا خاصا رش تھا۔ یہاں

گل خیرہ (Holly Hock)

ایک قسم کا پھول جس کا اصل وطن چین ہے۔ امریکا اور برطانیہ میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ گل خیرہ کی عام قسم کے پھول کی رنگین پنکھڑیاں ایک ہی چکر میں ہوتی ہیں، لیکن ترقی یافتہ اقسام کے پھولوں کا رنگ سفید زرد گلابی یا ارغوانی ہوتا ہے۔ بعض اقسام کے پھول سیاہ رنگ کے بھی ہوتے ہیں گل خیرہ کے پودے کی کاشت بیج یا جڑ کے ذریعے کی جاتی ہے۔ پرانے پودوں کی شاخوں کی قلمیں لگانے سے بھی نئے پودے حاصل کیے جاتے ہیں۔ کھاد ملی ریتلی زمین میں گل خیرا کے پودے خوب پھلتے ہیں۔ پودے کا قد عموماً 4 سے 8 فٹ تک، جڑ غیر اضافی Tap root اور پتے نرم ہوتے ہیں۔ پتوں اور تنے کی سطح باریک پشم سی ہوتی ہے۔ پھول خوشوں کے بجائے علیحدہ علیحدہ نکلتے ہیں اور نر اور مادہ حصوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ پنکھڑیاں باقاعدہ دائرے کی شکل میں مرتب ہوتی ہیں۔ رنگین پنکھڑیوں کے اندر کئی حامل زر ہوتے ہیں جن کے نچلے سرے مخلوط طور پر ایک نل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ کئی بیضہ دان آپس میں مل کر پھول کے مادہ کے حصے کی تشکیل کرتے ہیں۔ گل خیرہ سے پھل اوپر اور نیچے سے چپٹا ہوتا ہے۔ جس کے اندر کئی بیج ہوتے ہیں۔

مرسلہ: فراز یاسین، چنوٹ

ایک بڑا پی سی او تھا جس میں رازداری سے بات کرنے کے لیے کیبن بنے ہوئے تھے۔ میں نے بی اے سنکاری نامی پائلٹ کا نمبر آپریٹر کو دیا اور اس نے کیبن نمبر نو کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ”جب ریڈ لائٹ آن ہو تو ریسیو اٹھا لینا۔“

میں کیبن میں داخل ہوا۔ یہ چاروں طرف سے بند تھا اور اوپر ایک چھوٹا سا ایگزاسٹ فین لگا تھا تاکہ اندر گھٹن نہ ہو۔ جیسے ہی ریڈ لائٹ آن ہوئی میں نے ریسیو اٹھا لیا۔ ”بی اے سنکاری۔“

”بات کرتا ہے۔“ دوسری طرف سے گوراشاہی اردو

میں کہا گیا۔

”میرا نام شیام لال ہے اور مجھے ہیلی کاپٹر چارٹرڈ کرانا ہے۔“

”کدھر کے لیے؟“

”اوپر ہمالیہ کا نظارہ کرنا ہے۔“

”ایسا کرو میرا دفتر آجاؤ۔“ اس نے کہا اور پتا بتایا جو میں نے ذہن نشین کرلیا۔

”میں ابھی آرہا ہوں۔“

”آجاؤ میں بیٹھا ہے۔“

میں نے دوسری کال ہمالیہ ہوٹل کی اور آپریٹر سے بانو کو ملانے کو کہا۔ وہ ابھی تک اسکائپ پر لگی ہوئی تھی اور بہت خوش تھی وہ ان کو ہولڈ کرا کے آئی میری آواز سن کر چہکی۔ ”آپ کہاں ہیں مجھے ان سے بات کرکے بہت مزہ آرہا ہے۔“

”مزے لیتی رہو میں نے یہ بتانے کے لیے کال کی ہے کہ میں کچھ دیر سے آؤں گا پریشان مت ہونا۔“

”ٹھیک ہے۔“

میں پی سی او سے نکلا اور ٹیکسی والے کو بی اے سنکاری کا دیا پتا بتایا۔ اس کا منہ لٹک گیا۔ ”یہ تو شہر سے باہر ہے سر۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے ایک پانچ سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ ”سمجھ لو تمہارا میٹر چل رہا ہے اگر اوپر بنیں تو لے لینا ورنہ باقی تمہارا ہوگا۔“

اس کا منہ صحیح پوزیشن میں آگیا اور اس نے مستعدی سے ٹیکسی آگے بڑھادی۔ قدم قدم پر مشاہدہ ہوتا تھا کہ روپیا انسانی رویوں میں کس طرح تبدیلی لاتا ہے۔ فرض کی ادائیگی سے زیادہ اہم لوگوں کے نزدیک اضافی آمدنی تھی۔ ہم مزید نیچے کی طرف آئے اور اس جگہ کسی قدر گرمی تھی۔ ایک چھوٹا سا ائر کلب ہائی وے سے کچھ دور تھا بلندی سے وہاں کھڑے کوئی درجن بھر طیارے اور ہیلی کاپٹر دکھائی دیے تھے۔ دو منزلہ عمارت میں کنٹرول ٹاور اور آپریٹرز کے دفتر تھے۔ میں نے بی اے سنکاری کا نام لیا تھا کہ ایک شخص نے کونے میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھے ادھیڑ عمر شخص کی طرف اشارہ کیا۔ وہ پکا دیسی تھا یعنی رنگ و روپ نقلی انڈین تھا مگر لہجے سے اینگلو انڈین بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب انگریز بوریا بستر باندھ کر یہاں سے رخصت ہوا تو ایسے مقامی افراد کی کمی نہیں تھی جو خالصتاً ہندوستانی تھے مگر ان کی مائیں انگریزوں کے گھر کام کرتی تھیں اور انہوں نے نہایت بے غیرتی سے دعویٰ کیا کہ وہ اپنے باپ کے بجائے اصل میں اس انگریز کی اولاد ہیں۔ اس وقت معاشرے میں مقام حاصل کرنے کا یہ شارٹ کٹ طریقہ تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ بے حیا رواج انڈیا تک محدود رہا۔ البتہ ہمارے ہاں ایک طبقہ ہے جو اپنی معنوی ولدیت انگریزوں سے جوڑتا ہے۔ قارئین میرا اشارہ سمجھ گئے ہوں گے بے حیائی میں یہ ان نام نہاد انگلو انڈین لوگوں سے کم نہیں ہے۔ میں بی اے سنکاری کی طرف بڑھا جو کوکا کولا کی بوتل میں یقیناً دیسی ٹھرا پی رہا تھا اس سے نہایت ناگوار بو اٹھ رہی تھی۔

”شیام لال۔“ میں نے اس سے ہاتھ ملانے کی کوشش نہیں کی۔

”بدری آنند سنکاری۔“ اس نے کسی قدر خمار آلود لہجے میں کہا۔ ”کتنا آدمی ہے اور کب جانا ہے؟“

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”تین سے چار آدمی ہوں گے اور وقت کا تعین نہیں ہے۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ اس نے اعتراض کیا۔ ”کنٹرول والوں سے اجازت لینا پڑتا ہے فلائٹ پلان بتانا ہوتا ہے۔“

”اس کام میں کتنی دیر لگتی ہے؟“

”ایک سے ڈیڑھ گھنٹا۔“ اس نے جواب دیا اور بوتل سے ایک گھونٹ بھرا۔

”ٹھیک ہے تمہیں وقت ملے گا۔ مگر تمہیں چوبیس گھنٹے اسٹینڈ بائی پر رہنا ہوگا۔“

”فلائٹ ٹائم صبح نو بجے سے شام چھ بجے تک ہے اگر موسم صاف ہو تو بھی رات کو فلائٹ نہیں ہوتا۔“

”ہمیں دن میں جانا ہے رات کو کیا نظر آئے گا۔ میں وقت کا خیال رکھوں گا۔ اگر میں تم کو چوبیس گھنٹے انگیج رکھوں تو تمہارے چارجز کیا ہوں گے؟“

اس نے اپنی سفید ہوجانے والی داڑھی کھجائی۔ ”کتنا انگیج رکھے گا؟“

”آنے والے دو دن۔“

”ایک دن کا دس ہزار روپیہ ہوگا اور فلائٹ چارجز ایک گھنٹے کا دس ہزار روپیہ ہوگا۔“

میں نے اسے بیس ہزار دیے۔ ”یہ تمہارے دو دن کے ہو گئے اب تم مجھے صبح سات سے شام چھ بجے تک ملو گے۔ تمہارا فون بند نہ ہو اور تم ٹن نہ ہو۔“ میں نے بوتل کی طرف دیکھا۔ ”اسے پی کر تم بغیر ہیلی کاپٹر کے بھی پرواز کر سکتے ہو۔ لیکن مسئلہ ہمارا ہے۔“

”یہ.....“ اس نے کھسیا کر کہا۔ ”میرے لیے پانی ہے۔“

”شراب پی پی کر مرنے والے سارے شرابی یہی کہتے ہیں۔ بہرحال یہ تمہارا مسئلہ ہے۔“ میں کھڑا ہوگیا۔

”تمہارا نام اور کوئی آئی ڈی؟“

”نام بتا دیا ہے اور آئی ڈی کی کیا ضرورت ہے تم جو چاہے لکھوا دینا۔“ میں نے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے میں نمٹ لے گا۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ایک مرحلہ اور طے ہوگیا تھا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ راج کنور کا ہیلی کاپٹر ہی استعمال کروں گا لیکن اب وہ یقیناً بڑے کنور کے اشارے کا غلام تھا اور راج کنور خود سے اسے نہیں بلا سکتا تھا۔ اس پائلٹ کا فائدہ یہ ہوتا کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ سرحد کہاں سے پار کرنی ہے۔ مگر کوئی بھی تجربے کار پائلٹ یہ کام کرسکتا تھا اگر راضی خوشی نہیں کرتا تو اس سے کرایا جا سکتا تھا۔ بی اے سنکاری نے اپنا ہیلی کاپٹر دکھایا۔ یہ پانچ نشستوں والا ہلکا ہیلی کاپٹر تھا لیکن ایک بار فیول لے کر دو گھنٹے سے زیادہ پرواز کرسکتا تھا۔ اتنا وقت کافی تھا کیونکہ ہمیں ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ پرواز نہیں کرنی تھی اور اس دوران میں ہم لازمی سرحد عبور کر جاتے۔ ہیلی کاپٹر کسی قدر پرانا تھا مگر اس کی دیکھ بھال ہوتی تھی اس لیے نیا لگ رہا تھا۔ سنکاری نے مجھے بتا کر حیران کردیا۔

”میں اسے دس سال سے اڑا رہا ہے۔“

”یہ دس سال پرانا تو نہیں لگتا۔“

”یہ اس سے بھی پرانا ہے لیکن اس کا برابر مینٹی نینس کرتا ہے۔ سارا اہم پرزہ چینج کیا جاتا ہے۔ فلائنگ مشین میں ایک پرزہ بھی ٹھیک نہ ہو تو یہ دھڑام سے نیچے گر سکتا ہے۔“

اس بار میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ”میں تم سے رابطہ کروں گا تم تیار رہنا۔“

ٹیکسی والا منتظر تھا اور اونگھ رہا تھا مجھے دیکھ کر ہوشیار ہو گیا۔ ”اب کدھر جانا ہے سر؟“

”وہیں جہاں سے تم نے مجھے اٹھایا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ میں نے ہمالیہ ہوٹل کا حوالہ نہیں دیا۔ ٹیکسی بھی ہمالیہ ہوٹل سے کچھ فاصلے سے لی تھی۔ میں اب محتاط ہوگیا

فدا

منیٰ کے مقام پر جو قربانی دی جاتی ہے، اسے الفدیٰ کہتے ہیں، کیونکہ یہ رسم اس فدیے کی یاد میں ادا کی جاتی ہے جو حضرت اسماعیل کے لیے مینڈھے کی قربانی کرکے دیا گیا تھا۔ فدی کے معنی ہیں۔ انسان کو کسی مصیبت سے اس کی طرف سے کچھ خرچ کرکے محفوظ کرنا۔“

مرسلہ: نعیم الدین، حاصل پور

تھا۔ خاص طور سے جب فتح خان اور ڈیوڈ شا کے بارے میں پتا چلا تھا کہ وہ انڈیا میں میری موجودگی سے واقف تھے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ انہیں بالکل درست پتا ہو کہ میں کہاں تھا لیکن یہ بھی کم نہیں تھا کہ وہ انڈیا میں میری موجودگی سے واقف تھے۔ بابا نے جو تین نمبرز دیے تھے اور ان پر ڈیوڈ شا سے رابطہ کیا جا سکتا تھا۔ مگر میرا فی الحال رابطہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ جب میں ٹیکسی سے اترا تو دو بج رہے تھے۔ میں ہوٹل کے مخالف سمت کی طرف چل پڑا اور جیسے ہی ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہوئی میں نے یوٹرن لیا اور ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔ بانو اپنے کمرے میں تھی اور میری منتظر تھی اس نے لنچ نہیں کیا تھا۔ اس نے آرڈر کیا۔ ہم نے طے کیا ہوا تھا کہ کھانا اپنے کمرے میں کھایا کریں گے اور غیر ضروری طور پر باہر جانے سے گریز کریں گے۔ تاکہ کسی کی نظروں میں آنے کا امکان کم سے کم ہو۔ کھانے کے دوران میں نے اسے اپنی کارگزاریوں سے آگاہ کیا۔ وہ غور سے سن رہی تھی۔ کھانے کے بعد اس نے سوال کیا۔

”شہباز صاحب کیا یہ خطرناک نہیں ہے؟“

”ہاں ہے تو۔“ میں نے اعتراف کیا۔ ”لیکن خطرات تو تمام طریقوں میں ہیں۔“

”اگر ہیلی کاپٹر کو ہٹ کیا گیا تو بچنے کا امکان بہت کم ہوگا۔“

”رامن اسی طریقے سے آتا جاتا رہا ہے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”جب وہ ہمارے ساتھ ہوگا تو انڈیا کی طرف سے کوئی مشکل نہیں ہوگی اور میرا اندازہ ہے کہ دوسری طرف اس مقام پر شاید ریڈار کی نگرانی اتنی اچھی نہیں ہے اس لیے ان کو ہیلی کاپٹر کی آمدورفت کا پتا نہیں چلتا ہے۔“

بانو محبِ وطن پاکستانی کی طرح فکرمند ہوگئی۔ ”یہ تو

اچھی بات نہیں ہے۔ اس طرح سے ہمارے ملک کا دفاع کمزور ہو جائے گا۔"

"تم فکر مت کرو واپس جا کر ہم متعلقہ اتھارٹیز کو خبردار کر سکتے ہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "فی الحال تو یہ ہمارے لیے موقع ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر ہم واپس جا سکتے ہیں۔"

"راج کنور کیسے ہمارے ہاتھ آئے گا؟"

"اس کا بندوبست بھی کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر امرتسر سنگھ سے اسی لیے رابطہ کیا ہے۔"

اس کا نام سن کر بانو کا چہرہ ذرا سرخ ہوا تھا۔ "ٹھرکی آدمی ہے۔ بلاوجہ میرے سر پر سوار رہتا تھا اور فری ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر انتھونی سے شکایت کی تو اس کے بعد سیدھا ہو گیا تھا۔"

"تم نے پہلے بتانا تھا۔ خیر ابھی اس سے سلام دعا ہے اللہ نے چاہا تو جاتے جاتے اسے بھی کوئی جھٹکا دے جائیں گے۔"

"آپ کو یقین ہے کہ اس طرح ہم راج کنور کو حاصل کر لیں گے۔"

"یقین تو نہیں ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ خود مجھے بھی لگ رہا تھا کہ میں نے جو منصوبہ بنایا ہے وہ کوئی اتنا اچھا نہیں ہے اور اس کی کامیابی میں بہت سے اگر مگر حائل تھے۔

"شہباز صاحب ہمیں کوئی ایسا پلان بنانا چاہیے جس میں کامیابی کا امکان زیادہ ہو اور معاملات ہمارے ہاتھ میں ہوں۔"

میں نے غور کیا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ ہمیں راج کنور کو خود قابو کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"بالکل.... اس معاملے کو بڑے کنور کی طرف سے کارروائی پر مت چھوڑیں۔"

"کیا ایک اسپتال میں اس قسم کا کام آسان ہوگا۔"

"بالکل ہوگا، وہاں ہمیں مسلح افراد کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا جب کہ راج کنور کو منتقل کیا گیا تو یقیناً اس کے ساتھ زیادہ پہریدار ہوں گے۔"

"یہاں بھی رامن اور سنتوش ہیں۔"

"یہ دو ہیں اور مجھے امید ہے رامن کہیں پڑا اپنے زخموں کی سکائی کر رہا ہوگا۔ ہمیں صرف سنتوش سے نمٹنا پڑے گا۔"

بانو کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور پھر ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ "سنو اگر ہم ڈاکٹر اور نرس بن کر چلیں تو اسپتال میں کوئی ہمیں نہیں روکے گا۔"

بانو اچھل پڑی۔ "یہ آئیڈیا بہترین ہے۔ وہاں کوئی کسی پر توجہ بھی نہیں دیتا ہے۔ بہت بڑا اسپتال ہے میرا خیال ہے درجنوں ڈاکٹرز اور نرسیں کام کرتی ہوں گی سب کی صورتیں کسی کو یاد نہیں ہوں گی۔"

"اس کے لیے ہمیں ڈاکٹر اور نرس کا لباس درکار ہوگا اور حلیے میں بھی تبدیلی کرنا ہوگی۔"

"میرا مشورہ ہے آپ اس کام کے لیے ہوٹل کے منیجر سے بات کریں وہ سب کر لے گا۔" بانو نے دوسرا بہترین مشورہ دیا۔ میں نے پرتحسین نظروں سے اسے دیکھا۔

"شاندار.... کاش کہ تم لڑکا ہوتیں۔"

"کیوں؟"

"میں تمہاری پشت تھپکتا۔"

وہ ہنسی۔ "آپ مجھے لڑکا سمجھ سکتے ہیں۔"

"نہیں سمجھ سکتا۔" میں نے کہا۔ "سمجھ لو میں نے تمہاری پیٹھ تھپک دی ہے۔"

"میرا خیال ہے آپ فوری عمل کریں اور اس سے پہلے طے کر لیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟"

میں نے غور کیا۔ "سب سے پہلے ہمیں اسپتال میں آمد و رفت کے راستوں کے بارے میں جاننا ہے۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے ویٹنگ روم میں دیوار پر ایک نقشہ لگا ہوا ہے جس میں پورے اسپتال کی وضاحت کی گئی ہے۔"

"لیکن وہاں راج کنور کا کوئی نہ کوئی آدمی ہوگا۔"

"تب آپ ڈاکٹر امرتسر سے بات کریں۔ میرا خیال ہے وہ نقشہ لا دے گا آپ یہی کہیے گا کہ راج کنور سے ملنا ہے اور اس کے نگرانوں سے بچنا ہے۔"

میں نے آپریٹر سے امرتسر سنگھ کو کال ملوائی، وہ سو رہا تھا۔ اس نے فریاد کی۔ "اوہ بھائی مینوں سونے دیو۔ شام ڈیوٹی بھی دینی ہے۔"

"سردار جی مجھے اسپتال کا نقشہ چاہیے۔"

"کوئی ای میل ہو تو بتاؤ میں ابھی بھیج دیتا ہوں۔" خلاف توقع اس نے فوراً مسئلہ حل کر دیا اور میں نے اسے اپنا ای میل دے دیا۔ اس نے پیچ ہی دومنٹ میں نقشہ

ای میل کر دیا۔ پتا نہیں اس کے پاس کہاں سے آیا تھا لیکن اس سے میرا کام بن گیا۔ میں نے سومتر جن کو کال کی اور اس سے ایک پرنٹر مانگا۔ وہ بھی آ گیا اور نقشہ پرنٹ کر لیا گیا، لیپ ٹاپ کی چھوٹی اسکرین پر یہ فٹ نہیں آ رہا تھا۔ مگر کاغذ پر اب اسپتال کا مکمل نقشہ ہمارے سامنے تھا۔ میں دو راستوں سے واقف تھا لیکن ایک تیسرا راستہ اسٹاف کے لیے تھا یہ براہ راست ان کے لیے مخصوص پارکنگ میں کھلتا تھا۔ یہاں سے اندر داخل ہونے کے بعد دو راستوں سے پرائیویٹ رومز تک پہنچا جا سکتا تھا۔ ایک ڈاکٹروں کے ایریا سے گزرتا تھا اور دوسرا اسپتال کے کیفے ٹیریا اور میس سے گزرتا تھا۔ میں نے بانو سے کہا۔

"یہ کام تو آسان ہو گیا۔"

"ہم پارکنگ والے راستے سے اندر داخل ہوں گے۔" بانو خوش ہو گئی۔ "سردار نے بڑا کام کیا ہے اس پر اس کا۔ ٹھرکی پن معاف کیا جاتا ہے۔"

میں نقشہ دیکھ رہا تھا کہ میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ "بانو تمہارا ایک چیک اپ اور ہونا ہے۔ اس کے بعد تمہیں فضائی سفر کے لیے کلیئر کیا جائے گا۔ میرا مشورہ ہے تم چیک اپ کے لیے جاؤ میں کہیں سے ڈاکٹر کا سفید کوٹ حاصل کر کے پارکنگ والی جگہ سے اندر داخل ہوں گا اور راج کنور کو لے کر نکل جاؤں گا۔"

"اس کے لیے ایمبولینس کرنا پڑے گی۔"

"یہاں پرائیویٹ ایمبولینس سروس ہو گی۔ وہاں سے ایمبولینس منگوائی جا سکتی ہے۔ وہ اسی پارکنگ میں آ جائے گی۔ تم چیک اپ کراؤ گی اور جیسے ہی تم باہر جانے لگو گی میں بھی راج کنور کو لے کر نکل جاؤں گا۔"

"لیکن مجھے سامنے سے جانا پڑے گا اور وہاں رامن یا اس کا آدمی ہوگا۔"

"اس کا حل ہے تم عبائے میں جاؤ گی۔ اس طرح ہمیں کم سے کم لوگوں کو ملوث کرنا پڑے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ معاملہ ہوٹل انتظامیہ تک نہ پہنچے ورنہ وہ رانا وِیاس کی نشان دہی پر مجبور ہو جائیں گے اور یہ اس کی نیکی کا اچھا صلہ نہیں ہوگا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اس وقت بلاوجہ مجھے لڑکا بنا رہے تھے۔"

میں جھینپ گیا۔ "اس وقت یہ تجویز بہترین لگی تھی۔" "گویا اب ہمیں ایک ڈاکٹر والا کوٹ، ایک عبایا اور

ایک ایمبولینس کا بندوبست کرنا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اچھا ہوا کہ اب ہمیں نرس کے لباس کا بندوبست نہیں کرنا ہوگا ڈاکٹر بننے کے لیے ایک سفید کوٹ سے کام چل جاتا لیکن نرس کے لیے تو مکمل یونیفارم درکار ہوتا۔"

"بالکل، لیکن پہلے ڈاکٹر انتھونی کو کال کر کے چیک اپ کا وقت لیتے ہیں۔"

ڈاکٹر انتھونی ڈیوٹی پر تھا اس نے کہا کہ ہم کسی بھی وقت آ جائیں اس کا چیک اپ ہو جائے گا اور اس میں تقریباً دو گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ پھر میں نے آپریٹر سے کسی پرائیویٹ ایمبولینس سروس کا پوچھا۔ اس نے مجھے چار عدد سروسز کے نمبر مہیا کر دیے۔ وہ رابطہ کرا کے دے رہا تھا لیکن میں نے منع کر دیا کہ میں خود رابطہ کر لوں گا۔ اب مجھے ایک موبائل فون کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ورنہ کال کرنے کے لیے میں ہوٹل آپریٹر اور پی سی او کا محتاج ہو رہا تھا۔ جب پہلی بار انڈیا آیا تب میں نے یہاں کئی بار موبائل لیے اور سم بھی حاصل کیں لیکن اب حالات مختلف تھے اور میں زیادہ محتاط تھا۔ اس لیے خود سے موبائل اور سم لینے کے بجائے میں نے منیجر سے کہا کہ وہ میرے لیے ایک سیل فون کا بندوبست کرے لیکن اس کا تعلق ہوٹل یا مجھ سے نہ ہو۔ منیجر سمجھ گیا اور اس نے کہا کہ وہ کچھ دیر میں سیل فون بھجوا رہا ہے۔

آدھے گھنٹے بعد ہوٹل کا ایک آدمی ڈبے میں بند سیل فون دے گیا۔ اس میں سم بھی تھی اور اس کا نمبر ڈبے کے اندر لکھا ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہوٹل والوں نے یہ سیل فون کیسے حاصل کیا تھا۔ میرا کام ہو گیا تھا۔ میں نے ایمبولینس سروس کو کال کی اور ان میں سے ایک سروس کا انتخاب کیا کیونکہ وہ چوبیس گھنٹے کے لیے ایمبولینس دینے کو تیار تھے اور ان کا مرکز بھی ہوٹل ہمالیہ کے نزدیک تھا۔ ان چکروں میں شام ہو گئی تھی۔ اس لیے یہ کام آج ممکن نہیں تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ بانو کا چیک اپ کرا لیا جائے۔ ہم باہر نکلے۔ بانو کے لیے عبایا تو آسانی سے مل گیا تھا لیکن مجھے ڈاکٹر کا کوٹ بڑی مشکل سے ملا۔ یہاں سے ایک ٹیکسی کر کے ہم اسپتال روانہ ہوئے۔ بانو نے گارمنٹ اسٹور میں ہی عبایا پہن لیا تھا اور چہرہ نقاب سے ڈھک لیا۔ میں نے اسے اسپتال کے سامنے اتارا۔

"میں انتظار کروں گا۔"

"نہیں بہت دیر لگ سکتی ہے آپ واپس چلے جائیں میں خود آ جاؤں گی۔" بانو نے اصرار کیا لیکن میں نے

انتظار کو ترجیح دی۔ اگرچہ وہ عبائے میں تھی اس کے باوجود اسپتال میں رامن اور اس کے آدمیوں کی موجودگی کے خیال سے مجھے بے چینی ہو رہی تھی۔ اگر بانو شناخت کر لی جاتی اور وہ اسے قبضے میں کر لیتے تو یہ ان کی بڑی کامیابی ہوتی۔ کچھ دیر بعد میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو دو سو روپے دیے اور کہا۔

"تم رکو میں آتا ہوں اگر میم صاحب آئیں تو انہیں لے کر فوراً چلے جانا میرا انتظار مت کرنا۔"

"ٹھیک سر، پر وہ میری بات مانیں گی؟" ٹیکسی ڈرائیور نے دبی زبان میں کہا۔

"اسے کہنا کہ یہ فالکن نے کہا ہے۔" میں نے کہا تو اسے تعجب ہوا تھا مگر بانو اشارے سے سمجھ جاتی کہ یہ بات فالکن یعنی شہباز یعنی میں نے کی ہے۔ میں نے ڈرائیور کو زیادہ رقم نہیں دی کہ وہ لے کر نو دو گیارہ نہ ہو جائے اور پھر ہمیں ٹیکسی کے لیے خاصا آگے جانا پڑتا۔ میں نے سڑک پار کر کے اسپتال کی دیوار کے ساتھ رکتے ہوئے موبائل سے ڈاکٹر انتھونی کا نمبر ملایا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ "ڈاکٹر صاحب میں شیام بات کر رہا ہوں، رینا آگئی ہے؟"

"یس شی از ہیئر۔" اس نے تصدیق کی۔

"تھینک یو ڈاکٹر، جب اس کا چیک اپ ہو جائے تو آپ پلیز مجھے اسی نمبر پر کال کر دیجیے گا میں اسے لینے آجاؤں گا۔"

"وائے ناٹ۔" اس نے جواب دیا۔ یہ تصدیق ہو جانے کے بعد کہ بانو خیریت سے اندر پہنچ گئی ہے اصولاً مجھے شرافت سے واپس ٹیکسی کی طرف آجانا چاہیے تھا مگر میں نے سوچا کہ جب یہاں تک آگیا ہوں تو ذرا وہ راستہ بھی دیکھ لوں جس سے گزر کر راج کنور تک رسائی حاصل کرنی تھی اور پھر اسے نکال کر لے جانا تھا۔ نقشے اور حقیقت میں کچھ نہ کچھ فرق تو ہوتا ہے۔ اتفاق سے کوٹ میرے پاس تھا۔ یہ شاپنگ والے شاپر میں تھا۔ میں گیٹ سے اندر آیا اور اس بار بائیں طرف مڑا۔ عملے کے لیے مخصوص پارکنگ اسی طرف تھی اور اس کی نشان دہی کے لیے ایک بورڈ بھی لگا ہوا تھا تاکہ عام افراد اس طرف جانے سے گریز کریں۔ یہاں سناٹا تھا اور کسی نے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں آرام سے اس دروازے تک پہنچ گیا جس سے ڈاکٹر اور دوسرا اسٹاف اندر آتا جاتا تھا۔ اس کے سامنے پارکنگ میں جگہ تھی۔ اندر جانے سے پہلے میں نے ڈاکٹر والا کوٹ پہن لیا اور اس کا شاپر کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ میں نے اندر قدم رکھا۔ اس میں رسک تھا اگر کسی جان پہچان والے سے سامنا ہو جاتا اور وہ پہچان جاتا تو میں مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ میرے لیے وضاحت مشکل ہو جاتی کہ میں ڈاکٹر جیسے کوٹ میں یہاں کیا کر رہا تھا۔ اندر سے دو نرسیں اپنی ہائی ہیل کی ایڑیاں بجاتی ہوئی باہر جا رہی تھیں اور آپس میں بات کر رہی تھیں انہوں نے میری طرف توجہ نہیں دی اور برابر سے گزر گئیں۔ راہداری کے کونے پر پہنچ کر میں نے نقشہ ذہن میں تازہ کیا اس کے مطابق مجھے دائیں طرف مڑنا تھا اور پھر... بائیں طرف مڑتا تو پرائیویٹ روم ایریا تک پہنچ جاتا۔ راج کنور کا کمرا اسی جگہ تھا۔ لیکن جیسے ہی میں دائیں طرف مڑا مجھے ڈاکٹر انتھونی دکھائی دیا وہ ایک نرس سے بات کرتا اور ایک چارٹ دیکھتا اسی طرف آ رہا تھا اس سے پہلے اس کی نظر مجھ پر پڑتی میں تیزی سے واپس آیا اور جو پہلا دروازہ دکھائی دیا اسے کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ یہ کسی ڈاکٹر کا کمرا تھا اور خوش قسمتی سے خالی تھا۔ میں نے دروازہ ذرا سا کھلا رکھا۔ ڈاکٹر انتھونی نرس سے بات کرتا ہوا راہداری میں سیدھا نکل گیا تھا اس نے مڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نرس اس کے ساتھ تھی۔ ان کے جاتے ہی میں باہر نکل آیا اور دبے قدموں دائیں طرف مڑا۔ اس بار کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور میں بہ آسانی راج کنور کے کمرے تک پہنچ گیا۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے آہستہ سے دروازے کا ہینڈل گھمایا تھا کہ میرے کانوں نے بڑے کنور کی دھیمی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"راج تم بلا وجہ شک کر رہے ہو۔ اگر تم کاغذات میرے حوالے کر دو گے تو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ ورنہ میرے لیے کیا مشکل ہے کہ تمہارے بیوی بچوں کو بلا لوں۔"

"مجھے تم پر اعتماد نہیں ہے۔" راج کنور نے کہا۔ "وہ کاغذات میری زندگی کی ضمانت ہیں۔"

"نہیں، ہماری زندگیوں کی ضمانت وہ ان لکھا معاہدہ ہے جو خاندان میں آپس میں خون بہانے سے منع کرتا ہے اسی وجہ سے تم نے مجھے نہیں مارا اور میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ اگر تم مجھے کاغذات دے دو تو سب پہلے کی طرح ہو جائے گا۔"

"تم مجھے معاف کر کے جاگیر کا انتظام میرے ہاتھ میں دے دو گے۔" راج کنور نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"نہیں، یہ ممکن نہیں ہے لیکن شہر کا بزنس میں تمہارے حوالے کر دوں گا اور میرا حصہ دے کر تم اس سے کما سکتے ہو۔"

"اس سے کیا ملے گا مہینے کے دس پندرہ لاکھ۔ اس میں میرا گزارا کیسے ہوگا۔"

"تم نے پہلے بھی بہت کمایا اور بچایا ہوگا۔" بڑے کنور کا لہجہ سرد ہو گیا۔ "اسے بھی بزنس میں لگا سکتے ہو۔ پھر میرے بعد سب تمہیں ہی ملے گا۔"

"میں سوچوں گا۔" راج کنور نے عیاری سے کہا۔

"تمہارے پاس کل تک کی مہلت ہے۔" بڑے کنور نے خبردار کیا۔ "میں نے ڈاکٹر سے بات کر لی ہے کل تمہیں یہاں سے شفٹ کیا جا سکتا ہے اگر تم کاغذات دے دو تو تمہیں پیلس نہیں جانا پڑے گا تم یہیں سے اپنے بیوی بچوں کے پاس جا سکتے ہو۔"

"میں پیلس نہیں جاؤں گا۔" راج کنور کے لہجے میں پہلی بار خوف آیا۔ میں نے دروازہ ذرا سا کھلا رہنے دیا تھا اور کان اندر کی طرف لگائے ہوئے تھے لیکن نظریں آس پاس مرکوز تھیں، کوئی اچانک میرے سر پر آجاتا تو میں رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا اور اگر رامن یا سنتوش آجاتا تو پھر جان بچانے کی کوشش کرنا پڑتی۔

"راج تم بے بس ہو، اسے اپنے لیے آخری وارننگ سمجھو۔"

"تم مجھے خوف زدہ نہیں کر سکتے۔"

"میں جانتا ہوں تم کس کے بل پر اکڑ رہے ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ شہباز ملک تمہیں بچا لے گا لیکن یہ تمہاری اور اس کی بھول ہے۔ وہ بہت جلد خود میرے پاس آئے گا۔"

"وہ کیسے؟" راج کنور نے حیرت سے پوچھا۔ "میرا خیال ہے وہ اب تک انڈیا سے نکل چکا ہوگا۔"

"بے شک وہ انڈیا سے بھی نکل جائے اس کے باوجود خود میرے پاس آئے گا۔ تم اس پر تکیہ مت کرو۔ میری پیشکش کا فائدہ اٹھاؤ۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ بڑا کنور بہت پر اعتماد لہجے میں یہ بات کہہ رہا تھا اور اس کے پیچھے کوئی چکر تھا۔ آخر میں خود کیوں اس کے پاس آنے پر مجبور ہوتا؟ ایسا میں صرف اپنے کسی ساتھی کے لیے کر سکتا تھا۔ لیکن میرے تمام ساتھی اس کی دسترس سے باہر تھے۔ اچانک مجھے بانو کا خیال آیا۔ میں تیزی سے وہاں سے ہٹا اور دروازے کھول کھول کر دیکھنے لگا۔ دو کمروں میں مجھے مریض ملے اور میں نے سوری کہہ کر دروازہ بند کر دیا۔ تیسرا کمرا خالی ملا تھا۔ میں اندر داخل ہوا اور موبائل نکال کر ڈاکٹر انتھونی کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ "یس۔"

"ڈاکٹر اٹ از شیام۔" میں نے کہا۔ "رینا کا چیک اپ کس مرحلے میں ہے؟"

"ایم آئی آر ہو رہا ہے۔" وہ بولا۔

"ڈاکٹر میں اس کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔"

"وائے ناٹ.... آپ آجائیں، کسی سے ایم آئی آر سیکشن کا پوچھ لینا۔"

ڈاکٹر انتھونی کی بات سے لگ رہا تھا کہ وہ فی الحال بانو سے دور تھا۔ میں کمرے سے نکلا اور راج کنور کے کمرے تک آیا۔ بڑا کنور جا چکا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اکیلے یہاں تک کیسے آگیا تھا۔ جب کہ وہ جانتا تھا کہ میں یہاں تھا۔ شاید اس کے محافظوں کو اندر آنے نہیں دیا گیا تھا اور اسے بہ ظاہر یہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ الٹا اس کی بات نے مجھے پریشان کر دیا تھا اور میں ممکنہ خطرے کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک نرس نے مجھے ایم آئی آر سیکشن کے بارے میں بتایا اس نے پوچھا۔ "آپ نئے آئے ہیں؟"

"نہیں، میں ایک دوسرے اسپتال سے وزٹ پر آیا ہوں۔" میں نے کہا اور اس کی بتائی ہوئی سمت مڑ گیا۔ یہ لیب ایکسرے کا ایریا تھا اس لیے یہاں معمول سے زیادہ سناٹا تھا۔ ایم آئی آر روم کے باہر تختی لگی تھی اور میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو نیلے یونیفارم میں ملبوس... چینی نقوش والا اٹینڈنٹ حیران پریشان کھڑا تھا اور اس کی پریشانی کی وجہ بھی نظر آگئی۔ وہ ٹرے جس پر لٹا کر آدمی کو ایم آئی آر مشین میں ڈالا جاتا ہے۔ وہ خالی تھی اور بانو وہاں کہیں نہیں تھی۔ میرا خدشہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے نوجوان کا گریبان پکڑ کر کھینچا اور خونخوار لہجے میں بولا۔ "لڑکی کہاں ہے؟"

"مم.... مجھے نا ہی معلوم۔" اس نے ہکلا کر کہا۔

"بکواس مت کرو وہ یہیں تھی۔" میں نے لہجے کو مزید خونخوار کیا۔

اس نے جلدی سے سر ہلایا۔ "وہ یہیں تھی لیکن میں ٹرے میں کر کے اسے لٹا کر گیا تاکہ مشین آپریٹ کر سکوں۔ جب واپس آیا تو وہ نا ہی تھی۔"

وہ نہیں ذرا کھینچ کر بول رہا تھا۔ میں اسے کھینچ کر مشین

تک لے گیا۔ ”تم کہاں گئے تھے؟“

اس نے مشین کا آپریٹنگ سیکشن دکھایا۔ یہ بیچ اسکی جگہ تھا جہاں سے ٹرے والا حصہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ”کوئی اندر آیا تھا؟“

”نہیں، میں نے کوئی آواز نہیں سنی۔“

میں پریشان ہوگیا۔ اگر بانو اپنی مرضی سے نہیں گئی تھی تو اسے لے جانے والے نہایت ماہر تھے انہوں نے ذرا بھی آہٹ پیدا نہیں کی تھی۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ ”تم نے کسی کو بتایا؟“

”میں ڈاکٹر انتھونی کو کال کرنے جا رہا تھا کہ آپ آگئے۔“

”اسے کال کرو اور لڑکی کے غائب ہونے کا بتاؤ۔ میں لڑکی کا بھائی ہوں لیکن ڈاکٹر سے کہنا جب تک میں اس سے رابطہ نہ کروں کوئی کارروائی نہ کرے، مطلب پولیس وغیرہ کو کال نہ کرے۔ ورنہ یہ کال خود اس کے گلے پڑ جائے گی۔ میری بات سمجھ لی ہے؟“

”جی سر۔“ نوجوان نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

”اسے لفظ بہ لفظ بتا دینا اور کہنا میری کال کا انتظار کرے۔“ میں کہہ کر باہر نکل آیا۔ میں نے پتلون کی بیلٹ سے پستول نکال کر کوٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا اور اس کا دستہ میری گرفت میں تھا۔ میرا رخ ویٹنگ روم کی طرف تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہاں سنتوش یا رامن کے کسی اور آدمی کو ہونا چاہیے تھا لیکن کسی کو بھی وہاں نہ پا کر میرے اندر خطرے کا دھمکتا احساس مزید بڑھ گیا تھا۔ یقیناً بڑا کنور میری نقل و حرکت سے باخبر تھا اور وہی بانو کو لے گیا تھا۔ اس کا مقصد پورا ہوگیا تھا اور اب میں خود اس کے پاس حاضر ہو جاتا۔ وہ راج کنور سے یہی کہہ رہا تھا۔ میں واپس راج کنور کے کمرے کی طرف آیا ایک خدشہ یہ تھا کہ وہ اسے بھی نہ لے گیا ہو لیکن راج کنور کو بستر پر پا کر میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اسے پتا بھی نہیں چلا کہ میں نے جھانک کر اسے دیکھا تھا۔ اس وقت میں بہت چوکنا تھا اور ایک سیکنڈ کے نوٹس پر مار دھاڑ کے لیے تیار تھا۔ میں نے سامنے سے نکلنے کے بجائے اسٹاف والے دروازے کا رخ کیا اور وہاں سے نکل رہا تھا کہ ڈاکٹر انتھونی کی کال آگئی۔

”مسٹر شیام واٹ از دس۔“ وہ کسی قدر تیز لہجے میں بولا۔ ”رینا یہاں سے کہاں گئی؟“

”میں نہیں جانتا ڈاکٹر اور میں اسے تلاش کر رہا ہوں۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”اصل میں یہاں ہمارے کچھ دشمن بھی ہیں۔ مجھے شبہ ہے وہ رینا کو کڈنیپ کر کے لے گئے ہیں۔“

”ہاسپٹل سے؟.... یہ ناممکن ہے۔“

”ڈاکٹر یہ ممکن ہوگیا ہے اور لڑکی تمہارے آدمی کے سامنے سے غائب ہوئی ہے لیکن فی الحال تم پولیس کو اطلاع نہیں دو گے۔ جب تک میں اوکے نہ کروں۔ دوسری صورت میں تم خود پولیس کے سوالوں کے جواب دیتے رہنا۔ میں اور رینا یہاں واپس نہیں آئیں گے۔“

ڈاکٹر انتھونی سمجھ رہا تھا کہ اس صورت میں اس کی کیا پوزیشن ہو جائے گی۔ اس نے کہا۔ ”اوکے میں پولیس کو کال نہیں کروں گا۔“

میں باہر آیا اور اسپتال سے باہر نکل کر ٹیکسی کو تلاش کیا مگر ٹیکسی وہاں نہیں تھی جہاں میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ میں حیران پریشان سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ مشکل سے آدھے گھنٹے کے اندر ہی سب پلٹ کر رہ گیا تھا اور پھر مجھے احساس ہوا کہ میں اس طرح یہاں کھڑا ہو کر دشمن کے لیے ایک آسانی اور پیدا کر رہا تھا۔ کوٹ اتارتے ہوئے میں تیز قدموں سے جانے لگا۔ میری نگاہیں آس پاس کسی ممکنہ دشمن یا مشکوک شخص کو تلاش کر رہی تھیں لیکن وہاں نہ تو کوئی مشکوک شخص دکھائی دیا تھا اور نہ کوئی جانا پہچانا دشمن۔ مگر دشمن وہاں موجود تھا ورنہ وہ اتنی آسانی سے بانو کو کیسے لے جاتا۔ اس کا مطلب میں شروع سے ان کی نظروں میں تھا اور انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ میں کہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ بڑے کنور اور رامن کے آدمی ہماری نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے چالاکی سے کام لیا۔ بڑا کنور جانتا تھا کہ اگر مجھے براہ راست چھیڑا گیا تو میں مرنے مارنے پر تل جاؤں گا اور اس میں مجھے نقصان ہو سکتا تھا۔ یہ ہرگز اس کی منشا نہیں تھی، اسے میری جان نہیں میرا خون درکار تھا۔ اس لیے اس نے حکمت عملی سے کام لیا۔ بڑے کنور نے بانو کو قابو کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ کام ہوٹل میں ممکن نہیں تھا کیونکہ وہاں کی سیکیورٹی بہت سخت تھی اور وہاں کیمرے بھی لگے ہوئے تھے۔ یہ کام اسپتال میں ممکن تھا اور جیسے ہی بانو اسپتال آئی وہ اسے وہاں سے لے گئے۔

ایک سوال یہ تھا کہ اگر بڑا کنور کسی وجہ سے شروع سے شملہ میں میری اور بانو کی موجودگی سے واقف تھا تو اس نے پہلے یہ کام کیوں نہیں کیا؟ اس کا ممکنہ جواب یہ تھا۔ شاید اس

لیے کہ بانو زخمی تھی اور اسے علاج کی ضرورت تھی اگر بڑا... کنور اسے پہلے اٹھوا لیتا تو اس کا علاج ادھورا رہ جاتا اور وہ مر بھی سکتی تھی اس لیے اس نے صبر سے انتظار کیا جب بانو تقریباً ٹھیک ہوگئی تو اس نے اپنا کام کرلیا۔ راج کنور کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی اس لیے اس نے اسے وہیں چھوڑ دیا۔ اپنے آدمیوں کو میرے ممکنہ غیظ و غضب سے بچانے کے لیے انہیں اسپتال سے ہٹا لیا تھا۔ لیکن وہ اسپتال کے آس پاس موجود تھے اور کسی نامحسوس طریقے سے راج کنور کی نگرانی بھی جاری ہوگی ویسے وہ بستر کا قیدی تھا، اپنی مرضی سے کہیں نہیں جا سکتا تھا مگر اسے لے جایا تو جا سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بڑے کنور نے اس کا بندوبست بھی کر رکھا ہوگا کہ راج کنور اسپتال سے اپنی مرضی سے نہ جا سکے۔

چلنے کے دوران میں آس پاس دیکھ رہا تھا۔ کسی نگرانی کے معاملے میں میری چھٹی حس خاموش تھی لیکن عقل کہہ رہی تھی کہ ان حالات میں نگرانی نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اچانک سامنے سے ایک رکشا نمودار ہوا۔ پہاڑی شہر ہونے کی وجہ سے یہاں رکشے کم تھے مگر اکا دکا نظر آتے تھے۔ میں نے سامنے آ کر اسے روکا اور اس سے پہلے کہ رکشے والا کچھ کہتا میں اس میں سوار ہوگیا۔ ڈرائیور مقامی تھا اس نے گڑگڑاتی زبان میں کچھ کہا جو میرے سر سے گزر گیا، میں نے کہا۔ ”ہندی یا انگریزی بولو، میں ٹورسٹ ہوں۔“

میں نے اپنی بات انگریزی میں بھی دہرائی اور اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ڈرائیور مناسب انگریزی میں بولا۔ ”کہاں جانا ہے سر؟“

”رٹز ہوٹل کے پاس اتار دینا۔“ میں نے جواب دیا یہ ہوٹل ہمالیہ ہوٹل سے کچھ ہی دور تھا۔ شام تیزی سے اتر رہی تھی اور کچھ دیر میں رات کی تاریکی چھا جاتی۔ اس کم ہوتی روشنی میں مجھے کوئی گاڑی رکشے کے تعاقب میں نظر نہیں آئی۔ رکشا کئی چھوٹی گلیوں اور سڑکوں سے گزرا تھا۔ اگر کوئی تعاقب میں ہوتا تو لازمی نظروں میں آتا۔ آدھے گھنٹے بعد میں ہمالیہ ہوٹل کے پاس اترا اور اب میں تذبذب میں تھا اگر دشمن پیچھے نہیں تھا تو میری تھیوری غلط تھی۔ دوسری صورت میں مجھے چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر بڑا کنور بانو کو اپنے قبضے میں کر چکا تھا تو اتنی دیر میں اسے مجھ سے رابطہ کر لینا چاہیے۔ میرے پاس اس کی بات ماننے کے سوا اور کیا چارہ ہوتا۔ میں پیدل ہمالیہ ہوٹل کی طرف چل پڑا ایک امید کے ساتھ ریسپشن پر موجود لڑکی سے پوچھا۔ ”میری ساتھی یہاں آئی ہے؟“

”یس سر، وہ کچھ دیر پہلے پہنچیں اور آپ کے لیے پیغام ہے کہ ان کی آمد سے آپ کو آگاہ کر دیا جائے۔“

میں نے سکون کا طویل سانس لیا تھا کہ موبائل کی بیل بجی، میں نے دیکھا۔ ہوٹل کے نمبر سے کال آ رہی تھی میں لڑکی کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے ہٹا اور کال ریسیو کی۔ دوسری طرف بانو تھی۔ ”آپ کہاں ہیں میں وہاں سے نکل آئی ہوں۔“

”ہوٹل میں ہوں اوپر آ رہا ہوں۔“

میں نے بہت دیر بعد سکون محسوس کیا تھا۔ میرا خیال سراسر غلط نکلا تھا اور میں خوش تھا کہ غلط نکلا۔ بڑا کنور ہماری وجہ سے نہیں بلکہ راج کنور کی وجہ سے یہاں آیا تھا۔ میں اوپر آیا جہاں بانو بے تابی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی لپک کر پاس آئی۔ ”شکر ہے کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی ورنہ میں تو ڈر گئی تھی۔“

”وہاں کیا ہوا تھا؟“ میں نے صوفے پر گرتے ہوئے پوچھا۔ ویسے میں کسی حد تک سمجھ گیا تھا لیکن بانو کے منہ سے سننا چاہ رہا تھا۔

”میں اندر داخل ہوئی تو بڑا کنور وہاں موجود تھا اور وہ ڈاکٹر انتھونی سے بات کر رہا تھا میں سن گن لینے کے لیے وہیں رک گئی۔ بڑا کنور اپنا چیک اپ کرانے آیا تھا۔ ڈاکٹر انتھونی اسے بتا رہا تھا کہ اس کے کچھ نئے ٹیسٹ ہوں گے اور اسے دو دن بعد دوبارہ آنا ہوگا۔ پھر وہ راج کنور کے بارے میں پوچھنے لگا۔ جب بڑا کنور وہاں سے چلا گیا تو میں ڈاکٹر انتھونی کے پاس آئی۔ وہ مجھے ایم آئی آر روم میں لے آیا۔ لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ مجھے جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ اگر میں بڑے کنور یا اس کے کسی آدمی کی نظر میں آ جاتی تو وہ آپ کو مجبور کرنے کے لیے مجھے ہر صورت قابو کرنے کی کوشش کرتے۔“

”بالکل یہی خدشہ میرے ذہن میں تھا۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔ ”بلکہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ بڑا کنور میری یہاں موجودگی سے واقف تھا اور ہماری نگرانی کرا رہا تھا موقع پاتے ہی اس نے تمہیں اغوا کر لیا ہے۔ یہ سوچ کر میرا برا حال ہوگیا کہ وہ ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا اور میرے منصوبے سے واقف تھا۔ میں تو اس سے رابطے کا سوچ رہا تھا مگر ایک چیز سے کھٹک گیا، جب میں نے دیکھا کہ کوئی میری نگرانی نہیں کر رہا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ایک بار میں اس کی

نظروں میں آجاتا اور وہ میری نگرانی نہ کراتا۔ شکر ہے میں نے جلد بازی سے کام نہیں لیا۔"

"انہی خدشات کی بنا پر میں نے بھاگ نکلنے کا فیصلہ کیا۔ جیسے ہی اٹینڈنٹ مشین کے پیچھے گیا میں دبے قدموں اٹھی۔ اپنا عبایا اور سینڈلز اٹھائے اور وہاں سے نکل گئی۔ اتفاق سے پیچھے کا راستہ میرے ذہن میں تھا اور میں وہیں سے نکلی۔"

"اس وقت میں بڑے کنور اور راج کنور کی جاسوسی کر رہا تھا۔"

"باہر نکلی تو ٹیکسی والے نے آپ کا پیغام دیا اور جب اس نے کہا کہ یہ فالکن کا حکم ہے تو میں سمجھ گئی اور اس کے ساتھ ہوٹل آگئی۔ میں نے ٹھیک کیا نا؟"

"سو فیصد۔" میں نے کہا۔ "اگرچہ تمہارا چیک اپ ادھورا رہ گیا لیکن تم محفوظ رہیں یہ زیادہ اہم ہے۔ مجھے بڑے کنور کی ایک بات نے پریشان کردیا۔ وہ میرے لیے بے فکر ہے اس کا کہنا ہے کہ میں اس ملک سے نکل بھی جاؤں تب بھی خود اس کے پاس واپس آؤں گا اور ایسا صرف ایک صورت میں ممکن ہے۔"

"جب وہ آپ کے کسی ساتھی کو پکڑ لے۔"

"بالکل، میں اسی لیے تمہاری طرف سے بہت زیادہ فکر مند ہو گیا تھا۔"

"شہباز صاحب۔" بانو سنجیدہ ہو گئی۔ "میری درخواست ہے اگر ایسی کوئی بات ہو تب بھی آپ خود کو بڑے کنور کے حوالے نہیں کریں گے۔ مجھے آزاد کرانے کی کوشش کریے گا لیکن ایسا نہ ہو سکے تو مجھے میری تقدیر پر چھوڑ دیجیے گا۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "بہر حال اللہ کا شکر ہے میرا خدشہ غلط نکلا۔"

اس نے موضوع بدل دیا۔ "اب کیا کرنا ہے؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ کل شام کے وقت ہم یہاں سے نکلتے ہیں۔ اگر ہم سورج ڈوبنے کے بعد سرحد پار کریں تو رات کی تاریکی پردے کا کام کرے گی اور بچنے کا امکان بڑھ جائے گا۔"

"ہاں دن میں تو ہم آرام سے نظر میں آجائیں گے۔" بانو بولی۔ "لیکن سرحد کہاں سے پار کریں گے؟"

"ممتاز کی زمین اور حویلی کس علاقے میں ہے؟"

"پکھیالا میں۔" بانو نے جواب دیا۔ "فیروز پور سے ذرا پہلے جی ٹی روڈ سے ایک لنک روڈ پکھیالا کی طرف آتا ہے۔ ہم لاہور آمد و رفت کے لیے اسے ہی استعمال کرتے ہیں۔"

میں نے انٹرنیٹ پر اس علاقے کا تفصیلی نقشہ نکال کر دیکھا۔ سرحد یہاں سے تین چار کلومیٹرز دور تھی۔ اس مقام پر دریائے راوی کچھ زیادہ ہی بل کھا رہا تھا اور کبھی ایک ملک کی حد میں جا رہا تھا تو کبھی دوسرے ملک کی حد میں گھس رہا تھا۔ بعض مقامات پر بیک وقت دونوں ملکوں میں بہہ رہا تھا۔ اگرچہ اب راوی بہتا نہیں ہے۔ مگر سیلاب کے دنوں میں جب انڈیا پانی کھولتا ہے تو یہ اپنے پرانے دنوں کی جھلک دکھلاتا ہے۔ مگر عام دنوں میں راوی خشک اور ضعیف رہتا ہے۔ اب تو اس میں باقاعدہ پکی آبادیاں بن گئی ہیں۔ بانو نے انگلی رکھ کر بتایا۔ "یہاں کئی جگہوں پر زمین بہت نیچی ہے اور سیلاب کے وقت پانی تلے آجاتی ہے۔"

میرا اندازہ تھا کہ یہیں وہ رخنہ تھا جو ہمارے ریڈار کی نظروں سے اوجھل تھا اور جس سے فائدہ اٹھا کر راج کنور ہیلی کاپٹر میں میاں ممتاز کے پاس آتا تھا۔ انڈیا کی طرف سے اسے چھوٹ تھی کیونکہ وہ ان کی خدمت انجام دیتا تھا اور اپنا کام بھی نکالتا تھا۔ کسی ہیلی کاپٹر کے لیے یہ تین چار کلومیٹرز کا فاصلہ طے کرنا ایک ڈیڑھ منٹ سے زیادہ کا کام نہیں تھا۔ اگر ائر ڈیفنس سسٹم ہیلی کاپٹر کا سراغ لگا بھی لیتا تو یہ وقت کارروائی کے لیے کم تھا۔ راج کنور کہاں سے سرحد پار کرتا تھا یہ بات وہی جانتا تھا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ امکان تھا کہ امر تسر سنگھ ڈیوٹی پر آگیا ہوگا لیکن میں نے پہلے ڈاکٹر انتھونی کو کال کی۔ "ڈاکٹر پولیس کو کال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ رینا واپس آگئی ہے۔ اس نے بھی دشمنوں کو دیکھ لیا تھا اور اسپتال میں کسی ممکنہ گڑبڑ کے خیال سے وہاں سے نکل آئی۔"

ڈاکٹر انتھونی نے سکون کا سانس لیا۔ "تھینکس گاڈ۔"

"میں پھر اسے چیک اپ کے لیے لاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "آپ بھول جائیں کہ رینا آج چیک اپ کے لیے آئی تھی۔"

"آئی سی اٹ۔" وہ بولا۔

"تھینک یو ڈاکٹر۔" میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ اس بار امر تسر سنگھ کا نمبر ملایا۔

"ہیلو جی۔"

"ڈاکٹر میں بات کر رہا ہوں۔ میں مریض سے بات

کرنا چاہتا ہوں۔"

"ابھی ذرا مشکل ہے میں موقع دیکھ کر کراتا ہوں۔"

"مجھے اسی نمبر پر کال کرنا۔"

میں نے موبائل رکھا تو بانو نے پوچھا۔ "آپ راج کنور سے کیا بات کریں گے؟"

"اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں اس سے اس راستے کے بارے میں پوچھوں گا جس سے گزر کر وہ سرحد پار کرتا ہے تو تم غلطی پر ہو، میں اس سے بڑے کنور کی آمد کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں اور ہمارے کل کے پلان پر عمل کے لیے کچھ معلومات چاہتا ہوں۔"

بانو نے سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے فون پر اس قسم کی گفتگو بہت خطرناک ہو سکتی ہے۔"

"تم فکر نہ کرو میں محتاط ہوں۔" میں نے اسکائپ آن کیا۔ "ابھی کھانے کا موڈ نہیں ہے ایسا کرو چائے کا کہہ دو۔"

"لیکن مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"تب تم اپنے لیے کھانا منگوا لو اور میرے لیے چائے۔" میں نے کہا۔ "مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

"تب میں کھانا اپنے کمرے میں کھا لیتی ہوں۔" بانو نے جاتے ہوئے کہا۔ میں نے عبداللہ کا نمبر ملایا اور رابطہ ہوتے ہی کہا۔

"عبداللہ.... اسکائپ پر آؤ۔"

"میں باہر ہوں، وسیم سے کہتا ہوں وہ آجائے گا اگر مجھ سے بات کرنی ہے تو میں بھی دس منٹ میں پہنچ سکتا ہوں۔"

"سب سے بات کرنی ہے اس لیے تم بھی جتنی جلدی ہو سکے پہنچ جاؤ۔ میں اسکائپ پر ہوں۔"

"میں آ رہا ہوں۔"

چند منٹ بعد وسیم اسکائپ پر آگیا اور اسی اثنا میں چائے بھی آگئی۔ ویٹر کو رخصت کر کے میں واپس آیا۔ وسیم کے ساتھ سفیر بھی تھا۔ ابھی عبداللہ کے آنے میں وقت تھا اس لیے میں ان سے ہلکی پھلکی گفتگو کرتا رہا حالانکہ سفیر نے مجھے بہت اکسایا کہ میں اصل بات کروں لیکن میں نے انکار کردیا۔ "سب کا ہونا ضروری ہے۔ ہاں اگر کوئی اور لیپ ٹاپ ہے تو وہ بھی لے آؤ اگر نہیں ہے تو اس سے بھی کام چل سکتا ہے۔"

"دوسرا نہیں ہے۔" سفیر نے آگاہ کیا۔ "تم نے نادر کے بارے میں تو پوچھا ہی نہیں۔"

"بس یار ان دشمنوں نے اس طرح گھیر رکھا ہے کہ پرانے دشمن ذہن سے نکل جاتے ہیں۔ اس کا کیا حال ہے؟"

"بہتر ہو گیا ہے۔" وسیم نے بتایا۔ "جب سے اسے پتا چلا ہے کہ ہم اسے مرشد کے حوالے کرنے والے ہیں اس کی ہوا خراب ہے اور وہ ہماری منت سماجت کرتا ہے کہ ایسا کرنے سے گریز کریں۔ مگر وہ پہلے کے مقابلے میں سنبھل گیا ہے۔"

"مرشد کی طرف سے کوئی ردِ عمل ہوا ہے؟"

"وہ ندیم سے رابطے میں ہے۔" سفیر بولا۔ "کل تیرے کیسز کے بارے میں اہم پیشی ہے۔ پولیس کیس واپس لینے کی درخواست کرے گی۔"

میں خوش ہو گیا۔ "یہ بہت اہم پیش رفت ہے۔ تم لوگوں نے بتایا نہیں۔"

"بیٹے زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے اصل مسئلہ مرشد ہے۔ ایک بار نادر اس کے ہاتھ آگیا تو وہ نئے کیس بنا سکتا ہے اور خود کو بری الذمہ بھی قرار دلوا سکتا ہے۔"

"ایک بار تو ان کیسز سے جان چھوٹے۔" میں نے کہا۔ "میں اپنی ہی سرزمین پر آزادی سے نہیں گھوم سکتا۔ مرشد کو دوبارہ دیکھ لیں گے لیکن میرا خیال ہے وہ دوبارہ مشکل سے پنگا کرے گا۔"

سفیر نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے تو وہ کتے کی دم لگتا ہے، اتنی آسانی سے سیدھی نہیں ہوتی۔"

وسیم کا بھی یہی خیال تھا۔ اسی اثنا میں عبداللہ آگیا۔ "جی شہباز صاحب....."

"میں کچھ بتا رہا ہوں، تم لوگوں نے درمیان میں سوال نہیں کرنا ہے جب میں اپنی بات مکمل کرلوں تو پھر جو چاہے پوچھنا۔"

"مجھے ایک بات پوچھنی ہے۔" حسب توقع سفیر نے ٹانگ اڑائی۔

"پوچھو۔"

"کیا تمہارے ساتھ وہ گل بانو بھی آئے گی؟"

میں نے گہری سانس لی۔ "اس نے تمہارے بارے میں بالکل درست کہا تھا؟"

"کیا.... کیا کہا تھا اس نے؟" سفیر چہک کر بولا۔

"یہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا ویسے تم اپنے سوال پر غور کرو تو شاید اس کا جواب مل جائے۔"

وسیم اور عبداللہ ہنس رہے تھے۔ سفیر نے بھنا کر کہا۔ "تم لوگ کس خوشی میں دانت نکال رہے ہو؟"

"شکر کرو ابھی بیتو نہیں ہے، ورنہ تمہارا صحیح سے ریکارڈ لگتا۔"

وسیم کی بات پر میں نے کہا۔ "وہ تو بعد میں بھی لگ سکتا ہے واپس آ کر میری بیتو اور مونا دونوں سے ملاقات ہو گی۔"

"تم تو بلیک میلنگ پر اتر آئے ہو۔" سفیر گھبرا کر بولا۔

"شہباز صاحب۔" وسیم سنجیدہ ہو گیا۔ "میرا خیال ہے آپ دیر کر رہے ہیں آپ کو فوراً وہاں سے نکل آنا چاہیے۔"

"میں تم سے متفق ہوں اور اسی لیے تم سب سے بات کرنا چاہ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اللہ نے چاہا تو کل میں اور یا تو تمہارے پاس ہوں گے۔"

وہ چونکے عبداللہ نے بیتابی سے کہا۔ "وہ کیسے؟"

میں نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتانا شروع کیا کہ میں کیا چاہتا ہوں اور کس طرح ہم دو گھنٹے سے بھی پہلے پاکستان پہنچ سکتے ہیں۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ جب میں خاموش ہوا تو وسیم نے کہا۔ "شہباز صاحب یہ بہت خطرناک ہو سکتا ہے دونوں اطراف میں سے کسی بھی طرف سے فائر کیا جانے والا ایک میزائل ہیلی کاپٹر تباہ کر سکتا ہے۔"

"یہ تو ہے لیکن اس کا امکان بہت کم ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "اوّل میرے ساتھ راج کنور ہو گا اور وہ انڈین حکام سے راہداری لے سکتا ہے۔ پھر دوسری طرف پالیسی اتنی سخت نہیں ہے۔ پہلے وارننگ دی جاتی ہے اور اگر سرحدی خلاف ورزی کرنے والا واپس نہ جائے تو ائر ڈیفنس سسٹم حرکت میں آتا ہے لیکن ان سارے کاموں میں کچھ وقت لگتا ہے اور مجھے امید ہے اتنی دیر میں ہیلی کاپٹر کم سے کم ہمیں ڈراپ کر دے گا اس کے بعد وہ واپس جاتا ہے۔ پکڑا جاتا ہے یا گرا لیا جاتا ہے یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے ہمارے سرحدی محافظوں کو پتا ہی نہ چلے۔"

"وہ کیسے؟"

"راج کنور کا کہنا ہے کہ اس طرف کچھ ایسا رخنہ ہے جہاں ریڈار نیچی پرواز کرنے والے ہیلی کاپٹر کو ٹریس نہیں کر سکتا ہے۔ دوسرے سرحد پار کرنے کے دو سے تین منٹ کے اندر میں اس جگہ پہنچ جاؤں گا جہاں تم لوگ میرے منتظر ہو گے۔"

"یہ جگہ کہاں ہے؟" عبداللہ نے سوال کیا۔

"تم نیٹ سے واہگہ بارڈر کا نقشہ نکالو۔"

عبداللہ نے نقشہ نکالا۔ "نکال لیا۔"

میں نے نشان دہی کی۔ "اس پر دیکھو اوپر پاکستان میں پکھیالا ہے۔ ممتاز کی جاگیر اسی علاقے میں ہے۔"

"یہ بھی دیکھ لیا۔"

"اس کے اوپر نارنگ منڈی سے آنے والی سڑک چکیاں روڈ سے مل رہی ہے۔"

"بالکل۔" وسیم بولا کیونکہ انہوں نے ویب چیج کھولا ہوا تھا اس لیے ان کی تصویر نہیں آ رہی تھی اور نہ میری تصویر ان کو دکھائی دے رہی تھی البتہ ہم ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے۔

"تم لوگ نارنگ منڈی سے آنے والی سڑک کراس کر کے چکیاں روڈ پر تقریباً ایک کلومیٹر آگے انڈیا کی طرف آ کر ہمارا انتظار کرو گے۔ یہاں یہ سڑک مقبول پور روڈ کہلاتی ہے۔"

"میں سمجھ گیا جناب۔" وسیم نے کہا۔ "ایک زمانے میں میں یہاں بہت گھوما پھرا ہوں۔ دریائے راوی میں سردیوں کے دنوں میں پرندے آتے تھے میں ان کا شکار کرنے جاتا تھا یہاں دریا کسی قدر چوڑا اور گہرا ہے اور سردیوں میں بھی یہاں پانی ہوتا ہے۔"

"بالکل نقشے پر یہ سڑک موجود ہے لیکن اس کی اصل صورت حال کیا ہے یہ تم لوگ بتاؤ گے۔ میں چاہتا ہوں تم کل صبح روانہ ہو جاؤ اور اسی علاقے میں موجود رہو۔ وہاں کی صورت حال سے مجھے آگاہ کرو۔ ہمارے اترتے ہی ہمیں بہت تیزی سے اس علاقے سے نکل جانا ہو گا کیونکہ سیکورٹی والوں کی آمد متوقع ہو گی میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"بالکل، آپ کہیں تو ہم ابھی روانہ ہو جاتے ہیں۔"

"نہیں کل صبح نکل کر بھی تم لوگ ڈھائی تین گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتے ہو۔ ابھی تم غور کرو کہ تم لوگوں کو کیا کرنا ہے۔ مجھے ایک خیال آ رہا ہے آج کل جی پی ایس عام ہو گیا۔ تم وہاں پہنچ کر کوئی مناسب پوزیشن تلاش کر کے اس کی جی پی ایس لوکیشن بتانا۔ ہیلی کاپٹر ٹھیک وہیں پہنچ جائے گا اور ہمیں بھٹکنا نہیں پڑے گا امکان ہے کہ ہمیں اتارتے ہی ہیلی کاپٹر واپس چلا جائے گا۔"

"راج کنور سمیت۔" وسیم نے معنی خیز سوال کیا۔

"ابھی اس بارے میں سوچا نہیں ہے۔"

"تو سوچ لیں۔" وسیم نے اصرار کیا۔ "اسے بھی ہمیں اتار لیں گے اور پھر کسی مناسب جگہ ٹھکانے لگا کر ہمیشہ کے لیے زمین میں دبا دیں گے۔"

"میرا خیال ہے اس کا فیصلہ وہاں پہنچ کر کیا جائے تو بہتر ہو گا۔ تم ایک بات بھول رہے ہو وہ سعدیہ کا بھائی ہے اور ہمیں اس بات کا خیال بھی رکھنا ہے۔"

"اسے اپنی بہن کا کوئی خیال نہیں ہو گا۔" وسیم نے تلخی سے کہا۔ "اسے پتا چل جائے کہ وہ ہمارے ساتھ ہے اور مسلمان ہو چکی ہے تو وہ اس کا بھی دشمن بن جائے گا۔"

"اس میں اور ہم میں فرق ہے یار۔" میں نے کہا۔ "میں نے اپنا منصوبہ بتا دیا ہے آگے اب تم لوگوں نے پلان کرنا ہے کہ کس طرح یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے۔"

بیتو آ گیا تھا اس نے پوچھا۔ "کون سا کام شوبی بھائی؟"

"تمہاری شادی کا۔" سفیر نے جواب دیا۔ "کامی تو اب ایک سپر پاور ملک کی شہری بن چکی ہے اور وہ تمہیں گھاس نہیں ڈالے گی۔ اس لیے شوبی نے تمہارے لیے ایک لوکل دلہن تلاش کی ہے اسے ساتھ لا رہا ہے۔"

"شوبی سچ؟" بیتو نے بے یقینی سے کہا۔

"تم بھی کس کی باتوں میں آ رہے ہو۔" میں ہنسا۔

"ہم کو پہلے ہی شک تھا یہ سفیر بھائی اتنا اچھا کب سے ہو گیا کہ ہمارا شادی کا بات کرے یہ تو خود دوسری شادی کا فکر میں رہتا ہے۔"

"اوہ میرے دشمن سالے کیونکہ مونا کو بیوہ کرنا چاہ رہا ہے۔" سفیر بلبلا گیا تھا۔

"وہ بھی مونا کے اپنے ہاتھوں۔" میں نے لقمہ دیا۔ "جھوٹ کی ابتدا تو تم نے کی تھی۔"

"پر ہم جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ یہ سفیر بھائی ٹی وی پر آنے والی عورتوں کو بہت غور سے دیکھتا ہے۔"

سفیر بھنا گیا۔ "اس کا مطلب ہے میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"اگر نہیں کرنا چاہتا تو کیوں دیکھتا ہے؟" بیتو نے دوسرا سوال کیا۔

"اب بولو بیٹے تمہیں بہت شوق ہے نا سوال کرنے کا۔" میں نے کہا۔ "ویسے بیتو مزہ تو جب آئے گا جب مونا کے سامنے یہ سوال کیے جائیں۔"

"میں مکر جاؤں گا کہ میں ٹی وی ہی نہیں دیکھتا۔"

مونا دیدی ہمارا بات کا یقین کرے گا۔" بیتو نے دعویٰ کیا۔ "وہ جانتا ہے ہم جھوٹ نہیں بولتا۔"

"بیٹے بات یہ نہیں ہے۔" سفیر نے سرد آہ بھری۔ "بیوی اپنے شوہر کے سوا ہر ایرے غیرے کی بات کا یقین کرتی ہے۔"

"بشرطیکہ شوہر تیرے جیسا ہو۔" میں نے لقمہ دیا جس پر سفیر نے مجھے خونی نظروں سے دیکھا۔

"میرا خیال ہے یہاں کوئی کام کی بات نہیں ہو گی۔" وسیم نے عبداللہ کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے کہیں چل کر ڈسکس کرتے ہیں۔"

"میں بھی چل رہا ہوں۔" سفیر ان کے پیچھے لپکا۔

ان کے جاتے ہی بیتو نے لیپ ٹاپ سنبھال لیا۔ "شوبی ہم آپ کے بغیر بہت اداس ہے۔"

پہلی بار بیتو سے کھل کر بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ "مجھے بھی تمہارا بہت خیال آتا تھا۔ مجھے فکر تھی کہ ممتاز تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک نہ کرے۔"

"ہم اس کے ساتھ برا سلوک کرتا مگر ہم کو وسیم بھائی نے روک دیا۔ ان کو عبداللہ بھائی نے روکا تھا۔"

"تم وہاں سے فرار کیسے ہوئے؟"

"ایک بار ہنگامہ کیا تو ہم کو مارا تھا اور کمرے میں بند کر دیا تھا۔ ہم شرافت سے مار کھاتا رہا اور روتا رہا۔ اس پر وہ سمجھا کہ ہم شریف ہے۔ پھر ایک دن ہم کو موقع ملا اور ہم دو آدمیوں کو لٹا کر وہاں سے نکل گیا۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ "تو تم شریف نہیں ہو؟"

"سفیر بھائی کی طرح نہیں۔" بیتو نے دانت نکالے۔ "یہ بتاؤ دیدی کیسا ہے؟"

"بہت اچھی اور پر خلوص لڑکی ہے۔ اس اجنبی جگہ اس نے جس طرح میرا ساتھ دیا ہے یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔"

"پھر وہ اچھا ہو گا۔" بیتو نے فیصلہ دیا۔ "شوبی جس کو آپ اچھا بولو وہ ضرور اچھا ہوتا ہے۔"

کچھ دیر بیتو سے بات ہوتی رہی۔ اس نے مجھ سے منوا لیا کہ وہ بھی اس پارٹی کا حصہ ہو گا جو مجھے ریسیو کرنے آئے گی۔ اب مجھے بھوک لگ رہی تھی اس لیے میں نے کھانے کا کہہ دیا اور کھانا آنے تک بیتو سے بات جاری

رکھی۔ اس دوران میں بانو آگئی۔ لیپ ٹاپ اس کے حوالے کر کے میں کھانے میں مصروف ہو گیا۔ بانو بھی بیتو سے بات کر کے خوش ہوئی تھی' دونوں میں ایک قدر مشترک نکل آئی تھی کہ دونوں سفیر سے خار کھاتے تھے۔ بیتو کا معاملہ شروع سے تھا اور اب بانو بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔ میں ان نے باتیں سن کر مسکراتا رہا۔ ادھر میں نے کھانا ختم کیا اور ادھر سردار جی کی کال آگئی۔ میرے کال ریسیو کرتے ہی کہا۔ ''شیام جی، جلدی بات کرلو ادھر بندہ نہیں ہے ورنہ وہ منٹ منٹ پر آکر جھانک رہا تھا۔ ابھی کہیں باہر دفع ہوا ہے۔''

چند لمحے بعد راج کنور کی آواز آئی۔ ''شہباز.... کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''ڈاکٹر ہے یا جا چکا ہے؟''

''فکر مت کرو میں اس کے سامنے تمہارا نام نہیں لے رہا، وہ باہر ہے۔''

''بڑا کنور تمہارے پاس کیوں آیا تھا؟''

وہ حیران ہوا۔ ''تم جانتے ہو، اس کا مطلب ہے تم میری نگرانی کر رہے ہو؟''

''کیا مجھے نہیں کرنی چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''رامن کا کیا حال ہے؟''

''وہ پاگل ہو رہا تھا اگر اسے بڑے کنور کا خوف نہ ہوتا تو وہ مجھے بھی نہ چھوڑتا۔ وہ مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔''

''تم نے کیا جواب دیا؟''

''میں نے صاف منع کر دیا کہ مجھے تمہارے بارے میں نہیں معلوم ہے اور نہ تم میرے پاس آئے تھے۔''

''اب رامن کہاں ہے؟''

''وہ اکثر یہیں ہوتا ہے اور کبھی کبھی کہیں چلا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ جب تک ہوتا ہے ہر دس منٹ بعد میرے کمرے میں آکر جھانکتا ہے۔''

''اس کے علاوہ کون ہے؟''

''سنتوش نامی ایک شخص ہے اور ایک پاٹل نامی بندہ ہے۔ مگر وہ کم ہوتا ہے۔''

''تمہاری کنڈیشن کیسی ہے؟''

''آج میرا ایم آئی آر ہوا۔ اس میں گھٹنے کی پوزیشن صحیح ہے اور بازو کی ہڈی بھی سیٹ ہو گئی ہے۔ اب مجھے گھر شفٹ کیا جا سکتا ہے۔''

''لیکن تمہیں جہاں شفٹ کیا جائے گا وہ گھر نہیں ہو گا۔''

''میں کیا کر سکتا ہوں میں مجبور ہوں۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''تم نے میری آفر کے بارے میں سوچا؟''

''میں کیسے تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔''

''تم اس پوائنٹ سے واقف ہو جہاں سے ہیلی کاپٹر سرحد پار کرتا ہے۔''

''ہاں لیکن اس کے لیے میرا ہیلی کاپٹر میں ہونا ضروری ہے۔''

''اگر میں تمہیں لے جاؤں تو.....''

''میں کسی صورت نہیں جاؤں گا۔'' اس نے کہا۔ ''تمہیں نہیں معلوم ہے اس سہولت کا غلط استعمال مجھے کن مشکلات میں پھنسا سکتا ہے۔''

میں نے دل میں کہا۔ بیٹے تمہیں جانا تو پڑے گا۔ چاہے تم کتنی بڑی مشکل میں کیوں نہ پھنس جاؤ۔ ''راج کیا اس بات کا امکان ہے کہ کل تمہیں ڈسچارج کر دیا جائے۔''

''نہیں۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''ڈاکٹر کا کہنا ہے کل میرے ایک زخم کے ٹانکے کٹیں گے اور پھر مجھے ڈسچارج کیا جائے گا۔''

''راج کنور میری پیشکش پر غور کرنا' اگر تمہیں اس مشکل صورتِ حال سے کوئی نکال سکتا ہے تو وہ میں ہوں۔ تم غور کرو بڑے کنور کو میں ہر صورت زندہ سلامت درکار ہوں اور وہ میری بات ماننے پر مجبور ہے اس لیے مجھے اس کی طرف سے جان کا خطرہ نہیں ہے لیکن وہ تمہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔ اگر تم ایک بار پیلس واپس پہنچ گئے تو پھر تم کاغذات بھی دو گے اور اپنی جان بھی۔ اگر بڑے کنور نے تمہیں معاف بھی کر دیا تو ہمیشہ کے لیے کسی قید خانے میں ڈال دے گا جہاں سے تم اس کے جیتے جی نہیں نکل سکو گے۔ وہ تمہیں معاف نہیں کرے گا۔''

''میں جانتا ہوں۔ اس سے زیادہ رامن میرے خون کا پیاسا ہے۔'' وہ بولا۔ ''لیکن میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔''

اتنے میں ڈاکٹر امرتسر واپس آگیا اس نے راج کنور سے کہتے ہوئے موبائل چھین لیا۔ ''وہ مصیبت آگئی ہے۔'' اس نے کال کاٹ دی تھی۔ بانو بیتو سے بات کر رہی تھی پھر اس نے برا سا منہ بنایا اور لیپ ٹاپ کی اسکرین میری طرف

کر دی۔ ''کیا ہوا؟''

''وہ صاحب آگئے ہیں۔'' بانو دھیمی آواز میں بولی۔ ''بیتو کی باتیں سن لی تھیں اور اب دونوں میں جھگڑا ہو رہا ہے۔''

''بیتو میرا بہت پیارا اور معصوم ساتھی ہے۔ وہ راج کنور کے علاقے کا رہنے والا قبائلی ہے' اس کا پورا قبیلہ ان لوگوں کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ان کا قتل عام ہوا اور انہیں علاقے سے نکال دیا گیا۔ بہت کم لوگ زندہ بچے تھے۔''

بانو نے سر ہلایا۔ ''مجھے بیتو نے بتایا ہے۔''

''تب سے وہ ہمارے ساتھ ہے۔ درحقیقت ہم میں سے اکثر ایسے ہی دکھی اور زمانے کے ستائے لوگ ہیں۔ سعدیہ کے بارے میں تمہیں معلوم ہو گا۔ پھر وسیم ہے۔ میرا ایک ساتھی ایاز ہے اس کی بیوی شاہین بھی ہمیں اسی طرح ملی تھی۔ سفیر اور مونا شروع سے میرے دوست تھے لیکن وہ بھی دشمنی کی لپیٹ میں آگئے۔ اب ہم ایک خاندان کی طرح ہیں۔ ہم میں عبداللہ ہے، مانی ہے اور ایک لڑکی شازیہ بھی ہے۔''

''آپ مجھے بھول رہے ہیں۔'' بانو نے یاد دلایا۔

''میں بھولا نہیں ہوں۔ لیکن میں نے کسی کو بھی اپنے ساتھ شامل ہونے کو نہیں کہا۔ بلکہ میری کوشش تھی کہ میرے ساتھی اس دلدل سے نکل جائیں اور میں حالات کا تنہا سامنا کروں۔ مگر مجھ سے پیار کرنے والے مجھے اکیلا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں، انہوں نے ہر مشکل میں میرا مجھ سے زیادہ ساتھ دیا اور کسی موقع پر پیچھے نہیں ہٹے۔ ان میں سے ہر ایک نے مجھ سے زیادہ مشکلات برداشت کیں اس کے باوجود میری خواہش ہے کہ وہ خطرے سے دور رہیں۔''

''میں بھی آپ کے ساتھ مشکلات کا سامنا کرنا چاہتی ہوں۔'' بانو نے پہلی بار کھل کر کہا۔ ''آپ نے جس طرح مجھ بے سہارا لڑکی کو سہارا دیا اور پھر اس قابل بنایا کہ میں اکیلے اپنے دشمنوں سے مقابلہ کر سکوں۔ میں یہ احسان کس طرح بھلا سکتی ہوں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں اب بھی واپس جا کر اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کرنا چاہتی تھی۔''

''اور اب؟''

''اب میں خود کو آپ کے اس خاندان کا ایک حصہ تصور کرتی ہوں اور کوئی اپنے خاندان سے الگ نہیں ہو سکتا ہے۔''

''اگر تم ہمارے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو ہم تمہیں خوش آمدید کہیں گے لیکن بانو ایک بار پھر غور.....''

اس نے بات کاٹ کر کہا۔ ''قطع کلامی معاف، انسان غور وہاں کرتا ہے جہاں اس کے پاس چوائس ہو اور میرے پاس کوئی دوسری چوائس نہیں ہے۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''ٹھیک ہے۔ اب میرا کل کا پلان سنو، لیکن ایک منٹ.....'' میں نے لیپ ٹاپ تک آیا۔ وہاں سفیر اور بیتو آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ان کی لڑائی' زبانی کلامی ہوتی ہے۔ ابھی ایک منٹ بعد وہ دونوں کہیں بیٹھے ہنس بول رہے ہوں گے۔ میں نے سفیر کو بلایا۔ ''مجھے کل صبح تک تم لوگوں کی طرف سے فائنل پلان چاہیے اور دوپہر ایک بجے تک لوکیشن' جہاں ہمیں آنا ہے۔''

''تم فکر مت کرو۔ میں اور وسیم صبح سویرے نکل جائیں گے۔ ہمارے ساتھ دو افراد اور ہوں گے۔ بیتو اور عبداللہ ایک گھنٹے بعد آئیں گے۔ یعنی دو گاڑیاں اور چھ افراد ہوں گے ساز و سامان ہر قسم کا ہو گا۔''

''یہ ضروری ہے بلکہ گاڑیاں تین کرلو تو زیادہ بہتر ہو گا۔ ایاز کہاں ہے؟''

''بھگوال میں لیکن وہ آسکتا ہے۔''

''بس تو اسے بلوالو۔ وہ تیسری گاڑی میں ہو گا۔ بلکہ ایسا کرو وسیم اور عبداللہ کو بھی بلا لو میرے ذہن میں ایک پلان آیا ہے۔''

وہ دونوں کچھ دیر میں سامنے تھے۔ وسیم نے کہا۔ ''آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''پک اپ پوائنٹ تک ایک گاڑی آئے گی۔ اس میں تم اور عبداللہ ہو گے۔''

''ہم بھی ہو گا۔'' بیتو نے مداخلت کی۔

''اوکے بیتو بھی ہو گا لیکن پھر گاڑی بڑی رکھنا کیونکہ تین افراد ہم بھی ہوں گے۔''

''باقی دو گاڑیاں کہاں ہوں گی۔''

''وہ نارنگ منڈی روڈ اور چکیاں روڈ کی کراسنگ پر ہوں گی۔ جیسے ہی ہم وہاں پہنچیں گے۔ افراد ان دو گاڑیوں میں تقسیم ہو جائیں گے اور یہ سب الگ الگ سمتوں میں روانہ ہوں گی۔ نارنگ منڈی جانے والی گاڑی گھوم کر جی ٹی روڈ پر آئے گی اور گوجرانوالہ پہنچے گی۔ باقی دو گاڑیاں بھی اپنے روٹس سے گوجرانوالہ پہنچیں گی اور وہاں سے ہم آگے روانہ ہوں گے۔ کیا خیال ہے؟''

''بہترین' تقریباً یہی ہم نے سوچا ہے فرق صرف تین گاڑیوں کا ہے۔ ہم نے دو گاڑیوں کا سوچا تھا۔''

''معاملہ حساس ہے اس لیے امکان ہے کہ مقامی

وفاقی اداروں کی طرف سے ہماری تلاش شروع ہو جائے گی۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ احتیاط بہتر ہوگی ہم تین افراد جو باہر سے آئیں گے وہ الگ الگ گاڑیوں میں سفر کریں گے۔"

"اس صورت میں بہتر ہے کہ کم سے کم افراد ہوں اور اسلحہ بھی خطرناک والا نہ ہو۔" عبداللہ نے کہا۔ "میرے ذہن میں ایک تجویز اور آرہی ہے۔ اگر ہم پنجاب پولیس کی وردی حاصل کرلیں۔"

"اگر اصلی پولیس سے ٹاکرا ہوگیا؟"

"تو کیا جب تک شک والی بات نہیں ہوگی کوئی ہم سے نہیں پوچھے گا۔"

"اگر وردی آسانی سے مل سکتی ہے تو ٹھیک ہے لیکن ساتھ ہی ایسا بندوبست بھی کرنا کہ موقع ملتے ہی وردیوں سے چھٹکارا حاصل کرلیا جائے۔"

"یہ تو آسان ہے۔" وسیم نے کہا۔ "ہم لباس پر ہی وردی پہن لیں گے اور جہاں اتارنی ہوگی ایک منٹ میں اتار دیں گے۔"

مزید نصف گھنٹے تک پروگرام کی نوک پلک درست ہوتی رہی۔ پھر ہم نے ایک دوسرے کو الوداع کیا۔ میں نے اپنا موبائل نمبر دیدیا لیکن ساتھ ہی کہا کہ اس پر صرف اشد ضرورت کے تحت ہی رابطہ کیا جائے۔ بانو خاموشی سے سن رہی تھی۔ جب لیپ ٹاپ بند کیا تو اس نے کہا۔ "آپ مجھے کچھ بتانے جارہے تھے؟"

"بانو کل ہمارے لیے بہت اہم دن ہے۔ اس کا امکان ہے اور مجھے اللہ کی ذات سے پوری امید ہے کہ کل ہم شام تک سرحد پار کرکے جاچکے ہوں گے لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اس طرف یا دوسری طرف اجل کا شکار ہو جائیں اور ہمارے جسم ہیلی کاپٹر میں جل کر خاکستر ہو جائیں۔"

بانو نے جھرجھری لی۔ "اللہ نہ کرے۔"

"امید تو یہی ہے لیکن ہر صورت کے لیے تیار ہو کر جانا ہوگا۔ اس سے پہلے ہمیں اسپتال سے راج کنور کو اغوا کرنا ہوگا۔"

"وہ کیسے؟"

"میں ایمبولینس لے کر اسپتال جاؤں گا اور ڈاکٹر بن کر راج کنور کو نکال لاؤں گا۔"

"اس کے بعد؟"

"اس کے بعد ہم ائرکلب کا رخ کریں گے جہاں ہیلی کاپٹر موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم ایسے وقت سرحد پار کریں جب تاریکی تقریباً چھانے والی ہو۔ ہلکی روشنی میں ہیلی کاپٹر آرام سے اتر سکے گا اور اس کے بعد تاریکی ہو جائے گی اور اس میں ہماری تلاش آسان کام نہیں ہوگا۔"

بانو نے حساب لگایا۔ "آج کل سورج سوا سات تک غروب ہو رہا ہے۔ اگر ہم یہاں سے ساڑھے پانچ بجے نکلیں تو ہیلی کاپٹر سرحد تک کا فاصلہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے کرسکتا ہے۔"

"ہاں، ہم ریڈار سے بچنے کے لیے نیچی پرواز کریں گے اس لیے رفتار زیادہ نہیں ہوگی۔ پھر ہم پائلٹ کو کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس طرح چلے کہ ہم سوا سات بجے کے بعد سرحد عبور کریں۔ میرا خیال ہے فاصلہ دو سو میل بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا اور تصدیق کے لیے انٹرنیٹ پر نقشہ نکال کر دیکھا۔ واقعی فاصلہ تقریباً دو سو میل بن رہا تھا۔ بانو نے نقطہ اٹھایا۔

"ائرکلب پہنچ کر ایمبولینس ڈرائیور کے ساتھ کیا کرنا ہے؟"

"کچھ نہیں، وہ بھلا کیوں سوچے گا کہ ہم کوئی غلط کام کر رہے ہیں۔"

"جب ہم پائلٹ کو مجبور کریں گے تب تو وہ سوچے گا؟"

"ہم پائلٹ کو اس وقت مجبور کریں گے جب وہ پرواز کر جائے گا اور زمین پر موجود ایمبولینس ڈرائیور کو کیسے پتا چلے گا۔" میں نے کہا تو بانو قائل نظر آنے لگی۔ پھر اس نے دوسرا نقطہ اٹھایا۔

"جب ہم راج کو زبردستی لے جائیں گے تو وہ ہنگامہ نہیں کرے گا؟"

"امید تو ہے کہ نہیں کرے گا۔"

"فرض کریں کہ اس نے کیا تو؟"

بانو کے سوال نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے ہنگامہ آرائی یا مزاحمت سے باز رکھنا ضروری تھا۔ میں نے ڈاکٹر امرتسر کو کال کی اور اس سے کسی ایسی دوا کا پوچھا جسے کسی کو دیا جائے تو بہ ظاہر وہ ہوش میں ہو لیکن اس کا ذہن [illegible] جائے اور وہ فرمانبرداری سے دوسرے کی مرضی پر چلے۔ پہلے تو امرتسر سنگھ نے غیر متعلقہ سوالات کیے کہ کیوں چاہیے اور کس کے لیے چاہیے لیکن جب میں نے اسے یاد دلایا کہ میں نے اسے پچاس ہزار سوالات کرنے کے لیے نہیں دیئے ہیں تو وہ راہ راست پر آگیا اور اس نے مجھے ایسی چند دواؤں کے نام بتائے۔ یہ سب انجکشن کی صورت میں ملتی ہیں۔

میں نے پوچھا۔ "میڈیکل اسٹورز پر مل جائیں گی اور کوئی ڈاکٹر کی پرچی تو نہیں مانگے گا۔"

"بھاجی یہ انڈیا ہے یہاں سب ملتا ہے اور سب چلتا ہے۔"

میں نے دواؤں کے نام نوٹ کر لیے تھے پھر میں نے ہوٹل منیجر کو کال کی۔ "مجھے کچھ دواؤں کی ضرورت ہے۔"

"میں آدمی بھیج رہا ہوں آپ اسے نام دیدیں۔"

منیجر کا آدمی آکر دواؤں کے نام لے گیا۔ اس نے کہا کہ شاید کچھ دیر لگے کیونکہ رات کے وقت عام میڈیکل اسٹورز بند ہو جاتے تھے۔ میں نے کہا۔ "کوئی بات نہیں تم آرام سے تلاش کرو اور ڈسپوزیبل سرنجوں کا ایک سیٹ بھی لینا۔"

"یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔" بانو نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

"ویسے تم نے خواتین کے بارے میں میری رائے کسی قدر بدل دی ہے۔"

وہ ہنسی۔ "یہی کہ ہم عقل سے پیدل ہوتے ہیں۔"

"نہیں عقل مند تو بہت ہوتی ہیں مگر اپنی عقل مندی خاص خاص میدانوں تک محدود رکھتی ہیں اور عام حالات میں اور ہنگامی حالات میں جب آس پاس کوئی صاحب عقل موجود ہو تو ذاتی عقل کے بے جا استعمال سے گریز کرتی ہیں۔"

رات گہری ہو رہی تھی اور سارا دن بھاگ دوڑ میں گزر گیا تھا مگر آنکھوں میں نیند نہیں تھی بلکہ جو تھی وہ بھی آنے والے کل کا سوچ کر اڑی جا رہی تھی جب یا تو ہم اپنوں کے درمیان ہوتے یا پھر کہیں نہ ہوتے۔ میں نے کافی کی تجویز پیش کی لیکن بانو نے انکار کیا۔ "اب میں نے چائے بھی پی تو مجھے مشکل سے نیند آئے گی۔ میرے سر میں ہلکا سا درد ہو رہا ہے۔"

"تب بہتر ہے تم سو جاؤ تاکہ کل کے معرکے کے لیے تازہ دم ہو۔"

بانو چلی گئی۔ میں جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ میں خطرہ مول لے رہا تھا۔ اب تک مجھے یہ اتنا زیادہ محسوس نہیں ہوا تھا لیکن وسیم اور عبداللہ سے بات کر کے شاید میں اسے زیادہ محسوس کرنے لگا تھا اور رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ میں نے اندازے کی غلطی تو نہیں کی ہے۔ جب سوچوں نے زیادہ پریشان کیا تو تنگ آکر میں نے سونے کی تیاری شروع کر دی۔ گرم پانی سے غسل کر کے آیا تو ذہن کسی قدر ہلکا ہو گیا۔ [illegible] منیجر کا آدمی دوائیں لے آیا۔ یہ مختلف دوائیں [illegible] ایک ہی مقصد کے لیے تھیں۔ ان کے ساتھ چھوٹی سرنجوں کا ایک سیٹ بھی تھا۔ میں نے دواؤں کے ساتھ موجود ہدایات پڑھیں اور انہیں ذہن نشین کر لیا۔ بستر پر لیٹا اور آرام سے سو گیا۔ صبح میری آنکھ کھلی تو کھڑکی سے سورج کی روشنی کمرے میں آرہی تھی۔ نو بج رہے تھے اور میں خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ بانو بھی جاگ گئی تھی۔ ضروریات سے فارغ ہو کر ہم نے ناشتا کیا اور اس دوران میں اپنے پلان کی نوک پلک درست کرتے رہے تھے۔ بانو ذہین تھی اور یہ بات اس نے بارہا ثابت بھی کی تھی۔ اب بھی اس کی وجہ سے میں خطرات کو کم سے کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے ایمبولینس سروس کو کال کی جہاں سے پہلے ایک ایمبولینس طویل دورانیے کے لیے بک کرانے کی بات کی تھی۔ دوسری طرف موجود شخص نے بتایا کہ اس کے لیے مجھے خود ان کے سینٹر آنا ہوگا اور ادائیگی کے بعد ہی میں ایمبولینس حاصل کرسکوں گا۔ یہ کمرشل سروس تھی اور انہیں صرف رقم سے غرض تھی۔ میں سروس سینٹر تک گیا اور ادائیگی کر کے ایک ایمبولینس چوبیس گھنٹے کے لیے حاصل کر لی۔ مجھے بتایا گیا کہ ایمبولینس شملہ سے سو میل کے دائرے سے دور نہیں جائے گی اس صورت میں مجھے مزید ادائیگی کرنا پڑے گی۔ میں نے بتایا کہ مجھے سروس شملہ کی حدود میں چاہیے۔ اب میں ایک گھنٹے کے نوٹس پر ایمبولینس کو کہیں بھی طلب کر سکتا تھا۔ اس کے بعد میں نے بی اے سنکاری کو کال کی۔

"مجھے دوپہر تین بجے کی فلائٹ چاہیے۔ ہیلی کاپٹر میں ایندھن فل ہو ممکن ہے ہمیں ذرا دیر تک پرواز کرنا پڑے۔"

"میں ٹھیک 3 بجے تیار ملوں گا اور فیول میں ہمیشہ فل رکھتا ہوں۔"

"پورے ایندھن کے ساتھ ہیلی کاپٹر کتنی دیر پرواز کر سکتا ہے؟"

"ڈھائی سے تین گھنٹے۔" اس نے جواب دیا۔ "بلندی اور اسپیڈ پر ڈی پینڈ کرتا ہے۔"

میں نے اطمینان محسوس کیا کیونکہ اتنا وقت کافی تھا اور ہم آرام سے پاکستان پہنچ سکتے تھے اس کے بعد بی اے سنکاری واپس شملہ تک نہیں آسکتا تھا مگر وہ سرحد پار کر کے واپس جا سکتا تھا۔ اس کے بعد وہ کسی بھی ائرفیلڈ پر اتر سکتا تھا۔ امرتسر زیادہ دور نہیں تھا اور وہ یقیناً پکڑا جاتا لیکن میری بلا سے۔ میں ہوٹل واپس آیا تو بانو تیاری کر رہی تھی۔ اس نے میرے اور اپنے کپڑوں کے سوٹ کیس تیار کر لیے

تھے۔میں نے اس سے کہا۔"اس میں نے کچھ ہمارے ساتھ نہیں جائے گا۔"

"لیکن کیوں؟"

"یہ بلاوجہ کا بوجھ ہے۔مگر اسے ٹھکانے لگانا ہوگا ورنہ بعد میں تفتیش ہوگی تو یہ لباس ہمارے خلاف ثبوت کے طور پر استعمال ہو سکتے ہیں۔"

بانو کا دل دکھ رہا تھا۔"اللہ اتنے اچھے کپڑے ضائع جائیں گے۔"

"اللہ اور دے گا۔"میں نے اسے تسلی دی اور اسکائپ آن کر کے عبداللہ کو کال کی۔کیونکہ وہ نکل چکے تھے اس لیے اب کمپیوٹر سے بات ممکن نہیں تھی مجھے موبائل پر کال کرنا تھی میں نے فیصلہ کیا کہ لیپ ٹاپ اور یوایس بی انٹرنیٹ ڈیوائس ساتھ رکھوں گا اس سے رابطے میں آسانی رہے گی۔پھر میں نے منیجر کو کال کی۔اسے بتایا کہ ہم جا رہے ہیں لیکن کل تک یہ کمرے ہمارے لیے بک رہیں گے۔میں نے اسے اشاروں میں کہا کہ ہم یہاں آئے ہی نہیں تھے بہتر ہوگا وہ یہاں ہماری موجودگی کے تمام ثبوت ضائع کردے ان میں سی سی ٹی وی کیمروں کی ریکارڈنگ بھی شامل تھی۔اس نے یقین دلایا کہ سب ضائع کر دیا جائے گا۔روانگی سے پہلے ہم نے ہلکا لنچ کیا کیونکہ اب بھاگ دوڑ کا مرحلہ تھا اور اس میں بھاری پیٹ رکاوٹ بن سکتا تھا۔ہوٹل والے کسی قدر حیران ہوئے کہ ہم بغیر کسی گاڑی کے سامان سمیت پیدل روانہ ہوئے تھے مگر کسی نے اظہار نہیں کیا۔کچھ دیر بعد بانو نے تھک کر کہا۔"اُف یہ مصیبت لاد کر لانا ضروری تھا؟"

"بالکل ضروری تھا۔"

"ہم ٹیکسی بھی کر سکتے ہیں۔"

"بالکل لیکن اس صورت میں ان سوٹ کیسز کو کہاں ٹھکانے لگاتے اور وہ بھی ڈرائیور کی نظروں سے بچ کر۔"میں نے کہا تو بانو چپ ہو گئی۔کچھ دیر بعد ہم نے دونوں سوٹ کیس ایک بڑے ڈسٹ بن کے سپرد کیے۔جہاں سے انہیں کوئی نکال کر بھی لے جاتا تو اس سے ہمیں کوئی فرق نہ پڑتا۔پھر میں نے ایمبولینس سروس کو کال کی اور ایمبولنس آنند ورما ٹرسٹ اسپتال کے باہر بھیجنے کو کہا۔ساتھ ہی تاکید کی کہ ڈرائیور باہر رک کر میرا انتظار کرے خود سے اندر جانے کی کوشش نہ کرے۔اس کے بعد ہم نے ایک ٹیکسی لی اور اسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔ٹیکسی اسپتال سے کچھ پہلے چھوڑ دی تھی۔اسلحہ اور رقم ہمارے پاس تھی جب کہ لیپ ٹاپ اپنے چھوٹے سے بیگ میں میرے شانے سے لٹک رہا تھا۔میں نے ایک پستول بانو کے حوالے کر دیا تھا اور انڈین رقم بھی اسے دیدی تھی۔اگر ہم کسی وجہ سے بچھڑ جاتے تب بھی وہ خالی ہاتھ نہ رہتی۔اسپتال کے سامنے پہنچ کر میں نے اس سے کہا۔"تم یہیں رہو لیکن نمایاں مت رہنا اور میری واپسی کا انتظار کرنا۔"

"آپ کتنی دیر میں آجائیں گے؟"وہ کسی قدر فکرمند تھی۔

"کچھ کہنا مشکل ہے۔لیکن آدھا پون گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔"میں نے کہا اور کوٹ پہن لیا۔لیپ ٹاپ والا بیگ بانو کے حوالے کر دیا۔اسی لمحے سڑک پر ایمبولنس نمودار ہوئی۔بانو جلدی سے سڑک کے ساتھ لگی باڑھ کی طرف بڑھ گئی اور میں سڑک کراس کر کے ایمبولینس کی طرف آیا۔ڈرائیور نے مجھے سرسری نظروں سے دیکھا لیکن جب میں فرنٹ ڈور کھول کر اندر آیا تو وہ چونک گیا۔

"اوہ اچھا یہ آپ ہے آپ ڈاکٹر ہے؟"

"ہاں اندر چلو۔"میں نے کہا تو اس نے ایمبولینس آگے بڑھا دی۔اسے روکنے یا چیک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم آرام سے اسٹاف پارکنگ ایریا میں پہنچ گئے۔میں نے ایمبولینس دروازے کے سامنے رکوائی اور ڈرائیور سے کہا۔"میں مریض کو لینے جا رہا ہوں اگر کوئی کچھ کہے کہ یہاں کیوں رکے ہو تو کہنا کہ ڈاکٹر انتھونی نے کہا۔"

"ٹھیک صاحب۔"وہ بولا۔میں نیچے اترا اور ایک طرف رکھی وہیل چیئر لیے اندر داخل ہوا۔راج کنور کو اس پر آسانی سے ایمبولینس تک لایا جا سکتا تھا۔خوش قسمتی سے کسی نے راستے میں نہیں روکا۔میں نے وہیل چیئر راج کنور کے کمرے کے باہر چھوڑی اور دوا سے بھری سرنج نکالی۔میرا ارادہ تھا کہ اندر داخل ہوتے ہی راج کنور کو دوا انجکٹ کر دوں گا۔جیسے ہی وہ دوا کے زیر اثر آئے گا میں اسے لے کر نکل جاؤں گا۔لیکن اندر گھستے ہی مجھے جھٹکا لگا۔راج کنور کا بیڈ خالی تھا۔اس کے واش روم جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس کے سارے کام بیڈ پر ہوتے تھے۔اچانک عقب سے آواز آئی۔

"کون ہو تم اُدھر کیا کر رہے ہو؟"

میں نے مڑ کر دیکھا تو ڈاکٹر امر ترسنگھ میرے مقابل تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک سرجیکل نائف تھی۔

(جاری ہے)

بیت بازی

قارئین

(آصف جاوید کراچی کا جواب)

نصرت حمید..........لاہور

وہ جس کے دم سے ہے روشن ہماری بزمِ خیال
ستارہ رخ ہے کوئی کہکشاں جبیں ہے کوئی

فیروز خان..........حیدرآباد

وہ کوئی اور نہیں دوست میرا اپنا تھا
وہ اپنی کہتا رہا کہنے کچھ دیا نہ مجھے

مناف احمد..........کراچی

وہی سر ہے سر جس میں سودا تیرا
وہ دل دل ہے جس کو تری جستجو ہے

(نازی حسن کوئٹہ کا جواب)

ناہید ملک..........لاہور

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ نگہ کی تیغ بازی وہ سپہ کی تیغ بازی

(نسیم ساحر، جیکب آباد کا جواب)

افتخار رندھاوا..........لاہور

نیک نہاد و خلیق، راضی بہ تقدیرِ حق
جس پر ہے انعام رب آیۂ لاتقنطو

(قیصر خان لاہور کا جواب)

نگار..........لاہور

زندگی کیوں ہمہ تن گوش ہوئی جاتی ہے
کبھی آیا ہے جو آئے گا پیغام ان کا

وحید احمد بھٹی..........حیات آباد

نہ منزلوں کا نشاں ہے نہ رہبروں کا پتا
غبار راہ پریشاں ہے کارواں کے لیے

(نیاز احمد لاہور کا جواب)

وارث بیگ..........کراچی

عقدے سب حل ہوئے مگر آہ انیس
یہ بند اجل کسی سے کھولا نہ گیا

(عنایت چشتی لاہور کا جواب)

فاروق قیصر..........کراچی

طبع ہونے کی بات دور رہی
بطنِ فن کار میں جو گم ہیں ابھی

(ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب بکھر کا جواب)

حشمت خان..........کراچی

یہ تری تلخ نوائی ہے کہ گم راہوں میں
اپنی منزل پر پہنچنے کی للک باقی ہے

ندرت جمیل..........میرپور

یہ حسیں رہگذر ملے نہ ملے
آپ سا رہبر ملے نہ ملے

احسان اللہ..........ٹوبہ ٹیک سنگھ

یہ حکم ہے کہ اندھیروں کو روشنی سمجھو
ملے نشیب تو کوہ و دمن کی بات کرو

ارجمند رضا..........شادی پور

یہ انتقامِ گردشِ دوراں تو دیکھیے
چھوٹے قفس سے ہم تو ملا آشیانہ بند

نعیم خان..........کراچی

یہ کہہ رہا ہے وقت کا بھیدی پکار کے
اٹھو جلاؤ خونِ شہیداں سے ہر چراغ

(اکرم ممتاز ساہیوال کا جواب)

ناہید صدیقی..........کراچی

لے کے خط ان کا بہت ضبط کیا ہے لیکن
تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں نے بھرم کھول دیا

نفیس احمد..........کراچی

لکھا تھا اپنے ہاتھ سے تم نے جو ایک بار
اب تک ہمارے پاس ہے وہ یادگار خط

(ناہید وقار صدیقی کراچی کا جواب)

ریاست حسین..........کوئٹہ

اے شہرِ انا تیری قسم میرے سخن میں
ہے خونِ جگر لوحِ قلم نوکِ سناں ہے

سحرش یار خان..........کراچی
آج ملک میں کیوں ہے بھائی بھائی کا دشمن
نفرتیں دلوں میں ہیں، تلخیاں بہت سی ہیں

شاہد الیاس..........سکھر
اجڑے ہوئے گھر ہوتے ہیں آباد کہاں پھر
ٹوٹے ہوئے دل پھر بھی مذمت نہیں کرتے

نادیہ افشین..........کراچی
اس عہد کے لوگوں کی ہے یہ ریت نرالی
ملتے ہیں محبت سے محبت نہیں کرتے

نوشین ملک..........لاہور
آ رہا ہے مری وحشت پہ شباب
تجھ سے ملنے کے زمانے آئے

افسر حیات..........لاڑکانہ
اے ساقیا چپ چاپ گزرنے دے سحر کو
مت ہوش دلا درد نہ جام ہے باقی
(نوید ہمدانی ملتان کا جواب)

سحرش اصغر..........کراچی
نور ہی نور فضاؤں میں ہے رقصاں رقصاں
ہو کے سرشار ہر اک دل کا شگوفہ مہکا
(جاوید اختر میاں چنوں کا جواب)

اصغر بلوچ..........کوئٹہ
جاؤں کس در پہ، کروں کس سے شکایت اس کی
جو گلا کاٹ رہا ہے وہ مرا بھائی ہے
(تہمینہ فاروقی حیدرآباد کا جواب)

نرگس گل زیب..........میرپور خاص
دل کے نگر تک کرنیں کب آنے دیتے ہیں
جن کے بس میں چاند ستاروں کا خرمن ہے
(اکبر خان مہمند کراچی کا جواب)

زاہد خان مہمند..........پشاور
کسی کی نگاہوں کا شکوہ نہیں
یہ دل فطرتاً چوٹ کھا جائے ہے

نیاز ملکانی..........سکھر
کسی صورت شعاعوں کا اجالا کم نہیں ہوتا
چراغِ آرزو دل میں کبھی مدھم نہیں ہوتا
(ناہید سلیم کراچی کا جواب)

ارباز خان..........پشاور
بہت ہی کڑی ہے کمان وقت کی
کہاں تیر کوئی خطا جائے ہے
(مظہر الیاس راولپنڈی کا جواب)

عنایت اللہ خان..........زاہدان ایران
تیری رگ رگ میں رواں کتنے شہیدوں کا لہو
کتنے ہاتھوں نے دیا ہے تیرا پیکر تشکیل
(نوازش علی خان جھنگ کا جواب)

اصغر وٹو..........چنیوٹ
عزم کا نور ہے ایماں کی حرارت دل میں
ظلمتیں پگھلیں ترشنے لگی اک صبح جمیل
(فہد مصطفیٰ کراچی کا جواب)

ثنا انیس..........کراچی
جس نگری میں اپنا من ہے نہ اپنا تن ہے
اس نگری میں زندہ رہنا بھی اک فن ہے
(نعمان علی اسلام آباد کا جواب)

ذاکر حسن..........میانوالی
پھر آسماں پہ بھیجنا اس کو خدا کے پاس
پہلے دعا کو سینچ تو لے آبِ اشک سے
(محمد واصف حاصل پور کا جواب)

اختر حزیں..........وہاڑی
حیرت ہے وہ برسوں کی ہوا باندھ رہے ہیں
ہم کو تو بھروسا نہیں آتے ہوئے دم کا
(صدف احمد انصاری حیدرآباد کا جواب)

ناہید فاطمہ..........کراچی
رہنما کے ہوش گم ہیں یا الٰہی خیر ہو
کارواں گمنام منزل کی طرف جانے لگا

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدِنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش
97
30 دسمبر 2013ء

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام.................................ہے۔

نام:.................................

پتا:.................................

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 دسمبر 2013ء تک علمی آزمائش 97 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام.................................

پتا.................................

....

محترم / محترمہ..........کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں (شعر الگ کاغذ پر ہے)
58

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

اگر آپ کو
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ، ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
کے حصول میں دقت پیش آ رہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو
شکایت فیکس کریں
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
ثمر عباس 0301-2454188
بدرالدین سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200
فیکس نمبر 35802551
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

علمی آزمائش۔ 97

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک شخصی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 دسمبر 2013ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1305 ذوالحجہ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد نے فیروز بخت نام رکھا تھا۔ کلکتہ میں پلے بڑھے۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں لسان الصدق کے نام سے رسالہ نکالا۔ 1902 میں جب عمر صرف پندرہ سال تھی برصغیر کی سب سے بڑی، مسلمانوں کی تنظیم حمایت الاسلام کے جلسہ میں تقریر کی۔ پھر تو گویا تقریر کے بادشاہ بن گئے۔ 1921 میں پہلی بار سیاسی معاملات پر گرفتار ہوئے۔ برصغیر کے بڑے لیڈروں میں شمار ہوتے تھے۔ علما کی صف میں بھی مقام تھا۔

علمی آزمائش 95 کا جواب

محسن نقوی ڈیرہ غازی خان کے رہائشی تھے۔ غضب کی شاعری کرتے تھے ایک فلم کے گانے بھی لکھے۔ 7 سے زائد مجموعے مقبول ہوئے۔ وفاقی حکومت نے پرائیڈ آف پرفارمنس بھی دیا۔ دہشت گردی کا شکار ہو کر اجل کو لبیک کہا۔

انعام یافتگان

1- اظہر حفیظ، لڈن وہاڑی 2- نسرین طفیل احمد، راولپنڈی 3- عباس اظہر، لاہور

4- زاہد خان، کوئٹہ 5- احمد جان، پشاور

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے سید عزیز الدین (2 کوپن) سید عباس رضا رضوی تنویر (کھوکھراپار) سنبل جبین (دستگیر) امیر السلام، جمیل عثمانی، اختر بلقیس کوکب، ثنا بخاری، آفتاب منصور، اقبال احمد چشتی، اختر حسین، نوشین ملک، احسن خان اچکزئی، اقبال احمد چشتی، انوار علی شاہ، اختر عباس، طارق حبیب، نعیم اختر، اقبال قریشی، فرقان حمیدی، نعمت مرزا، جاوید اقبال، منظر خان، فیضان انصاری، فیض مسیح، ڈھوڈا مل، بھیکومل، ثنا بونگی، حمنا اختر۔ لاہور سے محمد رفیق رضا، افروز اسلم، توقیر انور، منظر علی خان، کمال حسن، مسز نادر شاہ، سلمان زیدی، سلیم درانی، شاہینہ بتول، چوہدری نیاز مسلم خان، زینت انصاری، نذیر مرزا، ماسٹر فیض محمد، انور کلیم شاہ، فلک شیر، ثنا بخاری، کوکب گرویزی، فیض ملک، بہادر خان، شہباز خان، ثاقب خان، انوار شاہ، یوسف خان، ابراہیم شاہ، محمد پہلوان اختر، نگار ملک، بیگم زوار شاہ، نوشین ملک، فیض الحسن، مرزا یوسف بیگ۔ ملتان سے طالب حسین طلحہ، رفیع الدین شاہ (گلگشت) محمد معین چشتی، خواجہ محمد حسنین (نشیمن ولز) عقیل احسن، حبیب الرحمن، شمروز، اصغر خان۔ پشاور سے شیر خان، مولانا ریاض محسن، بشیر فاروقی، قاسم جان، احمد مجاہد، مرتضیٰ زیدی، فہیم عباس، مصیب بٹ۔ شیخوپورہ سے ندا ممتاز، ثریا فاطمہ، ممتاز خان عقیل فیضان۔ ڈیرہ غازی خان سے ارشاد حسین، ناصر حسن، محمود نیاز، خان محمد خان، فہیم الدین۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے زوریز عالم خان، ارشد آفاق۔ ملتان سے زینت خان، عتیق الرحمن، فیض الحسن، قیام خان، شیریں عدنان، زہیب سلطان، نور خان ترمذی، شہباز خان، ملک فیروز، پروین سلطان، نعمان الحسن، عبادت حسن، قیام الدین خان۔ جھنگ سے عطا المصطفیٰ (گوجرہ روڈ)۔ جہلم سے قیصر ظہیر چغتائی، نعمت اللہ، ابرار شیخ، جاوید محمد حسن، تقی عثمان، نیاز حسن، حلیم اللہ خان، یاسمین، محمد ندیم، کاظم بیگم، فرحت اللہ، ارتضیٰ حسین، فہیم حسن، عباس۔ بہاولنگر سے معظم علی (چشتیاں) نوشین خٹک۔ بہاولپور سے وقار احمد، فراز احسن فاروقی۔ میانوالی سے نعمان نیازی (گرین ٹاؤن) سہاب خان، ملک انور۔ لیہ سے عالم حفیظ لوہانچ (شاہ اشرف بغدادی)، خاقان الحسن۔ مظفر گڑھ سے رانا محمد سجاد (شاہ جمال نواں شہر) منیب الرحمن، فیضان عثمانی، عقیل سید، عبادت حسن، قیصر خان، عطا خان، فیروز حسن، اصر محمود، امجد ملکانی، شبیر خان، فہیم وٹو، ماہم حسن۔ بھکر سے فقیر غلام حسین ضیائی، ہشام بنگیال (دریا خان)۔ اسلام آباد سے نادر ملک، سنجیدہ شاہ، انعم بٹ، شاہنواز، جاوید قیصر، ذوالقرنین، فصاحت مرزا، بلال مصطفیٰ، سلام خان، شریف الحسن، نادر خان، صلاح الدین، مرید علی خاکوانی، اسلم خان، بیگم امتیاز علی دستوری، مہر خان، اصغر عباس۔ راولپنڈی سے ملک نوریز، فتح الدین، قیصر خان، عدنانؔ سعیدی، غضنفر عباس، ابرار الحسن، شریف شاہ، حق نواز، امام الدین، بشیر کمال، فیض خان، صالح الرحمن، سید عباس زیدی، عباس مہکری، قاسم جان۔ کوئٹہ سے تقی چنگیزی، نور الحسن زیدی نور، فرید خان، ارباب خان، محمد فیضیاب، مستقیم اللہ، متقی کاظمی، عائشہ بختاور، نور فاطمہ، ارباب چنگیزی، فرحت بابر، خاقان عباس، عنایت، اچکزئی، فیاض ناصری، شہید حسین، انعام اللہ، مغنی فیض۔ منڈی بہاؤالدین سے زاہد علی، تاثیر حسین، فرحت خان، ندا علی، ناصر کیانی، احمد جاوید، سعید مصطفیٰ۔ سیالکوٹ سے منظر خان، حسن عالم، ارشد حسین، ندا آفاق، جاوید مصطفیٰ۔ درویش خان، محمد مظہر، سید محمد میثم رضوی، فرحت حسین باقری، فیاض محمد، اکبر خان۔ سرگودھا سے اطہر یونس، ثنا اللہ، فتح باری، آفتاب خان، نوید ہاشمی، آفتاب محمد خان، رانا ظفر اقبال، نوشین فاطمہ، کلیم خان، عباس اختر، منظر حسین، نصیر عباس، عظمت اللہ، نصیر عباس، نصرت افروز، امجد خان، نعیم خان، حکیم اللہ، ارباز خان۔ کوہاٹ سے فدا حسین۔ رحیم یار خان سے افضال میمن، امجد اقبال، فصاحت خان، نیاز حسن، نسیم احمد، ملک فیروز الدین، ارشد محمود، ثنا بتول، فہیم شاہ، محمد سراج الدین، اختر عباس، عمر مقصود، ایم اے شاہد، علی عباس، خادم حسین، فیض شاہ، فیض بلوچ۔

ممالک غیر سے اشفاق کیانی (جرمنی) انعام اللہ، فصاحت خان (العین) اشفاق حسین (ٹورنٹو کینیڈا) ارشد حسن (مانچسٹر یوکے) فصاحت خان (زاہدان ایران)

خدارا

قابلِ احترام عذرا رسول باجی
السلام علیکم!
ایک ایسا واقعہ جو چشم کشا ہے سبق بھرا ہے کے ساتھ آپ کی محفل میں حاضر ہورہی ہوں۔ لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کردیتے ہیں اور یہی واقعات بعد میں بڑے واقعہ کو جنم دیتے ہیں۔

ثوبیہ فہد
(کراچی)

رمل بڑی پیاری بچی تھی۔ بہت گلابی رنگت، پیارے سے نقوش، سنہری بال اور گڑیا جیسا جسم۔ وہ مشکل سے دو سال کی تھی جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا۔ میں شادی کے بعد اس محلے میں آئی تھی۔ میرے سسرال کے سامنے والا گھر رمل کا تھا۔ وہ ماں باپ کی ایک ہی بیٹی تھی اور اس کے بعد ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اعظم بھائی اور ایمل بھابی خود بھی بہت خوب صورت تھے۔ ان کا پرتو رمل تھی۔ وہ پیدا ہوئی تو پورا محلہ اس کا دیوانہ ہوگیا تھا۔ جن لوگوں سے ایمل بھابی کی جان پہچان نہیں تھی انہوں نے بھی ان کے گھر آنا جانا شروع کردیا۔ صرف رمل کو دیکھنے اور اسے پیار کرنے کے لیے۔ وہ بچپن سے ہنس مکھ اور سب سے فری ہوجانے والی بچی تھی۔ آرام سے ہر ایک کے پاس چلی جاتی۔ اس وجہ سے بھی محلے والوں اور خاص طور سے بچوں میں وہ مقبول تھی۔ شام ہوتے ہی بچے اس کے گھر پہنچ جاتے تھے اور پھر وہ کھلونے کی طرح ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی تھی۔

ذرا بڑی ہوئی اور چلنے پھرنے لگی تو خود سے باہر نکل جاتی۔ ایمل بھابی اسے روکتی رہ جاتیں لیکن بچپن سے اسے دوسروں کی توجہ کی عادت ہوگئی تھی۔ اسے باہر نہ جانے دو تو وہ چیخ چیخ کر روتی تھی۔ مجبوراً ماں باپ کو اسے باہر جانے دینا پڑتا تھا اور باہر نکل کر وہ تتلی کی طرح پوری گلی میں دوڑتی پھرتی تھی۔ ہم جس گلی میں رہتے تھے یہ ایک طرف سے بند تھی اور یہاں غیر متعلقہ لوگوں اور گاڑیوں کی آمدورفت نہیں تھی صرف گلی میں رہنے والے آتے جاتے تھے۔ یہ اچھا علاقہ تھا اور تقریباً تمام ہی پڑھے لکھے اور مہذب گھرانے تھے۔ ماحول پرسکون اور پرامن تھا۔ گلی کے سرے پر بیریئر لگا کر چوکیدار رکھ لیا تھا جو آنے جانے والوں پر نظر رکھتا تھا اس لیے لوگ اپنی حفاظت کے لیے اتنے فکرمند نہیں تھے۔ پھر وہ وقت بھی امن کا تھا۔ جن کے بچے باہر ہوتے تھے ان کو اتنی فکر نہیں ہوتی تھی۔ آج جیسے خوفناک حالات نہیں تھے۔

میری سسرال زیادہ بڑی نہیں تھی۔ ساس کے ساتھ ایک نند اور ایک دیور صمد ہے۔ میرے شوہر فہد سب سے بڑے ہیں اور باپ کے مرنے کے بعد وہی گھر چلا رہے تھے۔ میری شادی کے ایک سال بعد میری نند فریحہ بیاہ کر چلی گئی تو ساری ذمے داریاں مجھے دیکھنا پڑیں اور تب مجھے بہت مشکل ہوئی۔ وہ آدھے سے زیادہ کام کر لیتی تھی۔ حالانکہ کالج بھی جاتی تھی۔ میری ساس جوڑوں کی مریضہ تھیں ان کے لیے کام ممکن نہیں تھا۔ کوشش کرتیں تو بھی سبزی کاٹ لیتی تھیں اور کبھی لہسن ادرک چھیل دیتی تھیں مگر ان کے لیے یہ کام بھی مشکل تھے۔ البتہ جب میرا پہلا بیٹا ہوا تب میری ساس نے مجھے بہت آرام دیا۔ اس حالت میں

بھی سب دیکھتی رہیں۔ دو ہفتے بعد میری حالت ٹھیک ہوئی تو میں نے اپنی ذمے داریاں سنبھالیں۔ صمد ذرا لاابالی تھا۔ وہ انجینئر بن رہا تھا گھر میں کم رہتا تھا اور ہوتا تب بھی اپنے آپ میں مگن رہتا۔ پھیلاوا کرتا جو بے چاری میری ساس سمیٹتی پھرتی تھیں۔

فہد بہت اچھے شوہر ثابت ہوئے۔ بہت خیال رکھنے والے اور پیار کرنے والے۔ درحقیقت میرا سارا سسرال اچھا تھا۔ فریحہ بہت خیال رکھتی تھی۔ صمد بھی کرتا تھا لیکن زیادہ تر خود میں مگن رہتا تھا۔ میرا بیٹا اریب دو سال کا ہوا تو مجھے آسانی ہوئی تھی ورنہ وہ بہت چیکو قسم کا بچہ تھا جو ماں کی جان نہیں چھوڑتا ہے۔ اس کے بعد ہونے والا شاذیب اتنا ہی شریف تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ ساس کے پاس رہتا تھا اور خوش رہتا۔ میرے پاس بس فیڈ کے لیے آتا تھا۔ اریب شادی کے دو سال بعد ہوا تھا اور دو سال تک جس بچے نے ہمارے گھر میں رونق لگائی تھی وہ رمل تھی۔ میں اسے دیکھتے ہی فدا ہوگئی تھی۔ اسی طرح وہ میری دیوانی نکلی۔ صبح ہوتے ہی وہ ماں سے فرمائش شروع کردیتی تھی۔

"صوپھی آنٹی کے ہاں چلو۔"

میرا نام ثوبیہ ہے لیکن وہ صوپھی آنٹی کہتی تھی اور اس کے منہ سے بہت بھلا لگتا تھا۔ ایمل بھابی بے چاری اسے تیار کرکے لے آتی تھیں اور اس کے بعد وہ دوپہر تک ہمارے گھر میں رہتی تھی۔ دو سال کی ہوکر بھی وہ ماں کا دودھ پی رہی تھی اور بہ مشکل ہی کچھ اور کھاتی تھی۔ جب اسے بھوک لگتی تو میں یا فریحہ اسے چھوڑ آتے تھے۔ شام ہوتے ہی وہ پھر آجاتی اور ہم اس کے منتظر ہوتے تھے۔ فہد بھی اس کے دیوانے ہوگئے۔ وہ بار بار مجھ سے کہتے کہ ہماری بھی ایسی گڑیا جیسی بیٹی ہونی چاہیے اور میں شرما کر کہتی۔ "یہ تو اللہ کی دین ہے وہ جو چاہے دے، بیٹی یا بیٹا۔"

مجھے بھی بیٹیاں اچھی لگتی تھیں خاص طور سے رمل کو دیکھنے کے بعد تو اور بھی اچھی لگنے لگی تھیں۔ چند مہینے کے اندر وہ مجھ سے خاصی ہل گئی تھی۔ گھر میں لاڈلی تھی۔ ماں باپ کو خاطر میں نہیں لاتی تھی ان سے اپنی بات منوا کر رہتی تھی۔ معمولی سی بات میں ضد پکڑ لیتی۔ بیمار ہوتی تو اسے کھلانا اور دوا دینا پہاڑ سر کرنے کے برابر ہوجاتا تھا۔ ایسے میں میری خدمات حاصل کی جاتی تھیں اور میں جا کر اسے دوا یا کھانا کھلاتی تھی کیونکہ وہ مجھ سے شرافت سے کھا لیتی تھی۔ ایمل بھابی ہنس کر کہتیں۔ "لگتا ہے ہماری نہیں تمہاری اولاد ہے، دیکھو کیسے شرافت سے مان رہی ہے۔ ہمارا تو ناک میں دم ہوجاتا ہے۔"

"آپ لوگوں سے لاڈ کرتی ہے۔" میں رمل کو پیار سے دیکھتی۔ "ورنہ تو یہ بہت اچھی بچی ہے۔"

"رمل اچھی بچی ہے۔" وہ فوراً ماں سے کہتی۔ ایمل

بھابی کو بھی اس پر پیار آجاتا اور وہ اسے چوم کر کہتیں۔
''ہاں میری بیٹی اچھی ہے سب سے اچھی ہے۔''

ایمل بھابی خود بھی بہت طرح قے سلیقے والی عورت تھیں۔ میں نے ان کو گھر میں بھی کبھی خراب حلیے میں نہیں دیکھا۔ ہمیشہ بہت صاف ستھری رہتی تھیں اسی طرح وہ رمل کو بھی ہمیشہ صاف اور خوب صورت لباس میں صاف ستھرا اور تیار رکھتی تھیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور منہ ہمیشہ صاف ہوتے تھے۔ اس کے سنہری لچھوں جیسے بال ہمیشہ سلکی اور شیمپو کیے ہوئے ہوتے تھے۔ اس کے پاس سے بے بی پاؤڈر کی مہک آتی تھی۔ جب چھوٹی تھی تب بھی اس کی نیپی سے کبھی بدبو نہیں آئی۔ ایمل بھابی نے اسے تربیت دی تھی کہ جیسے ہی اس کی نیپی گندی ہو وہ فوراً ماں کو بتائے۔ ایمل بھابی نیپی تبدیل کر دیتی تھیں، چاہے انہیں دن میں دس بار کیوں نہ بدلنی پڑے۔ صفائی ستھرائی کی یہ عادت رمل میں بھی تھی۔ وہ عام بچوں کی طرح مٹی میں کھیلنا پسند نہیں کرتی تھی۔ اگر اس کے ہاتھ پیروں پر مٹی یا کوئی چیز لگ جاتی تو جب تک دھلوا نہیں لیتی اسے چین نہیں آتا تھا۔

جب میں نے پہلی بار اسے دیکھا تو چھوٹی سی پھولی پھولی فراک میں تھی۔ اس میں اس کی ٹانگیں نمایاں تھیں، وہ بھاگتی دوڑتی تو اس کی چھوٹی سی نیکر بھی نظر آتی۔ اوپر شانوں سے صرف دو ڈوریاں لگی تھیں۔ پشت کھلی ہوئی تھی۔ یوں سمجھ لیں خاصا کھلا ہوا لباس تھا لیکن وہ صرف دو سال کی بچی تھی اس لیے اس پر برا نہیں لگتا تھا۔ بلکہ اسے دیکھ کر پری کا احساس ہوتا تھا۔ پھر وہ دور بھی ایسا نہیں تھا۔ میں نے بتایا نا معاشرے میں امن و سکون تھا مگر ایک تبدیلی کا آغاز ہو گیا تھا۔ ڈش کا آغاز ہو گیا تھا اور ٹی وی پر انڈین چینلوں کی بھرمار ہو گئی تھی۔ ہمارے چینلوں کو بھی کھلی چھوٹ ملی ہوئی تھی انڈین چینلوں کی پیروی کرنے کی۔ ملک کو ایک روشن خیال سمت ڈال دیا گیا تھا اور کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے دنوں میں یہ روشن خیال راستہ کہاں جا کر رکے گا۔ آغاز ڈش سے ہوا تھا۔ رہی سہی کسر کیبل پوری کر رہا تھا۔ معاشرہ ایک غیر محسوس تبدیلی کی زد میں تھا۔ اس تبدیلی کی زد میں ہر فرد آ رہا تھا چاہے اس کا تعلق کسی بھی طبقے سے ہو۔

ایک عجیب رجحان چل نکلا تھا۔ لوگ نمازیں پڑھنے لگے۔ داڑھی رکھنے لگے، اپنے بچوں کو حافظ یا عالم بنانے کی تمنا کرنے لگے لیکن ساتھ ہی ان کے گھر میں کیبل بھی لگ گئی تھی اور ان کے گھر والے سب دیکھتے تھے۔ یہ میں سنی سنائی نہیں آنکھوں دیکھی بات کر رہی ہوں۔ ہماری گلی میں نصف گھر ایسے ہی تھے جہاں یہ دو عملی ہو رہی تھی۔ بچے حفظ یا مدرسے سے آ کر ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتے اور کارٹون چینل دیکھنے لگتے۔ ایک بار میں نے کارٹونز دیکھے کیونکہ میرے بھائی بھابی اور بھتیجے بھتیجیاں آئے تھے اور وہ ٹی وی کے آگے براجمان ہو گئے۔ تب میں نے دیکھا اور میں حیران رہ گئی۔ ان کارٹونز میں جو دکھایا جا رہا تھا اس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی انڈین یا انگلش مووی کارٹون کی صورت میں بنائی گئی ہو۔ میں نے بھائی اور بھابی سے کہا۔

''یہ بچے کیا دیکھ رہے ہیں؟ آپ انہیں منع نہیں کرتیں۔''

''بہن، سنتے کہاں ہیں۔'' بھابی نے بے پروائی سے کہا۔ ''ویسے برائی کیا ہے کارٹون ہی تو ہیں۔''

''لیکن بھابی یہ بھی دیکھیں کہ ان میں دکھایا کیا جا رہا ہے۔''

میرے کہنے پر بھائی اور بھابی نے کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ ایسا لگ رہا تھا ان کے نزدیک یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ مگر میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ اگر میرے بچے ہوئے تو میں گھر میں کیبل نہیں رکھوں گی۔ ہم پی ٹی وی دیکھتے آئے تھے اگرچہ پی ٹی وی بھی بدل گیا تھا لیکن بہر حال انڈین چینلوں اور ہمارے نجی چینلوں سے خاصا بہتر تھا۔ اس لیے اریب کے ہوتے ہی میں نے فہد کو کیبل ہٹانے کی وارننگ دے دی۔ وہ حیران ہوئے۔ ''ثوبی کیا ہوا ہے ابھی تو یہ بالکل چھوٹا ہے۔''

''میں نے پڑھا ہے بچہ پہلے دن سے سیکھنا شروع کر دیتا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ میرا بچہ کوئی غلط چیز سیکھے۔''

فہد خود نیوز اور اسپورٹس چینل شوق سے دیکھتے تھے اس لیے وہ ذرا مشکل سے مانے۔ صمد اور میری ساس کوئی وی سے دل چسپی نہیں تھی۔ صمد کمپیوٹر میں مگن رہتا تھا اور ساس نماز اور وظائف پڑھتی رہتی تھیں ٹی وی زیادہ تر میں اور فہد ہی دیکھتے تھے۔ کیبل نکلوا کر ہم انٹینا سے پی ٹی وی دیکھنے لگے۔ مگر اریب کے بعد مجھے اس کا موقع کم ملتا تھا، وہ بہتر بچہ تھا۔ حد یہ کہ باپ کے پاس بھی مشکل سے جاتا تھا۔ کبھی کبھی فہد شکوہ کرتے۔ ''تم نے بلاوجہ کیبل ہٹا دی یہ تو سوائے تمہارے کچھ دیکھتا ہی نہیں ہے۔''

''ابھی نہیں دیکھتا ہے بڑا ہو کر تو دیکھے گا تو ابھی سے کیوں نہ بچایا جائے۔''

جب اریب ہوا تو رمل چار سال کی تھی۔ اب وہ اسکول جانے لگی تھی۔ اس لیے صبح تو نہیں آتی تھی لیکن شام کو لازمی ہمارے گھر آتی تھی۔ ایمل بھابی اسے تیار کر کے ہمارے گھر چھوڑ جاتی تھیں۔ وہ اریب سے کھیلنا چاہتی تھی مگر اریب کسی کو پاس برداشت نہیں کرتا تھا۔ اسے دیکھ کر چیخ چیخ کر روتا۔ مجبوراً وہ اس سے دور ہو جاتی۔ رمل کو بھی ٹی وی کا شوق تھا مگر اسے ہمارے ہاں آنے والے چینل اچھے نہیں لگتے تھے۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ ''آنٹی آپ ہمارے والا چینل کیوں نہیں لگاتی ہیں۔''

مجھے اس چینل کا علم نہیں تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''اس میں کیا آتا ہے؟''

''آنٹی اس میں ڈانس آتا ہے، میں آپ کو کر کے دکھاؤں۔''

میں حیران ہوئی چار سال کی بچی کہہ رہی تھی ڈانس کر کے دکھاؤں۔ میں نے مذاق میں کہا۔ ''اچھا دکھاؤ تمہیں کیسا آتا ہے۔''

وہ فوراً ایک خاص پوز میں کھڑی ہو گئی اور پھر جو اس نے ڈانس کر کے دکھایا تو میں دنگ رہ گئی، وہ تمام اسٹیپ اتنی مہارت اور مکمل انداز میں کر رہی تھی جیسے اس نے نہ جانے کتنی مشق کی ہوئی ہو۔ یہی نہیں وہ بتا رہی تھی کہ وہ کس گانے پر ڈانس کر رہی ہے اور اسے ساری ورڈنگ بھی آتی تھی۔ ان میں سے بعض جملے ایسے تھے جو بچے کیا کسی بڑی عمر کی لڑکی کے منہ سے بھی مناسب نہیں لگتے۔ رمل نے کئی الگ الگ گانوں پر بالکل الگ ڈانس کر کے دکھایا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''آپ کے امی ابو کو منع نہیں کرتے۔''

''ماما پاپا کو اچھا لگتا ہے۔'' اس نے فخر سے بتایا۔

رمل چار سال کی ہو رہی تھی۔ شروع میں وہ ذرا ہلکی سی تھی مگر جب اس نے ٹھوس غذا شروع کی تو اس کا وزن بڑھا تھا اور اب وہ بھرے بھرے جسم کی پیاری سی بچی تھی۔ ابھی بھی ایمل بھابی اسے چھوٹے چھوٹے لباس پہناتی تھیں جن میں اس کا خوب صورت جسم نمایاں ہوتا تھا۔ میں نے اسے منع کیا۔ ''یہ اچھی بات نہیں ہے اچھی بچیاں یہ سب نہیں کرتی ہیں۔''

''اچھا۔'' اسے تعجب ہوا۔ ''ماما تو منع نہیں کرتیں۔''

میں نے اس سے تو نہیں کہا لیکن موقع ملا تو ایمل بھابی سے کہا۔ ''بھابی، رمل نے مجھے ڈانس کر کے دکھایا ہے۔''

''اچھا کرتی ہے نا۔'' وہ فخر سے بولیں۔ ''ایک ایک اسٹیپ بالکل اور پرفیکٹ اٹھاتی ہے۔''

میں گہری سانس لے کر رہ گئی۔ وہ بھلا کہاں رمل کو منع کرتیں جب کہ وہ خود اسے پسند کر رہی تھیں۔ پھر میں نے کہا۔ ''بھابی یہ اچھی بات نہیں ہے۔ یہ چھوٹی بچی ہے لیکن جب بڑے ہو کر یہ ڈانس کرے گی تو کیا آپ کو اچھا لگے گا اور بعد میں آپ اسے منع بھی کر سکیں گی؟''

''بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔'' ایمل بھابی نے کسی قدر روکھے لہجے میں کہا تو میں سمجھ گئی کہ ان کو یہ بات پسند نہیں آئی ہے اس لیے میں بھی چپ ہو گئی۔ بچی تو ان کی تھی اس کا اچھا برا وہ خود زیادہ بہتر سوچ سکتی تھیں۔ مگر مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ میں نے فہد سے کہا تو وہ بولے۔

''ٹینشن کیوں لے رہی ہو آج کل یہ سب عام سی بات ہے۔''

''فہد یہ سوچیں کہ آج ہم جیسے ہیں یہ ہم ایک دم سے بڑے ہو کر نہیں بن گئے بلکہ بچپن میں ہم نے سیکھا۔ ماں باپ نے جو اچھی بری باتوں کی تمیز سکھائی وہی آج ہمارے کام آ رہی ہے۔ ہماری پرورش بالکل بھی اس انداز میں نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی ہم یہ سب کرتے تھے جو آج کے بچے کر رہے ہیں۔ جیسے ہم نے جو سیکھا بچپن میں سیکھا اسی طرح یہ جو سیکھ رہے ہیں بچپن میں سیکھ رہے ہیں بڑے ہو کر بھی یہ اسی پر عمل کریں گے۔''

فہد سوچ میں پڑ گئے لیکن پھر انہوں نے کہا۔ ''چھوڑو، ہم سارے زمانے کا ٹھیکا نہیں لے سکتے بس اپنے بچوں کی ٹھیک پرورش کر لیں ان کو اچھی بری باتیں سکھا دیں یہی کافی ہے۔''

''ہاں مگر ہمارے سامنے کوئی برائی ہو رہی ہو تو ہاتھ سے نہ سہی زبان سے تو ٹوک دیں۔ اچھا برا آدمی کے سامنے رکھ دیں وہ قبول کرے یا نہ کرے یہ اس کی مرضی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''فہد ہمارے بچے بے شک اچھے نکلیں گے لیکن انہیں رہنا تو اسی معاشرے میں ہے اور سچی بات ہے یہ بہت خوفناک سمت جا رہا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے آنے والا وقت بہت خطرناک ہو گا خاص طور سے بچوں کے حوالے سے۔''

یہ سچ ہے، میں جب دیکھتی کہ جن باتوں کو ماں باپ بہت ہلکا لے رہے ہیں بلکہ ٹھیک سمجھ رہے ہیں وہی آگے چل

کر ان کے بچوں کے مزاج اور کردار بنائیں گے اور تب وہ انہیں روکنا ٹوکنا شروع کریں گے لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی ہو گی تب میں اندر ہی اندر کڑھتی تھی، پریشان ہوتی تھی۔ میری چھٹی حس کہتی تھی کہ بہت خوفناک دور آنے والا ہے۔ اس لیے میں اریب اور شاہزیب پر سخت نظر رکھتی تھی۔ اریب کو چار سال کی عمر میں اسکول میں داخل کرایا تو میں نے خود کئی دن جا کر اسکول کا ماحول دیکھا اور کئی اسکولوں کو اسی طرح چیک کیا۔ جب مجھے ایک اسکول کے بارے میں یقین ہوا کہ اس کا ماحول اچھا ہے تب میں نے اریب کو وہاں داخل کرایا اور اس کے بعد بھی مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ گئی بلکہ وقفے وقفے سے اریب سے رپورٹ لیتی تھی خود بھی اسکول جاتی تھی۔ شاہزیب اریب سے ایک سال چھوٹا تھا جیسے ہی وہ تین سال کا ہوا میں نے اسے بھی اسی اسکول میں داخل کرا دیا اور اس پر بھی اریب کی طرح نظر رکھتی۔

دونوں کو محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے دیتی تھی مگر کسی کے گھر جانے کی اجازت نہیں تھی اور کھیل کا وقت بھی عصر سے مغرب کے درمیان مخصوص تھا۔ مغرب کے بعد میں بچوں کو کھانا کھلا دیتی تھی اور عشا کے بعد وہ سو جاتے تھے۔ اس طرح ان کو دوسرے بچوں کے ساتھ گھلنے ملنے اور ان کے ماحول میں جانے کا موقع کم ملتا تھا۔ شام کے وقت کھیل ہوتا تھا جو جسمانی صحت کے لیے ضروری ہے۔ اس میں بچے ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے تھے۔ یہاں ان کو ایک دوسرے سے بات کرنے کا موقع کم ملتا تھا۔ میرے خیال میں بچوں کو باہر نکلنا اور دنیا کے بارے میں جاننا بھی لازمی ہے اس کے بغیر بچوں اور خاص طور سے لڑکوں میں اعتماد پیدا نہیں ہوتا ہے۔ مگر ساتھ ساتھ میں نوٹ کرتی تھی کہ وہ دوسرے بچوں سے کوئی منفی بات سیکھ کر تو نہیں آرہے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں ان کو صرف منع نہیں کرتی تھی بلکہ بٹھا کر تفصیل سے سمجھاتی تھی کہ یہ بات کیوں غلط ہے اور بچوں کو کیوں ایسی بات نہیں کرنا چاہیے۔

یہ سب کرنا آسان نہیں تھا مجھے بہت وقت بچوں کو دینا پڑتا۔ گھر کے کام اور دوسری ذمے داریاں ادا کرنا لازمی تھا اس لیے مجھے بچوں کے لیے وقت نکالنے کی خاطر اپنے آرام اور تفریح کی قربانی دینی پڑتی تھی لیکن میرے خیال میں یہ ضروری تھا۔ اسی قربانی سے عورت اپنے بچوں کی درست پرورش کر سکتی ہے۔ میں انوکھا کام نہیں کر رہی ہوں۔ ہماری مائیں اور نانیاں، دادیاں یہ سب کرتی آئی ہیں، بس آج کل مائیں سستی دکھا رہی ہیں۔ وہ بچوں سے محبت کرتی ہیں لیکن ان کی پرورش میں جان نہیں مارتی ہیں۔ وہ بہت بے پروائی سے بچے پال رہی ہیں اس وجہ سے ہمارے معاشرے اور ملک میں آئے دن سانحے ہو رہے ہیں۔ ایسے سانحے جن کے بارے میں سن کر دل لرز جاتا ہے لیکن شقی القلب لوگ کر گزرتے ہیں۔ خاص طور سے بچیوں کے ساتھ جو ہو رہا ہے اس پر ہر دردمند پاکستانی کا دل روتا ہے لیکن ہم سوچنے کی زحمت نہیں کر رہے ہیں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے اور اس کا تدارک کیا ہے۔ پولیس، حکومت اور معاشرے کو کوستے رہتے ہیں لیکن اپنے گریبان میں نہیں جھانکتے ہیں کہ جو ہو رہا ہے اس میں ہماری کوتاہی کہاں کہاں ہے؟

رمل دس سال کی ہو چکی تھی۔ اتفاق سے وہ بھی اسی اسکول میں آگئی کیونکہ میرے بچوں کی رپورٹس اور رویّہ دیکھ کر دوسرے ماں باپ بھی اپنے بچے اسی اسکول میں داخل کرا رہے تھے مگر وہ ایک بات بھول رہے تھے کہ اسکول کے ساتھ بچوں کو گھر میں بھی اچھا ماحول دینا اور ان کو ہمہ وقت اچھی بری بات کی تمیز سکھانا بھی لازمی ہے ورنہ صرف اچھے اسکول میں داخل کرنے سے بچوں کی تعلیم ہی اچھی ہوتی، تربیت تو بہر حال ان کی گھروں میں ہوتی ہے۔ رمل میرے بچوں کے ساتھ وین میں آتی جاتی تھی۔ اریب اور شاہزیب اس کے بارے میں بتاتے تھے کہ آج رمل باجی نے کلاس میں ڈانس کر کے دکھایا، آج وہ راستے میں یہ والا گانا گا کر اور ایکٹ کر کے بچوں کو دکھاتی رہی تھیں۔ اریب اب ذرا سیدھا ہو گیا تھا زیادہ سوال نہیں کرتا تھا جو میں کہتی فوراً مان جاتا لیکن شاہزیب بچپن میں جتنا سیدھا تھا اب اتنا ہی مشکل بچہ ثابت ہو رہا تھا۔ مشکل ان معنوں میں کہ اس میں جستجو بہت زیادہ تھی اگر کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی یا اس کی تسلی نہ ہوتی تو وہ بار بار سوال کرتا تھا اور بعض اوقات تو دماغ کھا جاتا تھا۔ اسے رمل سے انسیت تھی اور وہی زیادہ اس کے بارے میں بتاتا۔ جب میں اسے سمجھاتی کہ یہ بات ٹھیک نہیں ہے تو اس کے سوالات شروع ہو جاتے۔ بعض اوقات میں اسے سمجھا نہیں پاتی تھی کہ اس کی رمل باجی جو کرتی تھی وہ کیوں ٹھیک نہیں تھا اور اس میں کیا برائی تھی۔ رمل دس سال کی تھی مگر اپنی صحت اور ڈیل ڈول کی وجہ سے بارہ سال کی لگتی تھی اور اس میں اب بڑے پن کی جھلک آنے لگی تھی۔

وہ اب بھی گھر میں اور گھر سے باہر تنگ اور چھوٹے کپڑوں میں گھومتی تھی۔ میرے حساب سے یہ کپڑے اس کے لیے بالکل نامناسب تھے اور اسے معقول کپڑوں کے ساتھ اب دوپٹا بھی لینا چاہیے تھا مگر ایمل بھابی کا خیال مختلف تھا۔ ان کے نزدیک رمل ابھی بچی تھی اور اسے بچیوں والے کپڑے ہی پہنانے چاہیے تھے۔ اکثر وہ پنڈلیوں تک چڑھے چست ٹائٹس اور چھوٹی سی ٹی شرٹ میں بچوں کے ساتھ باہر کھیلتی نظر آتی۔ میں اسے دیکھتی تو مجھے عجیب سا لگتا۔ وہ جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھی مزید خوب صورت ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے سنہری بال اب شانوں سے نیچے آنے لگے تھے۔ رنگت میں نرمی اور ریشم جیسی چمک آگئی تھی۔ جسم بھرا بھرا تھا اور وہ بہت اچھی لگتی تھی مگر صرف پیار کی نظر سے دیکھنے والوں کو۔ بہت سے لوگ اسے یقیناً بچی سمجھ کر نہیں دیکھتے ہوں گے۔

میں نے بتایا کہ محلے میں تمام مہذب اور پڑھے لکھے لوگ رہتے تھے لیکن شیطان تو ہر انسان کے اندر ہوتا ہے۔ ایک دن میں نے پلاؤ بنایا تھا اور ایمل بھابی کے ہاں بھجوانے کے لیے باہر جھانکا کہ رمل نظر آئے تو اس کے ہاتھ بھجوا دوں تو وہ مجھے کچھ دور ایک آدمی سے بات کرتی نظر آئی۔ یہ آدمی محلے میں رہتا تھا مگر میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی۔ وہ رمل سے بات کر رہا تھا مگر اس کی نظریں جس طرح رمل کو دیکھ رہی تھیں ان کی گندگی مجھے اتنی دور سے بھی نظر آگئی تھی۔ رمل نے فراک پہنی تھی اور یہ مشکل سے اس کے گھٹنوں تک آرہی تھی۔ نیچے کوئی پاجامہ یا ٹائٹس نہیں تھا۔ مجھے غصہ آیا اور میں نے زور سے آواز دے کر رمل کو بلایا۔ وہ دوڑی آئی۔ کھیل کود سے اس کا چہرہ سرخ ہو کر تمتما رہا تھا اور وہ مزید پیاری لگ رہی تھی۔

”جی تو بی آنٹی؟“

”یہ شخص تم سے کیا بات کر رہا تھا۔“

”رفیق انکل....“ وہ بولی۔ ”وہ کہہ رہے تھے کہ میں ان کے پالے پرندے آ کر دیکھوں۔“

جب میں نے رمل کو آواز دی تو رفیق غائب ہو گیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ صرف اپنی بہت بوڑھی ماں کے ساتھ رہتا تھا اور محلے والوں سے اس کا زیادہ ملنا جلنا نہیں تھا۔ ”آپ نے کیا کہا؟“

”آنٹی مجھے پرندے بہت اچھے لگتے ہیں۔“ اس نے خوش ہو کر کہا۔ ”میں جاؤں گی۔“

”بالکل نہیں۔“ میں نے سختی سے کہا۔ ”تم اب بڑی ہو گئی ہو اور کسی ایسی جگہ بالکل مت جانا جہاں کے بارے

میلادالنبی صلی اللہ علیہ وسلم

نبیؐ کی پیدائش کا دن، بارہ ربیع الاول، خوشی کا یہ دن خصوصی اجتماعات اور دینی محفلوں کے انعقاد کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ ان میں نعتیں پڑھی جاتی ہیں اور حضور پاکؐ کی مداح سرائی کی جاتی ہے۔ قدیم تاریخوں میں یہ دن مصروتر کی میں منایا جاتا تھا۔ وہاں سے اس کا آغاز ہندوستان کے چند علاقوں میں، سینٹرل ایشیا کو چھوڑ کر ہوا۔ یہ ذکر خطیبوں، محفلوں کے انعقاد کے ساتھ ہندوستان آیا۔ مسٹر لین اپنی تصنیف ”جدید مصر“ میں ذکر کی محفلوں میں پڑھا جانے والا ایک ٹکڑا پیش کرتے ہیں۔ ”اے خدا، آنے والی نسلوں میں بھی محمدؐ کو سرخرو کر، ان پر رحمتیں نازل کر، ہر زمانے اور ہر دور میں، اور انہیں شدید طاقتور بادشاہوں میں بھی سرخرو کر، یوم الحشر کو اور تمام زمین اور آسمان پر تمام نبیوں اور رسولوں کو اپنی رحمت میں داخل کر (جن کے ناموں پر رحم مانگا جائے گا) ہمارے ماسٹر اور ہمارے آقا محمدؐ سے تو خوش رہ۔ اور وہ چار جو متاثر کن شخصیت کے مالک تھے، ابوبکر، عمر، عثمان، علی اس کے پیارے انسان تھے۔ خدا ...... تو ہماری سرپرستی کو کافی ہے اور تجھ سے بڑی کوئی قوت نہیں۔

اے خدا! ہمارے مالک، رحم کر۔ رحم پروروں سے بھی زیادہ رحم پرور“ آمین!

قیام پاکستان کے بعد سے عید میلادالنبیؐ پورے پاکستان بھر میں جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری تقریبات میں قرأت اور نعت خوانی ہوتی ہے۔ مسجدوں میں خصوصی اجتماع اور دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ مسلمانوں میں یہ عید کے طور پر منائی جاتی ہے۔ اس روز جشن ہوتے ہیں۔ جلوس نکلتے ہیں، چراغاں ہوتے ہیں اور لوگ اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ اس روز ملک بھر میں عام تعطیل ہوتی ہے۔

مرسلہ: کائنات فاطمہ کراچی

میں تمہارے ماما پاپا نہ جانتے ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ فرمانبرداری سے بولی۔

"یہ پلاؤ اپنی ماما کو دے آؤ۔" میں نے اسے ڈھکی ٹرے پکڑا دی۔

اگلے دن ایمل بھابی ٹرے واپس کرنے آئیں تو مجھے خیال آیا اور میں نے ان سے کہا۔ "بھابی پلیز.... میری بات کا برا مت منائیے گا.... آپ جانتی ہیں میں رمل سے محبت کرتی ہوں.... اس کے بھلے کا کہوں گی.... آپ اسے اب لڑکیوں والے کپڑے پہنایا کریں.... وہ بچی نہیں رہی ہے۔"

خلافِ توقع وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ "تو یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو.... وہ واقعی بڑی بڑی لگنے لگی ہے۔"

پھر میں نے ان کو کل والا واقعہ سنایا تو وہ فکر مند ہو گئیں۔ "میں جا کر اس سے پوچھتی ہوں اس نے مجھے نہیں بتایا۔"

"بھابی اس سے پوچھیں بھی اور اس پر پابندی بھی لگائیں۔ وہ اب گلی میں کم جائے اور جائے تو اس طرح مردوں اور لڑکوں سے بات نہ کرے۔ آج کا دور بہت ہی خراب ہے اور مردوں کی ذہنیت تو ہمیشہ سے خراب ہے۔"

"میں اب رمل پر نظر رکھوں گی۔" ایمل بھابی نے وعدہ کیا۔ اس کے بعد وہ ڈھنگ کے کپڑوں میں نظر آنے لگی۔ بھابی نے اسے شلوار قمیص پہنانا شروع کر دی۔ اگر پینٹ شرٹ پہنتی تو وہ بھی بہت تنگ اور چھوٹی نہیں ہوتی تھی۔ مگر دوپٹے کا تکلف وہ اب بھی نہیں کرتی تھی۔ شاید بھابی کے خیال میں وہ اتنی بڑی نہیں ہوئی تھی کہ دوپٹا لیتی۔ اسی طرح وہ اب گلی میں کم نظر آتی تھی شاید بھابی نے اس حوالے سے بھی اس پر پابندی لگائی تھی۔ اگرچہ اس کے لیے گھر بیٹھنا بہت مشکل کام تھا۔ وہ بچپن سے تتلی کی طرح اُڑتے رہنے کی عادی تھی۔ شوخی، کھیل کود اور بھاگ دوڑ اس کی رگ رگ میں بسا ہوا تھا۔ وہ صبح صبح شور کرتی آتی اور اریب اور شاہزیب کو اسکول کے لیے چلنے کو کہتی۔ اریب تو خود تیار ہو جاتا تھا مگر شاہزیب بہت تنگ کرتا تھا۔ رمل آتی تو میں شاہزیب کو اس کے حوالے کر دیتی تھی۔ وہ اسے تیار کراتی تھی۔

وین آتی تو بچے اسکول چلے جاتے تھے۔ وین میں لڑکیوں والا حصہ پیچھے تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ بچے اور لڑکے بیٹھتے تھے۔ جب دوپہر میں وین آتی تو عام طور سے میرے گھر کے دروازے کے سامنے رکتی اور وہیں سے بچے اتر کر اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے۔ رمل یونیفارم میں ہوتی۔ اس میں چھوٹا سا پٹی نما دوپٹا ہوتا تھا اور شرٹ کے ساتھ شلوار تھی۔ یہ بھی اس پر بجتا تھا۔ ایک دن جب وین آئی تو میں باہر ہی سبزی والے سے سبزی لے رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ رمل وین میں آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وین والا بچے اتار کر چلا گیا۔ رمل مجھے سلام کرتے ہوئے گھر کی طرف جانے لگی تب میں نے دیکھا کہ اس کی شرٹ کے اوپری بٹن کھلے ہوئے تھے۔ میں نے اسے آواز دے کر بلایا۔ "رمل ادھر آؤ۔"

"جی آنٹی۔"

سبزی والا بھی اسے غور سے دیکھ رہا تھا میں نے اسے ڈانٹا۔ "تم کھڑے کیا کر رہے ہو جاؤ یہاں سے...."

"جاتا ہوں بی بی جی۔" وہ بولا اور جلدی سے ٹھیلا لے کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے دور جانے کے بعد میں نے رمل سے کہا۔

"آپ کی شرٹ کے بٹن کیوں کھلے ہیں؟"

"آنٹی، ڈرائیور انکل کہہ رہے تھے کہ میں بٹن کھول لوں آج بہت گرمی ہے۔"

"تم نے کھول لیے؟"

"جی آنٹی میں نے کھول لیے گرمی لگ رہی تھی۔"

میرا دل چاہا کہ سر پیٹ لوں۔ رمل کی باتوں سے صاف لگ رہا تھا کہ اس جوان ہوتی بچی کو اس کی ماں نے کچھ سمجھایا ہی نہیں تھا۔ مجھے ڈرائیور پر غصہ آیا تھا لیکن اس سے زیادہ غصہ مجھے رمل کی ماں پر آیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "آپ بٹن بند کرو اور جا کر یہ بات اپنی ماں کو بتاؤ۔"

میرے لہجے سے وہ ڈر گئی۔ "آنٹی یہ بری بات ہے، ماما مجھے ڈانٹیں گی۔"

"نہیں ڈانٹیں گی۔" میں نے کہا تو وہ گھر کی طرف بڑھ گئی۔ میرا خیال تھا کہ ایمل بھابی کی طرف سے اس بات پر کوئی ردِعمل سامنے آئے گا اور وہ اسکول انتظامیہ سے بات کریں گی کیونکہ وین اسکول کی تھی اور بچوں کو لانے لے جانے والا صرف ملازم تھا۔ مگر ان کی طرف سے ایسا کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا کیونکہ وہی ڈرائیور بدستور بچوں کو لا لے جا رہا تھا۔ البتہ یہ ہوا کہ اس دن کے بعد مجھے رمل فرنٹ سیٹ پر نظر نہیں آئی تھی۔ مجھے شبہ ہوا کہ رمل نے ماں کو نہیں بتایا تھا چند دن بعد میں نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا۔

"جی آنٹی، ماما کو بتایا تھا۔"

"انہوں نے کچھ نہیں کہا؟"

"انہوں نے ڈرائیور کو ڈانٹا تھا کہ اب مجھے آگے نہ بٹھائے۔"

"آپ سے کچھ نہیں کہا کیونکہ بٹن آپ نے کھولے تھے؟"

"جی آنٹی ماما نے کہا کہ میں اب ایسا نہ کروں یہ اچھی بات نہیں ہے۔"

تب میں نے سکون محسوس کیا۔ ایمل بھابی بہت زیادہ نہیں لیکن اس پر توجہ دے رہی تھیں۔ اگلے سال رمل بارہ سال کی ہو گئی تھی۔ اس کے بڑھنے کی رفتار معمول سے تیز تھی اور بارہ سال کی ہو کر وہ چودہ سال کی لگنے لگی تھی۔ اس کے جسم میں تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ یہ اچھا ہوا کہ اس نے دوپٹا لینا شروع کر دیا تھا البتہ اس کا لاابالی پن برقرار تھا۔ وہ اب بھی اچھلتی کودتی چلتی تھی اور اکثر دوپٹا بس لٹک رہا ہوتا تھا۔ دیکھا جائے تو اس کا رویہ آج کل کی نوجوان ہوتی لڑکیوں سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ ماؤں کی بے پروائی نے اکثر بچیوں کو خود سے بے پروا بنا دیا ہے۔ مگر ساتھ ہی ان کو عمر سے پہلے وہ سب معلوم ہو چکا ہوتا ہے جو لڑکیوں کو عام طور سے شادی کے بعد پتا چلتا تھا۔ اس سے ہمارے معاشرے میں دوسرے بگاڑ بھی آ رہے ہیں۔ اس پر ہماری نظر بھی ہے لیکن اس کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے اس پر کم لوگوں کی نظر ہے اور بعض اوقات اس کے کتنے بھیانک نتائج نکلتے ہیں اس پر تو ہم بالکل نہیں سوچتے ہیں۔

جس طرح سے رمل کی پرورش ہوئی تھی۔ اس کی ماں نے اسے اچھے برے کی تمیز سے آگاہ نہیں کیا تھا اسے تربیت نہیں دی تھی کہ لڑکیوں کو کس طرح رہنا چاہیے۔ ایک زمانے تک یہ کام استاد اور معاشرہ بھی کرتا تھا لیکن اب استاد پروفیشنل ہو گیا ہے اور معاشرے میں نفسا نفسی کا عالم ہے۔ سب کو اپنی پڑی ہے۔ معاشرے کی جگہ میڈیا نے لے لی جو بگاڑ میں پیش پیش ہے۔ آپ چینل لگا کر دیکھ لیں گھنٹوں ٹی وی کے سامنے بیٹھے رہیں، آپ کو ایک پروگرام بھی اچھائی سکھاتا یا تربیت دیتا نظر نہیں آئے گا۔ مذہبی پروگرام صرف عبادات اور قصے کہانیوں تک محدود رہ گئے ہیں یا ان میں فرقہ واریت کی باتیں ہوتی ہیں۔

رمل ساتویں میں تھی۔ پڑھنے میں وہ بہت تیز تھی اور اس کی خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بنے۔ گرمیوں کی چھٹیاں آئیں تو اسکول بند ہو گئے۔ اب بچے زیادہ تر گھروں اور شام کے وقت گلی میں ہنگامہ کرتے تھے۔ جو مائیں بچوں سے پریشان ہوتی تھیں ان کی زندگی عذاب میں آ گئی تھی اور وہ بچوں سے چھٹکارے کے لیے ان کو مختلف کورسز پر بھیج رہی تھیں۔ مگر میں اپنے بچوں کو چھٹیوں میں بھرپور تفریح کراتی تھی۔ روز ان کی پسند کے کھانے بناتی۔ ہفتے میں ایک یا دو بار انہیں باہر لے جاتی تھی۔ پھر میں اور فہد شہر سے باہر کا پروگرام بھی بناتے تھے۔ اگر مالی حالات اجازت دیتے تو بچوں کو شمالی علاقے گھمانے لے جاتے تھے لیکن اگر حالات ٹائٹ ہوتے تو انہیں شہر میں پکنک پر لے جاتے تھے۔ اس بار واٹر پارک کا پروگرام بنایا اتفاق سے محلے کی کئی فیملیاں تیار ہو گئیں اور سب نے مل کر ایک بڑی بس کرائی اور ہم شہر سے باہر ایک واٹر پارک گئے۔ بہت مزہ آیا بھرپور تفریح رہی۔ خواتین کا حصہ الگ تھا۔ یہاں دس سال سے اوپر کے بچوں کو لانے کی اجازت نہیں تھی۔ اریب اور شاہزیب میرے پاس ہی تھے۔

میں رمل کو دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ ایمل بھابی نے اسے بہت چھوٹا سا لباس پہنا رکھا تھا۔ بے شک یہاں خواتین تھیں مگر اکثر نے پورا لباس پہن رکھا تھا اور کچھ تھیں جو جامے سے باہر ہو رہی تھیں مگر ان کا انداز بتاتا تھا کہ ان کا تعلق برگر طبقے سے تھا۔ رمل نے چھوٹی سی نیکر اور عجیب سی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جس کے آگے گرہ نما ڈیزائن تھا۔ اس کا پیٹ کمر نظر آ رہی تھی۔ نیکر بھی گھٹنوں سے اوپر تھی۔ نہ چاہتے

گسٹاپو Gestapo

نازی جرمنی کی رسوائے زمانہ خفیہ پولیس۔ جب ہٹلر برسرِ اقتدار آیا تو اس وقت جرمنی میں اشتراکیوں نے بہت زور پکڑ رکھا تھا۔ چنانچہ ان کی مخالفت کو ختم کرنے کے لیے یہ پولیس 1923ء میں گورنگ Goering نے تشکیل کی۔ بعد ازاں اس کا انتظام ہٹلر Himmler کے ہاتھوں میں آ گیا۔ جس نے اور زیادہ سخت گیری سے کام لیا۔ 1946ء میں نورمبرگ کی فوجی عدالت نے اسے مجرمانہ تنظیم قرار دیا۔

مرسلہ: زرین فیاض، کراچی

ہوئے بھی میں اعتراض کر بیٹھی۔ ”بھابی آپ نے رمل کو کیا پہنایا ہے؟“

”یہاں ساری عورتیں اور لڑکیاں تو ہیں یا چھوٹے لڑکے ہیں۔“

”ہاں وہ تو ہے۔“ میں چپ ہوگئی۔

”توبیہ اتنی دقیانوسی نہ بنو اب زمانہ بدل گیا ہے۔“

”زمانہ اچھے انداز میں نہیں بدلا ہے یہ ہمیں تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔“

ایمل بھابی نے بات آگے نہیں بڑھائی اور میں بھی چپ ہوگئی۔ واپسی پر میں نے دیکھا کہ رمل نے اسی لباس پر لانگ شرٹ پہن لی تھی لیکن اس کی صحت مند ٹانگیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہماری واپسی رات تک ہوئی تھی پھر گھر پہنچے تو لائٹ غائب تھی ہر طرف تاریکی تھی۔ بس رکتے ہی لوگ افراتفری میں نیچے اتر کر گھروں کی طرف لپکے۔ تھکن سے سب کا برا حال تھا اور سب نہا دھو کر سونا چاہتے تھے۔ میں بچوں کو لے کر گھر آگئی۔ فہد نہیں گئے تھے۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میری ساس کا جوڑوں کا درد بہت بڑھ گیا تھا۔ ان کے لیے چلنا پھرنا محال تھا۔ صمد سعودی عرب چلا گیا تھا۔ اس لیے اوپری کاموں اور ساس کی دیکھ بھال کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھ لی تھی۔ وہ رات میں بھی یہیں رہتی تھی۔ اسے ساس کے پاس چھوڑ کر گئی تھی۔ میں بچوں کو کپڑے دے کر اور نہانے کے لیے بھیج کر لاؤنج میں آئی سر میں درد تھا اور شدت سے چائے کی خواہش ہو رہی تھی۔ کال بیل بجی تو میں دروازے تک آئی۔ باہر ایمل بھابی پریشان کھڑی تھیں۔

”توبیہ، رمل تمہارے ہاں ہے؟“

میں چونکی۔ ”نہیں بھابی.... کہیں گئی تھی؟“

”نہیں.... ہم بس سے اتر کر گھر گئے تھے۔ میں نہانے چلی گئی اور اعظم جنریٹر اسٹارٹ کرنے لگے وہ مسئلہ کر رہا تھا۔ بہت دیر میں اسٹارٹ ہوا۔ میں نہا کر آئی تو رمل گھر میں نہیں تھی۔ اعظم کو بھی نظر نہیں آئی۔ میں سمجھی کہ باہر ہوگی بچوں کے ساتھ، یہاں آئی تو گلی میں سناٹا تھا۔ سب اپنے اپنے گھروں میں ہیں۔“

”ایمل بھابی.... رمل کو میں نے آخری بار بس میں دیکھا تھا۔ وہ بس سے اتری تھی نا؟“

”مجھے نہیں معلوم.... بس والے نے بھی رکتے ہی لائٹس آف کر دی تھیں پھر سب افراتفری میں اترنے لگے۔ میں خود دھکے کھاتی نیچے اتری تھی۔“

”لیکن نیچے اتر کر تو آپ کو رمل کو دیکھنا چاہیے تھا۔“

”میں سمجھی وہ اتر گئی ہوگی۔“ ایمل بھابی پریشان ہونے لگیں۔ ”پتا نہیں کہاں ہے اب تمہارے سوا کسی کے گھر بھی نہیں جاتی ہے۔“

”آپ محلے میں معلوم کریں ہو سکتا ہے کسی کے گھر چلی گئی ہو۔“

”میں معلوم کرتی ہوں، اللہ کرے میری بچی خیریت سے ہو۔“

ایمل بھابی کیسی ہی ماں صحیح لیکن ان میں ماؤں والی چھٹی حس تو تھی جس نے انہیں خبردار کر دیا کہ ان کی اولاد خطرے میں ہے۔ میں اندر آئی تو شاہزیب اور اریب نہا کر نکل آئے تھے۔ میں نے ان سے رمل کے بارے میں پوچھا۔ اریب نے نہیں دیکھا تھا لیکن شاہزیب کا کہنا تھا کہ شاید وہ آگے تھی اور سب سے پہلے اتری تھی لیکن اسے اترتے اس نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ چائے پی کر میں نے عجلت میں منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور فہد کو بتا کر ایمل بھابی کے گھر آئی۔ دروازے پر اعظم بھائی کے ساتھ محلے کے کچھ افراد جمع تھے اور وہ رمل کے بارے میں بات کر رہے تھے میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ میں نے اعظم بھائی سے پوچھا۔

”بھائی صاحب رمل ملی؟“

”نہیں ایمل نے سارے محلے میں معلوم کر لیا ہے۔“

ہماری گلی میں آمنے سامنے کل چودہ مکان تھے۔ یعنی سات مکان ایک طرف اور سات مکان دوسری طرف۔ ایک سو ساٹھ گز کے پلاٹ تھے اور درمیان میں تیس فٹ چوڑی گلی تھی اکثر مکانات دو اور تین منزلہ تھے اور ان میں ایک سے زیادہ فیملیز رہ رہی تھیں۔ ایمل بھابی نے ایک ایک گھر میں جا کر رمل کا پوچھا تھا لیکن وہ کہیں نہیں تھی۔ اندر ایمل بھابی کے ساتھ محلے کی دو خواتین اور تھیں اور وہ انہیں دلاسا دے رہی تھیں کیونکہ ایمل بھابی کا رو رو کر برا حال تھا۔ میں چپ کرانے والوں میں شامل ہوگئی اور خود بھی آبدیدہ ہوگئی تھی۔ رمل سے مجھے بھی بہت پیار تھا وہ تھی ایسی پیاری سی۔ نہ جانے کہاں گئی تھی اور اگر اسے کوئی لے گیا تھا تو نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ میں.... بے اختیار اللہ سے دعا کرنے لگی کہ وہ رمل اور اس کی عزت آبرو کی حفاظت فرما۔

اب باہر مرد اور محلے والے رمل کو تلاش کر رہے تھے۔ تلاش کا دائرہ گلی سے باہر تک بڑھا دیا گیا تھا۔ گلی سے باہر

نیم کمرشل سڑک تھی اس پر زیادہ تر مکانات تھے لیکن کہیں کہیں دکانیں بھی بنی تھیں جن سے روزمرہ کی اشیا مل جاتی تھیں۔ بچے اکثر اپنی چیزوں کے لیے ان دکانوں تک چلے جاتے تھے کیونکہ سڑک پر کمرشل ٹریفک نہیں تھا اس لیے ماں باپ بھی جانے دیتے تھے۔ لائٹ آگئی تھی۔ احتیاطاً ایک بار پھر محلے میں پوچھا گیا۔ سارے محلے کو پتا چل گیا تھا کہ رمل غائب تھی جو لوگ پکنک پر گئے تھے وہ بھی آگئے تھے۔ مرد مکان کے باہر تھے اور خواتین مکان میں تھیں۔ میں نے تفتیش شروع کر دی۔ خواتین اور بچوں سے رمل کے بارے میں پوچھنے لگی۔ تقریباً سب نے ایسے جوابات دیے جن سے معاملہ اور الجھ گیا تھا۔ بعض کہہ رہے تھے انہوں نے رمل کو بس میں دیکھا تھا اور بعض نے اسے بس سے باہر بھی دیکھا تھا مگر وہ یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے۔

اتفاق سے بس والا اعظم بھائی کا واقف کار تھا اور انہوں نے بس ہائر کرائی تھی اس لیے جب رمل محلے میں نہیں ملی تو اعظم بھائی نے فوری بس کے مالک کو کال کی اور رمل کے بارے میں بتایا۔ اسی وقت بس واپس پہنچی تھی اور مالک نے خود ڈرائیور سے پوچھا اور بس کا معائنہ بھی کیا لیکن بس خالی تھی اور ڈرائیور نے قسم کھا کر کہا اس نے روانگی سے پہلے بس دیکھی تھی کہ کسی کا کوئی سامان ہو تو وہ اتار دے۔ بس میں کوئی نہیں تھا۔ ادھر محلے میں دوسری بار تلاش بھی بیکار ثابت ہوئی اور رمل کا کہیں پتا نہیں چلا۔ آس پاس دیکھنے کے بعد قریبی مسجد میں اعلان کرایا گیا اور اس کے کچھ دیر بعد اعظم بھائی محلے والوں کے ہمراہ مقامی تھانے پہنچ گئے۔ اعظم بھائی کے پڑوسی کے بھائی ڈی ایس پی تھے ان کے توسط سے فوری ایف آئی آر کاٹی گئی اور ایک پولیس پارٹی تفتیش کے لیے محلے پہنچ گئی۔ پولیس والوں نے سب سے بیانات لیے اور سوالات کیے۔ اس دوران میں ایک پارٹی جا کر بس ڈرائیور کو گرفتار کر کے تھانے لے آئی۔ حالانکہ اعظم بھائی یا کسی نے اس کے خلاف شبہ ظاہر نہیں کیا تھا۔

پتا چلا کہ رات بھر ڈرائیور پر پولیس نے تشدد کیا لیکن وہ رمل کے بارے اپنے انکار پر قائم رہا تھا۔ کوئی ثبوت بھی نہیں تھا اس لیے صبح اسے رہا کر دیا گیا۔ بس کے مالک نے اس کی ضمانت لی تھی اور اس نے اعظم بھائی سے جھگڑا بھی کیا مگر ان کی بچی گم ہوئی تھی۔ اس میں ان کا بھی قصور نہیں تھا۔ یہ تک واضح ہو گیا تھا کہ رمل کی گم شدگی میں کسی کا ہاتھ تھا وہ کوئی بچی نہیں تھی جو گم ہو جاتی۔ جس وقت وہ غائب ہوئی آس پاس کوئی حادثہ بھی نہیں ہوا تھا اور نہ حالات خراب تھے۔ رمل کی گم شدگی کا سوائے اس کے کوئی جواز نہیں تھا کہ کسی نے اسے اغوا کر لیا ہے۔ دوسرے دن پولیس نے بیریئر کے چوکیدار کو بھی شاملِ تفتیش کر لیا۔ اس کا کہنا تھا کہ جس وقت بس اندر آئی اور پھر واپس گئی اس دوران میں کوئی دوسری گاڑی باہر نہیں گئی تھی اور چند ایک افراد پیدل گئے تھے لیکن ان میں کوئی بچہ نہیں تھا اور نہ کوئی اکیلی لڑکی تھی۔ بس کی واپسی کے بعد تقریباً آدھے گھنٹے تک کوئی گاڑی نہیں گئی تھی، ہاں اس دوران میں کئی گاڑیاں آئی ضرور تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو دفتروں اور کاموں سے واپس آ رہے تھے۔

کوئی سرا نہیں مل رہا تھا۔ ایک بار پھر بس والے سے سوالات ہوئے کہ اس نے راستے میں کہیں بس روکی تھی لیکن اس کا کہنا ہے کہ وہ بس سیدھا اپنے اڈے پر لے گیا تھا۔ کیونکہ صرف پکنک اور شادیوں و تقریبات کے لیے استعمال ہوتی تھی اسے کہیں اور روکنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ بس ہمارے محلے سے تقریباً ساڑھے سات بجے روانہ ہوئی تھی کیونکہ میں جب گھر میں آئی تو یہی وقت ہو رہا تھا۔ بس کے مالک کا کہنا تھا کہ بس آٹھ بجے واپس پہنچی تھی جب کہ راستہ بیس منٹ کا تھا۔ پولیس والے مشکوک تھے کہ بس دس منٹ تاخیر سے کیوں پہنچی۔ ڈرائیور کا کہنا تھا کہ بعض جگہوں پر رش تھا اور وہ اس میں پھنس گیا اسی لیے دیر سے اڈے پہنچا تھا۔ اب اس بات کی تصدیق کسی صورت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ سچ کہہ رہا تھا یا نہیں بعض لوگ اسے سچا قرار دے رہے تھے مگر اکثر کے نزدیک وہ مشکوک تھا۔ اگر اس کی ضمانت نہ ہوتی تو پولیس اسے دوبارہ گرفتار کر لیتی۔

ایمل بھابی اور اعظم بھائی کی حالت خراب تھی۔ رمل ان کی اکلوتی بیٹی تھی اور وہ اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ رمل کیا غائب ہوئی ان کی دنیا اجڑ گئی تھی۔ ایمل بھابی مستقل اسے یاد کر کے روتی تھیں۔ اعظم بھائی خود پر ضبط کرتے تھے کہ مرد تھے اور انہیں بہت کچھ دیکھنا تھا۔ آنے والے دو تین دنوں میں انہوں نے شہر کے تمام اسپتالوں اور مردہ خانوں کو بھی چھان لیا تھا ایسے تمام اداروں میں جا کر دیکھ لیا تھا جہاں لاوارث بچے لائے جاتے تھے۔ مگر رمل کہیں نہیں تھی اس کا معمولی سا سراغ بھی نہیں ملا تھا۔ ہفتہ گزرا تو اس کی بازیابی کی امید کم ہوتی چلی گئی۔ ایک خیال یہ تھا کہ اسے تاوان کے لیے اغوا کیا گیا ہے۔ فون یا موبائل کی بیل بجتی تو دونوں میاں بیوی لپک کر کال ریسیو کرتے تھے کہ

شاید اغوا کرنے والے کا فون ہو۔ وہ تاوان کے بدلے رمل کو رہا کرنے کو تیار ہو۔ اگر انہیں خود کو بیچ کر تاوان کی رقم کرنا پڑتی تو وہ اس کے لیے بھی تیار تھے۔ مگر اسے تاوان کے لیے اغوا نہیں کیا گیا تھا۔

یہ رمل کی گم شدگی کا نواں دن تھا۔ فہد دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے اور میں ناشتا بنا رہی تھی۔ بچے سو رہے تھے کہ اچانک باہر سے کسی کے چلانے کی آواز آئی اور پھر چلانے والوں میں کئی لوگ شامل ہو گئے۔ فہد تولیے سے سر رگڑتے ہوئے آئے میں نے کہا۔ ”اللہ خیر کرے باہر شور ہو رہا ہے۔“

”تم ناشتا لگاؤ میں دیکھ کر آتا ہوں۔“ وہ باہر کی طرف بڑھے۔ میں ناشتا لگانے لگی اور ساتھ ہی مجھے بے چینی ہو رہی تھی۔ جب سے رمل غائب ہوئی تھی میں کسی بری خبر کو سننے کے لیے تیار تھی۔ یہ ہنگامہ مجھے رمل سے متعلق لگا تھا۔

جب مجھ سے صبر نہیں ہوا تو میں چادر اوڑھ کر باہر آ گئی۔ رفیق کے گھر کے آگے پانچ چھ لوگ جمع تھے اور سب اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ مجھے اچھا نہیں لگا کہ مردوں کے پاس جاؤں، میں دروازے سے ذرا آگے آ کر دیکھنے لگی۔ تب مجھے رفیق اور بیریئر کا چوکیدار لڑتے دکھائی دیے۔ اچانک رفیق نے چوکیدار کو مارنا شروع کر دیا اور لوگ بیچ بچاؤ کر رہے تھے۔ لوگوں نے رفیق کو پکڑ لیا اور چوکیدار چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

”اس سے بولو ڈکی کھول کر دکھائے اس نے کیا رکھا ہے ہم نے خود پاؤں دیکھا.... خدا کا قسم.... پاؤں دیکھا۔“

مجھے یاد آیا کہ رفیق ایک بار رمل سے بات کر رہا تھا اور اسے بہت غلط نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چوکیدار کی بات سن کر مجھے چکر سا آیا اور میں گرنے سے پہلے اندر آ گئی۔ جب تک میرے حواس بحال ہوتے باہر سب ہو گیا تھا۔ چوکیدار کی بات نے سب کو مشکوک کر دیا تھا۔ چوکیدار کا کہنا تھا کہ رفیق نے ایک بنڈل سا لا کر اپنی کار کی ڈکی میں ڈالا تھا اور چوکیدار نے اتفاق سے بنڈل سے جھانکتا انسانی پاؤں دیکھ لیا، پاؤں چھوٹا تھا۔ رفیق کی ماں مر چکی تھی اور وہ اکیلا رہتا تھا۔ اب بھی اس کے محلے میں کسی سے تعلقات نہیں تھے۔ لوگوں نے رفیق کو قابو کر کے اس سے چابی لے کر ڈکی کھولی تو بنڈل سے جھانکتا پاؤں فوراً سامنے آ گیا اور جب اسے کھولا گیا تو اس میں رمل کی لاش تھی۔ لاش کئی دن پرانی تھی اور اس سے بو آنے لگی تھی۔ اسے گلا دبا کر مارا گیا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر لوگ اتنے مشتعل ہوئے کہ انہوں نے رفیق کو مار مار کر تقریباً مار ڈالا تھا۔ اگر کچھ ہوش مند درمیان میں نہ آتے تو وہ مر چکا ہوتا۔ پولیس کو اطلاع دی گئی اور اسے اسپتال پہنچایا گیا۔ لاش ملنے کے بعد کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ رمل کا پوسٹ مارٹم ہوا۔ اسے متعدد بار زیادتی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ پھر اسے بھوکا پیاسا گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔ یہ ایسی ہولناک داستان تھی جس نے ہر شخص کو ششدر کر دیا تھا۔ محلے میں کہرام برپا ہو گیا تھا۔ ایمل بھابی پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ اعظم بھائی خود کو اور انہیں سنبھال رہے تھے۔ رمل کی تدفین دو دن بعد ہوئی۔ میڈیا والے آئے اعظم بھائی سے تاثرات لیے۔ ایمل بھابی بات کرنے کے قابل نہیں تھیں۔

رفیق نے اقرار کیا کہ اس نے غلط نیت سے رمل کو اغوا کیا۔ وہ بس سے اتری تو اتفاق سے اس کے گھر کے سامنے تھی۔ رفیق نے تاریکی اور افراتفری سے فائدہ اٹھا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے دروازے سے اندر کھینچ لیا اور پھر ہاتھ پاؤں اور منہ باندھ کر اسٹور میں بند کر دیا۔ وہ مسلسل چھ دن رمل کو بھوکا اور پیاسا رکھ کر اپنی درندگی کا نشانہ بناتا رہا۔ اسے تین چار بار معمولی مقدار میں پانی دیا اور جب وہ مرنے جیسی ہو گئی تو اسے گلا دبا کر مار ڈالا۔ تین چار دن تک وہ ہمت کرتا رہا کہ لاش کہیں لے جا کر پھینک دے مگر پکڑا گیا۔ اس کے خلاف خصوصی عدالت میں مقدمہ چلا اور اسے سزائے موت سنائی گئی تھی۔ اس کی جائداد ضبط کر لی گئی اور اس سے رمل کے وارثوں کو دس لاکھ روپے ہرجانہ ادا کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اب رفیق جیل میں بند سزائے موت کا منتظر تھا۔ واقعے کے چند مہینے کے بعد دوبارہ سب معمول پر آ گیا سوائے رمل کے گھر کے۔ لوگ ویسے ہی ہنسنے بولنے لگے۔ گلی میں بچے ویسے ہی شور مچانے لگے اور چند دن محتاط رہ کر مائیں دوبارہ بچوں اور خاص طور سے لڑکیوں سے بے پروا ہو گئیں۔ لوگوں نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا کم سے کم مجھے تو ایسا ہی لگا تھا۔ یہ سچ بیانی اسی لیے آپ تک پہنچا رہی ہوں کہ خدارا اپنے بچوں پر توجہ دیں باہر درندے ہیں انہیں غیر محفوظ نہ چھوڑیں۔ ان کی پرورش اپنی اقدار کے رسم و رواج کے مطابق کریں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو آنے والے وقت میں درندے ہمارے بچوں کو گھروں سے اٹھا کر لے جائیں گے۔

بٹوارا

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!
عرض یہ ہے کہ میں آپ کا یہ ڈائجسٹ بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ مجھے لکھنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے پھر بھی کوشش کی ہے، کس حد تک کامیاب ہوئی ہوں یہ آپ ہی بتاسکیں گے۔ یہ میری اپنی سچ بیتی ہے۔ مجھ پر جو گزری ہے وہ تحریر کررہی ہوں۔
سعدیہ احمر
(لاہور)

میری آنکھ کھلی تو کانوں میں ٹپ ٹپ کی آواز سنائی دی جیسے کہیں دور جلترنگ بج رہے ہوں، میں نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ اندھیرا اپھیل چکا تھا۔ بستر سے اٹھ کر کمرے کی لائٹ جلائی اور گھڑی پر نظر ڈالی آٹھ بج رہے تھے۔ گویا میں چار گھنٹے تک سوتی رہی لیکن احمر کہاں رہ گئے۔ وہ تو عموماً چھ بجے تک آ جاتے ہیں۔ اگر راستے میں ٹریفک جام ملے تو زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹا کی تاخیر ہو سکتی ہے لیکن اتنی دیر انہیں کبھی نہیں ہوئی۔ وہ وقت اور اصولوں کے بہت پابند تھے۔ ہمیشہ

صبح مقررہ وقت سے پانچ دس منٹ پہلے دفتر پہنچتے اور شام میں پانچ بجتے ہی اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑے ہوتے۔ وہ ان لوگوں کو نکما اور نااہل سمجھتے تھے جو دفتر کا وقت ختم ہونے کے بعد بھی کام کرتے رہتے ہیں۔

میں کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آئی۔ وہاں بھی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے لاؤنج کے ساتھ ہی پورچ اور گیٹ کی بتیاں بھی روشن کر دیں۔ پھر مرکزی دروازہ کھول کر باہر پورچ میں آ گئی۔ وہاں صرف میری کار کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے کچن میں آ کر چولہے پر چائے کا پانی رکھا۔ بسکٹوں کے ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا لیکن یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا کہ ابھی کچھ کھا لیا تو بھوک مر جائے گی۔ کیونکہ میں رات کا کھانا احمر کے ساتھ ہی کھایا کرتی تھی لہٰذا ان کے انتظار میں چائے کی پیالی لے کر ٹی وی لاؤنج میں آ گئی۔ ٹی وی آن کیا اور مختلف چینلز بدل بدل کر شہر کے حالات جاننے کی کوشش کرنے لگی لیکن کہیں سے بھی ٹریفک جام کی خبر نہیں ملی۔ ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ اب تو مجھے تشویش ہونے لگی۔ میں نے ان سے رابطہ کرنا چاہا لیکن میرے موبائل کی بیٹری ڈاؤن ہو چکی تھی۔ اسے چارجنگ پر لگایا اور گھر کے فون سے ان کا نمبر ملانے کے بارے میں سوچا لیکن وہ بھی ڈیڈ پڑا ہوا تھا۔ دراصل موبائل کا رواج عام ہونے کے بعد گھر کے فون کا استعمال برائے نام رہ گیا تھا۔ اس لیے بعض اوقات یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ فون کام کر رہا ہے یا نہیں۔ میں نے جھنجلا کر ریسیور کریڈل پر پٹخا اور دوبارہ ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئی۔ مجھے احمر پر غصہ آ رہا تھا کہ اگر کسی وجہ سے کہیں رک گئے تھے تو کم از کم ٹیلی فون کر کے ہی بتا دیتے۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ ہو سکتا ہے انہوں نے فون کیا ہو لیکن میرے موبائل کی بیٹری ڈاؤن ہونے کی وجہ سے رابطہ نہ ہو سکا ہو۔ اب مجھے بیٹری کے چارج ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ اس کے بعد ہی احمر سے بات ہو سکتی تھی۔

آدھ گھنٹا بعد میں نے احمر کا نمبر ملایا تو جواب میں ان کی آواز سن کر میری جان میں جان آئی، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے۔ میں پھٹ پڑی۔ ”کہاں رہ گئے آپ؟ کچھ وقت کا بھی اندازہ ہے۔ نو بجنے والے ہیں، میرا تو دم نکلا جا رہا ہے۔ طرح طرح کے وسوسے اور خیالات آ رہے ہیں۔ اگر آپ کو کسی کام سے جانا تھا تو کم از کم ایک فون ہی کر دیتے۔ مجھے آپ سے اس غیر ذمے داری کی توقع نہ تھی۔“

”اپنی ہی کہے جاؤ گی یا میری بھی سنو گی۔“ وہ بڑے سکون سے بولے۔ ”میں بہت دیر سے کوشش کر رہا ہوں لیکن رابطہ ہی نہیں ہو رہا۔ کہیں تمہارے فون کی بیٹری تو ڈاؤن نہیں ہو گئی۔ گھر کا نمبر ملایا تو وہاں بھی رسپانس نہیں۔“

”ہاں“ میں شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”دراصل میری آنکھ لگ گئی تھی اس لیے بیٹری چارج نہ ہو سکی۔ گھر کا ٹیلی فون بھی خراب ہے۔ خیر چھوڑیں ان باتوں کو۔ یہ بتائیں کہ آپ کہاں ہیں اور کتنی دیر میں گھر پہنچ رہے ہیں۔“

”ایک ایمرجنسی ہو گئی ہے لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ گھر آ کر تفصیل بتاؤں گا۔ شاید ایک گھنٹا اور لگ جائے۔“

ان کی باتوں سے مجھے کچھ اطمینان ہوا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسی کیا ایمرجنسی ہو گئی جو وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچ سکے۔ وہ کسی پرہجوم جگہ سے باتیں کر رہے تھے کیونکہ پس منظر میں لوگوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے دماغ پر مزید زور دینا مناسب نہ سمجھا اور وقت گزارنے کے لیے ٹی وی دیکھنے لگی۔ بارش رک چکی تھی اور ٹی وی پر بارش کی تباہی کے مناظر دکھائے جا رہے تھے۔ شہر کی بیشتر سڑکیں زیرِ آب آ چکی تھیں جس کی وجہ سے ٹریفک میں خلل پڑ رہا تھا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا کہ احمر کو گھر پہنچنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگ سکتا ہے۔

ان کی واپسی گیارہ بجے کے قریب ہوئی۔ وہ کافی تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ اس لیے میں نے فوراً ہی کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ فریش ہونے اور کھانا کھانے کے بعد جب وہ آرام سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے تو میں سمجھ گئی کہ اب انہیں چائے کی طلب ہو رہی ہے۔ وہ رات کے کھانے کے بعد چائے ضرور پیتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ اس کے بغیر مرغی بھی انہیں دال لگتی ہے لہٰذا میں نے چائے بنائی اور پیالی انہیں تھماتے ہوئے بولی۔ ”اب بتائیں وہ کون سی ایمرجنسی تھی جس کی وجہ سے آپ پانچ گھنٹے تاخیر سے گھر آئے؟“

”ہوا یوں کہ جب میں دفتر سے نکلا تو بارش شروع ہو چکی تھی اور لوگ گھر جانے کے لیے سواری کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ایسے میں میری نظر دفتر میں کام کرنے والی ثمینہ پر پڑی جو گھر جانے کے لیے بس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہاں کوئی شیڈ نہیں تھا اور اس کے لیے اپنے آپ کو بارش میں

بھیگنے سے بچانا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے گاڑی اُس کے پاس لے جا کر روکی اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پہلے تو وہ ہچکچائی لیکن میرے اصرار کرنے پر جھجکتی ہوئی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ بری طرح بھیگ چکی تھی اور ابھی تک پانی کے قطرے اس کے سر سے پھسل کر گالوں پر گر رہے تھے۔ میں نے ڈیش بورڈ پر رکھے ہوئے ڈبے کی طرف اشارہ کیا تو اس نے جھجکتے ہوئے ایک ٹشو پیپر اٹھا لیا اور اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے بولی۔ ”سر! آپ نے بلاوجہ زحمت کی، میں بس سے چلی جاتی۔“

”جانتا ہوں کہ تم روزانہ بس سے ہی گھر جاتی ہو لیکن اس وقت تیز بارش ہو رہی ہے۔ نہ جانے بس کتنی دیر میں آتی، یہی سوچ کر میں نے تمہیں بٹھا لیا۔“

”بہت بہت شکریہ ورنہ آج کل کون اس طرح سوچتا ہے۔“

مجھے اس کے انداز میں کچھ تلخی سی محسوس ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔

اس نے جو ایڈریس بتایا۔ وہ میرے راستے میں ہی پڑتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اسے گھر تک پہنچانے کے لیے مجھے کوئی اور راستہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ باقی سفر خاموشی سے کٹا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی منزل آ گئی اور وہ کھڑکی کے شیشوں سے باہر کی طرف جھانکتے ہوئے بولی۔

”بس، یہیں روک دیجیے۔“

میں نے وہاں کا جائزہ لیا۔ وہ لائنز ایریا کا علاقہ تھا اور سڑک کے بائیں جانب دکانوں کی ایک قطار تھی۔ مجھے وہاں کوئی رہائشی مکان نظر نہیں آیا۔ تب میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ ”تمہارا گھر کہاں ہے؟“

”زیادہ دور نہیں۔ اس سڑک پر آگے جا کر چند قدم کے فاصلے پر ہے۔“

”دیکھ رہی ہو کہ بارش ابھی نہیں رکی۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے تو اور زیادہ بھیگ جاؤ گی۔ میں تمہیں گھر کے دروازے تک چھوڑ دیتا ہوں۔“

”رہنے دیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ ہمارا گھر ایک گلی میں ہے۔ وہاں تک آپ کی گاڑی نہیں جا سکے گی۔“

میں نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور گاڑی کو ذیلی سڑک پر ڈال دیا۔ ابھی ہم نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ ثمینہ کا موبائل بجنے لگا۔ دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا۔ اسے سن کر وہ پریشان ہو گئی اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا ہوا ثمینہ، خیریت تو ہے؟“

”خیریت نہیں ہے سر۔“ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ”ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔“

”اوہ۔ آئی سی۔ انہیں فوراً اسپتال لے جانا ہو گا۔ تم راستہ بتاؤ۔ میں کوشش کروں گا کہ گاڑی تمہارے گھر سے نزدیک ترین جگہ پر پارک کر سکوں۔“

”بس یہیں روک دیں۔“ اس نے ایک گلی کے نکڑ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہاں گھُپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور گلی میں بھی بارش کا پانی جمع ہو گیا تھا۔ وہ اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔

”بہت بہت شکریہ۔ اگر آپ نے مجھے لفٹ نہ دی ہوتی تو شاید وقت پر گھر نہ پہنچ پاتی۔“

ثمینہ کا گھر گلی کے شروع میں ہی تھا۔ گاڑی کی آواز سن کر کسی نے دروازہ کھولا اور مجھے وہاں ایک پندرہ سولہ سال کا لڑکا کھڑا ہوا نظر آیا۔ اس نے ثمینہ کو گاڑی سے اترتے دیکھا تو تیزی سے لپکتا ہوا ہماری طرف آیا اور بولا۔ ”باجی! جلدی کریں۔ ابو کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔“

ثمینہ بولی۔ ”تم جلدی سے ٹیکسی لے کر آؤ۔ انہیں اسپتال لے جانا ہو گا۔“

”ایک منٹ۔“ میں نے کھڑکی کے شیشے سے سر باہر نکالتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت ٹیکسی کا ملنا بہت مشکل ہے۔ میں تم لوگوں کو اسپتال پہنچا دیتا ہوں۔“

”رہنے دیں سر! آپ کو پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ ٹیکسی کا کیا ہے۔ مل ہی جائے گی۔“

”یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ جلدی سے انہیں لے کر آؤ۔“ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا تو وہ اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر گھر کی طرف چل دی۔

پانچ منٹ بعد ہی وہ اپنے باپ کو لے کر آ گئی۔ اس کی امی اور بھائی بھی ساتھ تھے۔ اس کے ابو کی طبیعت واقعی بہت خراب تھی۔ انہوں نے ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھا ہوا تھا اور بیٹے کا سہارا لے کر چل رہے تھے۔ میں نے جلدی سے اتر کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور ان لوگوں کو گاڑی میں بٹھا کر اسپتال کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس وقت میں نے فون کر کے تمہیں بھی بتانے کی کوشش کی تھی کہ مجھے گھر آنے میں دیر ہو سکتی ہے لیکن تم سے رابطہ نہ ہو سکا۔ ہم انہیں ایمرجنسی وارڈ میں لے گئے۔ ڈاکٹروں نے تفصیلی معائنہ

کرنے کے بعد بتایا کہ انہیں معمولی نوعیت کا دورہ پڑا تھا اور اب حالت خطرے سے باہر ہے۔ انہیں ایک گھنٹا آبزرویشن میں رکھا گیا۔ اس کے بعد گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ ڈاکٹر نے کچھ دوائیں لکھیں اور اگلے دن کنسلٹنٹ کو دکھانے کا مشورہ دیا۔ بس اسی بھاگ دوڑ میں اتنی دیر ہوگئی۔"

وہ اپنی بات ختم کر چکے تو میں نے کہا۔ "چلیں اچھا ہوا کہ آپ کی نیکی کسی کے کام آگئی۔"

"ہاں" وہ سنجیدگی سے بولے۔ "میں یہی سوچ رہا تھا کہ اگر دفتر سے باہر نکلتے ہوئے میری نظر ثمینہ پر نہ پڑتی تو وہ بے چاری نہ جانے کب تک بارش میں بھیگتی بس کا انتظار کرتی رہتی۔"

"چلیں جو ہوا ٹھیک ہی ہوا۔" میں چائے کے کپ اٹھاتے ہوئے بولی۔ "ہوسکتا ہے کہ اس نیکی کے بدلے ہمارا دامن بھی خوشیوں سے بھر جائے۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونکتے ہوئے بولے۔ "تم کس خوشی کی بات کر رہی ہو۔ اللہ کا دیا ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ آخر کس چیز کی کمی ہے؟"

"اس کمی کو پورا کرنا میرے اور آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ ہم تو بس دعا ہی کر سکتے ہیں۔"

وہ میرا اشارہ سمجھ گئے۔ انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور نرم لہجے میں بولے۔ "دل چھوٹا مت کرو۔ اس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ایک نہ ایک دن ہماری مراد ضرور پوری ہوگی۔"

یہ کہہ کر وہ سونے کے لیے چلے گئے۔ میں بھی کچن کا کام ختم کر کے بستر پر لیٹ گئی۔ احمر تو تھوڑی دیر بعد ہی سو گئے لیکن میری نیند غائب ہوگئی تھی۔ وہ جس والہانہ انداز میں ثمینہ کا تذکرہ کر رہے تھے۔ اس نے مجھے چوکنا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ شاید کوئی بھی بیوی شوہر کی زبان سے کسی دوسری عورت کا نام سننا پسند نہیں کرتی جبکہ میں اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتی تھی۔ ہر دم یہی دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں اولاد کی خاطر احمر دوسری شادی نہ کر لیں گو کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور انہوں نے اشارتاً بھی کبھی دوسری شادی کے بارے میں کچھ نہیں کہا لیکن وہ آخر کب تک اولاد سے محرومی کا دکھ برداشت کر سکتے تھے۔ ممکن ہے کہ وہ اولاد کی خاطر دوسری شادی کا فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ میں جانتی تھی کہ ان پر اس سلسلے میں بہت دباؤ تھا۔ ساس کا تو انتقال ہو چکا تھا لیکن میری نند بھاوجیں بھی کسی سے کم نہ تھیں۔ خاص طور پر میری بڑی نند سلمٰی تو آفت کی پرکالہ تھی۔ وہ بری طرح احمر کے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور مجھے بھی طعنے دینے سے باز نہ آتی۔ اس کی زبان پر ہمیشہ ایک ہی جملہ ہوتا کہ وارث کے بغیر یہ دولت اور جائداد کس کام کی۔ احمر اپنی بڑی بہن کی بہت عزت کرتے تھے اور انہیں ماں جیسا درجہ دیتے تھے۔ اسی وجہ سے میں بھی سلمٰی بیگم کو کوئی سخت جواب دینے سے کتراتی تھی۔

احمر سے میری شادی کو دس سال ہو چکے تھے لیکن ابھی تک میری گود ہری نہیں ہوئی تھی شروع کے دو تین سال تو ہم نے اس بارے میں نہیں سوچا لیکن لوگوں کی سرگوشیاں سن سن کر مجھے بھی فکر ہونے لگی۔ میں نے احمر سے اس کا ذکر کیا تو وہ حسب معمول بے پروائی سے بولے۔ "ابھی سے کیوں پریشان ہو رہی ہو۔ شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ بلاوجہ کی سوچوں کو ذہن میں جگہ نہ دو۔"

ان الفاظ سے مجھے تسلی نہیں ہوئی اور میں نے احمر کا پیچھا لے لیا۔ میری خواہش تھی کہ ہم دونوں اپنا طبی معائنہ کروائیں تاکہ اولاد نہ ہونے کی وجہ معلوم ہو سکے اور اگر کوئی خرابی ہے تو اس کا بروقت علاج ہو جائے لیکن وہ مسلسل ٹال مٹول کرتے رہے۔ ان میں ایک ہزار خوبیاں تھیں لیکن سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ اپنے کام کے علاوہ کسی اور بات کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ انہیں کام سے عشق تھا۔ میں نے انہیں کبھی چھٹی کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ شادی کے چوتھے روز ہی دفتر جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے جس پر مجھے کافی حیرت ہوئی۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ انہوں نے کم از کم ایک ماہ کی چھٹی لی ہوگی اور وہ مجھے اس دوران کہیں گھمانے پھرانے بھی لے کر جائیں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور میں اپنا دل مسوس کر رہ گئی۔

احمر سلیف میڈ انسان تھے۔ انہوں نے محرومیوں کی گود میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد کسی دفتر میں کلرک تھے۔ معمولی تنخواہ میں چھ بچوں اور بیوی کے ساتھ گزارہ مشکل تھا۔ اس لیے گھر میں ہر وقت تنگی رہتی۔ احمر بچپن سے ہی بہت حساس تھے۔ وہ اکثر اس بارے میں سوچتے، وہ جان گئے تھے کہ ان کے والد کنوئیں کے مینڈک بن کر رہ گئے ہیں اور اب کوئی دوسرا کام کرنے کے قابل نہیں رہے۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ اس محرومی کی دلدل سے نکلنے کی کوشش کریں گے تاکہ باپ کا بوجھ بانٹ سکیں۔

ایک روز انہوں نے اپنی ماں سے عجیب و غریب فرمائش کی کہ وہ انہیں تھوڑے سے چھولے بنا کر دیں۔ وہ اسکول میں ہاف ٹائم کے دوران چھولے بیچا کریں گے۔ اس فرمائش پر انہیں خوب ڈانٹ پڑی۔ والد نے کہا کہ انہیں ایسی فضول باتیں سوچنے کے بجائے اپنی پڑھائی پر توجہ دینی چاہیے، احمر بھی پیچھے ہٹنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح باپ کو قائل کر ہی لیا کہ چھولے بیچنے سے ان کی پڑھائی متاثر نہیں ہوگی کیونکہ وہ یہ کام ہاف ٹائم میں کریں گے جب دوسرے بچے کھیل کود میں مصروف ہوتے ہیں والد بھی ان کے مزاج کو سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے احمر کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

احمر شروع سے ہی ذہین اور عقل مند واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے کسی ناخوشگوار واقعہ سے بچنے کے لیے حفظ ماتقدم کے طور پر اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے ہاف ٹائم کے دوران چھولے بیچنے کی اجازت مانگ لی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب یہ سن کر بہت حیران ہوئے اور بولے کہ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس پر احمر نے بتایا کہ اس کے والد کی آمدنی بہت کم ہے۔ اس لیے وہ ان کا سہارا بننا چاہتے ہیں۔ اس طرح کم از کم وہ اپنے اخراجات تو پورے کر سکیں گے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے اجازت دے دی اور اس طرح یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کی والدہ کے ہاتھ کے بنائے ہوئے چھولے بہت پسند کیے گئے اور پہلے دن ہی منٹوں میں پورا تھال ختم ہو گیا۔ اب وہ باقاعدگی سے چھولے بنوا کر اسکول لے جانے لگے۔ پہلے مہینے حساب لگایا تو انہیں پانچ سو روپے کی بچت ہوئی تھی۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ خاصی بڑی رقم تھی۔ اب وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ اپنے ساتھ ساتھ بہن بھائیوں کی بھی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں پوری کر سکیں۔

میٹرک کے امتحان میں وہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے اور انہیں ایک بڑے اور معروف کالج میں داخلہ مل گیا۔ اب وہ چھولے نہیں بیچ سکتے تھے لیکن انہیں کمانے کا چسکا لگ گیا تھا۔ اسی لیے وہ کسی دوسرے کام کے بارے میں سوچنے لگے۔ شروع کے چند روز تو وہ باقاعدگی سے کالج گئے لیکن جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنا وقت ضائع کر رہے تھے۔ زیادہ تر لیکچرارز غائب رہتے تھے۔ وہ کسی کوچنگ سینٹر میں پڑھاتے یا انہوں نے گھر پر ٹیوشن سینٹر کھول رکھے تھے۔ احمر نے سوچا کہ وہ خود بھی چھوٹی جماعت کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیں۔ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی انہوں نے ایک چھوٹا سا بینر بنوا کر گھر کی بیرونی دیوار پر لگا دیا۔ اسی روز شام کو آٹھویں جماعت کے دو بچے آگئے۔ وہ پڑھائی میں بہت کمزور تھے اور ان کی ماں کی خواہش تھی کہ احمر ان بچوں کی کمی دور کر دے۔ احمر کے گھر والوں کو یہ آئیڈیا پسند نہیں آیا کیونکہ ان کے دو کمروں کے مکان میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ وہ انہیں ایک کمرا دے سکیں، احمر نے انہیں یقین دلایا کہ اگر بچوں کی تعداد بڑھ گئی تو وہ کسی دوسری جگہ کا بندوبست کر لیں گے۔

چند ہی روز میں مزید پانچ بچوں کا اضافہ ہو گیا اور مہینا ختم ہونے تک ان کی کلاس میں دس بچے ہو گئے تھے۔ اب احمر کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ اپنا ٹیوشن سینٹر کسی دوسری جگہ منتقل کر دیں چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں بھاگ دوڑ شروع کر دی اور چند ہی دنوں بعد انہیں گھر سے کچھ فاصلے پر ایک کمرا مل گیا۔ یہ دراصل دو سو گز کے پلاٹ پر بنا ہوا ایک پورشن تھا جس میں دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ اس کی بے ڈھنگی بناوٹ کی وجہ سے کوئی بھی کرایہ دار وہاں زیادہ عرصے تک نہیں رہتا تھا۔ احمر نے جب مالک مکان سے ایک کمرا مانگا تو وہ بخوشی تیار ہو گئے اور ساتھ ہی یہ پیشکش بھی کی اگر ضرورت ہو تو وہ دوسرا کمرا بھی کرایہ پر مل سکتا ہے لیکن فی الوقت احمر کی اتنی گنجائش نہیں تھی لہٰذا انہوں نے ایک ہی کمرے پر اکتفا کیا۔

صرف تین ماہ کے عرصہ میں اُن کے طالب علموں کی تعداد بیس ہو گئی۔ احمر نے ایک کمیٹی ڈال کر کچھ پیسوں کا بندوبست کیا اور اس سے کلاس روم کے لیے کرسیاں اور بلیک بورڈ وغیرہ خریدے گئے۔ جب انسان نیک نیتی سے کوئی کام شروع کرے تو قسمت بھی اس کا ساتھ دیتی ہے۔ ایک روز کوئی صاحب احمر سے ملنے آئے۔ وہ کسی مقامی کالج میں لیکچرار تھے۔ انہوں نے تجویز دی کہ اس سینٹر میں بڑی کلاسوں کی کوچنگ بھی شروع کی جائے اور اس مقصد کے لیے مختلف مضامین کے ماہر اساتذہ کی خدمات شراکت کی بنیاد پر حاصل کی جا سکتی ہیں۔ احمر کو یہ آئیڈیا پسند آیا اور انہوں نے چند روز بعد ہی سینٹر کی بیرونی دیوار پر بینر لگا دیا اور طلبا کی رجسٹریشن شروع ہو گئی۔ کئی لیکچررز نے ان سے رابطہ کیا اور ایک مہینے کے اندر بڑی کلاسوں کی کوچنگ شروع ہو گئی۔ احمر نے دوسرا کمرا بھی لے لیا لیکن طلبہ کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ اس لیے دو کمرے بھی کم پڑ گئے۔ احمر نے مالک مکان کی اجازت سے عارضی طور پر دو مزید کمرے تعمیر کروائے

اور چھت کی جگہ ان پر ٹین کی چادریں ڈال دیں۔ اس طرح جگہ کی کمی کا مسئلہ حل ہوگیا۔ احمر نے ایک کامیاب بزنس مین کی طرح اساتذہ سے معاملہ طے کیا یعنی وہ اپنے مضمون میں جتنے طلبہ کو پڑھائیں گے۔ انہیں ان کی فیس کا پچاس فیصد ملے گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اساتذہ بھی طلبہ کی تعداد بڑھانے کی کوشش میں لگ گئے تاکہ ان کی آمدنی میں اضافہ ہوسکے۔

احمر نے فرسٹ ایئر کا امتحان دیا تو اس وقت تک انہیں سینٹر سے پچیس تیس ہزار روپے کی بچت ہونے لگی تھی۔ یہ رقم ان کے ابا کی ماہانہ تنخواہ سے تین گنا زیادہ تھی گو کہ وہ شام چار بجے سے رات دس بجے تک سینٹر میں ہی رہتے تھے۔ اس کے باوجود فرسٹ ایئر کے امتحان میں امتیازی نمبروں سے پاس ہوگئے۔ کوچنگ سینٹر کی آمدنی سے گھر میں خوش حالی آگئی۔ اچھا کھانا، اچھے کپڑے، ایک ایک کرکے گھر میں ضرورت کی تمام چیزیں آتی چلی گئیں، لیکن احمر نے ایک جگہ رکنا نہیں سیکھا تھا وہ ہمیشہ ایک قدم آگے کے بارے میں سوچتے تھے۔

گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران سینٹر دو ماہ کے لیے بند ہوا تو انہوں نے انگریزی اور کمپیوٹر کی کلاسیں شروع کردیں۔ اس کے لیے انہوں نے شراکت کی بنیاد پر دو پروفیشنل ٹیچرز کی خدمات حاصل کیں۔ قسطوں پر چار عدد کمپیوٹرز اور آڈیو ویڈیو سسٹم خریدا، اور اللہ کا نام لے کر طلبہ کی رجسٹریشن شروع کردی۔ ایک ہی ہفتہ میں مطلوبہ تعداد پوری ہوگئی۔ اس طرح یہ سلسلہ چل نکلا۔ اب ان کی آمدنی دگنی ہوگئی تھی۔ دیکھنے والے حیران تھے کہ ایک سیکنڈ ایئر کا طالب علم محض اپنی ذہانت اور سوجھ بوجھ کے ذریعے پچاس ساٹھ ہزار روپے ماہوار کما رہا تھا۔ عزیز رشتے دار اور محلے والے ان کی مثالیں دیا کرتے اور احمر کے والد کو یہ سب ایک خواب لگتا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا نوعمر بیٹا اپنی غیر معمولی قابلیت اور ذہانت سے گھر کی حالت بدل دے گا۔

احمر نے انٹر پاس کرنے کے بعد بی اے میں داخلہ لے لیا اور آمدورفت کے لیے ایک موٹر سائیکل بھی خرید لی۔ اب انہیں باقاعدگی سے کالج جانا پڑتا تھا۔ اس کے باوجود وہ کوچنگ سینٹر کی نگرانی کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی اصغر کو بھی کچھ ذمے داریاں سونپ دیں تاکہ ان کی غیر موجودگی میں وہ سینٹر کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ سینٹر میں طلبہ کی تعداد بڑھتی جارہی تھی اور ان کے ساتھی ٹیچرز کا اصرار تھا کہ سینٹر کو کسی بڑی عمارت میں منتقل کیا جائے لیکن یہ سینٹر ان کی منزل نہیں بلکہ وقتی سہارا تھا۔ وہ ایم بی اے کرنے کے بعد کسی اچھی ملازمت کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے سینٹر میں توسیع کے خیال کو کوئی اہمیت نہیں دی اور زیادہ سے زیادہ وقت اپنی پڑھائی کو دینے لگے۔ اصغر بڑا ہوگیا تھا اور وہ سینٹر کے معاملات کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔

احمر نے ایم بی اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور انہیں فوراً ہی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ جو تنخواہ مقرر ہوئی وہ ان کی کوچنگ سینٹر کی آمدنی سے بہت کم تھی لیکن احمر اچھی تنخواہ کے انتظار میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی نظر میں ایک دن بھی بہت اہمیت رکھتا تھا۔ انہوں نے کوچنگ سینٹر کا انتظام مکمل طور پر اصغر کے حوالے کردیا اور خود نئی منزلوں کی تلاش میں لگ گئے۔

ان کی سیمابی فطرت کو قرار نہیں تھا۔ آگے بڑھنے کی لگن اور جستجو انہیں اگلا قدم اٹھانے پر اکساتی رہتی تھی۔ وہ بہتر تنخواہ اور اچھے عہدے کی خاطر سال دو سال بعد کمپنی تبدیل کرلیتے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پانچ سال کے عرصہ میں اسسٹنٹ منیجر سے ترقی کرتے کرتے جنرل منیجر کے عہدے تک جا پہنچے۔ اب ان کے پاس گاڑی، بنگلا اور زندگی کی تمام آسائشیں تھیں لیکن اس کے باوجود ان کے قدم زمین پر تھے۔ وہ ہمیشہ نظریں جھکا کر چلتے اور کسی سے اونچی آواز میں بات نہ کرتے۔ دونوں بہنوں کی شادیاں ہوچکی تھیں۔ اس کے بعد احمر کا نمبر تھا۔ وہ ہمیشہ ماں باپ کی مرضی کو اہمیت دیتے تھے۔ اس لیے جب ان کی والدہ نے ایک رشتہ کرانے والی عورت کی معرفت میرا انتخاب کیا تو انہوں نے سعادت مند بیٹے کی طرح ماں کے فیصلے کو تسلیم کرلیا۔ اس طرح میں ان کی دلہن بن کر اس گھر میں آگئی۔

شروع شروع میں احمر کی اصول پسند زندگی کے ساتھ نباہ کرنا بہت مشکل تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کی عادی ہوتی چلی گئی۔ احمر نے پہلی ہی رات اپنے بارے میں سب کچھ بتادیا تھا کہ کس طرح انہوں نے چھوٹے پیمانے سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور مسلسل جدوجہد کرکے اس مقام تک پہنچے۔ وہ اپنی کامیابی اور ترقی کا راز وقت کی پابندی کو قرار دیتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ وقت ایک دولت ہے اور اسے ضائع کرنے والا زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے۔

وقت کا پہیہ آگے بڑھتا رہا۔ ایک ایک کرکے احمر کے ماں باپ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ چھوٹے بھائیوں کی

بھی شادیاں ہوگئیں اور انہوں نے اپنے راستے الگ کرلیے۔ اب اتنے بڑے گھر میں صرف دو افراد رہ گئے۔ بعض اوقات تنہائی بری طرح ستاتی۔ شادی کے دس سال گزر جانے کے باوجود میں اولاد کی نعمت سے محروم تھی۔ احمر بظاہر تو نارمل نظر آتے لیکن وہ بھی اندر ہی اندر اس محرومی کو محسوس کرتے ہوں گے۔ البتہ انہوں نے زبان سے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا بلکہ ہمیشہ مجھے ہی تسلی دیتے رہتے تھے۔

☆☆☆

اگلے دن بھی احمر کی واپسی دیر سے ہوئی البتہ انہوں نے فون کرکے مجھے اس بارے میں بتادیا تھا۔ وہ جب گھر آئے اور میں نے تاخیر کی وجہ پوچھی تو بولے۔ ''ہاں، میں ثمینہ کی طرف چلا گیا تھا۔ اس کے باپ کا حال پوچھنے۔ وہ دفتر نہیں آئی تھی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ پانچ منٹ کے لیے رک کر اس کے باپ کی خیریت معلوم کرلوں۔''

احمر کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے ورنہ وہ کوئی اور بہانہ بھی بناسکتے تھے۔ اسی لیے میں نے بھی جرح کرنا مناسب نہ سمجھی کہ ان کے پانچ منٹ، دو گھنٹے میں کیسے بدل گئے البتہ ذہن میں یہ خیال ضرور آیا کہ ثمینہ کے باپ کی خیریت ٹیلی فون پر بھی معلوم کی جاسکتی تھی، اس کے گھر جانے کی ضرورت کیوں پیش آگئی جبکہ وہ اپنے کسی قریبی عزیز یا دوست کی عیادت کے لیے بھی نہیں جاتے تھے اور ٹیلی فون پر ہی اس کا حال پوچھ لیتے۔ ان کا کہنا تھا کہ جو کام ٹیلی فون کے ذریعے ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے پھر یہ انقلاب کیسے آگیا؟

یہی وہ لمحہ تھا جب میرے دل میں شک کے ناگ نے سر اٹھایا۔ اس کے باپ کی عیادت تو ایک بہانہ تھا۔ یقیناً ثمینہ کی کشش ہی انہیں اس کے گھر لے گئی ہوگی۔ دفتر میں وہ اہم پوزیشن پر فائز ہونے کی وجہ سے ثمینہ سے بے تکلف نہ ہوسکتے تھے۔ ثمینہ میں ایسی کیا خوبی ہے جو مجھ میں نہیں۔ میں ثمینہ کو نہیں جانتی تھی، اس لیے اس کی خوبیوں اور خامیوں کا مجھے علم نہیں تھا۔ البتہ اپنی خامی فوراً ہی نظر میں آگئی اور وہ یہ کہ میں دس سال گزر جانے کے باوجود انہیں اولاد کا تحفہ نہ دے سکی۔ اگر میں ماں بن جاؤں تو امجد کسی دوسری عورت کی جانب ملتفت ہونے کے بجائے ہمیشہ کے لیے میرے ہوجائیں گے۔

دوسرے دن ناشتے کی میز پر میں نے یہ ذکر چھیڑا لیکن احمر نے حسب عادت مجھے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن میں بضد ہوگئی کہ ہم دونوں کو اپنا ڈاکٹری معائنہ کروانا چاہیے۔ خلاف توقع وہ میری بات مان گئے اور وعدہ کرلیا کہ وہ پہلی فرصت میں مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔

اگلے دن وہ وقت پر گھر آئے تو میری جان میں جان آگئی پھر کئی روز تک وہ معمول کے مطابق گھر آتے رہے تو میرے دل کو قرار آگیا اور میں پوری طرح مطمئن ہوگئی۔

میرے بار بار کہنے پر انہوں نے ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے وقت نکال ہی لیا۔ وہ جس ڈاکٹر کے پاس مجھے لے کر گئے۔ وہ حال ہی میں امریکا سے آئی تھیں اور انہیں بے اولاد جوڑوں کے علاج میں خاص مہارت حاصل تھی۔ انہوں نے ہم سے کچھ سوالات کیے اور دونوں کا لیبارٹری ٹیسٹ کروایا۔ ساتھ ہی تسلی بھی دی کہ میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ مرد و عورت میں سے کسی میں بھی کوئی خرابی ہو تو اس کا علاج ممکن ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ لیبارٹری رپورٹ آنے کے بعد ہی وہ اس سلسلے میں مزید کوئی بات کرسکیں گی۔

چوتھے روز رپورٹ مل گئی اور احمر نے بتایا کہ رپورٹ بالکل ٹھیک آئی ہے، ہم دونوں میں کوئی خرابی نہیں اور لیڈی ڈاکٹر کا یہ کہنا ہے کہ جب کوئی خرابی ہی نہیں تو پھر وہ کیا علاج کریں۔ اب یہ مسئلہ دوا سے نہیں بلکہ دعا سے حل ہوگا۔ یہ سن کر میری رہی سہی امید بھی دم توڑ گئی اور میں نے دل کو سمجھا لیا کہ ہمیں تقدیر کے فیصلے کو قبول کرلینا چاہیے۔ جب اوپر والے کی مرضی ہوگی تو ہمیں اولاد کی نعمت سے نواز دے گا۔

اس کے بعد میں نے خدا سے لو لگالی اور مصلے بچھا کر بیٹھ گئی۔ میں نہ صرف پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے ادا کررہی تھی بلکہ اکثر اوقات تہجد بھی پڑھ لیا کرتی تھی۔ اب میری توجہ روحانی علاج پر مرکوز ہوگئی۔ جس کسی نے جو وظیفہ بتادیا وہی پڑھنے بیٹھ جاتی۔ اسی طرح کئی سال بیت گئے لیکن میری گود خالی ہی رہی۔

احمر نے ملٹی نیشنل کمپنی کی ملازمت چھوڑ کر اپنی فرم قائم کرلی تھی۔ انہیں ایک معروف غیر ملکی برانڈ کی ایجنسی مل گئی جو ویلڈنگ کا سامان اور دیگر صنعتی مشینری و آلات تیار کرتے تھے۔ احمر نے اپنے پرانے تعلقات استعمال کرتے ہوئے کئی بڑے صنعتی اداروں کو یہ سامان سپلائی کرنا شروع کردیا اور سال بھر کے اندر ان کی پوزیشن اتنی مستحکم ہوگئی کہ انہیں دوڑ دھوپ کیے بغیر ہی آرڈر ملنے لگے۔ وہ اس کمپنی کے پاکستان میں واحد ایجنٹ تھے۔ اس لیے بھی ادارے

ان کی معرفت مال منگوانے پر مجبور تھے۔ احمر کو کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا۔ وہ صرف مال کی بروقت سپلائی کا بندوبست کرتے اور اپنا کمیشن کھرا کر لیتے۔ البتہ مارکیٹنگ کا شعبہ انہوں نے اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں وہ ملک کے مختلف شہروں میں جا کر صنعتی اداروں کی ضروریات کا جائزہ لیتے اور اس کے حساب سے مستقبل میں سامان کی سپلائی کا شیڈول طے کرتے۔ انہیں اکثر و بیشتر بیرون ملک بھی جانا ہوتا۔ اس کمپنی کا ہیڈ کوارٹر جرمنی میں تھا۔ جہاں آئے دن میٹنگز اور سیمینار وغیرہ منعقد ہوتے رہتے تھے اور ان میں احمر کی شرکت لازمی تھی۔ اس طرح مہینے میں وہ بیس بائیس دن گھر سے باہر رہنے لگے تھے۔ ہم دونوں کو بات کرنے کا بہت کم موقع ملتا۔ کئی مرتبہ تو ایسا ہوا کہ وہ شام کو کسی سفر سے واپس آئے۔ فریش ہو کر کھانا کھایا، چائے پی۔ مجھ سے دو چار باتیں کیں اور سو گئے۔ دوسری صبح دیکھا تو ناشتے کی میز پر پھر کہیں جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ ویسے بھی میں اس صورتِ حال کی عادی ہو چکی تھی۔ ان کے ہونے نہ ہونے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ گھر میں خانساماں، مالی، ڈرائیور، چوکیدار، ماسی اور میڈ موجود تھے۔ میں انہی لوگوں کو اپنی فیملی سمجھتی اور سارا دن انہی میں گھری رہتی۔

ایک اتوار کی صبح احمر کی بڑی بہن سلمٰی بغیر اطلاع دیے تشریف لے آئیں۔ ان کی آمد عموماً کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہوا کرتی تھی۔ وہ احمر سے لمبی رقم مانگنے آتیں یا انہیں دوسری شادی کی ترغیب دینے۔ رقم کی تو مجھے کوئی پروا نہیں تھی۔ احمر کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ تھا۔ ان کے لیے پانچ دس ہزار کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ویسے اب وہ پچاس ہزار یا لاکھ سے کم کا مطالبہ نہیں کرتی تھیں لیکن جب وہ احمر کی دوسری شادی کا ذکر چھیڑتیں تو میرے پتنگے لگ جاتے۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد انہوں نے گھر کے در و دیوار پر نظر دوڑائی اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولیں۔ ''اس گھر کا سونا پن دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ تم کس لیے اتنی محنت اور دوڑ دھوپ کر رہے ہو۔ وارث کے بغیر یہ دولت و جائداد کس کام کی؟''

''وارث بھی آجائے گا۔ بس آپ دعا کرتی رہیں۔'' احمر حسبِ معمول ٹالنے والے انداز میں بولے۔

''مجھے تو ایسے حالات نظر نہیں آتے۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولیں اور میں سمجھ گئی کہ وہ اگلا جملہ کیا بولیں گی جسے سننے کی مجھ میں برداشت نہیں تھی لہٰذا چائے کے برتن سمیٹ کر وہاں سے اٹھ گئی۔ ابھی میں دروازے تک بھی نہ پہنچی تھی کہ میرے کانوں میں سلمٰی کی آواز آئی۔ ''میری بات مان لو، وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ آخر کب تک انتظار کرو گے۔''

''اگر آپ کا اشارہ دوسری شادی کی طرف ہے تو میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔'' احمر ٹھوس لہجے میں بولے۔ ''اگر ہمارے یہاں اولاد نہیں ہو رہی تو اس میں سعدیہ کا کوئی قصور نہیں۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق ہم دونوں اولاد پیدا کرنے کے قابل ہیں۔ بالفرضِ محال میں آپ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے دوسری شادی کر لوں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آنے والی میری اس محرومی کو دور کر سکے گی۔''

''پھر تمہاری قسمت۔''

''اگر میری قسمت میں یہی لکھا ہے تو میں دوسری شادی کا کھڑاگ کیوں پالوں۔ ویسے بھی مجھے دو کشتیوں میں سواری کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔''

''تمہارے ساتھ بات کرنا تو دیوار سے سر ٹکرانے کے برابر ہے۔'' وہ غصے میں بولیں اور پیر پٹختے ہوئے چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد میں نے مورچہ سنبھال لیا۔ سلمٰی کی باتوں نے مجھے پریشان کر دیا تھا ویسے وہ کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہی تھیں۔ اولاد کی خاطر مرد دوسری شادی کرتے ہی ہیں اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی، اگر پتھر پر بھی مسلسل پانی گرتا رہے تو اس میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ احمر تو پھر گوشت پوست کے انسان تھے اگر کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آگئے تو میں کہیں کی نہ رہوں گی چنانچہ میں نے جارحانہ انداز اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور بولی۔ ''آپ شوق سے دوسری شادی کر لیں۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن اس سے پہلے آپ کو میری بات ماننا ہوگی۔''

''وہ کیا؟''

''آپ مجھے طلاق دے کر ہی دوسری شادی کر سکتے ہیں کیونکہ میں اپنی محبت کا بٹوارہ برداشت نہیں کر سکتی۔''

''اگر تم نے ہماری باتیں سن لی ہیں تو میرا جواب بھی سن لیا ہوگا۔ پھر تم نے ایسی فضول شرط عائد کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟''

''اس لیے کہ آپ مرد ہیں۔ اولاد سے محرومی کا دکھ زیادہ عرصہ برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے خوشی سے دوسری شادی کی اجازت دے رہی ہوں۔ آپ میری شرط مان کر یہ تجربہ کر سکتے ہیں۔''

''میں تمہیں چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ ''اگر میری قسمت میں بے اولاد رہنا لکھا ہے تو میں اسے بھی تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لوں گا۔''

اس لمحے مجھے احمر پر بڑا ترس آیا اور میں اپنے آپ کو قصوروار سمجھنے لگی۔ وہ میری خاطر اتنی بڑی قربانی دے رہے تھے اور میں اس قدر خودغرض تھی کہ ان کی خوشیوں کے راستے میں دیوار بن گئی۔ کئی بار جی میں آیا کہ کوئی شرط عائد کیے بغیر انہیں دوسری شادی کی اجازت دے دوں لیکن کسی دوسری عورت کا تصور ہی میرے لیے سوہانِ روح تھا۔ اس لیے ایک بار پھر پورے خشوع و خضوع کے ساتھ رب کے حضور اپنی جھولی بھرنے کی دعائیں مانگنے لگی۔

وقت یونہی گزرتا رہا اور میں محرومی کا دکھ دل میں لیے زندگی کے دن گزارتی رہی۔ البتہ میں نے احمر میں ایک بہت بڑی تبدیلی محسوس کی اور وہ یہ کہ اب میرا بہت خیال رکھنے لگے تھے۔ ویسے تو انہوں نے ہمیشہ ہی میری ضرورتوں اور خواہشوں کا خیال رکھا لیکن ان دنوں یوں لگ رہا تھا جیسے ہماری نئی نئی شادی ہوئی ہو۔ پہلے وہ بہت کم بات کیا کرتے تھے لیکن اب ان کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی تھی۔ وہ میرے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے، ہفتے میں ایک بار باہر ڈنر کے لیے لے جانے لگے جبکہ ماضی میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ دفتر سے آنے کے بعد دوبارہ باہر نہیں جاتے تھے۔ میں اس اچانک کایا پلٹ پر حیران تھی لیکن ایک دن انہوں نے خود ہی یہ بھید کھول دیا۔

ایک دن وہ دفتر سے واپس آئے تو کچھ پریشان لگ رہے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ میرے ساتھ ہی ٹی وی دیکھنے بیٹھ گئے۔ ٹی وی پر میرا پسندیدہ ڈراما چل رہا تھا جو میں بڑی باقاعدگی سے دیکھا کرتی تھی۔ اس کے ایک منظر میں ہیروئن اپنے شوہر کی موت پر بین کر رہی تھی۔ مجھ سے یہ منظر نہ دیکھا گیا اور میں نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آف کر دیا۔ احمر نے چونک کر دیکھا اور بولے۔ ''کیا ہوا بھئی؟ ٹی وی کیوں بند کر دیا۔ اتنا اچھا ڈراما آرہا تھا۔''

''مجھ سے ایسے دردناک مناظر نہیں دیکھے جاتے۔'' میں منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''خدا جانے یہ لوگ ایسے ڈرامے کیوں بناتے ہیں جو دیکھنے والوں کو تفریح دینے کے بجائے افسردہ کر دیں۔''

''تم خوامخواہ جذباتی ہو رہی ہو۔ وہ عورت سچ مچ تو بیوہ نہیں ہوگئی۔ ہمیں عام زندگی میں بھی ان حقیقتوں کو قبول کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ فرض کرو کل کو تمہارے ساتھ ایسا ہو جائے تو؟''

''خدا نہ کرے۔ کیسی بدفالیں منہ سے نکال رہے ہیں۔'' میں نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ میرے جانے کے بعد تم کتنی تنہا رہ جاؤ گی۔ کاش......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے لیکن میں ان کے لہجے میں چھپا ہوا کرب محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی لہٰذا میں نے ان کا دھیان بٹانے کے لیے کہا۔ ''ہوسکتا ہے، پہلے میں چلی جاؤں پھر آپ کیا کریں گے؟''

''دوسری شادی کر لوں گا۔'' انہوں نے ازراہِ مذاق کہا پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔ ''کیوں نہ ہم کوئی بچہ گود لے لیں۔''

''رہنے دیں۔ آج کل سگی اولاد ساتھ نہیں دیتی، وہ تو پھر غیر ہوگا۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔ میں نے تو یہ سوچ کر کہا تھا کہ ہم دونوں عمر کے اس حصے میں داخل ہو چکے ہیں جہاں کسی سہارے کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔''

''سب سے بڑا سہارا تو اوپر والے کی ذات ہے۔ وہی ہماری تنہائی دور کرنے کا کوئی بندوبست کرے گا۔''

کچھ دیر بعد وہ سونے کے لیے چلے گئے اور میں لاؤنج میں بیٹھی ان کی باتوں پر غور کرتی رہی اس سے پہلے کبھی انہوں نے ایسی گفتگو نہیں کی تھی۔ وہ کچھ پریشان اور مضمحل دکھائی دے رہے تھے کہیں ان کی طبیعت تو خراب نہیں ہوگئی لیکن ایسی بات ہوتی تو وہ مجھے ضرور بتاتے۔

دوسرے دن ان کے دفتر جانے کے بعد میں بستر کی چادر ٹھیک کر رہی تھی۔ میری عادت تھی کہ ہر دوسرے تیسرے روز سائڈ ٹیبل کی درازیں چیک کرتی اور ان میں سے فالتو چیزیں نکال کر ڈسٹ بن میں پھینک دیتی۔ جب میں نے احمر کی سائڈ والی دراز کھولی تو مجھے ایک شاپر میں کچھ دوائیں رکھی نظر آئیں۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر کا نسخہ بھی تھا۔ میں نے اس پر ڈاکٹر کا نام پڑھا۔ کارڈیالوجسٹ احمد صمدانی۔ یاالٰہی خیر، میں اپنا دل پکڑ کر بیٹھ گئی۔ احمر کو ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ وہ کیا روگ لگا بیٹھے ہیں۔

میں نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا کہ اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ان کا

زیادہ وقت میٹنگز میں گزرتا تھا اور وہ اس دوران کوئی کال اٹینڈ نہیں کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے مجھے سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ اگر کوئی ایمرجنسی نہ ہو تو انہیں فون کر کے ڈسٹرب نہ کروں۔

میرے لیے شام تک وقت گزارنا مشکل ہوگیا۔ بار بار گھڑی پر نظر جاتی۔ خدا خدا کر کے چھ بجے اور احمر کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو میں لپک کر دروازے کی جانب بھاگی۔ آج بھی وہ گزشتہ روز کی طرح تھکے تھکے دکھائی دے رہے تھے۔ اس روز ایک خاص بات یہ ہوئی کہ کھانا کھانے اور چائے پینے کے بعد وہ میرے ساتھ لاؤنج میں نہیں بیٹھے بلکہ اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے کمرے میں آگئی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے چھت کو دیکھ رہے تھے۔ میں کرسی گھسیٹ کر ان کے پاس بیٹھ گئی اور بولی۔

”کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بس تھوڑی سی تھکن محسوس ہو رہی ہے۔“

”پھر یہ دوائیں کیسی ہیں؟“ میں نے دراز سے شاپر نکال کر ہاتھ میں لہرایا۔

”کوئی خاص بات نہیں۔ میرا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے دوائیں لکھ دی ہیں اور احتیاط کرنے کا مشورہ دیا ہے۔“

”آپ نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی؟“ میں نے شکوہ کیا۔

”بتا کر کیا کرتا۔ تم بلاوجہ ہی پریشان ہو جاتیں۔“

”یہ معمولی بات نہیں ہے احمر۔ بلڈ پریشر کو خاموش قاتل بھی کہا جاتا ہے۔ آپ کو علاج کے ساتھ ساتھ احتیاط کی بھی ضرورت ہے لیکن آپ کا جو لائف اسٹائل ہے۔ اس میں احتیاط ہو ہی نہیں سکتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اتنی محنت کیوں کرتے ہیں۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ آپ ساری زندگی گھر بیٹھ کر آرام سے گزارہ کر سکتے ہیں۔“

”یہ ممکن نہیں۔ میرا کام اتنا پھیل چکا ہے کہ اسے سمیٹتے سمیٹتے بھی سال ڈیڑھ سال تو لگ ہی جائے گا۔“

”کچھ بھی ہو۔ میں آپ کو اتنا زیادہ کام نہیں کرنے دوں گی۔ کچھ اور نہیں کر سکتے تو بیرونی دوروں میں ہی کچھ کمی کر دیں۔ مسلسل سفر میں رہنے سے بھی تھکن بڑھتی ہے۔“

”تمہارے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ فی الحال مجھے آرام کرنے دو۔“

احمر کی روش میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اسی طرح کام میں جتے رہے۔ مشکل سے چار پانچ دن گھر میں رکتے پھر انہیں کسی دوسرے شہر جانا پڑ جاتا اور واپسی دو تین روز بعد ہوتی۔ میں نے ان سے کئی بار کہا کہ وہ اس کام کے لیے کسی ہوشیار شخص کو ملازم رکھ لیں لیکن وہ کسی پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ میں نے ان کے معاملے میں بولنا ہی چھوڑ دیا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے۔ ان کی صحت بھی بگڑتی چلی گئی۔ ان کا بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا۔ بات کرنے یا سیڑھیاں چڑھنے سے ان کی سانس پھولنے لگتی۔ ان میں پہلے جیسی چستی اور مستعدی نہیں رہی تھی اور وہ شکل سے ہی بیمار لگنے لگے تھے۔ میں نے انہیں کئی بار کسی اسپیشلسٹ کے پاس جانے کے لیے کہا لیکن وہ ٹال جاتے پھر ایک روز وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ انہوں نے دفتر سے آنے کے بعد کھانا کھایا اور چائے پینے کے بعد ٹی وی دیکھنے بیٹھ گئے۔ پانچ منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ انہوں نے اچانک ہی بیٹھے بیٹھے اپنا سینہ پکڑ لیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتی۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور ان کا پورا چہرہ پسینے میں بھیگ گیا۔ میں دوڑتی ہوئی بیڈ روم میں آئی اور سائڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے میڈیکل باکس میں سے ایک گولی نکالی اور ان کی زبان کے نیچے رکھ دی۔ اس کے بعد میں نے ڈاکٹر صمدانی کو فون کر کے ان کی کیفیت بتائی تو وہ بولے۔ ”میں ایمبولینس بھیج رہا ہوں۔ آپ انہیں لے کر فوراً کلینک پہنچیں۔“

چند منٹوں بعد ہی ایمبولینس بھی آگئی۔ اس وقت تک احمر کی طبیعت کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ میں نے ملازموں کی مدد سے انہیں ایمبولینس میں سوار کرایا اور وقت ضائع کیے بغیر ڈاکٹر صمدانی کے کلینک کی جانب روانہ ہوگئی۔ ڈاکٹر نے معائنے کے بعد تصدیق کر دی کہ احمر کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ انہوں نے کچھ دوائیں تجویز کرنے کے ساتھ ساتھ ایک مہینا مکمل بیڈ ریسٹ کا بھی مشورہ دیا۔ یہ سنتے ہی احمر کا منہ لٹک گیا اور وہ بولے۔ ”ڈاکٹر صاحب اس طرح تو میرے کام کا بہت حرج ہوگا۔“

”انسان کی زندگی اور صحت سے بڑھ کر کچھ نہیں۔“ ڈاکٹر صاحب نے پیشہ وارانہ انداز میں کہا۔ ”میں آپ کو اس حالت میں دفتر جانے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ آپ چاہیں تو ضروری امور گھر پر ہی نمٹا سکتے ہیں۔“

گھر آنے کے بعد بھی احمر کی بے چینی میں کوئی کمی نہیں

آئی۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے نہ جانے کس سے بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ البتہ ان کی گفتگو سے میں نے یہ اندازہ ضرور لگا لیا کہ دفتر کے معاملات ہی ڈسکس ہو رہے تھے۔

دوسرے دن بھی یہی ہوا۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے فون پر کسی کو ہدایات دیتے رہے۔ شام ہوئی تو ملازمہ نے کسی عورت کے آنے کی اطلاع دی۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کی ہدایت کی اور خود اپنا حلیہ درست کر کے اس سے ملنے چلی گئی۔ وہ ایک انتہائی پرکشش عورت تھی جس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان ہوگی۔ اس نے جدید طرز کا لباس زیب تن کر رکھا تھا اور اس کے سامنے والی میز پر کچھ فائلیں رکھی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تعظیماً کھڑی ہوگئی اور اپنا ہاتھ میری طرف مصافحے کے لیے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”میرا نام ثمینہ ہے اور میں احمر صاحب کے دفتر میں کام کرتی ہوں۔“

”ثمینہ“ میں چونکتے ہوئے بولی اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن میں پندرہ سال پرانا منظر گھوم گیا جب احمر نے اپنی گاڑی میں کسی ثمینہ نامی لڑکی کو لفٹ دی تھی گویا یہ عورت ابھی تک ان کی جان سے چمٹی ہوئی تھی جبکہ احمر کئی سال پہلے وہ کمپنی چھوڑ چکے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ثمینہ کی ذات، شخصیت اور صلاحیت سے اتنے متاثر تھے کہ انہوں نے اسے اپنے دفتر میں ملازمت دے دی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ فائلیں لے کر آئی تھی جس سے دفتر میں اس کی حیثیت کا تعین کیا جا سکتا تھا ورنہ کوئی عام ملازم اس طرح اپنے مالک کے گھر آنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میں نے اس سے زیادہ سوچنا ضروری نہ سمجھا اور احمر کو موبائل فون کے ذریعے ثمینہ کے آنے کی اطلاع دی پھر میں نے ثمینہ کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور اسے اپنے ساتھ لے کر بیڈ روم کی طرف چل دی۔

اسے دیکھتے ہی احمر کے چہرے پر رونق آگئی اور وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ”سعدیہ! تم نے پہچانا، یہ وہی ثمینہ ہیں جنہیں میں نے کئی برس پہلے اپنی گاڑی میں لفٹ دی تھی، انتہائی محنتی اور ذمے دار خاتون ہیں۔ اس لیے میں نے انہیں اپنے پاس بلا لیا اور ان کے آنے سے مجھے بہت سہولت ہوگئی ہے۔ اس وقت بھی یہ دفتر کے کسی کام سے ہی آئی ہیں۔“

”جی ہاں سر! یہ کچھ کاغذات اور چیک ہیں جن پر آپ کے دستخط درکار ہیں۔“

میر انیس

1801-1874ء

اردو کے مرثیہ گو شاعر، ببر علی نام، انیس تخلص تھا۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ میر مستحسن خلیق کے بیٹے، میر حسن دہلوی (صاحب مثنوی سحرالبیان) کے پوتے تھے۔ جدِ امجد میر امامی ایران سے دہلی آئے۔ لیکن زمانے کی نامساعدت نے میر حسن کو ترکِ وطن پر مجبور کر دیا۔ پہلے فیض آباد گئے پھر لکھنؤ آ کر بود و باش اختیار کی۔ میر انیس کی تعلیم و تربیت لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ مولوی حیدر علی اور مفتی میر عباس سے عربی فارسی پڑھی۔ فنونِ سپہ گری کی تعلیم بھی استادوں سے حاصل کی۔ فن شہسواری سے بخوبی واقف تھے۔ شعر میں اپنے والد سے اصلاح لیتے تھے۔ پہلے حزیں تخلص تھا۔ شیخ ناسخ کے کہنے پر انیس اختیار کیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں والد کے ارشاد پر مرثیہ گوئی کی طرف توجہ دی اور اس میں چار چاند لگا دیے۔ اپنے بیٹے میر نفیس کی ولادت کے بعد لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ اور جب تک لکھنؤ آباد رہا کہیں باہر نہیں گئے۔ اودھ کی تباہی کے بعد پہلے 1859ء میں مرثیہ پڑھنے عظیم آباد گئے اور پھر 1871ء میں نواب تہور جنگ کے اصرار پر حیدر آباد دکن کا سفر کیا۔ میر انیس نے آلِ رسولؐ کے مداح کی حیثیت سے اردو شاعری میں وہ ناموری حاصل کی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ انہوں نے اردو زبان میں منظر نگاری کو اوجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ فارسی تراکیب کی دل نشینی، زبان کی صفائی، بیان کی سادگی اور خیالات کی نفاست و نزاکت ان کی شاعری کے نمایاں اوصاف ہیں۔ وہ اپنے کلام میں تازہ تشبیہات و استعارات بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ اردو میں رزمیہ شاعری کی کمی پوری کی۔ سلام اور رباعیوں کا شمار نہیں۔ مرثیوں کی پانچ جلدیں طبع ہو چکی ہیں۔ 1291ھ مطابق 1874ء لکھنؤ میں انتقال ہوا اور اپنے سکونتی مکان واقع محلہ سبزی منڈی میں دفن ہوئے۔

مرسلہ: محشر عابدی، کراچی

''تم بیٹھو ثمینہ۔'' میں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے لیے چائے بھجواتی ہوں۔''

یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر آگئی۔ ثمینہ تقریباً دو گھنٹے احمر کے پاس بیٹھی رہی۔ جاتے وقت اس نے مجھ سے کہا۔ ''میڈم! احمر صاحب دفتر آنے کے لیے بے چین ہو رہے ہیں۔ آپ انہیں سمجھائیں۔ جب تک ڈاکٹر نہ کہے، انہیں دفتر آنے کی ضرورت نہیں۔ وہاں کے معاملات میں دیکھ لوں گی۔''

''تمہارے مشورے کا شکریہ۔'' میں بے رخی سے بولی۔ ''کوشش کروں گی کہ انہیں اس ضد سے باز رکھ سکوں۔''

ثمینہ کے جانے کے بعد میں نے احمر سے کہا۔ ''کمال ہے، یہ عورت اتنے عرصہ سے آپ کے دفتر میں کام کر رہی ہے اور آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں۔''

''تم جانتی ہو کہ میں دفتر کی باتیں گھر میں ڈسکس نہیں کیا کرتا۔ اس لیے تمہیں بتانا ضروری نہیں سمجھا۔''

اس کے بعد میں کچھ نہیں بولی۔ ان کی طبیعت ویسے ہی خراب تھی۔ میں بحث کر کے انہیں پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے بعد یہ روز کا معمول بن گیا۔ ثمینہ بلاناغہ شام کو دفتر کا وقت ختم ہونے کے بعد آتی۔ ضروری کاغذات اور چیک پر احمر سے دستخط کرواتی اور گھنٹا دو گھنٹا باتیں کرنے کے بعد چلی جاتی۔ دن میں بھی احمر کئی بار اس سے فون پر باتیں کرتے یا کبھی اس کا فون آجاتا۔ نہ جانے کبھی کبھی مجھے یہ کیوں محسوس ہونے لگتا کہ ثمینہ وہ نہیں جو نظر آرہی ہے بلکہ اس کی اصلیت کچھ اور ہے لیکن میں اسے ایک واہمہ سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیتی۔

ایک مہینے بعد احمر کی طبیعت سنبھل گئی اور وہ دفتر جانے لگے۔ البتہ ان کا علاج اور پرہیز جاری تھا۔ ایک ہفتہ بعد انہوں نے ناشتے کی میز پر اطلاع دی کہ وہ شام کی فلائٹ سے لاہور جا رہے ہیں اور ان کی واپسی تین روز بعد ہوگی۔ یہ سنتے ہی میرا پارہ چڑھ گیا اور میں لڑنے کے انداز میں بولی۔ ''کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی آپ پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے۔ اگر یہ ٹور اتنا ہی ضروری ہے تو اپنی جگہ ثمینہ کو بھیج دیں۔''

''یہ اس کے بس کا روگ نہیں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولے۔ ''تم جانتی ہو کہ اس قسم کے دوروں میں کئی کئی میٹنگز ہوتی ہیں۔ مختلف نوعیت کے سوالات کیے جاتے ہیں جن کے تسلی بخش جوابات میں ہی دے سکتا ہوں۔''

انہوں نے میری ایک نہ سنی اور پروگرام کے مطابق لاہور چلے گئے۔ میں صبر کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ جب اس شخص کو خود اپنی صحت کی فکر نہیں تھی تو مجھے ہلکان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ ہر چوتھے پانچویں روز وہ کسی دورے پر نکل جاتے۔ کبھی لاہور، کبھی اسلام آباد تو کبھی فیصل آباد۔ میں نے تو اس معاملے میں بولنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ البتہ ان کی صحت کی طرف سے مجھے تشویش ہونے لگی تھی، وہ ایک بار پھر بیمار اور تھکے تھکے سے نظر آنے لگے تھے۔ میرے کانوں میں ڈاکٹر احمد صمدانی کے الفاظ گونجنے لگے۔ ''آپ کے شوہر دل کے مریض بن چکے ہیں۔ انہیں اپنا طرزِ زندگی بدلنا ہوگا۔ باقاعدہ علاج، پرہیز اور اس کے ساتھ ہی زیادہ سے زیادہ آرام۔ بہتر ہوگا کہ وہ اپنی ذمے داریاں اور دوسرے لوگوں کو منتقل کر دیں اور خود خاموش باس کا کردار ادا کریں۔ یاد رکھیے، دل کا دوسرا دورہ جان لیوا ہو سکتا ہے۔''

میں ان کے علاج اور پرہیز پر پوری توجہ دے رہی تھی لیکن ان کی مصروفیات کو کنٹرول کرنا میرے بس میں نہیں تھا پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ حسب معمول لاہور جانے کے لیے گھر سے روانہ ہوئے اور دوسرے دن اسپتال سے فون آگیا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور انہیں ایڈمٹ کر لیا گیا ہے۔

میرا سر بری طرح چکرانے لگا۔ وہ تو لاہور گئے تھے پھر ڈاکٹر صمدانی کے کلینک کیسے پہنچ گئے۔ بہرحال یہ ان باتوں کے سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے گاڑی نکالی اور تیزی سے دوڑاتی ہوئی کلینک کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ سی سی یو میں تھے اور اس کے دروازے کے باہر کرسیوں پر ثمینہ کے ساتھ ساتھ دفتر کے کچھ دوسرے لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ثمینہ سے کچھ پوچھنے ہی والی تھی کہ ڈاکٹر صمدانی کمرے سے باہر آتے دکھائی دیے۔ مجھے دیکھ کر بولے۔ ''آپ ان سے مل سکتی ہیں لیکن زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی ان کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ آیندہ چوبیس گھنٹے بہت اہم ہیں۔''

وہ حسب عادت بستر پر لیٹے چھت پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ انہوں نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولے۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں نے وصیت لکھ دی ہے۔ میرے بعد سب کچھ تمہارا ہی ہوگا۔ البتہ مرنے سے پہلے ایک بات

کہنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ میری آخری خواہش ضرور پوری کرو گی۔''

''ایسی باتیں مت کریں۔'' میں روتے ہوئے بولی۔ ''آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔''

وہ میری بات کو نظرانداز کرتے ہوئے بولے۔ ''ثمینہ بہت تنہا ہے۔ وعدہ کرو کہ اس کا پورا خیال رکھو گی۔''

میں سمجھی کہ وہ ثمینہ کی ملازمت کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔ اس لیے ان کی دلجوئی کی خاطر بولی۔ ''آپ کی خواہش میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔''

اسی لمحے نرس کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ ''میم، انہیں آرام کرنے دیں۔''

میں کمرے سے باہر آگئی۔ ثمینہ غمگین چہرہ بنائے بیٹھی تھی۔ اس وقت مجھے احمر کی فکر لگی ہوئی تھی۔ اس لیے یہ بھی نہ سوچ سکی کہ احمر نے ثمینہ کا خیال رکھنے والی بات کیوں کی تھی۔ میں نے اپنے پرس سے تسبیح نکالی اور کرسی پر بیٹھ کر وظیفہ پڑھنے لگی۔ آدھ گھنٹے بعد وہاں کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی۔ پہلے دو ڈاکٹر پھر ایک نرس کمرے سے باہر آئی۔ ان کا رخ ڈاکٹر صمدانی کے کمرے کی طرف تھا۔ پھر صمدانی تیزی سے سی سی یو کی طرف لپکے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یا اللہ خیر! اب خیریت ہو پھر دس منٹ بعد کمرے کا دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر صمدانی سر جھکائے کمرے سے نکلے اور میرے پاس آکر آہستہ سے بولے۔ ''مجھے افسوس ہے مسز احمر۔''

مجھے یوں لگا جیسے قریب ہی کوئی دھماکا ہوا ہو۔ میرے کانوں میں سائیں سائیں کرنے لگے۔ میں چکرا کر گری اور وہیں بے ہوش ہو گئی۔ ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو گھر میں پایا۔ میرے ارد گرد عورتوں کا ہجوم تھا۔ گھر کے برآمدے اور لان میں کافی مرد موجود تھے۔ ان میں احمر کے دونوں بھائی اور دفتر کا عملہ شامل تھا۔ میں بہت سے لوگوں کو نہیں جانتی تھی اور نہ مجھے اس وقت اتنا ہوش تھا کہ میں انہیں پہچاننے کی کوشش کرتی۔ پھر میرے کانوں میں سلمیٰ کی کرخت آواز ٹکرائی۔ وہ بین کرنے کے انداز میں کہہ رہی تھی۔ ''ہائے ہائے۔ میرا بھائی اولاد کی حسرت لیے دنیا سے چلا گیا۔''

میرا جی چاہا کہ اس منحوس عورت کا منہ نوچ لوں لیکن احمر کے انتقال کے بعد میری پوزیشن بہت نازک ہو چکی تھی۔ اگر میں بولتی تو شاید ان کے بہن بھائی مجھے گھر سے ہی نکال دیتے۔ اس لیے ضبط کر کے رہ گئی لیکن میری بجائے ثمینہ نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے محترمہ! مسز احمر اس وقت صدمے کی کیفیت میں ہیں، آپ انہیں مزید دکھی نہ کریں۔''

''اے بی بی! تم کون ہو اور ہمارے گھریلو معاملات میں کیوں ٹانگ اڑا رہی ہو۔'' سلمیٰ نے تنک کر کہا۔

''میں کون ہوں۔'' ثمینہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''اس کا پتا بہت جلد چل جائے گا۔ فی الحال آپ کی تسلی کے لیے اتنا بتائے دیتی ہوں کہ میں احمر صاحب کی دست راست اور وصیت کھلنے تک ان کے گھر، دفتر اور کاروبار کی نگراں ہوں۔''

اس کے پُراعتماد لہجے نے مجھے بھی چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اس انداز میں بول رہی تھی جیسے میرے بجائے وہ اس گھر کی مالک ہو۔ تدفین کے بعد لوگ ایک ایک کر جانے لگے۔ صرف احمر کے بہن بھائی رک گئے تھے۔ شام سے رات ہو گئی لیکن ثمینہ اپنے گھر نہیں گئی، بالآخر مجھے ہی کہنا پڑا۔ ''ثمینہ، تم بہت تھک گئی ہو، گھر جا کر آرام کر لو۔ صبح آجانا۔''

اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں باجی، میں یہیں رہوں گی۔ وکیل صاحب کے آنے تک آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔''

مجھے یوں لگا جیسے اچانک ہی دشمنوں کے نرغے میں آگئی ہوں اور ثمینہ ایک مضبوط ڈھال بن کر میری حفاظت کر رہی ہے۔ میں نے ملازمہ کو بلا کر ثمینہ کے لیے اپنے برابر والا کمرا تیار کرنے کے لیے کہا۔ اس دوران ثمینہ نے گھر کا سارا انتظام سنبھال لیا تھا۔ مجھے تو کسی طرح قرار نہیں آرہا تھا اور مسلسل احمر کو یاد کر کے روئے جا رہی تھی۔ سوئم کا سارا انتظام بھی ثمینہ نے ہی کیا۔ وہ پورے گھر میں اس طرح پھر رہی تھی جیسے وہ ہی یہاں کی مالک ہو۔ مجھے بھی اس کی موجودگی سے خاصا اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔ جب سب مہمان جانے لگے تو احمر کے چھوٹے بھائی اصغر میرے پاس آئے اور بولے۔ ''بھابی! میں نے وکیل صاحب کو کل شام چار بجے بلایا ہے تاکہ وہ احمر کی وصیت سنا دیں۔''

مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے جل کر کہا۔ ''اتنی جلدی کیا تھی۔ کم از کم مرحوم کا کفن تو میلا ہونے دیتے۔''

اس نے ڈھیٹ بنتے ہوئے کہا۔ ''ایسے کاموں میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ آخر ہم لوگ کب تک اپنے کام چھوڑ کر یہاں بیٹھے رہیں گے۔''

دوسرے دن وکیل صاحب مقررہ وقت پر آگئے۔ احمر کے سارے بہن بھائی ان کے گرد یوں بیٹھ گئے جیسے کوئی

لاٹری کھلنے والی ہو۔ میں نے ثمینہ کو بھی اپنے ساتھ بٹھالیا کیونکہ دفتری امور وہی دیکھ رہی تھی اس لیے اس کا موجود ہونا ضروری تھا۔ وکیل صاحب نے بریف کیس سے ایک فائل نکالی اور گلا صاف کرتے ہوئے بولے۔

''احمر صاحب مرحوم نے انتقال سے ایک ہفتہ پہلے یہ وصیت تیار کروائی تھی۔ اس کے مطابق ان کی تمام جائداد، اثاثے اور کاروبار کی واحد وارث مسماۃ سعدیہ بیگم یعنی مسز احمر ہیں۔''

یہ کہہ کر وکیل صاحب نے فائل مجھے پکڑا دی۔ سلمیٰ بیگم سے ضبط نہ ہوا۔ وہ پیر پٹختے ہوئے بولیں۔ ''چلو بھئی، بلاوجہ ہی یہاں بیٹھ کر اپنا وقت ضائع کیا۔''

اس کے ساتھ ہی سارے بہن بھائی اٹھ گئے۔ ان کے جانے کے بعد وکیل صاحب نے بریف کیس سے ایک لفافہ نکال کر مجھے دیا اور بولے۔ ''یہ آپ کے لیے ہے۔ احمر صاحب نے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ یہ لفافہ آپ کو ان کے انتقال کے بعد دیا جائے۔''

میں لفافے کو حیرت اور تعجب کے ساتھ دیکھتی رہی۔ ایسی کیا بات تھی جس کے لیے انہیں تحریر کا سہارا لینا پڑا۔ وہ تو سب کچھ بے تکلف ہی کہہ دیا کرتے تھے۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا اور احمر کا خط پڑھنے لگی۔ اس میں لکھا تھا۔

''جانِ من، پیاری سعدیہ!

میں جانتا ہوں کہ زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گا۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ مجھ سے جو غلطیاں سرزد ہوئیں اور ان کی وجہ سے مجھے تم سے جو جھوٹ بولنا پڑے، ان کا اعتراف کرلوں تاکہ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو سکے اور تم بھی حقیقت جان کر مجھے معاف کرسکو۔ میں نے پہلا جھوٹ تم سے ڈاکٹری رپورٹ کے بارے میں بولا۔ ہم دونوں نارمل نہیں تھے بلکہ میڈیکل رپورٹ کے مطابق تم بانجھ تھیں اور تمہارے بطن سے کبھی اولاد نہیں ہوسکتی تھی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ سچ بول کر تمہیں دکھوں کے سمندر میں دھکیل دوں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی محرومی کا احساس شدت سے ہونے لگا اور یہ جان لینے کے بعد کہ تم کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔ میں بھی اولاد کی خاطر دوسری شادی کے بارے میں سوچنے لگا۔ تم سے ذکر کرنا فضول تھا کیونکہ تم کبھی اس کے لیے تیار نہیں ہوتیں اور تمہارا یہی مطالبہ ہوتا کہ دوسری شادی کرنے سے پہلے تمہیں طلاق دے دوں کیونکہ تم اپنی محبت کا بٹوارہ برداشت نہیں کرسکتی تھیں اور میں تم سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا لہٰذا میں نے ثمینہ سے خفیہ طور پر شادی کرلی۔ وہ مجھے پہلے روز سے ہی اچھی لگنے لگی تھی۔ پھر کچھ عرصہ بعد اس کے ماں باپ یکے بعد دیگرے انتقال کرگئے۔ بھائی بری صحبت میں پڑ گیا اور ایک دن ایسا غائب ہوا کہ پلٹ کر شکل بھی نہ دکھائی۔ ثمینہ بالکل تنہا ہوگئی تھی۔ چنانچہ میں نے اسے سہارا دیا، اب وہ میری بیوی ہے میں نے ایک فلیٹ اس کے نام کردیا ہے اور دس لاکھ روپے اس کے اکاؤنٹ میں منتقل کردیے ہیں۔ باقی سب کچھ تمہارا ہے۔ لیکن ثمینہ بھی مجھے اولاد کی خوشی نہ دے سکی۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق وہ بالکل ٹھیک ہے اور اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ البتہ دوسری بار معائنہ سے یہ بات سامنے آئی کہ خرابی مجھ میں ہے اور میں اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ پہلے والی رپورٹس غلط تھیں۔ غالباً ہمارے سیمپل بدل گئے تھے۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کہ میں نے تم سے جھوٹ بولا ورنہ تمہیں کتنا صدمہ ہوتا۔ میرے گناہوں کی فہرست خاصی طویل ہے لیکن تم نے معاف کردیا تو خدا بھی مجھے معاف کردے گا۔ میں تم سے مسلسل جھوٹ بولتا رہا کیونکہ سچ جان کر تمہیں صدمہ ہوتا اور میں کسی قیمت پر بھی تمہیں دکھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ خیر میں نے جو کچھ کیا۔ اس کی سزا روزِ قیامت ضرور ملے گی البتہ تم سے ایک التجا ہے۔ بلکہ اسے میری آخری خواہش سمجھ لو اور وہ یہ کہ میرے مرنے کے بعد تمہاری طرح ثمینہ بھی بالکل تنہا ہوجائے گی۔ تم دونوں کو سہارے کی ضرورت ہے۔ اس لیے اگر ثمینہ کو اپنے ساتھ رکھ لو تو دونوں کی تنہائی دور ہوجائے گی۔ تم میری زندگی میں تو اپنی محبت کا بٹوارہ برداشت نہیں کرسکیں لیکن میرے مرنے کے بعد اسے اپنے دل اور گھر میں جگہ ضرور دے سکتی ہو۔

فقط تمہارا

احمر''

میں نے اپنے آنسو پونچھ کر خط لفافے میں رکھا اور ثمینہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ''اب تم مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گی۔''

ثمینہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اسے کیسے بتاتی کہ احمر نے خفیہ شادی کرکے میری محبت کا بٹوارہ تو پہلے ہی کردیا تھا۔ میں گزرے وقت کو تو واپس نہیں لاسکتی تھی لیکن مرحوم شوہر کی آخری خواہش کا احترام کرنا مجھ پر فرض تھا جو میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔

✖

کباب

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم!

ایک بار پھر ایک نیا واقعہ لکھ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ یہ واقعہ میری دوست شایان کے ساتھ پیش آیا۔ جسے میں من وعن تحریر کررہی ہوں۔ یہ ایسا سبق بھرا ہے کہ اسے ہر ایک کو ذہن میں محفوظ کرلینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کس کس طریقے سے کرم کرتا ہے آپ بھی ملاحظہ کریں۔

صدف آصف

(کراچی)

''اماں...... پلیز مجھے گوشت کے کباب کھانے ہیں۔'' بیٹے نے ماں کا گھٹنا ہلا کر لاڈ سے کہا۔

''لے لو، تو میں نے اپنی چندا کو کیا منع کیا ہے؟ تنخواہ ملنے دو، بنادوں گی۔'' کنیز فاطمہ نے پیار سے اپنی جوان ہوتی بیٹی کو دیکھا جو آس بھری نظروں سے ماں کو تک رہی تھی، اپنے تئیں اسے مطمئن کیا۔ بیٹی پر سے توجہ ہٹا کر وہ جلدی جلدی اللہ بخش کی قمیص کے کالر پر صابن رگڑنے لگی، جانتی تھی کہ شوہر کے پاس کام پر جانے کے لیے

دو سے تین قمیصیں ہی ہیں، اسی لیے ایک میلی ہوتی تو وہ دوسری کو فوراً ہی دھو کر استری کر کے تیار رکھتی۔

نیہا کے انگنا میں ہمیشہ کپڑے رات گئے ہی دھلتے تھے، اس کی دو وجوہات تھیں، ایک تو دن میں ماں نوکری پر چلی جاتی تھی، اسے ٹائم نہیں ملتا تھا، دوسرے ان کے گھر پانی ایک دن کے ناغے سے آتا تھا۔ رات بارہ بجے کے بعد نلوں کی دھار موٹی ہوتی تو کپڑے دھونے میں آسانی رہتی۔ جب سے پاس پڑوس والوں نے پانی کھینچنے والی مشینیں لگائی تھیں، ان کے یہاں پانی کی دقت ہوگئی تھی۔

''نہیں اماں...... وہ نہیں جو تو بناتی ہے، نرے دال کے کباب، مجھے تو سدرہ کے گھر جیسے چاہئیں۔ اس کی امی نے تو لگتا تھا چنے کی دال ڈالی ہی نہ ہو بس منہ میں گوشت ہی گوشت آرہا تھا۔'' اس نے آنکھ میچ کر منہ میں ان کبابوں کا ذائقہ لیا جو کالج میں اس کی بیسٹ فرینڈ لائی تھی، وہ کباب ان چاروں لڑکیوں نے پراٹھے کے ساتھ منٹوں میں ختم کر دیے۔ ''نیہا کے حصے میں بھی ایک، دو ٹکڑے ہی آئے تھے۔ بیٹی کی بات سن کر کنیز فاطمہ مزید سر جھکا کر صاف پانی کی دھار کو دیکھنے لگی جو میل کچیل کو دھو کر کپڑا صاف کر رہی تھی، کاش خوشیوں کی ایسی برسات ہوجائے کہ پریشانیاں دھل دھلا جائیں اور زندگی صاف شفاف ہوجائے۔

کنیز فاطمہ بھی کیا کرتی، مہنگائی کی گاڑی اتنا تیز دوڑ رہی تھی کہ قابو میں ہی نہ آتی۔ وہ جتنا بھی ہاتھ کھینچ لیتی گزارہ مشکل سے ہی ہو پاتا۔ وہ ایک پاؤ گوشت میں آدھا کلو چنے کی دال ڈال کر بمشکل کباب بناتی تب جا کر کہیں سات جنوں کا پیٹ بھر پاتا، ایسے حالات میں لاڈو بیٹی کی خواہش پوری کرنا ناممکن تو نہیں مگر مشکل ضرور ہوگیا تھا، کنیز فاطمہ بھی ریاضی دان بنی ایک ایک روپے کی جمع تفریق میں لگ جاتی تب کہیں جا کر گھر کا روکھا سوکھا بجٹ بن پاتا۔

''چنے کا ایک کلو بغیر ہڈی کا گوشت لاؤں، اتنے میں آٹے کی ایک بوری یا دال نہ ڈلوا لوں۔'' وہ سوچنے لگی مگر بیٹی کی اتری صورت بھی نہ دیکھی جارہی تھی۔

''اچھا...... اچھا، بٹیا، ویسے ہی بنادوں گی۔'' کنیز فاطمہ نے بیٹی کی تکرار پر بجھے دل سے وعدہ کیا، وہ مزاجاً بہت حساس واقع ہوئی تھی، شوہر ایک لانڈری میں کپڑے استری کرنے کا کام کرتا تھا، روزانہ کے سو روپے اور ماہانہ چھ ہزار روپے ملتے تھے، بھلا اتنی قلیل تنخواہ میں اتنے بڑے کنبے کا گزارہ کیسے ہو پاتا؟

سال کے سال بچوں کی آمد نے کنیز فاطمہ کو الگ مصروف کر رکھا تھا، چھوٹا والا پاؤں پاؤں چلنے لگا تو اسے احساس ہوا کہ اللہ نے والدین پر بچوں کی تربیت کی بڑی بھاری ذمےداری عائد کی ہے۔ وہ خود تو پڑھی لکھی تھی نہیں ورنہ کسی اسکول میں ہی پڑھانے لگ جاتی لیکن بچوں کو پڑھانے لکھانے کا شوق دن بہ دن جنون بنتا جارہا تھا۔ وہ دیکھتی تھی کہ اتنی محنت کے باوجود اللہ رکھا کے ہاتھ میں مہینے کے آخر میں اتنے قلیل پیسے آتے کہ جائز خواہشات پوری ہونا بھی مشکل ہوجاتیں۔ آج اگر وہ پڑھا لکھا ہوتا تو کہیں ڈھنگ کی نوکری کر رہا ہوتا۔

اب ایک تنخواہ میں گزارہ ہو ہی نہیں پا رہا تھا، اس کو شوہر کے شانہ بشانہ کھڑا ہونا ناگزیر ہوگیا، بڑی لڑکی بھی آٹھویں جماعت میں آگئی تھی، گھر کے حالات نے اسے وقت سے پہلے ہی باشعور بنادیا، ماں کو دن بھر کولہو کا بیل بنا دیکھ کر اس نے بن کہے اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے بہت سارے کام سنبھال لیے تو کنیز فاطمہ نے بھی سکون کا سانس لیا۔ اس نے سارے جاننے والوں سے کام کے لیے کہہ رکھا تھا، آخر تیسرے گھر والی منورہ اسے اپنی مالکن کی بہن کے گھر لے گئی جنہیں کھانا پکانے والی ایک شریف عورت کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

میکے میں بڑی بیٹی ہونے کی وجہ سے کنیز فاطمہ نے بہت کم عمری سے ہی چولہا چوکی سنبھال لیا تھا، ماں تو بستر ہی سنبھالے رہتی، ہر سال کی خوش خبریوں نے اسے اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ وہ گھر کے کام دام کو دیکھ سکے۔ کنیز فاطمہ کا باپ ایک بنگلے میں باورچی لگا ہوا تھا، مالک کی صرف جیب ہی بڑی نہ تھی، دل بھی بہت بڑا تھا۔ وہ تنخواہ کے علاوہ بھی صفدر علی کی مدد کرتا رہتا تھا، یہاں ایک ہی پریشانی تھی کہ اہلِ خانہ صفدر علی کے ہاتھ کے ذائقے کے اتنے عادی ہوگئے تھے کہ کسی اور کے پکائے گئے کھانے پسند ہی نہیں آتے۔ اسی لیے اسے تنخواہ میں اضافے کے ساتھ وہیں رہائش بھی دے دی گئی۔ گھر میں خوش حالی دیکھ کر اس نے مالک کی پیشکش منظور کرلی۔ ویسے بھی غریب کی کیا مرضی؟

اب پورے ہفتے میں وہ صرف ایک دن گھر آپاتا تھا۔ باقی پورا وقت وہ مالکوں کے ساتھ ہی رہتا، یہ اور بات تھی کہ وہ جب بھی گھر آتا بیٹی کو نت نئے کھانے پکانے کی

سکھا دیتا، تاکہ وہ ماں کی بیماری میں گھر کی دیکھ ریکھ اور کھانا پکانے کا کام کر سکے۔ کنیز فاطمہ بھی ہونہار نکلی، ہر قسم کے کھانے پکانے میں بچپن سے ہی طاق ہوگئی، باپ کی غیر موجودگی میں وہ اپنے دس بھائی بہنوں کی دیکھ بھال کے ساتھ کھانے پینے کا بھی انتظام بہتر طریقے سے کرلیتی، ماں کو اس کے دم سے بڑا سہارا تھا۔ کہتے ہیں ہنر کبھی ضائع نہیں جاتا، اس کا وہ تجربہ آج کام آیا۔

نوکری کے پہلے دن گلابی کوٹھی والی شایان باجی نے اس سے سفید کڑھائی، یخنی پلاؤ اور پڈنگ بنوائی تو سب میز سے انگلیاں چاٹتے ہوئے اٹھے۔ اتنا مزیدار کھانا پکانے والی صاف ستھری عورت کو شایان کھونا نہیں چاہتی تھی، اس نے فوراً ہی ماہانہ چھ ہزار پر اسے اپنے یہاں ملازمت دے دی۔ کنیز فاطمہ تو چار ہزار پر بھی راضی ہوجاتی اتنے پیسوں کا سن کر خوشی سے جھوم اٹھی، وقت گزرنے کے ساتھ گلابی کوٹھی والے کنیز فاطمہ کے معترف ہوتے گئے۔ وہ بہت ہی ایماندار عورت تھی، شایان کو کبھی اس سے روایتی ملازموں والی شکایت نہیں ہوئی کہ مرچ مسالے چوری ہوگئے یا وہ گندگی سے کھانا پکاتی ہے کنیز فاطمہ اپنے بچوں کو حق حلال کا نوالہ کھلانا چاہتی تھی، اسی لیے مالکوں کی مرضی کے بغیر نمک کی ڈلی بھی گلابی کوٹھی سے نہ اٹھاتی۔

☆☆☆

شایان خود تو دل کی بہت اچھی تھی مگر اس کی ساس برکت خاتون کی نفسیات سمجھ سے بالا تھی، اتنا پیسا ہونے کے باوجود دل کی بہت چھوٹی تھی۔ کسی کو ایک ٹکا بھی دینے کی روادار نہیں تھی، اکثر کنیز فاطمہ پر بھی نظر رکھتی کہ وہ جاتے ہوئے اپنے تھیلے میں کھانے کی چیزیں تو چھپا کر نہیں لے جارہی۔ بچے ہوئے سالن بھی فریج میں جمع کرتی رہتی، بھلے سڑا کر پھینک دیتی مگر کسی کے منہ نہ پڑنے دیتی۔ اگر کبھی شایان کنیز فاطمہ کو کوئی سالن گھر لے جانے کے لیے دے دیتی، اور یہ بات برکت خاتون کے علم میں آجاتی تو کھانے کی میز پر جان بوجھ کر خوب فضیحتا کرتی کہ مجھے تو وہ ہی سالن کھانا ہے جو فریج میں رکھوایا تھا، ایسے میں شایان چور سی بن جاتی۔ کنیز فاطمہ الگ سبکی محسوس کرتی، اسی لیے وہ شایان بی بی کو بہانے بہانے کھانے پینے کی چیزیں دینے سے منع کر دیتی۔ ایک دو دفعہ کے تجربے کے بعد شایان نے بھی اسی میں عافیت جانی۔

''اگر ماں کی عادت ایسی ہے تو ہم اس عمر میں آکر

فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت قیس

رسول اکرمؐ کی صحابیات میں تھیں اور قبیلہ بن کنانہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں ایمان لائیں اور ہجرت اختیار کی۔ پہلا نکاح ابوعمرو حفص بن مغیرہ سے ہوا۔ سن 10ھ میں ابوعمرو نے طلاق دے دی۔ عدت کی میعاد پوری ہونے کے بعد امیر معاویہؓ، ابوجہمؓ اور اسامہؓ بن زید نے نکاح کا پیغام بھیجا، چنانچہ آنحضورؐ کے ایما پر اسامہؓ سے نکاح کرلیا۔ 14ھ میں اسامہؓ کے انتقال کے بعد پھر شادی نہیں کی اور اپنے بھائی ضحاک کے ساتھ رہیں۔ 24ھ میں جب حضرت عمرؓ نے انتقال فرمایا، تو مجلسِ شوریٰ کا اجلاس حضرت فاطمہؓ ہی کے مکان پر ہوا تھا۔ فاطمہؓ بنت قیس بڑی عقلمند اور حسین و جمیل تھیں۔ فاطمہؓ نے آنحضورؐ سے چند احادیث روایت کی ہیں، جو متعدد شخصیتوں کے ذریعے سے مروی ہیں۔ عبداللہ ابن زبیرؓ کے زمانہ خلافت تک زندہ رہیں۔

مرسلہ: نثار احمد، میرپورخاص

ان میں تبدیلی پیدا نہیں کرسکتے، اسی لیے اب تمہیں ہی اپنے اندر بدلاؤ لانا پڑے گا۔'' احمر بھی روز روز کے ڈراموں سے زچ ہوجاتا تو بیوی کو سمجھانے بیٹھ جاتا۔ شایان نم آنکھوں سے شوہر کی طرف دیکھتی رہ جاتی جو اس کی اچھی عادتیں ختم کروانے پر تلا بیٹھا تھا۔ بیوی کی شکوہ بھری نگاہیں، احمر کے دل پر اثر کرتیں، اسے لگتا کہ وہ چکی کے بیچ میں پسنے والا دانہ بن گیا ہو، ماں نے جوانی بھر جتنی تکالیف اٹھائی تھیں وہ خود اس بات کا گواہ تھا، باپ نے پیسا ہونے کے باوجود بیوی کو اس کی اوقات میں رکھنے کے لیے باسی کھانوں اور پرانے کپڑوں تک محدود رکھا۔ باپ کے انتقال کے بعد بیٹے نے کاروبار سنبھالتے ہی ماں کے ہاتھ میں گھر کا خرچ دے دیا، وہ باپ کی غلطیوں کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ برکت خاتون نے اب جو کھلا پیسا دیکھا تو دانتوں سے پکڑتی، برکت خاتون کی مزاج کی تبدیلی کے پیچھے بہت سے عوامل کارفرما تھے، جس سے شایان لاعلم تھی، احمر کو مرے ہوئے باپ کی پردہ داری مقصود تھی۔ اسے بیوی سے نظریں

چرانا بھی منظور تھا، تاہم وہ ماں کو جھڑ کنے کا روادار نہ تھا۔

☆☆☆

''کنیز آپا...... آج رات کو اماں نے حلیم پکوانے کی فرمائش کی ہے۔ میں نے صبح سے گوشت کے کئی پیکٹ فریج سے نکال کر باہر رکھ دیے کہ پگھل جائیں، آپ اس میں سے اتنا نکال لیجیے گا جتنا حلیم کے لیے ضروری ہے باقی فریزر میں واپس رکھ دیجیے گا، میں اماں جی کو ان کی بہن سے ملوانے لے کر جا رہی ہوں، شام تک واپسی ہوگی، آپ کام ختم کر کے چلی جایئے گا۔'' شایان نے سن گلاسز بالوں پر ٹکا کر جلدی جلدی ہدایت دی اور گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گئی۔

''یا میرے اللہ...... کسی کے پاس اتنا ہے کہ سنبھالا بھی نہیں جاتا اور کوئی دانے گن گن کے کھاتا ہے۔'' گائے کے گوشت کا ڈھیر سنک میں پڑا دیکھ کر آہ بھری۔ نیہا کی چھوٹی سی خواہش بھی وہ پوری نہیں کر پا رہی تھی، اس نے سوچا تھا کہ تنخواہ ملنے پر گوشت لا کر بیٹی کی پسند کے مطابق کباب بنا لے گی مگر بخار کی وبا ایسی پھیلی کہ اس کا سارا گھر لپیٹ میں آ گیا، دوا دارو میں اتنے پیسے خرچ ہو گئے کہ کنیز فاطمہ اپنی پڑوسن کی قرض دار ہو گئی۔

بقر عید آئی تو آس بنی کہ شاید اتنا گوشت مل جائے گا کہ بیٹی کے لیے مزیدار شامی کباب بنا لے، ایک تو ان کا محلہ غریبوں کا، ایک دو گھروں میں قربانی ہوئی بھی تو اتنا ہی گوشت آیا کہ دو سے تین ٹائم پک کر ختم۔ جب سے لوگوں نے قربانی کے گوشت سے فریزروں کا پیٹ بھرنا شروع کیا بانٹنے کے لیے ہڈیاں اور چھیچھڑے ہی رہ گئے تھے۔ ان کے محلے کے کچھ گھروں نے یہ ریت اپنا لی تھی کہ وہ عید کے دن شہر کی طرف نکل جاتے اور مانگ مانگ کر گوشت جمع کرتے، مگر اس کنبہ کے دل کو ایسی باتیں گوارا نہیں تھیں۔

''کیوں ری کنیز، چلتی ہے، سانجھ اتنا گوس (گوشت) مل جائے گا کہ سکھا کر ہفتوں کھائے گی؟'' منورہ نے دروازہ بجا کر پاٹ دار آواز میں پوچھا، مگر کنیز فاطمہ کو ہاتھ پھیلانے کی عادت جو نہ تھی، چھوٹے بیٹے سے انکار کہلوا دیا۔

وہ بڑی آس سے شایان کے بلاوے پر عید کے دوسرے دن گلابی کوٹھی پہنچی تو برکت خاتون نے بھی مایوس کیا جو گوشت کے ڈھیر کے پاس بیٹھی سارے نوکروں کے حصے لگا رہی تھیں۔ کنیز فاطمہ کی آس بھری نگاہیں ان پر ٹک گئیں مگر انہوں نے تھیلی میں چار ہڈیاں، چار بوٹیاں اور چربی کا بڑا سا ٹکڑا ڈال کر اسے دیا تو وہ بجھے دل سے وہاں سے ہٹ گئی۔ شایان بھی ایسے موقع پر مجبور ہو جاتی ورنہ اس کے میکے میں تو قربانی کا گوشت دل کھول کر بانٹا جاتا تھا۔ اسے خود بھی احساس تھا کہ وہ لوگ تو سال بھر بہ آسانی گوشت کھا لیتے ہیں، کم از کم بقر عید میں تو ایسے لوگوں کو قربانی میں سے حصہ ملنا چاہیے جن کو مہنگائی کی وجہ سے سال بھر گوشت کھانے کی استطاعت نہ ہو۔

''کچھ بھی ہے، میں اپنی بیٹی کو اس کی پسند کے کباب ضرور کھلاؤں گی۔'' اس نے حلیم کو جلدی جلدی بگھار لگایا اور آدھا کلو روکھی بوٹیوں کی وہ تھیلی اٹھا لی جو اس نے گوشت کے بڑے حصے میں سے چھیچھڑے صاف کرتے ہوئے صفائی سے اڑا لی تھیں، بڑی عید کو دو مہینے گزرنے کے باوجود برکت خاتون کا فریزر لبالب بھرا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف قدم بڑھا رہی تھی مگر پہلی بار غلط کام کیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ قدم من من بھر کے ہو گئے ہوں اٹھنے کو تیار ہی نہیں ہو رہے تھے۔

ضمیر کی ملامت اپنی جگہ مگر اولاد کی محبت میں وہ اپنے مزاج کے خلاف کام کرنے پر مجبور ہو گئی۔

کیا تھا جو برکت بی بی سارے نوکروں میں طریقے سے گوشت بانٹ دیتی۔ آج مجھے یوں بغیر اجازت گوشت تو نہیں اٹھانا پڑتا، بچی کی محبت میں اپنی نظروں سے ہی گر گئی۔ کنیز فاطمہ کے دل میں خلش سی جاگی، اس نے تھیلی کی طرف دیکھ کر سوچا جس میں سے قطرہ قطرہ لال پانی ٹپک کر جگہ جگہ نشان چھوڑ رہا تھا۔

☆☆☆

''ہائے...... اماں آج میں کل کالج کباب لے کر جاؤں گی، اب سب کو پتا چلے گا کہ میری اماں جیسے کھانے کوئی نہیں پکا سکتا۔'' نیہا خوشی سے جھوم اٹھی، کنیز فاطمہ کے ہونٹوں پر بھی پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی، اس نے گوشت دھو کر چھلنی میں رکھا اور صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ کر چنے کی دال چننے لگی۔

''اماں...... او اماں...... ہائے میں مر گئی'' نیہا کی دکھ بھری صدائیں سن کر تھال کنیز فاطمہ کے ہاتھ سے چھوٹا، وہ کچن کی جانب بھاگی، نیہا کو چائے کا کہا تھا، کہیں آگ تو نہیں لگ گئی، کب سے اللہ رکھا سے کہہ رکھا ہے کہ چولہا لیک ہو رہا ہے ٹھیک کروا لو مگر وہ سنتا ہی کہاں ہے، مختلف سوچوں سے لڑتی

جب وہ باورچی خانے میں داخل ہوئی تو نیہا کو بت بنے کھڑا دیکھا۔

"اری...... کیا ہوا، کہاں آگ لگی۔" اس نے ٹٹول ٹٹول کر بیٹی کو چیک کیا، کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو پوچھنے لگی۔

"اماں ...... بلی...... وہ بلی......" آنسو نیہا کی خوبصورت آنکھوں کے کونے پر لرز رہے تھے، اس نے ماں کی جانب دیکھا اور ایسے دکھ بھرے لہجے میں کہتے ہوئے ہاتھ سے روشندان کی جانب اشارہ کیا کہ کنیز فاطمہ دل تھام کر رہ گئی۔

"ارے کیا بلی ...... بلی کر رہی ہے، منہ سے کچھ اور بھی بول" کنیز فاطمہ نے گھبرا کر بیٹی کو جھنجوڑا۔

"ہائے...... وہ سارا گوشت کھا گئی، اماں...... بلی میرے کباب کا گوشت کھا کر بھاگ گئی۔" نیہا کا دکھ کے مارے برا حال تھا، وہ زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی اور لگی بین کرنے۔

کنیز فاطمہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیٹی کو دیکھا، سامنے ہی وہ چھلنی خالی پڑی تھی جس میں وہ کچھ دیر قبل گوشت دھو کر رکھ گئی تھی۔

☆☆☆

"ارے...... کنیز آپا...... اچھا ہوا آپ آگئیں اماں کی طبیعت خراب ہے، وہ اسپتال میں داخل ہیں آپ جلدی سے کھچڑی اور مرغی کی یخنی بنا دیں۔ مجھے اسپتال بجھوانا ہے۔" کنیز فاطمہ مرے مرے قدموں سے گلابی کوٹھی میں داخل ہوئی، سوچا تھا جاتے ہی اپنے جرم کا اعتراف کر لے گی مگر شایان پر اپنی افتاد پڑی تھی، برکت بیگم کی بیماری کا سن کر وہ بھی گھبرا اٹھی اور کام میں جت گئی۔

"اچھا...... شایان ...... بی بی ...... میں گھر جا رہی ہوں۔" سارے کام نمٹا کر جب وہ ہاتھ دھو کر گھر جانے لگی تو ایک بار پھر ہمت کر کے شایان کے کمرے میں داخل ہوئی، وہ اپنے بیٹے کو ہوم ورک کرا رہی تھی۔

"شکریہ...... کنیز آپا...... آپ کی وجہ سے مجھے مشکل وقت میں بہت سہارا رہتا ہے۔" شایان نے ممنونیت سے اسے دیکھا، جو اکثر شایان کے ایسے کام بھی کر دیتی تھی جو اس کی ذمے داری نہ تھے، آج بھی برکت بی بی کی بیماری کی وجہ سے کافی لوگ گلابی کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس نے نہ صرف مہمانوں کی وجہ سے اضافی کھانا پکایا بلکہ شایان کی نندوں اور ان کے بچوں کو کھانا کھلا کر ٹیبل صاف کی اور سارے برتن دھو کر کچن بھی صاف کر دیا۔ شایان نے پرس میں سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر کنیز فاطمہ کے ہاتھ پر رکھا تو اس کی برداشت کی حد ختم ہو گئی ضمیر کی مار مزید سہنے کا حوصلہ نہ رہا۔

"بس بی بی...... آپ خود اتنی اچھی ہیں مگر میں بہت بری ہوں...... آپ کی نمک حلالی نہ کر سکی۔" کنیز فاطمہ شایان کا ہاتھ تھام کر رو دی اور ساری حکایت بیان کر بیٹھی۔

"اچھا...... تو...... یہ بات تھی، جب ہی صبح سے آپ کا چہرہ اترا ہوا تھا۔" شایان نے اسے پاس پڑے صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا اور دلاسا دیا۔

بس ...... بی بی ...... میں بہت شرمندہ ہوں۔" کنیز فاطمہ روتے ہوئے بولی۔

"نہیں ...... آپا شرمندہ تو ہم جیسوں کو ہونا چاہیے ...... جو لوگوں کو ایسے امتحانات میں ڈال دیتے ہیں مگر مجھے لگتا ہے کہ اوپر والے نے کچھ سبق تو میری ساس کو بھی دے ہی دیا ہے۔" شایان نے اسے کچھ دیر ٹھہرنے کا کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

"آپا یہ...... لیجیے ...... یہ میں نے آپ کے لیے نکالا تھا" شایان کمرے میں لوٹی تو اس کے ہاتھ میں گوشت کا بڑا سا تھیلا تھا، جو اس نے کنیز فاطمہ کو تھمایا، وہ ہکا بکا شایان کا منہ تکتی رہ گئی۔

"اس دن ... جو آپ نے حلیم پکایا، جانے اس میں کتنی آہیں گھول کر رکھ دیں، میری ساس نے کئی پلیٹیں بڑے شوق سے کھائیں، رات میں ایسی بدہضمی ہوئی کہ مت پوچھیں، اسپتال میں داخل کرانے کی نوبت آ پہنچی ڈاکٹر نے خوب ڈانٹ پلائی کہ اس عمر میں ایسے بھاری کھانے۔ اس نے اماں جی کا بڑے کا گوشت بالکل بند کر دیا ہے، کیونکہ ان کا کولیسٹرول بھی حد سے تجاوز کر گیا تھا۔ بس بیماری کی حالت میں انہیں جانے کیسے کیسے خواب نظر آئے کہ صبح ہی مجھے موبائل پر تاکید کی کہ فریزر میں پڑا سارا قربانی کا گوشت غریبوں میں بانٹ دو، میں نے بھی شکر ادا کیا کہ انہیں کچھ تو عقل آئی، سب کو بانٹنے کے بعد آپ کا حصہ علیحدہ نکال دیا۔" شایان نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ کنیز فاطمہ تھیلا اٹھا کر خوشی خوشی گھر کی طرف چل دی، اس نے جدوجہد کر کے اپنے بچوں کو حلال کا نوالہ کھلایا تھا پھر ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا کیسے اس کی تپسیا ضائع ہونے دیتا۔

☆

گندے انکل

محترمہ عذرا رسول

سلامِ تہنیت!

میرا تعلق قانون نافذ کرنے والے ادارے سے ہے۔ میں آپ کا یہ ڈائجسٹ بصد شوق پڑھتا ہوں۔ میں نے ایک ایسا مجرم گرفتار کیا تھا جس پر تھوکنے کو دل کر رہا تھا۔ ایسا کیوں، یہ آپ کو میری اس کہانی میں مل جائے گا۔ اگر یہ شائع ہوگئی تو مزید لکھوں گا۔

س۔ح۔ا

(سرگودھا)

مجھے حکومت کی طرف سے خاص قسم کے اختیارات دے دیئے گئے تھے۔

میں اس وقت اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف ایک اعلیٰ حاکم کے پی اے کا فون تھا۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ صاحب نے مجھے فوری طور پر طلب کیا ہے۔

یہ صاحب قسم کے لوگ اس وقت مجھے طلب کیا کرتے جب کوئی مشکل سامنے آجاتی یا کوئی گمبھیر مسئلہ

ہو جاتا۔ میں نے اپنی کیپ اپنے سر پر جمائی۔ اپنے سیکریٹری سے کہا کہ فوراً میری گاڑی نکلواؤ اور پندرہ منٹ کے اندر اندر اس اعلیٰ حاکم کے پاس پہنچ گیا جو ایک دردمند دل رکھنے والا انسان تھا۔

''تشریف رکھیں حامد صاحب۔'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں اس کا شکریہ ادا کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔

''حامد صاحب، آپ یہ بتائیں کہ یہ زمین کیوں نہیں پھٹتی۔ یہ آسمان کیوں نہیں ٹوٹ پڑتا۔'' اس نے کہا۔

''شاید آپ کا اشارہ اس بچی کے کیس کی طرف ہے سر۔'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ غضب خدا کا! پانچ چھ برس کی بچی کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک۔ کیا ہم درندوں کی بستی میں رہتے ہیں۔ اور ستم یہ ہے کہ وہ وحشی آج تک گرفتار بھی نہیں ہوئے۔''

''بہت دکھ کی بات ہے سر۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے جب سے اس کیس کے بارے میں سنا ہے، میری نیندیں اڑ گئی ہیں۔ آپ یقین کریں گے کہ میں بہت دیر تک روتا رہا ہوں۔''

''یقین ہے مجھے۔ ہر پاکستانی اور دنیا بھر کے ہمدرد انسانوں نے ایسا ہی محسوس کیا ہوگا۔ بہر حال آپ کو اس لیے زحمت دی جا رہی ہے کہ آپ ان وحشیوں کا پتا چلائیں۔ پکڑیں ان کو۔ آپ کو خصوصی اختیارات بھی دیے جا رہے ہیں۔''

''میں خوش ہوں سر۔'' میں نے کہا۔ ''یہ اس بات کی خوشی ہے کہ پہلی بار مجھے ایسا کیس مل رہا ہے کہ مجرموں کو خود میں پکڑنا چاہتا ہوں۔''

''آپ کو لیٹر مل جائے گا۔ آپ خدا کا نام لے کر اپنا کام شروع کر دیں۔'' حاکم نے کہا۔

اور لیٹر ملتے ہی میں نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔

سب سے پہلے میں اس بچی کو دیکھنے ہاسپٹل پہنچا۔ اس کی حالت دیکھ کر لرز اٹھا تھا۔ خدا کی پناہ پانچ چھ سال کی بچی کے ساتھ ایسا سلوک۔ وہ خاموش تھی۔ لیکن اس کی معصوم آنکھیں سوال کر رہی تھیں کہ آخر کیوں۔ گندے انکل نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ (اس عمر کے بچوں کی سوچیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ انکل بہت گندے ہیں۔ میں ان سے بات نہیں کروں گی۔ انہوں نے مجھے بہت دکھ دیے ہیں۔ اللہ میاں ان کو بہت گناہ دیں گے)

اس کی آنکھیں ہم سے اور پورے معاشرے اور پورے سسٹم سے یہی سوال کر رہی تھیں۔ جن کے جواب کم از کم میرے پاس نہیں تھے۔ میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بھیگی آنکھوں سے باہر آ گیا۔

اب میرا کام شروع ہو چکا تھا۔

وہ بچی ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ ایک اوسط درجے کی آبادی کی رہنے والی۔ جہاں کچے پکے مکانات بنے ہوئے تھے۔ اور زیادہ تر لوگ مزدور تھے۔

میں نے اپنے کام کا آغاز قلفی کے ٹھیلے سے کیا تھا۔

ایک ٹھیلا۔ جس پر دو مٹکے، جن میں سستی قلفیاں اور برف بھری ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ میں نے اپنا حلیہ بھی بدل لیا تھا۔ پرانی سی چپل۔ پھٹا پرانا لباس۔ ایک خاص قسم کے جیل سے چہرے اور ہاتھوں کی رنگت ہی بدل لی تھی۔ بکھرے ہوئے بال۔

مجھے دیکھ کر اب کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ میں کون ہوں۔ کیا کرنے آیا ہوں۔ میں ٹھیلا دھکیلتا قلفی ٹھنڈی ٹھار قلفی کی آوازیں لگاتا اس گلی میں پہنچ گیا جس میں اس بدنصیب بچی کا گھر تھا۔

شام کا وقت تھا۔ ابھی بھی اس گلی میں کئی بچے اور بچیاں اپنے کھیلوں میں مصروف تھے۔ اس بات سے بے خبر کہ اس بے رحم معاشرے میں کسی بھی وقت کوئی بھی ان کی مسکراہٹوں کا خون کر سکتا ہے۔ ان کی خوشیوں کا گلا گھونٹ کر ان کے نازک جسموں کو بے جان کر سکتا ہے۔

کچھ بچے اپنے گھروں سے پیسے لے کر میرے پاس آ گئے۔ میں نے قلفیوں کے دام بہت کم لگائے تھے۔ اسی لیے سب ہی خرید رہے تھے۔ اسی دوران ایک آدمی میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ ایک مکروہ صورت کا آدمی تھا۔ آنکھیں بالکل سفید سفید تھیں اور اس کے کپڑوں سے بدبو اٹھ رہی تھی۔ ''ہاں بھائی پہلوان۔'' اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''پہلی بار اس علاقے میں آیا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں بھائی۔'' میں نے خوش دلی سے جواب دیا۔ ''پہلے سہیل نگر میں ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب وہاں والے فیشن میں آ گئے ہیں۔ کہتے ہیں بازار کی قلفی مت کھاؤ۔ بیمار پڑ جاؤ گے۔ دھندا ہی ختم ہونے لگا تھا۔ اسی لیے میں نے سوچا، چلو کسی دوسرے محلے میں کوشش کرتے ہیں۔ ویسے استاد تم کیا کرتے ہو۔''

''وہ اپنا ٹھیلا کھڑا ہے۔'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ''ٹین ڈبے اور ردی کا کام کرتا ہوں۔''

''تو یہ کہو نا کہ کباڑیا ہو۔''

''ہاں پہلوان۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''ایسا ہی سمجھ لو۔''

''یہ لو، ایک قلفی تم بھی کھا لو۔ کلیجا ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' میں نے ایک قلفی مٹکے سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ ''یہ میری طرف سے ہے۔''

''واہ پہلوان!'' وہ قلفی چوستا ہوا بولا۔ ''بہت مزے کی ہے۔''

''اپنی قلفی اسپیشل ہوتی ہے بھائی۔''

اس دوران ایک بچی ٹھیلے کے پاس آ گئی۔ اس کی عمر آٹھ دس برس کی ہوگی۔ سانولا رنگ۔ لیکن اس کے نقوش بہت خوبصورت تھے۔

''ایک قلفی دے دو۔'' اس نے کہا۔ ''پھر پوچھا۔ ''کتنے کی ہے۔''

''دو روپے کی۔'' میں نے بتایا۔

اس نے اپنی مٹھی کھول دی۔ اس کی ہتھیلی پر صرف ایک روپے کا ایک چھوٹا سکہ پڑا ہوا تھا۔ ''لیکن میرے پاس تو صرف ایک روپیا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میرے بولنے سے پہلے وہ کباڑیا بول پڑا۔ ''میں تیری طرف سے دو روپے دے دیتا ہوں۔ تو اپنا روپیا بھی لے جا اور قلفی بھی لے جا۔'' پھر اس نے مجھے دیکھا۔ ''پہلوان اس بچی کو ایک قلفی دے دو۔''

میں نے قلفی نکال کر بچی کو دے دی۔ بچی نے کچھ جھجکتے ہوئے قلفی لے لی تھی پھر وہ قلفی چوستی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔

وہ کباڑیا اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ اس وقت اس کی سفید آنکھوں کی سفیدی اور بڑھ گئی تھی۔

''پہلوان، اب تیری میری دوستی ہو گئی۔'' اس نے میری طرف دیکھا۔ ''نام کیا ہے تیرا؟''

''شکور نام ہے بھائی اور تمہارا؟'' میں نے پوچھا۔

''ارشاد۔'' اس نے بتایا۔ ''یہاں آ کر کسی سے پوچھ لینا، ارشاد کباڑی والا کہاں کھڑا ہے۔ وہ فوراً بتا دے گا۔ سب جانتے ہیں مجھے۔''

''ہاں استاد، تم بندے تو ایسے ہی لگتے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''وہ بچی بھی تمہیں جانتی تھی۔ ورنہ وہ کسی غیر سے قلفی کیوں لیتی۔''

''یہ بات تو ہے۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''سب ہی جانتے ہیں۔ میرے ٹھیلے پر بچوں کے کام کی بھی چیزیں ہوتی ہیں نا، اسی لیے سب میرے ہی پاس آتے ہیں۔ کھلونے، گڑیاں اور بہت کچھ۔''

اس دوران ایک دو آدمی قلفی خریدنے میرے ٹھیلے کے پاس آ گئے۔ وہ کباڑیا اپنے ٹھیلے کی طرف چلا گیا تھا۔ میں... بہت دیر تک کسی سراغ کی تلاش میں اس محلے میں بھٹکتا رہا لیکن کوئی خاص بات پتا نہیں چلی۔

لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس محلے پر خوف کی فضا ضرور قائم تھی۔ میں شام کو 5 بجے اس محلے کے ایک ہوٹل میں چائے کے لیے بیٹھا تو وہاں بھی لوگ اس بچی کے حوالے سے باتیں کر رہے تھے۔

''یار اپنے محلے پر تو قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔'' کسی نے کہا۔

''ہاں بھائی، اس کے گھر والوں کا حال تو جا کر دیکھو۔ بے چارے رو رو کر بے حال ہو رہے ہیں۔''

''کچھ نہیں پتا چلتا کس نے ایسا کیا ہوگا۔''

''اگر مجھے مل جائے نا تو اس کو کتوں کے آگے ڈال دوں۔''

اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی۔ ہوٹل سے باہر آ کر میں نے دوبارہ اپنا ٹھیلا سنبھالا اور دھکیلتا ہوا اس محلے سے بہت دور لے آیا۔ میں نے اپنے ایک آدمی کو فون کر کے بلایا تھا۔

میں نے ٹھیلا اس کے حوالے کیا اور اپنا حلیہ تبدیل کرنے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلے دن مجھے کوئی خاص کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔

اس کباڑیے پر ایک ہلکا سا شک ہو رہا تھا۔ آخر کیوں اس نے بچی کے ساتھ ہمدردی کر کے اسے قلفی ..... دلوائی تھی۔ ہماری لائن میں اس قسم کے چھوٹے چھوٹے سراغ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ میں نے دوسرے دن اس کباڑیے کو چیک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اپنا حلیہ درست کر کے میں ہاسپٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ کاش کسی طرح وہ بچی خود پر ظلم کرنے والے کا حلیہ بتا سکتی۔ لیکن وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ ایک سرجری کے

بعد اس کی دوسری سرجری ہوئی تھی۔
اس دن کی اتنی پروگریس تھی کہ بچی نے ہوش میں آنے کے بعد اس شخص کا حلیہ بتا دیا تھا اور وہ حلیہ بھی کسی کام کا نہیں تھا۔ بچی اس شخص کو پہچانتی نہیں تھی۔ شناخت کے خوف سے اس نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ ایسا شخص کون ہوسکتا تھا۔ خاندان کا کوئی شخص۔ محلے کا یا روزانہ آنے جانے والا۔ جیسا وہ کباڑیا تھا۔ اس کی بھی تو روز کی آمد تھی۔

بہرحال ایک دن اور دیکھنا تھا۔

دوسرے دن میں پھر اسی گلی، اسی محلے میں گھوم رہا تھا۔ کل کی طرح وہ خوبصورت سی بچی پھر دکھائی دے گئی جو ٹھیلے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کا دل پھر قلفی کھانے کو چاہ رہا ہوگا۔

ایک طرف سے کباڑیا بھی آوازیں لگاتا ہوا پہنچ گیا۔ کچھ عورتیں اس کے ٹھیلے کے پاس کھڑی ہوگئیں۔ وہ پرانی چیزیں بیچنے آئی تھیں۔

میں نے بھی اپنا ٹھیلا ایک طرف کھڑا کردیا۔ اسی دوران وہ بچی میرے ٹھیلے کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ ”کیا بات ہے، قلفی چاہیے۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں انکل۔“ وہ گڑبڑا کر بولی۔ ”میں تو بس یوں ہی آگئی۔“

وہ جانے لگی تھی۔ لیکن میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ ”بات سنو۔“

”جی انکل۔“ اس نے رک کر پوچھا۔

”یہ لو۔“ میں نے مٹکے سے ایک قلفی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ ”یہ آج میری طرف سے۔ میں اس کے پیسے نہیں لوں گا۔“

اس نے جھجکتے ہوئے میرے ہاتھ سے قلفی لے لی اور اسی وقت ایک آدمی میرے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ بچی اسے دیکھ کر جھجک کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔

نہ جانے کیوں اس آدمی کو دیکھ کر میری چھٹی حس بے دار ہونے لگی تھی۔ بظاہر وہ ایک معقول آدمی دکھائی دیتا تھا۔ بچی بھی اسے پہچانتی تھی۔ اس نے بچی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا ہو رہا ہے حمیدہ۔“

”انکل، قلفی لینے آئی تھی۔“ بچی نے بوکھلا کر کہا۔

”بس جاؤ اب گھر جاؤ شاباش۔“

بچی جلدی سے اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔ اس آدمی نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”کتنے پیسے لیے ہیں اس بچی سے۔“

”پیسے کہاں لیے ہیں صاحب۔“ میں نے بتایا۔ ”میں نے تو یوں ہی دے دی تھی۔“

”کیوں، بغیر پیسے کے کیوں دے دی؟“

”کیا بتاؤں صاحب، یہ بچی اچھی لگی۔ بھولی بھالی سی ہے۔ کل یہ بے چاری قلفی لینے آئی تو اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ پھر ایک ٹھیلے والے کباڑیے نے قلفی کے پیسے دے دیے تھے۔ مجھے وہ بندہ اچھا نہیں لگا۔ اسی لیے آج میں نے اپنی طرف سے دے دی۔ ایسا نہ ہو کہ بے چاری بچی اِدھر اُدھر ہو جائے۔“

”ٹھیک کہتے ہو تم۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”وہ کباڑیا ایک نمبر کا بدمعاش ہے۔ محلے میں اس کا آنا جانا بند کرانا ہوگا۔“

وہ یہ بول کر چلا گیا۔

بظاہر تو اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی جو غیر معمولی ہوتی۔ لیکن میرے دل کو کھٹکا ہوگیا تھا۔ وہ آدمی اسی محلے کا معلوم ہوتا تھا۔ اسی لیے بچی اسے جانتی تھی۔

دوسرا دن بھی یوں ہی گزر گیا۔ لیکن تیسرے دن کامیابی مل ہی گئی۔ میں جب معمول کے مطابق ٹھیلا لے کر اس گلی میں پہنچا تو وہ بچی میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔

”کیا بات ہے۔ قلفی چاہیے۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، قلفی انکل دلائیں گے۔“ اس نے کہا۔

”کون انکل۔“

”انکل شاہد۔“ اس نے بتایا۔ ”وہی جو کل آئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ روز قلفی دلا دیا کروں گا۔ وہ آنے ہی والے ہوں گے۔“

”بیٹا تمہارے یہ انکل شاہد کہاں رہتے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ... وہ اس مکان میں۔“ اس نے گلی کے آخری مکان کی طرف اشارہ کردیا۔

”کون رہتا ہے ان کے ساتھ؟“

”کوئی نہیں، اکیلے رہتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”اچھا، بیوی بچے نہیں ہیں ان کے۔“

”نہیں تو، کوئی نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”وہ آرہے ہیں انکل۔“

وہی آدمی تیز تیز ٹھیلے کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ پاس آکر اس نے بچی کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے پوچھا۔ ”کس وقت آئیں۔“

”بس ابھی آئی ہوں انکل۔“ بچی نے بتایا۔ پھر اس نے اس انداز سے میری طرف دیکھا جیسے سمجھا رہی ہو کہ اس نے انکل شاہد کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے وہ ظاہر نہ کروں۔

”لاؤ بھائی، اس کو دو قلفیاں دے دو۔“ اس آدمی نے دس کا نوٹ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے دو قلفیاں مٹکے سے نکال کر بچی کی طرف بڑھا دیں۔ بچی قلفیاں لے کر اپنے گھر کی طرف چل دی تھی۔

”کیا بات ہے..... وہ کباڑیا نظر نہیں آرہا۔“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”پتا نہیں صاحب، مجھے نہیں معلوم۔“

”ایک نمبر کا بدمعاش ہے۔ اگر یہ بچی اس کے ٹھیلے کے پاس دکھائی دے تو ڈانٹ کر بھگا دینا۔“

”ٹھیک ہے صاحب۔“ میں نے گردن ہلا دی۔

چونکہ ابھی تک کوئی خاص بات سامنے نہیں آئی تھی اس لیے میں نے ایک جوا کھیلنے کا فیصلہ کرلیا۔ محلے میں اس قسم کے واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی فلاں انکل نے قلفی دلا دی۔ کبھی فلاں نے پیار سے بلا لیا۔ یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہوتی۔

میں نے سوچا کہ اگر میں اس ڈگر پر کام کرتا رہا تو برسوں تک کچھ بھی معلوم نہیں ہوسکے گا۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا اور جب وہ شخص میرے ٹھیلے کے پاس سے جانے لگا تو میں نے اسے آواز دی۔ ”بھائی صاحب، ذرا بات سنیں۔“

وہ میرے پاس آگیا۔ ”ہاں کہو، کیا بات ہے۔“

”صاحب، یہ جو بچی ہے نا...“ میں نے جان بوجھ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ہاں بتاؤ، کیا ہے؟“

”جانے دیں صاحب، آپ پتا نہیں کیا سمجھیں۔ اس محلے میں پہلے ہی ایک واردات ہوچکی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں پھنس جاؤں۔“

”ارے نہیں بھائی، تم کیوں پھنسنے لگے۔“ اس نے بے تکلفی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”بتا بھی دو۔“

دنیا کے کسی بھی گوشے میں، اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

''نہیں صاحب، وہ آپ کی رشتے دار ہوئی تو آپ تو میری جان کو آجائیں گے۔''

''نہیں بھائی، کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ اسی محلے میں رہتی ہے۔ تم بتاؤ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''صاحب، بچی بہت اچھی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ بہت پیاری ہے۔ خوبصورت....'' میں نے ہچکچانے کا مظاہرہ کیا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' اس بار اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''لیکن تمہیں کیا، تم اپنے کام سے کام رکھو۔''

''میں تو یوں ہی کہہ رہا تھا صاحب۔'' میں نے سہم جانے کی ایکٹنگ کی۔ ''آپ برا نہ مانیں۔''

''اس قسم کی باتیں ذرا احتیاط سے کیا کرو۔'' اس نے کہا۔ ''کسی اور نے سن لیا تو مصیبت آجائے گی۔''

''ٹھیک ہے صاحب، آپ نے سمجھا دیا تو ایسا ہی کروں گا۔''

وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں نے دانہ ڈال دیا تھا اور میرا تجربہ اور میرا مشاہدہ یہ بتا رہا تھا کہ اس شخص کے ساتھ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

اب مجھے اپنے اگلے مرحلے پر کام کرنا تھا۔ میں نے بنیاد تو ڈال دی تھی لیکن اس کے لیے کچھ محنت کی ضرورت تھی اور وہ محنت کیا تھی۔ وہ میں بعد میں بتاؤں گا۔

اگلی دوپہر کو وہ بچی پھر گلی میں دکھائی دی۔ میں نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلالیا۔ ''کیا بات ہے، آج قلفی نہیں لینی۔''

''لینی ہے انکل۔'' اس نے گردن ہلائی۔

''میں تمہیں بہت سے کھلونے بھی دوں گا۔ میرے پاس رکھے ہیں۔ تم چلوگی میرے ساتھ۔''

وہ کچھ گھبرا رہی تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دلایا تو وہ میرے ساتھ چلنے کو تیار ہوگئی۔ ''بس اب تم میرے ٹھیلے کے ساتھ ساتھ چلتی رہو۔'' میں نے کہا۔

گرمی کی دوپہر تھی۔ اسی لیے وہ گلی اس وقت بالکل ویران ہو رہی تھی۔ سوائے دو چار بچوں کے اور کوئی نہیں تھا اور ان کا بھی دھیان دوسری طرف تھا۔

میں آہستہ آہستہ ٹھیلا آگے بڑھاتا گیا۔ وہ بچی کچھ فاصلہ دے کر ٹھیلے کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی کہ اچانک وہ شخص کسی طرف سے نکل کر ہمارے سامنے آگیا۔ ''رک جاؤ، کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''صاحب... وہ۔ وہ میں... میں واپس جا رہا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''اور یہ بچی... یہ کیوں تمہارے ساتھ چل رہی ہے۔'' اس نے پوچھا۔ ''کہاں لے جا رہے ہو اس کو۔''

''صاحب میرے پاس کچھ کھلونے رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا اس بچی کو دے دوں۔''

اس آدمی نے ادھر اُدھر دیکھا۔ گلی ویران ہی تھی۔ اس نے میرے پاس آکر سرگوشی کی۔ ''کیا ارادے ہیں تیرے؟''

''وہ صاحب....'' میں نے دانت نکال دیے اور اسی کے انداز میں سرگوشی کی۔ ''بس صاحب، اب کیا بتاؤں۔ تم خود سمجھ لو۔''

''گھر کہاں ہے تمہارا؟''

''گولیمار میں ہے صاحب۔''

''وہ تو یہاں سے بہت دور ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ایسا کر، میرے گھر میں لے آ۔ ویسے تو آتی نہیں ہے۔ تیری وجہ سے آجائے گی۔''

''ٹھیک ہے صاحب، تم گھر چلو۔ لیکن اس نے واویلا مچا دیا تو میرا تو کچھ نہیں ہے۔ محلے میں تمہاری عزت چلی جائے گی۔''

''کیسے مچائے گی واویلا۔ مجھے چپ کرنا آتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''جلدی کر۔ ابھی گلی سنسان ہے۔ ایسا نہ ہو کوئی نکل ہی آئے۔''

''تم اندر جاؤ، میں آرہا ہوں۔''

وہ جلدی سے اپنے گھر کے اندر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اس بچی کو اشارہ کیا کہ وہ انکل شاہد کے مکان میں داخل ہوجائے۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی اندر داخل ہوگیا تھا۔

ہمارے داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ ''انکل، دروازہ کھول دیں۔'' اس بچی نے کہا۔

''خاموش۔'' اب اس شخص کے تیور اچانک بدل گئے تھے۔ ''آواز نکالی تو زبان کاٹ دوں گا۔''

اس نے میز پر رکھا ہوا ایک چھرا اٹھا لیا۔ جس کو دیکھ کر وہ بچی کانپنے لگی تھی۔ ''یار، تم تو ان کاموں کے ماسٹر معلوم ہوتے ہو۔'' میں نے اس کی تعریف کی۔

''ابے، یہ چوتھا کیس ہوگا۔'' وہ فخریہ طور پر بولا۔

"اور وہ اس محلے کی جس بچی کا معاملہ تھا، کیا اس میں بھی تمہارا ہاتھ تھا۔"

"ہاں۔ اور تجھے اس لیے بتا رہا ہوں کہ تو بھی میری ہی لائن کا بندہ نکلا ہے۔" اس نے کہا۔ "یہ سالی بچیاں اس عمر میں بھی ایسی مزے کی ہوتی ہیں کہ بس۔" اس نے ایک لذت آمیز سسکاری لی۔ "اب چل یار، اس کو اندر والے کمرے میں لے چل۔"

اور اسی وقت میں نے ایک زوردار گھونسا اس کو رسید کر دیا۔ گھونسا کھا کر وہ دیوار سے جا ٹکرایا تھا۔ چھرا اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے۔

دروازے پر دستک ہونے لگی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ اس بچی کے ماں باپ اور محلے کے کچھ لوگ دروازے پر تھے۔

"یہی ہے وہ آدمی۔" میں نے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ "اسی نے محلے کی اس بچی کے ساتھ ایسی درندگی کی تھی۔"

"یہ جھوٹ بولتا ہے۔" اس آدمی نے شور کیا۔ "یہ ٹھیلے والا بچی کو بہکا کر لایا تھا۔"

"بیٹے، میں ٹھیلے والا نہیں ہوں۔ ایجنسی کا آدمی ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور اس بچی کا یہاں تک آنا پوری پلاننگ تھی میں نے تجھے پکڑنے کے لیے کل رات ہی بچی کے ماں باپ اور محلے والوں کو سمجھا دیا تھا۔"

اس آدمی نے اپنی گردن ڈال دی۔

محلے والے اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ اگر میں مداخلت نہیں کرتا تو شاید اسے جان ہی سے مار دیتے۔ اسی دوران پولیس بھی آ گئی تھی جو اس آدمی کو اپنے ساتھ لے گئی۔

میری یہ حکمتِ عملی بے ڈھنگی سہی۔ لیکن اس بچی کے معاملے میں کارآمد رہی تھی۔

دوسرے دن مجھے پھر اسی اعلیٰ آفیسر کے سامنے جانا پڑا جس نے یہ کیس میرے والے کیا تھا۔

"آپ نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اس کیس کو حل کیا ہے۔" اس نے کہا۔

"شکریہ جناب۔"

"لیکن آپ کے ذہن میں یہ طریقہ کہاں سے آ گیا؟" اس نے پوچھا۔

"اس لیے کہ اس قسم کی وارداتیں عام طور پر جان پہچان کے لوگ ہی کیا کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "محلے کے ایسے لوگ جن پر کسی کا دھیان نہ جاتے یا گلیوں میں پھیری لگانے والے۔ بچے تو بچے ہوتے ہیں۔ انہیں ذرا سے لالچ سے بہکایا جا سکتا ہے۔ پھر دردناک کہانیاں سامنے آ جاتی ہیں۔"

"حامد صاحب، کیا آپ نے آج کا اخبار دیکھا ہے؟" آفیسر نے پوچھا۔

"نہیں جناب، آج اخبار دیکھنے کی فرصت نہیں ملی۔ کوئی خاص خبر۔"

"ہاں۔ ملک کے دیگر حصوں میں بھی اس قسم کی تین اور وارداتیں ہو چکی ہیں۔" اس نے بتایا۔ "اب ظاہر ہے کہ ہم پورے ملک میں تو آپ کو بھیج نہیں سکتے۔ اس لیے فی الحال اپنے شہر میں جو نئی واردات ہوئی ہے ذرا اس کا سراغ لگائیں۔"

"نہیں صاحب، اب نہیں۔ اب میں یہ نہیں کر سکوں گا۔" میں نے کہا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ میں ایک بے بس آدمی ہوں۔ قانون نے میرے ہاتھ باندھ دیے ہیں۔ جبکہ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں گندے انکلوں کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ہر محلہ، ہر گلی، ہر خاندان میں ایک گندا انکل بیٹھا ہوا ہے۔ جس کی ہوسناک نگاہیں خوبصورت بچیوں پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہیں۔ آپ اور ہم کہاں تک پورے ملک میں بھٹکتے رہیں گے۔ اب یہ کام تو بچوں کے ماں باپ کا ہے جو ایسے گندے انکلوں پر نظر رکھیں اور بچوں کو ان کے قریب نہ جانے دیں۔ یہ جذبہ بہت طاقت ور اور منہ زور ہوتا ہے جناب۔ جب تک معاشرے میں انتہائی درجے کی حساسیت پیدا نہیں ہو گی، یہ سب ایسا ہی چلتا رہے گا۔ ایسا ہی رہے گا۔"

بولتے بولتے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میں سچ ہی کہہ رہا تھا۔ آخر میں کس کس محاذ پر جنگ لڑ سکتا تھا۔ کاش والدین خود یہ احساس کر لیں کہ اب اس معاشرے میں ہمیں کسی پر بھروسا نہیں کرنا ہے تو شاید سب ٹھیک ہو جائے۔

بے لگام جذبے

محترم ایڈیٹر

السلام علیکم!

میں نے اپنی رودادِ حیات قلمبند تو کرلی ہے لیکن اپنا اصل نام نہیں لکھا ہے۔ اسے میں مخفی رکھنا چاہتا ہوں۔ اپنی روداد اس لیے بھی قلمبند کررہا ہوں تاکہ قارئین سبق حاصل کرسکیں۔ رشتے ناتے کچھ نہیں ہوتے۔ عمل وکردار اہم ہوتا ہے جس کا اندازہ آپ کو میری آپ بیتی پڑھ کر ہوجائے گا۔

اعظم

(بھکر)

قیامتِ صغریٰ کا منظر تھا، میری آنکھیں پتھرا کر رہ گئی تھیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ منظر دیکھ کر میری حرکت قلب بند کیوں نہ ہو گئی۔ صحن کے عین درمیان میں میرے باپ کی لاش پڑی تھی۔ مرنے کے بعد بھی ان کی عقابی آنکھوں میں ایک رعب تھا، ایک دبدبہ تھا۔ ان کے جسم میں نہ جانے کتنی گولیاں لگی تھیں؟ جسم کے گرد خون کا تالاب سا بن گیا تھا۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے باپ کے بھاری بھرکم اور ورزشی جسم کو دیکھا۔

ابھی تین دن پہلے ہی تو وہ آن بان کے ساتھ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے رخصت کی اجازت چاہی تھی تو انہوں نے مجھے سینے سے لگالیا تھا اور دروازے تک رخصت کرنے آئے تھے۔

ان کے نزدیک ہی ان کے ملازم خاص میر علی کی لاش پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف جیسے منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔

حویلی کے برآمدے میں میری پھولوں جیسی نازک اور خوبصورت بہن خاک وخون میں نہائی پڑی تھی۔ اس کی لاش دیکھ کر میرے دل میں ہوک سی اٹھی۔ اس کی ابھی عمر ہی کیا تھی؟ اس بے چاری نے تو ابھی گزشتہ مہینے اپنی سولہویں سالگرہ منائی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی دل موہ لینے والی مسکراہٹ تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی ہنستی ہوئی اٹھے گی اور "بھیا" کہہ کر مجھ سے لپٹ جائے گی۔ اس کے چہرے اور ریشمی بالوں میں مٹی لگی ہوئی تھی۔ میں نے بے اختیار اس کے خوبصورت چہرے سے گرد صاف کی پھر اس کا لمبا چوڑا دوپٹا اس پر ڈال دیا جو اس کے جسم کے نیچے دبا ہوا تھا۔

ڈرائنگ روم کے دروازے پر میرے چھوٹے بھائی اعجاز کی لاش تھی۔ وہ کلثوم سے دو سال چھوٹا تھا، گھر بھر کا لاڈلا اس وقت اپنے ہی خون میں نہایا ہوا پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے ابا جی کا ریوالور بھی نظر آیا۔ غالباً اس نے حملہ آوروں سے مقابلہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ میں بہ مشکل تمام اپنے ریزہ ریزہ وجود کو سمیٹے کھڑا تھا۔ ماں باپ اور بہن بھائی کی لاشیں دیکھ کر میرا ذہن ایسا ماؤف ہوا تھا کہ مجھے حویلی کے صحن میں جابجا پڑی ملازموں کی لاشیں پہلی نظر میں تو دکھائی ہی نہیں دی تھیں۔ ان میں سے بیشتر کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے لیکن وہ ہتھیار بھی ان کی جانیں نہ بچا سکے تھے۔

اچانک مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے صحن میں پڑے ہوئے ایک ملازم کی رائفل اور گولیوں کی پیٹی اٹھائی اور ایک ستون کی آڑ میں ہوگیا۔

قدموں کی آہٹ اب مزید نزدیک آگئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت آہستہ آہستہ چل رہا ہو۔

میں نے رائفل سنبھالی اور فائر کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔

چند لمحوں کے انتظار کے بعد مجھے ایک آدمی دکھائی دیا۔ وہ چند قدم آگے بڑھا۔ میں فائر کرنے ہی والا تھا کہ وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر مجھے فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ آنے والا بری طرح زخمی ہے۔ اس کے زخموں سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ میں نے رائفل کی نال جھکادی اور زخمی کی طرف بڑھا۔ مجھے اس کا چہرہ کچھ شناسا سا محسوس ہوا لیکن یہ یاد نہیں آرہا تھا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے۔

میں محتاط انداز میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اس کے پیچھے کوئی اور نہ آجائے۔

میں نے چوکنے انداز میں ارد گرد دیکھا، پھر زخمی کے نزدیک بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

"کون ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

زخمی نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ اس کی نظر میرے چہرے پر پڑی تو وہ نحیف آواز میں بولا۔ "آپ...... یہاں سے...... بھاگ جائیں...... چھوٹے ملک صاحب!...... آپ کی جان...... خطرے...... میں ہے۔"

"لیکن کیوں؟" میں نے کہا۔ "میری جان کیوں خطرے میں ہے؟"

"ان لوگوں نے میری...... آنکھوں کے...... سامنے...... حویلی کے ایک ایک آدمی...... کو مار دیا...... وہ......"

اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔

میں جھپٹ کر اندر گیا اور اس کے لیے پانی لے آیا۔ میں نے اس کا سر اٹھا کر اسے پانی پلایا۔ پانی پی کر وہ کچھ سنبھل گیا۔

"کن لوگوں نے کیا ہے یہ سب کچھ اور تم کون ہو؟"

"ملک شہباز کے آدمیوں نے آپ کے گھر پر حملہ کیا تھا۔ ملک شہباز خود بھی موجود تھا۔"

"بکواس کرتے ہو تم؟" میں نے چیخ کر کہا۔ "شہباز بھائی ایسا کیوں کریں گے؟" ملک شہباز میرا ماموں زاد تھا۔

"میں اگر اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا تو مجھے بھی یقین نہ آتا۔" اس نے نحیف لہجے میں کہا۔ "آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں شکور ہوں چھوٹے ملک صاحب!"

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ شکور بچپن میں ہماری حویلی میں کام کرتا تھا۔ پھر میں نے سنا تھا کہ وہ لاہور چلا گیا۔

"تم زخمی کیسے ہوئے شکور؟" میں نے پوچھا۔

"میں آج ہی لاہور سے یہاں پہنچا تھا!" شکور بولا۔ "میں حویلی میں داخل ہی ہوا تھا کہ ملک شہباز دس بارہ آدمیوں کے ساتھ یہاں آگیا۔ اس کے آدمیوں نے حویلی میں گھستے ہی فائرنگ شروع کر دی۔ دو گولیاں مجھے بھی لگی ہیں۔ میں بے ہوش ہو کر گر گیا۔ وہ لوگ مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔"

"لیکن اچانک ایسا کیا ہوگیا کہ......" میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔" شکور نے جواب دیا۔ "میں گرتا پڑتا باہر نکلا کہ گاؤں والوں سے کچھ معلوم کروں لیکن گاؤں کا ہر آدمی گھر میں بند ہو کر بیٹھ گیا ہے۔"

"تم میرے ساتھ آؤ۔" میں نے شکور سے کہا۔ "ہم پہلے پولیس اسٹیشن جائیں گے، پھر تمہیں اسپتال لے چلوں گا۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہے ملک صاحب!" اس نے نحیف لہجے میں کہا۔ "پولیس الٹا آپ کو پریشان کرے گی۔ یہاں کا تھانے دار بھی ملک شہباز کے ہاتھوں بک چکا ہے۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں، صاحب جی؟" شکور نے نحیف آواز میں کہا۔ "جب ملک شہباز نے حویلی پر حملہ کیا تو تھانے دار بھی اس کے ساتھ تھا...... آپ یہاں سے...... چلے جائیں...... وہ لوگ اب آپ کی تلاش میں لاہور گئے ہیں۔"

اسی وقت باہر گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ میں چونک اٹھا۔ پھر میں نے پھرتی سے شکور کو اٹھایا اور اندر لے گیا۔ اس کے بعد میں رائفل سنبھال کر دروازے کے پاس بیٹھ گیا۔

شکور کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی۔ اس کا خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔

پھر مجھے حویلی کے صحن میں دو آدمی دکھائی دیے۔ میں ان دونوں کو پہچانتا تھا۔ وہ کرم داد اور خان محمد تھے۔ دونوں ابا جی کے گارڈز تھے۔ وہ دونوں دہشت زدہ نظروں سے وہاں بکھری ہوئی لاشوں کو دیکھ رہے تھے۔

پھر ان کی نظر ابا جی کی لاش پر پڑی۔ وہ دونوں جھپٹ کر لاش کے پاس پہنچے اور بلک بلک کر رونے لگے۔

کرم داد اچانک کھڑا ہوگیا اور غصے میں مٹھیاں بھینچ کر چیخا۔ "ملک صاحب! میں آپ کے قاتلوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں پورے گاؤں کو آگ لگا دوں گا۔ کوئی یہاں گھس کر ملک صاحب کو قتل کر گیا اور گاؤں والوں کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگی۔ میں گاؤں کے ایک ایک آدمی کو ختم کر دوں گا۔"

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطہ اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس
03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
مندرجہ ذیل فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

''کرم داد!'' میں نے اچانک اسے آواز دی۔

اس نے چونک کر کمرے کی طرف دیکھا، پھر تیزی سے آگے بڑھا۔ ''چھوٹے ملک صاحب...... آپ...... لاہور سے کب آئے؟'' اس نے پوچھا۔ ''اور یہ سب کیسے ہوا؟''

''میں نہیں جانتا کرم داد!'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''جب میں یہاں پہنچا تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے خود پر ضبط نہ کر سکا اور رونے لگا۔ ''شکور نے بتایا ہے کہ حویلی پر حملہ کرنے والا ملک شہباز تھا۔''

کرم داد چونک کر بولا۔ ''ملک شہباز!...... وہ حویلی پر حملہ کیوں کریں گے۔ نہیں چھوٹے ملک صاحب...... ملک شہباز......''

''میں نے انہیں اور...... ان کے آدمیوں...... کو اپنی...... آنکھوں سے...... دیکھا ہے۔'' شکور نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ورنہ مجھے بھی اس بات پر یقین...... نہ آتا۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''وقت ضائع مت...... کریں...... ملک صاحب...... آپ یہاں...... سے نکل جائیں...... آپ کی جان خطرے میں...... ہے۔''

''کرم داد!'' میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''شکور کو اٹھا کر لے چلو۔ یہ بہت شدید زخمی ہے۔''

میں نے اس کی آنکھیں بند کیں اور کھڑا ہو کر اپنے پیاروں پہ نظر دوڑائی۔

اس وقت میرے کانوں میں کسی گاڑی کے انجن کی آواز آئی۔ وہ آواز اگرچہ بہت دور تھی لیکن میرے حساس کانوں نے وہ آواز سن لی۔ میں نے جھپٹ کر وہاں پڑی رائفل اور اس کی بلٹ اٹھائی اور باہر کی طرف لپکا۔

آواز اب مزید واضح ہو گئی تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک سے زیادہ گاڑیوں کے انجن کی آواز تھی۔

میں نے لاشوں کے پاس سے ایک ریوالور بھی اٹھا لیا تھا اور تیزی سے سامنے والے کھیتوں میں چلا گیا۔

چند منٹ بعد وہاں دو گاڑیاں آ کر رکیں۔ ان میں سے ایک پجارو تھی اور دوسری پرانی سی جیپ!

ان میں سوار افراد نیچے اترے تو میں نے ملک آفتاب کے بیٹے شہباز اور اس کے ملازم خاص ابراہیم کو پہچان لیا۔ گویا میرے باپ اور خاندان کے دیگر افراد کے قتل کا ذمے دار ملک شہباز تھا۔

میں اس وقت ایک گھنے درخت کی شاخوں میں چھپا بیٹھا تھا۔

میری گاڑی گاؤں آتے وقت خراب ہو گئی تھی۔ میں نے گاڑی وہیں چھوڑ کر مکینک کو ٹیلی فون کر دیا تھا۔ مکینک کی ورک شاپ جہلم میں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک میری گاڑی جہلم پہنچ چکی ہوگی۔ یہ بھی ایک طرح سے میرے حق میں بہتر ہی ہوا تھا۔ اگر میری گاڑی یہاں موجود ہوتی تو ان دونوں کو یقین ہو جاتا کہ میں اس وقت وہیں موجود ہوں یا گاؤں میں کہیں چھپا ہوا ہوں۔

''اوئے دیکھ، وہ اعظم پہنچا کہ نہیں؟'' یہ آواز ملک آفتاب کے بیٹے کی تھی۔

''اعظم اگر یہاں پہنچا ہوتا تو اس کی گاڑی بھی موجود ہوتی۔'' ابراہیم نے جواب دیا۔

''اوئے، کبھی اپنی عقل بھی استعمال کر لیا کر۔'' شہباز نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔ ''ضروری نہیں ہے کہ اس نے گاڑی یہیں کھڑی کی ہو۔ وہ گاؤں میں کہیں بھی گاڑی چھپا سکتا ہے۔''

''میں گاؤں والوں سے معلوم کرتا ہوں کہ کسی نے چھوٹے چوہدری کی گاڑی دیکھی ہے یا نہیں؟ گاؤں میں گاڑیاں ویسے بھی چوہدری اور جاگیرداروں کے پاس ہوتی ہیں، پھر اعظم کی گاڑی تو شہر میں بھی پہچانی جا سکتی ہے، بالکل نئی لینڈ کروزر ہے۔'' ابراہیم نے کہا۔

''اوئے زیادہ تقریر نہ جھاڑ کے افلاطون دی اولاد!'' شہباز نے کہا۔ جا کے اس کمینے کو ڈھونڈ، اگر وہ بچ گیا تو ہمارے لیے بہت مصیبت ہو جائے گی۔''

ان میں سے ایک آدمی حویلی کے اندر چلا گیا۔ بقیہ لوگ ارد گرد مجھے تلاش کرنے لگے۔ ملک شہباز بھی گاڑی سے اتر کر کھڑا ہو گیا اور سگریٹ سلگا کر ایک گہرا کش لیا۔

اچانک اس نے اوپر کی جانب دیکھا۔ میرا دل اچھل کر گویا حلق میں آ گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس نے مجھے دیکھ لیا ہو۔ میں نے سانس تک روک لی۔ وہ چند لمحے یونہی اوپر دیکھتا رہا پھر سگریٹ پینے میں مصروف ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ باہر آ گیا جو حویلی کے اندر گیا تھا۔

''ہاں، کیا خبر ہے؟'' شہباز نے پوچھا۔

''ملک جی! اندر تو صرف لاشیں ہیں۔ زندہ آدمی تو کوئی نہیں ہے۔ میں نے حویلی کی اچھی طرح تلاشی لی

ہے۔''

چند منٹ بعد دوسرے لوگ بھی واپس آ گئے۔ ابراہیم نے کہا۔ ''ملک صاحب! میں نے گاؤں کے دو چار لوگوں سے معلوم کیا ہے۔ ان میں سے کسی نے بھی چوہدری اعظم کی گاڑی نہیں دیکھی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ کتے دا پتر ابھی تک گاؤں پہنچا ہی نہیں ہے۔'' شہباز نے کہا۔ ''بالے اور رحمت!'' اس نے اپنے آدمیوں کو مخاطب کیا۔ ''تم گاؤں آنے والے راستے پر جا کر بیٹھو۔ اس حرام زادے کی گاڑی نظر آئے تو فوراً مجھے اطلاع دینا۔ رشید! تو اس کچے راستے پر جا کر بیٹھ جہاں سے بیل گاڑیاں اور ڈھور ڈنگر آتے ہیں۔ وہ اس گاؤں کے ہر راستے سے واقف ہے۔ اس راستے سے بھی آ سکتا ہے۔''

اس کا حکم سن کر اس کے آدمی وہاں سے چلے گئے۔ چار آدمی اب بھی اس کے ساتھ تھے۔

اچانک ایک اور افتاد آ پڑی۔ آسمان تو پہلے ہی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پہلے تو اچانک موٹی موٹی بارش کی بوندیں گریں، پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ میں اس صورت حال سے پریشان ہو گیا لیکن اچانک میری نظر اپنے جوتوں کے ان نشانات پر پڑی جو اندر جانے کی وجہ سے خون میں لتھڑ گئے تھے اور واپسی پر کچی زمین پر میرے جوتوں کے سول کے نشانات بن گئے تھے۔ وہ لوگ میری آمد کے بارے میں اتنے پُرتجسس تھے کہ کسی نے بھی ان نشانات پر توجہ نہ دی ورنہ اب تک وہ لوگ مجھے پکڑ چکے ہوتے۔ بارش کی وجہ سے کچی مٹی پر بننے والے نشانات معدوم ہو گئے۔

مجھے زیادہ فکر اس اسلحے کی تھی جو میرے پاس تھا۔ اس کے کارتوس اور میگزینز بارش میں بھیگ کر خراب ہو گئے تھے۔ میں نے حتی الامکان یہ کوشش کی کہ اپنے اسلحے کو اس بارش سے بچا کر رکھوں۔ یوں بھی وہ درخت بہت گھنا تھا اور بارش کا پانی بہت کم مجھے بھگو رہا تھا۔

میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں مجھے نیند ہی نہ آ جائے۔ نیند کا آنا گویا ہمیشہ کے لیے سو جانا تھا۔ وہ درخت اگرچہ محفوظ تھا لیکن اس کی شاخیں ایسی نہیں تھیں کہ میں ان کے درمیان خود کو چھپا کر بیٹھ سکتا۔

اچانک دور سے کسی رائفل کے فائر کی آواز آئی میں بری طرح چونک اٹھا۔ ان لوگوں نے میرے دھوکے میں کسی اور کو گولی ماردی تھی۔ نہ جانے ان کی گولی کا نشانہ کون بنا تھا۔

چند منٹ بعد بارش جس پُرشور انداز میں اچانک شروع ہوئی تھی اسی انداز میں تھم بھی گئی۔

مجھے اس بدنصیب کی فکر تھی جو میرے بدلے ان کی گولی کا نشانہ بنا تھا۔

پھر مجھے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ شہباز کے آدمی گھوڑوں پر گئے تھے۔ آنے والا شخص جسے شہباز نے رحمت کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

''اوئے، تو وہاں سے آ کیوں گیا؟'' شہباز نے پوچھا۔ ''اور فائر کس نے کیا تھا؟''

''ملک صاحب...... وہ......''

''اوئے کیا وہ...... وہ کر رہا ہے، منہ سے پھوٹ بات کیا ہے؟'' شہباز گرج کر بولا۔

''ملک صاحب، بالے کو کسی نے گولی ماردی۔''

''کیا بکواس کر رہا ہے؟'' شہباز بھڑک کر بولا۔ ''بالے کو گولی کون مار سکتا ہے۔ گاؤں کے لوگوں میں تو اب سر اٹھانے کی جرأت نہیں ہے۔''

مجھے خود بھی حیرت تھی کہ گاؤں میں میرا ایسا کون سا ہمدرد پیدا ہو گیا جس نے میری خاطر ملک شہباز کے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔

ملک شہباز غصے سے پاگل ہو رہا تھا اور وہ اس شخص کو مغلظات بک رہا تھا جس نے اس کے آدمی کو قتل کرنے کی جرأت کی تھی۔

وہ چیخ کر بولا ''اوئے رحمت! اس آدمی کو تلاش کر جس نے بالے کو قتل کیا ہے اور اسے زندہ یا مردہ میرے سامنے لا۔'' اس نے پھر دو چار انتہائی بھاری بھرکم قسم کی گالیاں دیں۔ پھر اس نے مجھے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ میں برداشت کرتا رہا۔ اچانک اس نے مجھے اتنی غلیظ اور شرمناک گالی دی کہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ خون میری کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا لیکن میں بے بس تھا۔ میں نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ اگر میں زندہ رہا تو ملک شہباز کو اس گالی کے عوض موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ملک شہباز کوئی غیر نہیں بلکہ میرا ماموں زاد تھا۔ میرے بابا اکلوتے تھے اور ہزاروں ایکڑ زرعی اراضی کے بلا شرکتِ غیرے مالک تھے۔ ماموں کی نظریں ان کی جائداد پر تھیں۔ زمین اور جائداد کے چکر میں اکثر بھائی بھائی کا خون کر دیتا ہے۔

ماموں نے بھی اس چکر میں نہ صرف اپنی بہن کا سہاگ اجاڑا تھا بلکہ بہن ہی کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا تھا۔ زمین اور جائداد کی ان کے پاس بھی کمی نہیں تھی لیکن انسان کی ہوس کبھی ختم نہیں ہوتی۔

اب جب تک میں زندہ تھا یہ جائداد انہیں نہیں مل سکتی تھی۔ اس لیے ملک شہباز پاگل کتّے کی طرح مجھے تلاش کر رہا تھا۔

"رشید!" ملک شہباز نے کہا۔ "اس سالے کی لاش کو اٹھا کر کہیں غائب کر دے اور پتا لگا کہ وہ اُلو کا پٹھا چوہدری آخر شہر سے روانہ بھی ہوا ہے یا نہیں؟"

"میں معلوم کر چکا ہوں ملک صاحب!" رشید نے کہا۔ "چوہدری اعظم شہر سے روانہ ہو چکا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ادھر آنے کی بجائے کہیں اور چلا گیا ہو؟"

"اندر جو لاشیں پڑی ہیں ان کا کیا کرنا ہے ملک صاحب؟" رحمت نے پوچھا۔

"اس واردات کو ڈکیتی کی واردات بنا دو، چوہدری کی تجوری سے سارے زیور نکالو، حویلی کا سامان الٹ پلٹ کرو، پھر میں خود ہی ٹیلی فون کرتا ہوں کہ میں ماموں جان سے ملاقات کے لیے آیا تو مجھے یہاں کئی لوگوں کی لاشیں ملیں۔ پولیس کا انچارج اپنا بندہ ہے۔ اسے تو ہم جو بیان دیں گے وہ اسے مان لے گا۔ وہ جانتا ہے کہ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کی ہزاروں روپے مہینا کی آمدنی تو جائے گی ہی، اس کا تبادلہ کسی ایسے دور افتادہ علاقے میں کرا دیا جائے گا جسے پولیس والے عموماً کالا پانی کے نام سے پکارتے ہیں۔"

مجھے اپنے باپ کی موت کا بہت افسوس تھا۔ وہ فرشتہ نہیں تھا لیکن تھا تو میرا باپ! اس میں وہ تمام برائیاں موجود تھیں جو عموماً جاگیرداروں میں ہوتی ہیں، مزاروں پر ظلم کرنا، ان کی لڑکیاں اٹھا لینا، شراب وشباب کی محفلیں سجانا۔ کل تک اسی تھانے کا انچارج میرے باپ کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا لیکن اب...... ہاں، مجھے اپنی مظلوم ومعصوم اور بے قصور ماں کی موت کا شدید غم تھا۔ وہ اللہ کی نیک بندی تھی۔ اس نے کبھی میرے باپ کی مخالفت میں ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے سامنے ان کی اچھائیاں ہی کرتی تھیں۔

دادا جی کے انتقال کے بعد بابا نے شراب وشباب کی محفلیں سجانا شروع کیں تو اماں جی نے خود کو عبادت و ریاضت میں مصروف کر لیا۔ بابا ان سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے لیکن وہ ہمیشہ ان کی خوشی کے لیے کمربستہ رہتی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ میرا بھی بہت خیال رکھتی تھیں۔

میں ان دنوں میٹرک میں تھا جب میں نے پہلی دفعہ بابا کی محفل میں شرکت کی تو انہوں نے ذرا بھی اعتراض نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ بڑے جاگیرداروں کے بیٹوں کو بھی اتنا ہی رعب والا ہونا چاہیے۔

میں اس محفل میں شرکت کر کے رات گئے جب اپنے کمرے میں پہنچا تو میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور سر بری طرح چکرا رہا تھا۔

میں اپنے کمرے میں اماں جی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ان کے چہرے پر رنج وملال کی کیفیت تھی اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

میں انہیں اس حال میں دیکھ کر تڑپ گیا اور ان کی طرف بڑھنے کی کوشش کی لیکن لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا، پھر ان تک پہنچا اور بولا۔ "کیا بات ہے اماں جی؟ آپ آج پریشان کیوں ہیں، کیا بابا نے کچھ کہا ہے؟

"تیرے بابا تو مجھے زندگی بھر کچھ نہ کچھ کہتے آئے ہیں اعظم لیکن آج تو نے مجھے جو صدمہ پہنچایا ہے اس نے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ میں نے تجھے ہمیشہ اچھائی کی ترغیب دی تھی۔ تو بھی ان ہی راستوں پر چل نکلا جو تباہی کی طرف جاتے ہیں۔ میں تیرے بابا کو تو اس راستے پر جانے سے نہیں روک سکی لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ میں تجھے بھی نہیں روک سکوں گی۔ تو اب جوان ہو گیا ہے نا؟ میری بات کب سنے گا۔"

"اماں جی!" میں نے ان کے گلے میں بانہیں ڈالنے کی کوشش کی "آپ ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں۔"

انہوں نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور بولیں۔ "اعظم! تیری سانسوں میں جو تعفن ہے، میں اسے ایک عرصے سے برداشت کر رہی ہوں۔ تیرے بہکتے ہوئے قدم بھی دیکھ رہی ہوں۔ تو نے ثابت کر دیا کہ ماں بیٹے کو جتنی بھی اچھی اور اعلیٰ تربیت دے دے، وہ چلتا باپ ہی کے نقشِ قدم پر ہے۔ آیندہ تو مجھ سے کوئی واسطہ نہ رکھنا۔ تو میرا نہیں بلکہ چوہدری صاحب کا بیٹا ہے۔"

"ایسی باتیں مت کریں اماں جی!" میں نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو اس وقت اپنے حواس میں نہیں ہے اور میرا بھی اس کمرے میں دم گھٹ رہا ہے۔ میں تجھ سے صبح بات کروں گی۔" یہ کہہ کر ماں جی دوپٹے سے آنسو صاف کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔

میں ساری رات بے چین رہا۔ اماں کے غمزدہ اور بے بس چہرے اور ان کے الفاظ نے میری نیند اُڑا دی تھی۔ بابا کے کمرے سے ابھی تک گھنگروؤں کی جھنکار اور ان کے دوستوں کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ اماں جی نے تو عرصہ ہوا بابا کے کمرے میں سونا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک طرح سے گوشہ نشین ہو گئی تھیں۔ صرف اس وقت کمرے سے باہر نکلتی تھیں جب بابا کو ناشتا یا کھانا دینا ہو یا کسی نوکر سے ان کے کپڑے نکلوانا ہوتے تھے۔

جب میری بے چینی حد سے بڑھ گئی تو میں نے باتھ روم کا رخ کیا۔ وہ آتی سردیوں کا موسم تھا اس لیے پانی کچھ سرد تھا لیکن میں دیر تک نہاتا رہا۔ اس سے مجھے کچھ سکون ملا۔ پھر میں بستر پر آ کر ڈھے گیا اور کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

میں علی الصباح اٹھنے کا عادی تھا لیکن اس روز میں دن چڑھے تک سوتا رہا۔

پھر کرم دین نے مجھے آہستہ سے ہلا کر اٹھایا اور بولا۔ "چھوٹے صاحب جی! اٹھ جائیں۔ آدھا دن چڑھ چکا ہے۔"

کرم دین یا اماں جی کے علاوہ کسی کی جرأت نہ تھی کہ مجھے نیند سے بیدار کرتا۔ ان دنوں میں بالکل جاگیرداروں کے بگڑے ہوئے بچوں کی طرح رہتا تھا۔ کوئی نوکر بھولے سے بھی میرے کمرے کے سامنے سے گزر جاتا تو اس کی شامت آ جاتی کہ تجھے معلوم نہیں تھا کہ میں ابھی سو رہا ہوں۔

ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا کیونکہ اماں جی مجھے صبح فجر کے لیے خود اٹھاتی تھیں۔

میں سمجھ گیا کہ اماں جی اب تک مجھ سے ناراض ہیں۔ وہ اس لیے مجھے اٹھانے بھی نہیں آئیں۔

میں نہا دھو کر باہر نکلا تو دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔

دوسرے جاگیرداروں کی دیکھا دیکھی بابا نے مجھے بھی مری کے ایک مہنگے اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ ان دنوں میں چھٹی پر گھر آیا ہوا تھا۔ بابا نے وہ تقریب چونکہ میرے میٹرک میں پاس ہونے کے اہتمام میں کی تھی اس لیے مجھے بھی اس میں شرکت کرنا پڑی تھی۔

وہاں بابا کے دوستوں کے بیٹے بھی موجود تھے۔ ان میں سے زیادہ تر میرے ہم عمر تھے۔ جب میں نے انہیں پیتے دیکھا تو میں نے بھی زندگی میں پہلی دفعہ ڈرتے ڈرتے شراب پی لی۔ میرا خیال تھا کہ بابا میری اس حرکت پہ مجھے ڈانٹیں گے اور ملامت کریں گے لیکن وہ تو اپنے کسی دوست سے مسکرا کر باتیں کر رہے تھے اور گاہے بگاہے مجھ پر بھی نظر ڈال لیتے تھے۔

میں اماں کے کمرے میں پہنچا تو وہ نہ جانے کس وقت کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ نماز سے فارغ ہو کر انہوں نے مجھ

کیموفلاج Camou flage

اکثر جانوروں کے جسم پر ایسے نشانات ہوتے ہیں کہ ان پر کسی پودے یا جھاڑی کا شبہ ہوتا ہے اور وہ اپنے پس منظر میں ایسے مل جاتے ہیں کہ شناخت دشوار ہو جاتی ہے۔ گھنے جنگلوں میں جہاں روشنی درختوں سے چھن کر زمین پر آتی ہے، چیتا پاس ہی کیوں نہ بیٹھا ہو، بالکل دکھائی نہ دے گا۔ بہت سے کیڑے مکوڑوں پر پتوں اور کونپلوں کا گمان ہوتا ہے۔ تتلیاں بھی رنگ برنگ کے پتے معلوم ہوتی ہیں۔ گرگٹ اور مینڈک ماحول کے مطابق اپنا رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ قطبین کے جانوروں (لومڑی خرگوش وغیرہ) کے جسم پر سردیوں میں برف باری کے وقت سفید رُواں پیدا ہو جاتا ہے۔ ارمین (ایک سموری جانور) سرما میں اپنا سمور بدل کر بالکل سفید ہو جاتا ہے۔

مندرجہ بالا مشاہدات کی روشنی میں فوجی ماہرین نے دورانِ جنگ میں سامانِ حرب اور فوجی مقامات کو دشمن کے ہوابازوں کی نظر سے چھپانے کے لیے ایک تکنیک ایجاد کی، جسے کیموفلاج کہتے ہیں۔ مکانوں کی چھتوں، موٹر گاڑیوں اور جہازوں وغیرہ پر ہرا رنگ، جس پر سیاہی مائل مٹیالے دھبے ہوں، چڑھا دیتے ہیں۔ میدان میں کھڑی گاڑیوں پر جالی لگا دی جاتی ہے۔ ایسا کرنے سے ان چیزوں کی آسانی سے شناخت نہیں ہوتی اور نقصان یا تباہی کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔

مرسلہ: ذیشان الرحمان، پھالیہ

پر دم کیا اور ناراض ناراض سی اپنے بیڈ پر جا بیٹھیں۔

''اماں جی! آپ مجھ سے اب تک ناراض ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اعظم!'' اماں جی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''آیندہ مجھے اماں جی مت کہنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میرے اندر کا خودسر جاگیردار بیدار ہوگیا۔

''میں اسکول سے چھٹی پر یہاں صرف آپ کی وجہ سے آتا ہوں۔ آیندہ میں اس طرف کا رخ بھی نہیں کروں گا۔ اپنے کسی دوست کے گاؤں چلا جاؤں گا۔ لاہور یا اسلام آباد چلا جاؤں گا لیکن یہاں نہیں آؤں گا۔''

اماں جی نے مجھے زخمی نظروں سے دیکھا اور بولیں۔ ''ٹھیک ہے بیٹا! تو اگر اپنے باپ جیسا بننا چاہتا ہے تو پھر یہاں نہ آنا ہی بہتر ہے۔''

مجھے اماں جی سے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ وہ میری اس دھمکی کو سن کر موم ہو جائیں گی اور رو رو کر میری خوشامد کریں گی کہ ایسا مت کرنا، میں.... جانتا تھا کہ وہ مجھے ٹوٹ کر چاہتی ہیں لیکن انہوں نے صاف صاف جواب دے دیا تھا۔ میں خود بھی ان کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور بولا۔ ''اماں جی! آپ کو میری قسم مجھے معاف کردیں۔''

اماں جی تڑپ کر رہ گئیں، پھر گلوگیر لہجے میں بولیں۔ ''اعظم میں تجھے ایک شرط پر معاف کرسکتی ہوں۔ تو ابھی اور اسی وقت مجھ سے وعدہ کر کہ تو آیندہ نہ شراب کو ہاتھ لگائے گا، نہ اپنے باپ کی کسی ایسی محفل میں شریک ہوگا۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں اماں جی!'' میں نے کہا۔ ''آیندہ یہ نہیں ہوگا۔''

''ایسے نہیں اعظم! میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا کہ تو آیندہ اپنے باپ والی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔ نہ مزارعوں پر ظلم کرے گا، نہ گاؤں کی کسی لڑکی کو بری آنکھ سے دیکھے گا۔''

میں چند لمحے کے لیے ہچکچایا۔ پھر اماں جی کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی ''آیندہ میں کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کروں گا جس سے آپ کو صدمہ ہو۔''

اماں جی نے مجھے سینے سے لگالیا اور میری پیشانی چوم کر بولیں۔ ''اعظم بیٹا! مجھے تجھ سے یہی امید تھی۔ چل، اب ناشتا کر لے، رات سے بھوکا ہے اور اب دوپہر ہونے کو آئی ہے۔''

پھر ایک ہفتہ یوں ہی گزر گیا۔ اس کے بعد کالج میں داخلے شروع ہوگئے اور بابا نے مجھے ایک مرتبہ پھر کالج میں بھیج دیا۔ جہاں بڑے بڑے صنعت کاروں، وزیروں اور بیوروکریٹس کے بچے پڑھتے تھے۔ بابا خود تو زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ گاؤں کے قریبی اسکول سے صرف آٹھویں تک پڑھا تھا۔ پھر بقول دادا جی کے جاگیرداری میں مصروف ہوگئے تھے۔

اس دوران اتنی چھٹیاں ایک ساتھ پڑگئیں تو میں گاؤں آگیا۔ مجھے حویلی کے ماحول میں عجیب سی کشیدگی دکھائی دی۔ اماں جی بھی پہلے سے کچھ زیادہ خاموش ہوگی تھیں اور بابا بھی الجھے الجھے سے رہتے تھے۔

میرے بہت زیادہ اصرار پر اماں جی نے بتایا کہ تیرے بابا اور ماموں کے درمیان زمین کے ایک ٹکڑے پر جھگڑا ہوا ہے۔

''زمین کے ٹکڑے کے لیے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''ہماری زمین تو اتنی ہے اماں جی کہ اگر کوئی بندہ پیدل اس کا چکر لگانا چاہے تو کم سے کم دو دن لگیں گے پھر زمین کا وہ کون سا ٹکڑا ہے جس پر ماموں جی اور بابا کی ان بن ہوگئی ہے۔''

''میں نہیں جانتی کہ زمین کا کون سا ٹکڑا ہے جس کی خاطر تیرے بابا اور ماموں میں ٹھن گئی ہے لیکن یہ ساری تفصیل تجھے تیرے بابا یا منیجر سے معلوم ہوجائے گی۔''

میں وہاں سے اٹھ کر باہر مردانے میں آیا۔ وہاں بابا کے ساتھ ہمارا منیجر بھی موجود تھا اور ایک وکیل بھی۔ وکیل بابا کو نہ جانے کیا سمجھانے کی کوشش کررہا تھا اور بابا اس کی باتوں پر سر ہلارہے تھے۔ وکیل کو میں نے اس کے کالے کوٹ سے پہچانا تھا۔ وہاں کئی اور نوکر بھی موجود تھے۔

مجھے دیکھ کر بابا کے علاوہ وہاں موجود ہر شخص.... کھڑا ہوگیا۔

''آ پتر، تو بھی آجا!'' بابا نے کہا۔ ''میرے بعد تو اس جاگیر کی دیکھ بھال کرے گا۔'' پھر وکیل سے مخاطب ہوئے۔ ''بیرسٹر، یہ میرا بیٹا اعظم! لارنس کالج میں پڑھتا ہے۔''

''ماشاءاللہ!'' بیرسٹر صاحب نے خوشامدی لہجے میں کہا۔ ''چوہدری صاحب! میری مانیں تو اعظم بیٹے کو وکالت کی

اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن بھیج دیں۔ آپ کو یوں بھی وکیل کی ضرورت تو پڑتی رہتی ہے۔ گھر کا وکیل ہوگا تو آپ لاکھوں روپے کے اخراجات سے بچ جائیں گے۔''

''نہیں بیرسٹر صاحب!'' بابا نے کہا، پھر مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''اعظم کو تو میں مقابلے کا امتحان دلواؤں گا۔ ڈپٹی کمشنر یا پولیس کا افسر بنواؤں گا۔''

''یہ آئیڈیا بھی برا نہیں ہے۔'' بیرسٹر صاحب نے بابا کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''مسئلہ کیا ہے بابا؟'' میں نے ہمت کر کے پوچھا۔ وہ بعض اوقات میرے سوالوں پر بھی ہتھے سے اکھڑ جایا کرتے تھے لیکن اس وقت وہ خاصے خوش گوار موڈ میں تھے اس لیے میں نے سوال کرنے کی ہمت کرلی تھی۔

''پتر! مسئلہ ہے زمین کے ایک ٹکڑے کا؟'' بابا نے کہا۔ ''وہ زمین برسوں سے ہماری ملکیت ہے۔ اب اچانک تیرے مامے کو خیال آیا کہ وہ زمین ان کی ہے جس پہ ہم نے ناجائز قبضہ کررکھا ہے۔''

''زمین ہے کتنی بابا؟'' میں نے پوچھا۔

''زمین کا وہ ٹکڑا تو ڈھائی ایکڑ سے زیادہ نہیں ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کسی بھی جاگیردار کے لیے زمین ہی تو سب کچھ ہوتی ہے۔''

''وہ زمین کیا ماما کی زمینوں کے پاس ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں پتر!'' بابا نے کہا۔ ''وہاں سے تیرے مامے کی زمین شروع ہوتی ہے۔ وہ اگر شرافت سے زمین کا وہ ٹکڑا مانگتا تو میں اسے خوشی خوشی دے دیتا لیکن وہ تو اس پر اپنا حق جتا رہا ہے۔ عدالت میں جانے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو ہم نے بھی کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔''

''بابا! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ماما سے ملاقات کرلوں؟'' میں نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

''اوئے، تو بھی ملاقات کر کے کیا کرے گا؟'' بابا نے کہا۔ ''تو کیا سمجھتا ہے، وہ تیری بات مان لے گا؟''

''شاید مان جائیں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ بچپن سے مجھے بہت چاہتے ہیں، آپ بھول گئے کہ میرے میٹرک کرنے پر انہوں نے اپنی زمین میں سے سو ایکڑ زمین میرے نام کردی ہے؟''

''اوئے، اس کا احسان میں اتار دوں گا۔ اس کا پتر پڑھتا تو ہے نہیں۔ ہاں اس کی شادی ہوگی تو میں بھی ڈیڑھ سو ایکڑ زمین اس کے نام کردوں گا لیکن دھونس دھاندلی سے میں اسے اپنی ایک انچ زمین بھی نہ دوں۔ یہ بات تو انا کی ہے پتر! زبردستی یا جھوٹا قبضہ بتا کر زمین ہتھیانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ ان لوگوں نے ابھی تک صرف دعویٰ کیا ہے.... عملی طور پر اس زمین پر قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی ورنہ اب تک تو خون خرابا ہوسکتا تھا۔''

''بابا میں......''

''پتر، تو نہیں جانتا ہے اسے ضرور مل اپنے مامے سے۔ شاید خون خرابا... کی نوبت نہ آئے اور ہمیں تھانے کچہری کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔''

میں وہاں سے اٹھ کر اپنی جیپ کی طرف بڑھا تو ہمارا منیجر بھی میرے پیچھے پیچھے آگیا۔

''چھوٹے صاحب، آپ خیریت سے تو ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں جی خیریت سے ہوں لیکن یہ کیا چکر چل رہا ہے۔ ہماری کون سی زمین ماما نے ہتھیانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے پاس پٹواری کے کاغذات تو ہوں گے؟''

''میں نے چوہدری صاحب کا نمک کھایا ہے چھوٹے صاحب۔'' منیجر نے کہا۔ ''لیکن میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ وہ زمین تمہارے ماما کی ہے۔ تمہارے نانا نے زمین کا وہ ٹکڑا وہاں ایک باغ لگانے کے لیے تمہارے دادا کو دیا تھا۔ ان دونوں میں بہت محبت تھی۔ تمہارے نانا چاہتے تھے کہ وہاں خوبصورت سا ایک باغ لگایا جائے۔ درمیان سے ایک چھوٹی سی نہر نکالی جائے اور دونوں خاندانوں کی خواتین وہاں سیر کے لیے جاسکیں اور وقت گزار سکیں۔ باغ کے چاروں طرف ایسے درخت لگائے جائیں کہ پردے کا بھی انتظام ہوجائے۔''

''پھر...... پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''پھر وہ معاملہ لٹکتا رہا۔ تمہارے نانا نے نہ جانے کیا سوچ کر یہ کام تمہارے دادا کے سپرد کردیا تھا۔ تمہارے دادا زمین کا وہ حصہ لے کر شاید بھول گئے لیکن اس کی باقاعدہ لکھت پڑھت نہیں ہوئی تھی۔ تمہارے دادا مرحوم نے اس پر کھیتی شروع کردی۔ پھر تمہارے نانا اور دادا دونوں کا انتقال ہوگیا۔ زمین ہمارے ہی قبضے میں رہی۔ اب نہ جانے کیسے ملک صاحب کو اس کا خیال آگیا۔ انہوں نے پٹواری سے زمین کے کاغذات نکلوائے تو وہ زمین ان کی

ملکیت نکلی۔"
"تو وہ بابا سے نرمی سے بھی تو اس زمین کا مطالبہ کر سکتے تھے؟" میں نے کہا۔
"اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ شاید ملک صاحب کا بیٹا بہت نافرمان اور سرکش ہے۔ اسے جب یہ معلوم ہوا کہ وہ زمین ان کی ملکیت ہے تو ایک دن وہ اپنے دو تین آدمیوں کو لے کر اکیلا ہی یہاں آگیا۔ اکیلے سے میری مراد ہے کہ تمہارے ماما کو یہ خبر نہیں تھی۔ اس نے چوہدری صاحب سے بہت سخت لہجے میں بات کی۔ وہ صرف چوہدری نہیں بلکہ رشتے میں اس کے سگے پھوپا بھی تو ہیں۔ وہ جاتے جاتے دھمکی دے کر گیا ہے کہ اگر ہم نے پندرہ دن کے اندر اندر زمین کا وہ ٹکڑا ان کے حوالے نہیں کیا تو وہ چوہدری صاحب کو عدالت میں گھسیٹ لے گا۔ بی بی جی نے بھی اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ بیٹا یہ مسائل ایسے حل نہیں ہوتے۔ تم بھائی جان کو بھیجو، وہ خود بات کریں گے۔ تم اس مسئلے میں مت پڑو۔"
"یہ مردوں کا معاملہ ہے پھپھو۔" اس نے بدتمیزی سے کہا۔ "آپ اس میں دخل نہ دیں۔"
"میں ابھی ماما کے پاس جا کر ایک کوشش کر لیتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"ہاں، ایک کوشش کر لو۔" منیجر نے آہستہ سے کہا۔ "چوہدری صاحب کو اس بیرسٹر سے بچاؤ۔ یہ انتہائی گھٹیا اور دو نمبر آدمی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ ان کے بیٹے کی ملاقات ہی نہ ہونے دے۔ چوہدری صاحب کے ہاں قانونی کاغذات بھی نہیں ہیں۔ لیکن اس نے کہا ہے کہ وہ دو دن کے اندر اندر کاغذات بھی بنوا لے گا۔ اس کے لیے اس نے ان سے دو لاکھ روپے کا مطالبہ کیا ہے۔ چوہدری صاحب شاید اسے چیک دے بھی چکے ہوں۔"
"تم ابھی بابا کو رقم دینے سے روکو۔" میں نے کہا۔
"اس کی آپ فکر مت کریں۔ چوہدری صاحب کی چیک بکس اور پیسے وغیرہ میرے پاس ہی ہوتے ہیں۔"
میں وہاں سے سیدھا ماما کے پاس پہنچا۔ ان کا گاؤں ہمارے گاؤں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ صرف بائیس چوبیس کوس تھا۔ دادا جی نے اپنے زمانے میں وہاں جانے کے لیے ایک پختہ سڑک بنوائی تھی جو اب ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔
میں ماما کے گاؤں ملک عدل کلاں پہنچا تو مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ ان کی حویلی وہاں سے اب بھی دو تین کلومیٹر دور تھی۔ میں نے جیپ روک کر مغرب کی نماز ادا کی۔ اماں جی سے وعدہ کرنے کے بعد میں کوئی نماز قضا نہیں کرتا تھا۔ نماز کے بعد دعا مانگی کہ یا اللہ! تو ہی میرا حامی و ناصر ہے۔ اس مسئلے کو تو ہی بہ خیر و خوبی حل کر سکتا ہے۔ میری مدد فرما اور زبان میں اتنی تاثیر فرما کہ ماما میری بات مان جائیں۔"
دعا مانگنے کے بعد مجھے خاصا سکون اور حوصلہ ملا۔
میں نے حویلی ..... پہنچ کر دروازے پہ کھڑے ہوئے چوکیدار کو فوری طور پر گیٹ کھولنے کو کہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ اس سے پہلے میں جب بھی حویلی آیا تھا وہ لوگ دوڑ دوڑ کر، گھبرا گھبرا کر آتے اور مجھ سے پہلے ہی میری آمد کی اطلاع ماما کو ہو جاتی تھی اور میرے استقبال کے لیے سارے ہی نکل کے آجاتے تھے اور مجھے انتہائی شفقت اور محبت سے گلے لگا کر حویلی میں لے جاتے تھے۔
کافی دیر بعد گیٹ کھلا اور میں جیپ اندر تک لیتا چلا گیا۔ گیٹ سے برآمدے تک فاصلہ خاصا تھا۔ میں پورچ میں پہنچا تو وہاں دو جیپ پہلے سے موجود تھیں۔ اسے پورچ تو نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں برآمدے سے لے کر خاصے فاصلے پر اک سائبان سا بنا دیا گیا تھا جہاں گاڑیاں دھوپ اور بارشوں سے محفوظ ہوتی تھیں۔
دوسرا دھچکا مجھے اس وقت لگا جب میں نے وہاں ماما کی بجائے شہباز کو کھڑا دیکھا۔ اس کے چہرے پہ خشونت و ناگواری کے تاثرات تھے۔ اس نے مجھ سے سلام دعا کی بجائے کرخت لہجے میں پوچھا۔ "کیسے آئے اعظم؟"
"شہباز بھائی! میں ماما سے ملنے آیا ہوں۔" میں نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ کو اعتراض ہے تو واپس چلا جاتا ہوں۔"
شہباز نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ تمہاری مرضی ہے، جانا ہے تو چلے جاؤ۔
میں نے ریورس گیئر لگایا اور گاڑی پیچھے کرنے لگا۔
اسی وقت اندر سے ماما نکل آئے۔ وہ مجھے دیکھ کر محبت آمیز لہجے میں بولے۔ "ارے اعظم بیٹا! تو کب آیا اور واپس کہاں جا رہا ہے؟"
"شہباز بھائی کو شاید میرا یہاں آنا پسند نہیں آیا۔" میں نے کہا۔
"اوئے، یہ گھر تیرے ماما کا ہے، شہباز کا نہیں ہے۔" ماما نے کہا۔
میں گاڑی سے اترا اور انہوں نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ پھر وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ گاؤں میں کبھی "بیٹھک" ہوا کرتی تھی لیکن اب وہاں بھی ڈرائنگ روم ہوتے ہیں۔
بیس بائیس برس میں سب بالکل بدل چکا تھا۔ اس سے پہلے تو ماما خود ہی اماں جی اور بابا سے ملنے آتے رہتے تھے۔
اس وقت مامی بھی ڈرائنگ روم میں آگئیں۔ انہیں شاید شہباز یا گھر کے کسی ملازم نے میری آمد کی اطلاع دی تھی۔ شہباز کی طرح ان کا رویہ بھی کچھ اکھڑا اکھڑا تھا۔ انہوں نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "کیسے ہو اعظم؟"
"میں ٹھیک ہوں مامی!" میں نے ہنس کر کہا۔
اچانک مجھے ایسا لگا جیسے ڈرائنگ روم میں چاند طلوع ہو گیا ہو۔ وہ اتنی ہی خوبصورت تھی بلکہ گزشتہ چار پانچ برسوں میں ہو گئی تھی۔ وہ ماما کی بیٹی کلثوم تھی۔ اس کے لمبے گھنے سیاہ بالوں کی چوٹی کچھ یوں لہرا رہی تھی کہ دل اچھل اچھل جا رہا تھا۔ سرخ و سفید چہرے کے گرد سیاہ بالوں کا ہالا تھا جیسے چاند کے گرد بادل چھا گئے ہوں۔ اس کا جسم کسی مجسمے کی طرح ترشا ہوا تھا اور وہ اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے مجھے پُرشوق انداز میں دیکھ رہی تھی۔
"کیسی ہو کلثوم!" میں نے کہا۔ "تم تو بہت بڑی ہو گئی ہو۔"
"ارے بیٹا، تو کیا یہ اسی طرح چھوٹی سی بچی رہتی جسے تو بچپن میں بہت تنگ کیا کرتا تھا۔" ماما مسکرا کر بولے۔ پھر کلثوم سے بولے۔ "جا کسی سے کہہ کہ اعظم کے لیے کچھ چائے پانی کا بندوبست کرے۔"
"دیکھو اعظم!" شہباز نے کہا۔ "تم اگر زمین کے اس ٹکڑے کے سلسلے میں آئے ہو تو کوئی بات نہ کرنا۔ فضول میں تمہیں مایوسی ہو گی۔"
"میرے خیال میں زمین کے مالک ابھی ماما ہیں۔ تم اس سلسلے میں کیوں بول رہے ہو شہباز بھائی؟" میں نے سرد لہجے میں کہا۔
"اور میرے خیال میں زمین کے اس ٹکڑے کے دعوے دار ... پھوپا ہیں۔ اس طرح تو تمہیں بھی اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہیے۔"
"میں بابا ہی کے کہنے پر آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر ماما تمہیں بات کرنے کا اختیار دے دیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"
"اوئے، تم لوگوں نے یہ کیا شروع کر دیا۔ شہباز! اعظم ہمارا مہمان ہے۔ اس سے اس لہجے میں بات مت کر۔" پھر وہ مجھ سے بولے۔ "اعظم بیٹا! اب تو جوان ہو گیا ہے۔ تجھے ساری بات کا علم ہو گیا ہے کہ زمین کا وہ ٹکڑا ہمارا ہے۔ مجھے تو اس کا خیال ہی نہ آتا لیکن شہباز بولتا ہے کہ پھوپا سے وہ ٹکڑا واپس لیا جائے۔"
"ماما، بس اتنی سی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "زمین کا وہ ٹکڑا اگر آپ کا ہے تو آپ کو ضرور ملے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس سلسلے میں کوئی خون ریزی یا پولیس کچہری کا چکر ہو۔ آپ کل میرے ساتھ گاؤں چلیں۔ بابا کل ہی آپ کو زمین کا وہ ٹکڑا دے دیں گے۔ اس کی بھلا حیثیت ہی کیا ہے۔

سسپنس، سرگزشت، پاکیزہ، جاسوسی
سول ایجنٹ برائے یو۔ اے۔ ای
WELCOME BOOK SHOP
ویلکم بُک شاپ
پی او بکس: 27869 کرامہ، دبئی
فون: 04-3961016 فیکس: 04-3961015
موبائل: 050-6245817 ای میل: welbooks@emirates.net.ae

معیاری کتابوں کا اعلیٰ مرکز
WELCOME BOOK PORT
ویلکم بُک پورٹ
ریٹیل، ہول سیل، ڈسٹری بیوٹر، پبلشر، ایکسپورٹر
مین اردو بازار کراچی
فون: 32639581 ,32633151 (92-21) فیکس: 32638086 (92-21)
ای میل: welbooks@hotmail.com
ویب سائٹ: www.welbooks.com

ہمارے پاس ہزاروں ایکڑ اراضی ہے، آپ کی زمین بھی ہم سے کم نہیں ہے۔ دادا جی کا منصوبہ تھا کہ ...... اس علاقے میں دونوں گھرانوں کے لیے ایک خوبصورت باغ بنایا جائے۔"

"وہ سب تو اس دور کی بات ہے اعظم۔" شہباز نے کہا۔ "پہلے پوپا زمین کا وہ ٹکڑا ہمارے حوالے تو کریں۔"

میں تو اسی رات واپس آنا چاہ رہا تھا لیکن ماما نے اصرار کر کے مجھے وہیں روک لیا۔ میں نے سیل فون پر بابا کو اطلاع دے دی کہ میں کل تک آؤں گا۔ میرے ساتھ ماما ہوں گے۔

ماما نے حویلی ہی کے ایک کمرے میں میرے سونے کا بندوبست کر دیا تھا۔

کھانے پر بھی کچھ دیر ماما سے بات کرتا رہا، پھر سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب میری آنکھ کھل گئی۔ فضا میں مہکی مہکی خنکی تھی اور میری آنکھ بلا سبب نہیں کھلی تھی۔ میرے کمرے کا دروازہ بہت آہستگی سے کھلا تھا۔ میری عادت تھی کہ میں ہلکی سی آہٹ سے بھی جاگ جاتا تھا۔

کمرے میں اس وقت گھپ اندھیرا تھا۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ میں پھرتی سے بیڈ سے اتر کے اس کے نیچے گھس گیا تا کہ خطرے کی صورت میں اپنا دفاع کر سکوں۔

تھوڑی دیر بعد کہیں سے آواز آئی اور پھر میرا بیڈ سائیڈ لیمپ آن ہو گیا۔ اس کی مدھم روشنی میں مجھے کلثوم نظر آئی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ مجھے بیڈ پہ نہ پا کر خود بھی حیران تھی۔ میں بہت آہستگی سے بیڈ کے نیچے سے نکلا تو وہ بری طرح اچھل پڑی۔ "تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"آہستہ بولو اعظم!" اس نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کو کہا۔ "اعظم تمہاری جان کو خطرہ ہے۔ تم یہاں سے ابھی اور اسی وقت نکل جاؤ۔"

"میری جان کو خطرہ؟" میں نے الجھ کر پوچھا۔

"بحث میں وقت ضائع مت کرو۔ یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تم ابھی یہاں سے نکل جاؤ۔"

"لیکن، کلثوم!" میں نے کہا، تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی کب سے ہو گئی؟

وہ جلدی سے بولی۔ "یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ ان کے لیے تو عمر پڑی ہے۔ تم ابھی اور اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔"

"مجھے صرف اک بات بتا دو۔" میں نے کہا۔ "شہباز بھائی میرے اتنے دشمن کیسے ہو گئے؟"

"اعظم...... مجھے...... بتاتے ہوئے بھی...... شرم آتی ہے...... شہباز بھائی جس لڑکی کو پسند کرتے تھے، پھوپا نے اسے اپنے بندوں کے ذریعے اٹھوا لیا ہے، وہ لڑکی اب نہ جانے کس حال میں ہے، زندہ بھی ہے یا نہیں؟" کلثوم نظریں جھکا کر بولی۔ "لیکن تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔

جلدی کرو زندگی رہی تو پھر ملاقات ہو گی۔"

میں نے بے اختیار اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ بھی خود سپردگی کے عالم تھی پھر چونک کر بولی۔ "جلدی کرو اعظم، میراز خان اور اس کے آدمی پہنچنے والے ہوں گے۔"

میں نے جلدی جلدی جوتے پہنے، اپنے کپڑے اٹھائے اور جیب لے کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

پھر میں آندھی طوفان کی طرح اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے ایسا راستہ اختیار کیا جو عام استعمال میں نہیں تھا۔ وہ راستہ دشوار گزار ضرور تھا لیکن نسبتاً مختصر تھا۔

میں نے گاؤں پہنچ کر بابا کو ساری بات بتا دی صرف اس لڑکی کے اغوا کی بات چھپا گیا۔ اس واقعے کے بعد سے میرے دل میں بابا کا وہ احترام نہیں رہا تھا۔ ان کی عمر ایسی نہیں تھی کہ جذبوں کو بے لگام چھوڑ دیا جاتا۔ بے لگام جذبے بھی کبھی انتہائی تباہی اور بربادی کا باعث بھی بن جاتے ہیں۔

بابا نے مجھ سے کہا کہ تو یہاں کی فکر مت کر، کالج چلا جا۔ میں شہباز اور اس کے ڈاکوؤں سے نمٹ لوں گا۔ وہ کیا سمجھتا ہے کہ ڈاکو صرف وہی رکھتا ہے؟"

میں انتہائی تشویش اور فکر مندی کی حالت میں کالج چلا گیا۔ مجھے بابا سے زیادہ اماں جی کی فکر تھی۔ میرا دل بری طرح اداس تھا اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

کالج میں بھی میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔

میرا خدشہ حقیقت میں بدل گیا۔ مجھے اطلاع ملی کہ شہباز نے ہمارے خاندان پر حملہ کیا ہے اور گاؤں کے کئی لوگوں کو خاص طور پر بابا کے آدمیوں کو بری طرح زخمی کر دیا ہے۔

میں اسی وقت گاؤں کے لیے روانہ ہو گیا لیکن راستے میں گاڑی نے میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً اسے

میں بینک کے پاس چھوڑ کر بس سے اپنے گاؤں پہنچا۔

وہاں کا منظر دیکھ کر تو میرے ہوش ہی اڑ گئے۔ وہاں ایک ساتھ کئی لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں میرے بابا کی لاش بھی تھی اور اماں جی کی لاش بھی!

میرا دل چاہ رہا تھا کہ دہاڑیں مار مار کر روؤں لیکن میں نے خود پر بہت مشکل سے قابو پایا۔

مجھے اس درخت پر چڑھے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ ہوگئے تھے۔

مجھے وہاں بیٹھے بیٹھے اونگھ آگئی تھی کہ اچانک ... کئی گاڑیوں کی آواز۔ س گونجیں اور میری آنکھ کھل گئی.... آنکھ بروقت کھلی ورنہ میں سیدھا زمین پر آگرتا۔

پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ ان میں پرانے اسٹیشن انچارج کی جگہ ایک نوجوان اور مستعد آفیسر تھا۔

"قتل کی واردات کہاں ہوئی ہے؟" اس نے سرد لہجے میں شہباز سے پوچھا۔

"قتل کی وارداتیں تو اس حویلی میں ہوئی ہیں لیکن آپ...."

"اس علاقے کے نئے انچارج ہیں ملک صاحب!" ایک کانسٹیبل نے کہا۔

شہباز نے انسپکٹر کو آگے لے جا کر کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے انکار کردیا اور بولا۔ "آپ کو جو کچھ کہنا ہے یہیں کہیں۔"

"آپ جانتے ہیں، آپ کس سے بات کررہے ہیں؟" شہباز جھٹے سے اکھڑ گیا۔

"میں اچھی طرح جانتا ہوں، میرے پاس آپ کے خلاف بہت سے ثبوت ہیں۔ کئی گواہ ہیں۔ جن میں سے ایک گواہ تو آپ کی بہن ہی ہے۔ آپ کے آدمیوں نے اسے بھی قتل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے اپنے دفاع میں گولی چلا کر آپ کے اس بالے کو قتل کردیا۔ میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو چوہدری صاحب، ان کی فیملی اور ان کے آدمیوں کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔ کلثوم کو شبہ ہے کہ آپ نے چوہدری کے بیٹے اعظم کو بھی راستے سے ہٹا دیا ہے یا اسے اغوا کرلیا ہے۔"

میں اسی وقت درخت سے نیچے اتر آیا اور بولا۔ "آفیسر! اگر میں بروقت اس درخت پر چڑھ کر چھپ نہ جاتا تو اس کے آدمی یا یہ خود قتل کردیتا۔"

"آپ کو بھی میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنے کی زحمت کرنا ہوگی۔" انسپکٹر نے کہا۔

پھر اس نے حویلی کے اندر جا کر جائے واردات کا جائزہ لیا۔ حیرت انگیز طور پر وہ ملازم ابھی تک زندہ تھا جس نے مجھے وہاں سے بھاگ جانے کا مشورہ دیا تھا۔

اس کے بیان نے تو گویا شہباز کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

☆☆☆

اتنے لوگوں کو قتل کرنے کے الزام میں شہباز اور اس کے ساتھیوں کو عدالت نے سزائے موت سنا دی۔ اس نے ہائی کورٹ میں اپیل کی لیکن وہاں بھی عدالت نے ماتحت عدالت کا فیصلہ برقرار رکھا۔

شہباز آج کل جیل میں ہے اور سزائے موت کا منتظر ہے۔ اس کے بے لگام جذبوں نے اسے ان حالوں کو پہنچایا ہے۔

ایک بات آپ کو بتاؤں، بے لگام جذبے بعض اوقات مثبت بھی ہوتے ہیں۔ کلثوم کے عشق کا جذبہ بھی بے لگام تھا۔ وہ اپنے بھائی کی پروا کیے بغیر میرا ساتھ دے رہی تھی۔

اب کلثوم میری بیوی اور دو پیارے پیارے بچوں کی ماں ہے۔ ماما نے اس قطعۂ زمین پر ایک شاندار باغ تعمیر کرایا ہے۔ وہاں مختلف پھلوں کے درخت بھی ہیں اور اس کے درمیان سے ایک نہر بھی نکلتی ہے۔ ہم اکثر وہاں چلے جاتے ہیں۔ ماما نے وہاں چھوٹا سا ایک کاٹیج بھی بنوا دیا ہے۔

مجھے آج بھی ان بے لگام جذبوں سے خوف آتا ہے۔ میرے باپ کو تو اس کے کیے کی سزا مل گئی۔ میری فرشتہ صفت ماں کا کیا قصور تھا؟ وہ کس گناہ کے پاداش میں موت کے گھاٹ اتار دی گئی۔

اماں جی جب بھی مجھے یاد آتی ہیں تو میں پھر اداس ہوجاتا ہوں۔ کلثوم جانتی ہے کہ میرے لیے یہ غم آج بھی پہاڑ کے برابر ہے۔ ایسے موقع پر وہ میری بہت دلجوئی کرتی ہے۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر کلثوم نہ ہوتی تو یقیناً میں شہباز کو ٹھکانے لگا کر مفروروں کی زندگی گزار رہا ہوتا یا پھر شہباز کی طرح جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتا لیکن کلثوم کے مثبت اور بے لوث بے لگام جذبوں نے مجھے ان صعوبتوں سے بچا لیا۔

شہباز کو زمین کے اس ٹکڑے کی ہوس تھی۔ اب ماما کی پوری جاگیر میری ہے۔ مجھے بھی اندازہ ہی نہیں ہوا کہ.... کلثوم مجھے اس قدر ٹوٹ کر چاہتی ہے۔ آج اگر میں باعزت زندگی گزار رہا ہوں تو صرف اور صرف کلثوم کی بدولت!

☹

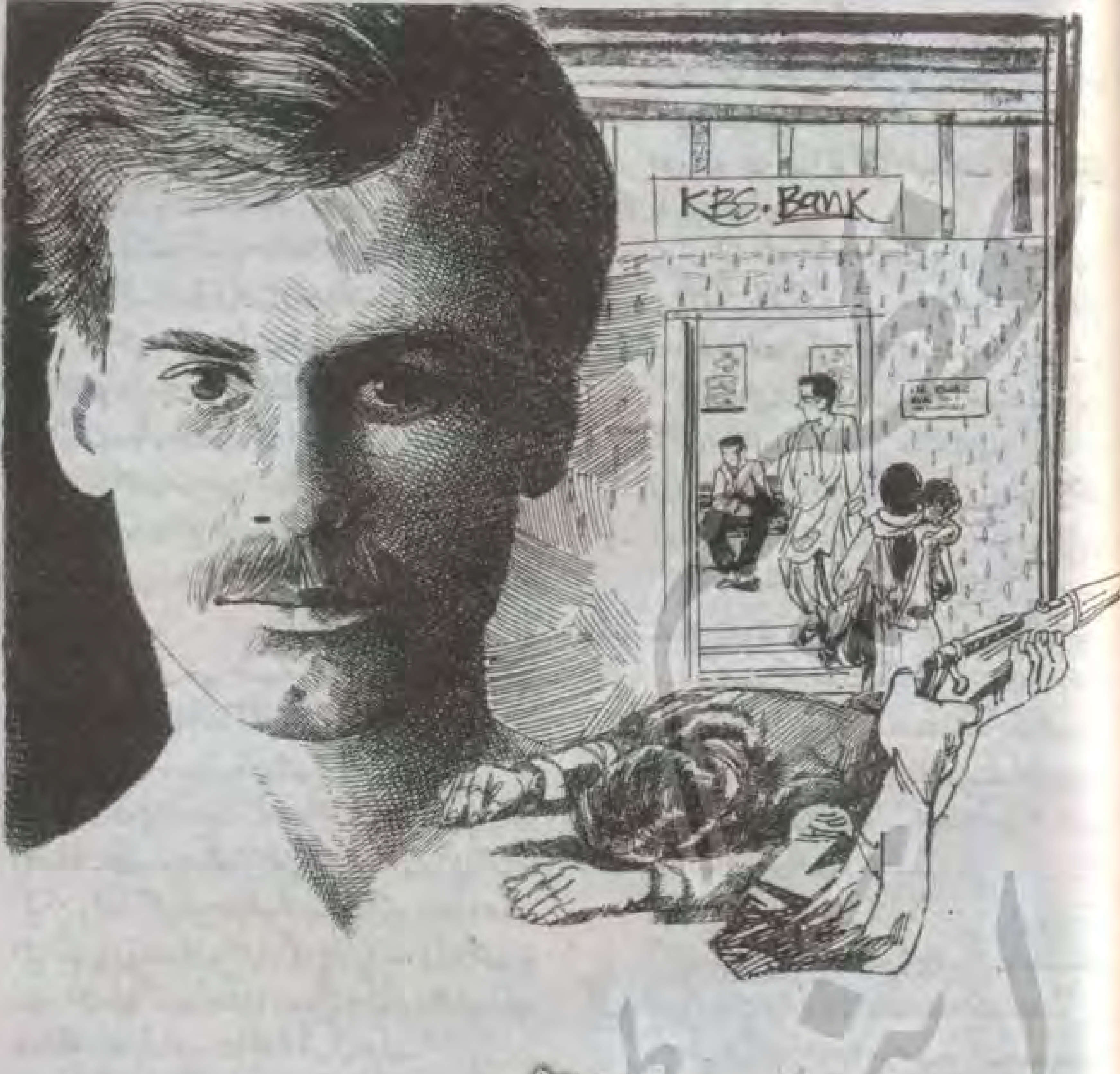

محافظ

جناب ایڈیٹر صاحب
سلام مسنون!
ایک دلچسپ اور سبق آموز واقعہ جس کا میں خود بھی گواہ ہوں اسے لے کر آپ کی محفل میں آیا ہوں۔ امید ہے کہ یہ واقعہ قارئین کو بھی پسند آئے گا۔

صفدر شیرازی
(کوئٹہ)

اس پر قتل کا مقدمہ چل رہا تھا۔ اس نے ایک بندے کو گولی ماردی تھی۔ بظاہر اس کی اس حرکت کا کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ صرف اتنا کہہ رہا تھا کہ گولی اتفاقاً چلی تھی۔

وہ اپنی بندوق سیدھی کررہا تھا کہ گولی چل گئی اور اتفاق سے اس نوجوان کو جا لگی جو اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

گولی مارنے والے کا نام رشید تھا۔ وہ ایک سیکورٹی گارڈ تھا۔ پرائیوٹ سیکورٹی کمپنی کا گارڈ۔ اس کی ڈیوٹی بینک

ہی میں تھی کہ اس سے یہ حرکت سرزد ہوگئی۔

گولی مارنے کے بعد وہ بہت دیر تک مرنے والے کی لاش پر لپٹ کر روتا رہا تھا۔ جب میرے پاس اس کا کیس آیا تو میں نے فوری طور پر اس سے ملاقات کا فیصلہ کرلیا۔

میرے پاس آنے والا اس بینک کا منیجر سلیم درانی تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک پڑھا لکھا معقول آدمی ہوگا اسی لیے وہ بینک کی ایک برانچ کا منیجر مقرر ہوا تھا۔

''سلیم صاحب، آپ اپنے گارڈ کی وکالت کیوں کروانا چاہتے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔ ''جبکہ یہ بات طے ہے کہ اس بے گناہ نوجوان کا مرڈر اسی نے کیا ہے۔''

''دیکھیں صاحب، وہ گارڈ کئی برسوں سے ہمارے بینک میں خدمات انجام دے رہا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اور پورا اسٹاف اس بات کا گواہ ہے کہ وہ انتہائی نیک اور سیدھا سادہ انسان ہے۔''

''لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے نا کہ اس سے کوئی جرم سرزد ہو ہی نہیں سکتا۔'' میں نے کہا۔

''ہو تو سکتا ہے۔ لیکن اس کا کوئی جواز تو ہو۔'' سلیم نے اپنی بات پر زور دیا۔ ''خود سوچیں کہ حادثے کے وقت وہ نوجوان بینک سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ قریب بھی نہیں تھا کہ ہم یہ شبہ کرسکیں کہ وہ بینک لوٹنے کی غرض سے آیا ہوگا۔ اس کے پاس سے کوئی ہتھیار بھی پولیس نے برآمد نہیں کیا ہے۔ اسی لیے ہمیں رشید کی بات ماننی ہوگی کہ یہ صرف ایک حادثہ تھا۔ بندوق اس سے اتفاقاً چل گئی ہوگی۔''

''آپ کی باتوں میں وزن ہے سلیم صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''میں آپ کے کہنے پر یہ کیس لے تو رہا ہوں لیکن گناہ گار کو بے گناہ اور بے گناہ کو گناہگار کرنا میرا اصول نہیں ہے۔''

'میں جانتا ہوں صفدر صاحب، اس لیے تو میں کہیں اور جانے کی بجائے سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے تو پھر میں کیس لے رہا ہوں۔ آگے اللہ مالک ہے۔ دیکھیں عدالت کیا فیصلہ کرتی ہے۔'' میں نے کہا پھر کچھ خیال آگیا۔ ''سلیم صاحب، ذرا اس پوائنٹ سے سوچیں کہ ان لوگوں کے یہاں خاندانی دشمنیاں بھی نسل در نسل چلا کرتی ہیں۔''

''ہاں، یہ بات میرے ذہن میں تھی۔'' سلیم نے کہا۔ ''لیکن رشید ہرگز ایسا آدمی نہیں ہے۔ جو کسی سے اس قسم کی دشمنیاں رکھ سکتا ہو۔''

''مجھے رشید سے ملنا ہوگا۔''

''وہ اس وقت تھانے میں ہے۔'' سلیم نے بتایا۔ ''آپ اس سے مل سکتے ہیں۔''

دوسرے دن میں اپنی کوششوں سے رشید سے ملنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

پچاس کے لگ بھگ عمر ہوگی۔ دبلا پتلا انسان۔ چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی تھی اور وہ دیکھنے ہی میں انتہائی شریف اور سیدھا سادہ انسان دکھائی دے رہا تھا۔

''کیا حال ہیں رشید۔'' میں نے پوچھا۔

''بس صاحب، آپ کے سامنے ہوں۔'' اس نے کہا۔ اس کا لہجہ بہت ڈوبا ڈوبا سا تھا۔ پھر اس نے دریافت کیا۔ ''آپ کون ہیں صاحب۔''

''میں تمہارا وکیل ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''تمہارے بینک کے منیجر ہیں نا سلیم صاحب، انہوں نے مجھے تمہارا کیس لڑنے کے لیے مقرر کیا ہے۔''

''ہاں بس ان کی مہربانی۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔''

''رشید، دیکھو... وکیل اور ڈاکٹر سے کوئی بات چھپاتے نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ورنہ نہ تو ڈاکٹر علاج کرسکے گا اور نہ ہی وکیل کیس لڑ سکے گا۔''

''جی صاحب جانتا ہوں میں۔''

''اسی لیے مجھ سے کچھ مت چھپاؤ۔ اگر حادثہ ہے تو بھی بتادو۔ اگر جان بوجھ کر گولی چلائی ہے تو بھی بتادو۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا صاحب۔'' اس نے پُرزور انداز میں اپنی گردن ہلادی۔ ''میں جان بوجھ کر گولی چلا ہی نہیں سکتا۔''

''تو پھر یہ حادثہ ہوا نا؟''

''جی صاحب، حادثہ ہی ہوا۔'' اس نے کہا۔ ''یہ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوسکتا۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''اب تم اس وکالت نامے پر سائن کردو۔''

اس نے وکالت نامے پر دستخط کردیے۔

اس کا کیس چلا۔ تفتیشی آفیسر یہ ثابت کرنے پر تُل گیا تھا کہ رشید نے جان بوجھ کر گولی چلائی تھی۔ لیکن رشید نے بہت سختی سے اس بات کی تردید کردی۔ ''نہیں صاحب، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ میں اسے جان بوجھ کر ماردوں۔'' اس نے کہا۔ ''کوئی سوال نہیں ہے۔''

''آخر کیوں سوال نہیں ہے؟''

''اس لیے کہ وہ...... وہ مرنے والا تو میرا بیٹا تھا صاحب۔'' رشید نے بتایا۔

''کیا؟'' ہم سب ہی اچھل پڑے تھے۔ ''تمہارا بیٹا تھا؟''

''ہاں صاحب۔'' اب اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ''اسی لیے میں اس کی لاش سے لپٹ کر رونے لگا تھا کہ میرے ہاتھوں میری اپنی اولاد کا خون ہوگیا تھا۔ اب تو آپ لوگوں کو یقین آگیا ہوگا کہ جو کچھ ہوا وہ صرف حادثہ تھا۔''

عدالت میں سناٹا چھا گیا تھا۔

پھر اس سے پوچھا۔ ''تم نے اس وقت کیوں نہیں بتایا کہ مرنے والا تمہارا بیٹا تھا۔''

''کیسے بتاتا صاحب۔ لوگ یہی سمجھتے کہ میں نے جان بوجھ کر مارا ہے۔''

''لیکن کیوں۔ لوگ ایسا کیوں سمجھتے؟''

''اس لیے کہ میں اس کی ماں کو طلاق دے کر گاؤں سے آیا تھا صاحب۔'' رشید نے بتایا۔

یہ ایک نیا پہلو سامنے آیا تھا۔

''رشید، بہتر یہی ہے کہ تم صاف صاف بتادو کہ یہ کیسی کہانی ہے۔''

''کوئی کہانی نہیں ہے صاحب۔ سامنے کی بات ہے۔'' اس نے کہا۔ ''حمید کو اپنی ماں سے بہت محبت تھی۔ وہ اکثر اپنی ماں کے لیے مجھ سے لڑ جایا کرتا تھا۔ یہ بات پورا گاؤں جانتا ہے جبکہ میری اس کی ماں سے کبھی نہیں بنی۔ یہ بھی سب جانتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے درمیان طلاق ہوگئی۔ پورا گاؤں جانتا ہے کہ طلاق والے دن حمید نے مجھ سے بہت بدتمیزی کی تھی۔ اپنی ماں کے لیے اس نے مجھ سے جھگڑا کیا تھا جبکہ اس کی ماں اس کا ساتھ دیتی رہی تھی۔ اس بات سے میں اتنا بددل ہوا کہ طلاق دے کر شہر آگیا۔''

''اوہ...... تو کہانی یہ ہے کہ جب وہ بیٹا تمہارے سامنے آیا تو تم نے اس دن کے جھگڑے کا بدلہ لے لیا۔'' جج نے کہا۔

''نہیں صاحب! بالکل نہیں۔'' اس نے پُرزور انداز میں تردید کی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ میں تو اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ باپ خوش ہی تو ہوسکتا ہے صاحب۔ لیکن قسمت کو ہماری یہ خوشی پسند نہیں آئی اور میرے ہاتھ سے بندوق چل گئی۔ یہ ہے پوری کہانی صاحب۔''

یہ مقدمہ کئی دنوں تک چلتا رہا۔

بہرحال رشید کے ہاتھوں ایک خون ہوا تھا۔ چاہے وہ اتفاقاً ہو یا اس کی کوئی اور وجہ ہو۔ اسی لیے عدالت نے اسے چھ مہینے کی سزا سنائی تھی۔

یہ سزا بندوق کے غلط استعمال اور غفلت کی وجہ سے دی گئی تھی۔ اور اس بات کو مدِنظر رکھا گیا تھا کہ مرنے والا مارنے والے کا اپنا بیٹا تھا۔ اپنی اولاد۔

جب وہ سزا کاٹ کر واپس آیا تو بینک نے اسے اسی برانچ میں رکھ لیا جہاں وہ واردات ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ تو تھا لیکن نہ جانے کیوں رشید کی بات مجھے ہضم نہیں ہورہی تھی۔ کوئی نہ کوئی خلا ضرور تھا۔

ایک شام میں اس وقت اس کے بینک اس کے پاس پہنچ گیا جب اس کا آف ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے بڑے ادب سے سلام کیا۔ میری خیریت دریافت کی۔

''رشید مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''جی صاحب، بتائیں۔''

''یہاں نہیں۔ تمہاری چھٹی تو ہوچکی ہے نا۔''

فلابیئر، گستاو

1821-Flaubert Gustave 1880ء

فرانسیسی ناول نویس۔ ایک معمولی سرجن کا بیٹا تھا۔ شہر روئن میں پیدا ہوا۔ سخت اعصابی تکلیف کے باعث اس کی زندگی کا بیشتر حصہ روئن کے قریب ایک گاؤں میں اپنی والدہ کے ہمراہ بسر ہوا۔ اس کا پہلا ناول 1842ء میں شائع ہوا۔ 1857ء میں اس کا شہرۂ آفاق ناول ''مادام بواری'' چھپا۔ جس کی تخلیق میں پانچ برس لگے تھے۔ یہ ناول رومانی رجحان کے باوجود حقیقت نگاری کا شاہکار ہے۔ اس ناول پر فحش نگاری کے الزام میں مقدمہ چلا لیکن فلابیئر جیت گیا۔ 1862ء میں قدیم کارتھیج (لیبیا) کے بارے میں ایک ناول ''سلامبو'' لکھا۔

مرسلہ: نیاز سولنگی، بکھر

"جی صاحب۔"

"تو چلو، کسی قریب کے ہوٹل میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہیں باتیں ہوں گی؟"

"خیریت تو ہے نا صاحب۔"

"ہاں ہاں، بالکل خیریت ہے۔" میں نے کہا۔ "بس جلدی سے آجاؤ۔ میں سامنے ہی کھڑا ہوں۔"

وہ کچھ دیر بعد میرے پاس آگیا تھا۔ ہم ایک ہوٹل میں جا کر بیٹھ گئے تھے۔

چائے وغیرہ کا آرڈر دینے کے بعد میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "رشید، تمہیں یاد ہوگا کہ جب میں پہلی بار تم سے ملا تو میں نے کیا کہا تھا۔"

"یاد نہیں ہے صاحب۔ آپ بتا دیں۔"

"میں نے کہا تھا کہ ڈاکٹر اور وکیل سے کوئی بات نہیں چھپاتے۔" میں نے یاد دلایا۔ "ان کو سب کچھ بتا دیتے ہیں۔"

"جی صاحب یاد آگیا۔ آپ نے یہی کہا تھا۔" اس نے گردن ہلائی۔

"لیکن افسوس ہے کہ تم نے اصل بات نہیں بتائی۔ تم نے پوری دنیا کو چاہے کچھ بھی بتایا ہو اور سب نے یقین بھی کرلیا ہو لیکن میں نے یقین نہیں کیا۔ تم مجھے اپنا دوست اور ہمدرد سمجھ کر صاف صاف بتا دو کہ یہ کہانی کیا تھی۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا وہ حادثہ ہرگز نہیں تھا۔ میں ماننے کو تیار نہیں ہوں۔"

اس نے گردن جھکالی۔ کچھ دیر بعد اس نے میری طرف دیکھا۔ "ہاں صاحب! وہ حادثہ نہیں تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اسے گولی ماری تھی۔"

"اوہ، تو تم نے اپنی بیوی سے جھگڑے کا اس طرح بدلہ لیا۔" میں نے کہا۔

"نہیں صاحب، خدا گواہ ہے اس لیے نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔

"تو پھر کیا بات تھی۔"

"صاحب، وہ کم بخت بینک لوٹنا چاہتا تھا۔" اس نے بتایا۔

اس حیرت انگیز انکشاف پر میں اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ "کیا کہہ رہے ہو رشید؟ تمہارا بیٹا اکیلے ہی بینک لوٹنے چلا آیا تھا۔"

"وہ اکیلا نہیں تھا صاحب، اس کے چار ساتھی اور بھی تھے۔" اس نے بتایا۔ "گاؤں سے وہ میرے پاس آیا تھا۔ بینک نہیں بلکہ میرے گھر جہاں میں رہتا ہوں۔ وہ اپنے ساتھ پوری اسکیم لے کر آیا تھا۔ اس کے دو ساتھی اور تھے۔ انہوں نے شہر کے بھی دو بندوں کو اپنے ساتھ ملالیا تھا۔ اسکیم یہ تھی کہ میرا بیٹا جھوٹ موٹ کا حملہ کر کے مجھ سے اسلحہ چھین لے گا اور اس دوران اس کے چاروں ساتھی بینک میں داخل ہو جائیں گے۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ جب وہ اور اس کے ساتھی آئیں تو میں اشارے سے بتا دوں کہ اس وقت بینک کی کیا پوزیشن ہے۔ اس میں کتنے لوگ ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"رشید۔" میں نے ستائشی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "اور جب وہ بینک کی پوزیشن معلوم کرنے کے لیے تمہاری طرف آرہا تھا تو تم نے اسے گولی ماردی۔"

"ہاں صاحب، میں نے ایسا ہی کیا۔"

"لیکن کیوں۔ تم پولیس کو بھی تو خبر کر سکتے تھے۔" میں نے کہا۔ "ڈائریکٹ مار دینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اس وقت وہ زندہ گرفتار ہو جاتا صاحب اور پوری دنیا کو پتا چل جاتا کہ وہ میری اولاد ہے، میرا خون ہے۔ اس کے بعد کیا ہوتا صاحب، معلوم ہے۔ لوگ ہم جیسے گارڈز پر بھروسا کرنا چھوڑ دیتے۔ پھر ہمیں محافظ نہیں کہا جاتا، کچھ اور کہا جاتا۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ میں اس بینک میں اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ میں نے اس بینک میں نوکری کی تھی۔ اس کا نمک کھایا تھا۔ میں اپنے فرض سے کیسے غافل ہو سکتا تھا صاحب۔ اس لیے میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا.... مجرم کو تو سزا ملنی چاہیے صاحب۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو۔"

اس بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "رشید، تم واقعی محافظ ہو۔ ایک بڑے آدمی ہو۔ یقین کرو اگر اس ملک کے سارے محافظ تمہاری طرح ہو جائیں تو پھر یہاں ہر طرف سکون ہی سکون ہو۔"

میں اس بڑے آدمی کو ایسے الفاظ کے سوا اور کیا دے سکتا تھا۔ میں نے آج تک یہ راز کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ لیکن آج یہ کہانی اس لیے لکھ رہا ہوں کہ رشید اب اس دنیا میں جا چکا ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا اور مجھے یقین ہے کہ اس کے چاروں طرف سکون ہی سکون ہوگا۔

❄

انہونی

مکرمی مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!
ایک اور سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ میرے جگری دوست کا واقعہ ہے جسے میں نے من وعن بیان کیا ہے۔ امید ہے یہ عجیب وغریب ایک شادی کے گرد گھومتا دلچسپ واقعہ ...... آپ کو بھی پسند آئے گا۔

عمران قریشی
(کوئٹہ)

میری شادی نہایت عجلت میں سوچے سمجھے بغیر حالات کے تیز وتند دھارے کو مدنظر رکھتے ہوئے کردی گئی تھی۔ شادی کے ڈیڑھ دو سال پلک جھپکتے گزر گئے اور پتا ہی نہیں چلا۔ لیکن ایک لڑکے کا باپ بننے کے بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ میری بیوی چاند بی بی کا اصل نام مدھومتی ہے اور وہ مذہب کے لحاظ سے ہندو ہے۔ مزید کریدنے پر کچھ اور انکشافات بھی ہوئے۔

مدھومتی کے ساتھ میری شادی چودہ اگست 1947ء

کے دو دن بعد ہوئی تھی۔ بہت سے لٹے پٹے مہاجرین کے ساتھ جب میں نے پاکستان کی سرحد پر قدم رکھا تو میں ان چند خوش نصیب لوگوں میں سے ایک تھا جنہیں اپنے وطن کی سرزمین کو حاصل کرنے کے لیے زیادہ قربانیاں نہیں دینی پڑیں۔ مشرقی پنجاب کے مدھن پور گاؤں میں تھوڑی سی زمین اور کچے مکان کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ سیاسی حالات میں تغیر دیکھتے ہی میں نے تمام زمین اونے پونے داموں فروخت کردی تھی اور رقم کو کپڑے کی پوٹلی میں محفوظ کرنے کے بعد پوٹلی کو شلوار کے نیفے کے ساتھ سی لیا تھا۔ ایسا میں نے کیوں کیا تھا یہ آگے چل کر بتاؤں گا۔ میری والدہ کا انتقال ایک سال پہلے ہوا تھا اور آگے پیچھے دور پار کے رشتے داروں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ مدھن پور گاؤں پاکستان کی سرحد کے قریب ہی واقع تھا۔ حالات خراب ہوتے ہی میں نے جمع پونجی سمیٹی اور مہاجرین کے قافلوں کے ہمراہ پاکستان چلا آیا۔

یہاں سرحد کے پاس ہی چھوٹا سا غیر معروف گاؤں چک چونیاں تھا۔ چک چونیاں سے آگے جانے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ سو وہیں ڈیرا ڈال کر بیٹھ گیا۔ گاؤں زیادہ بڑا نہیں تھا۔ مکانات کی تعداد پندرہ سے بیس کے درمیان رہی ہوگی۔ میرے پاس شلوار کے نیفے میں رقم موجود تھی، سو میں نے زمین خرید کر اپنے سابقہ پیشے کو مدِنظر رکھتے ہوئے کھیتی باڑی کا آغاز کردیا۔ کچا پکا مکان بھی اونے پونے داموں دستیاب ہوگیا۔ مکان اور زمین کی خرید و فروخت کے دوران جن افراد کی سرپرستی مجھے دستیاب ہوئی ان میں سرفہرست نام چک چونیاں کی اکلوتی مسجد کے امام عبدالرحمان کا تھا جنہوں نے بعد میں ہمارے موجودہ مسئلے کو نہایت افہام و تفہیم کے ساتھ حل کرنے کی کوششیں کیں۔

ذریعۂ معاش کی دستیابی اور رہائش کا معقول انتظام ہوجانے کے بعد بھی میں اپنے آپ کو ادھورا ادھورا سا محسوس کرتا تھا۔ گھر کے در و دیوار سُونے دکھائی دیتے تھے۔ عورت کے وجود کے بغیر گھر مکمل نہیں ہوسکتا۔ کام سے تھکے ماندے گھر واپس آنے کے بعد مجھے نہایت عجلت کے عالم میں ہانڈی روٹی کی تیاری کرنی پڑتی تھی۔ کچا پکا جو بھی تیار کرپاتا تھا اسے زہر مار کرلیتا تھا۔

یہ دسمبر کے اوائل کی بات ہے۔ موسم ابر آلود تھا۔ بارش آنے والی تھی۔ سرِشام میں نے کام مکمل کرنے کے بعد چک چونیاں کا رخ کیا اور اکلوتی مسجد کی جانب چلا آیا۔ وہاں تقریباً آدھے سے زیادہ چک مسجد کے باہر جمع تھا۔ جن میں مردوں اور بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ بوندا باندی کا آغاز ہونے لگا تھا۔ لوگوں کے درمیان عبدالرحمان صاحب کے علاوہ ایک نوجوان لڑکی سیاہ چادر میں ملبوس کھڑی تھی۔ اس کے جسم کا کافی حصہ بشمول چہرہ چادر کے درمیان چھپا ہوا تھا۔ لیکن جسم کے نشیب و فراز جوان ہونے کا اعلان کررہے تھے۔ میں نے مجمع سے کچھ ہٹ کر کھڑے دینو کمہار سے وجہ دریافت کی۔ تب دینو کمہار سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔

"بے چاری بھارت سے لٹ پٹ کر آئی ہے۔ گھر والے تمام قربان ہوگئے۔ جیب میں ٹکا دھیلا بھی موجود نہیں ہے۔ بے آسرا چک کے باہر کھیتوں کے قریب ہکا بکا کھڑی تھی۔ گاؤں کی عورتیں پکڑ کر یہاں لے آئیں۔"

تبھی مولوی عبدالرحمان صاحب کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی جانب بلایا۔ میں لوگوں کے درمیان راستہ بناتا ہوا مولوی صاحب کی جانب چل دیا۔ قریب پہنچنے پر مولوی صاحب بولے۔ "میاں نماز مغرب کے بعد گھر نہیں جانا تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر انہوں نے چند عورتوں کو ہدایت دی کہ وہ لڑکی کو ان کے گھر چھوڑ آئیں۔ جب تک اس کی رہائش کا مسئلہ حل نہیں ہوجاتا تب تک لڑکی ان کی لڑکیوں کے ہمراہ رہ سکتی ہے۔ پھر انہوں نے سامنے موجود افراد کی جانب دیکھتے ہوئے استدعا کی کہ وہ نماز مغرب کے بعد صلاح و مشورے کے لیے کچھ دیر مسجد میں ہی ٹھہرے رہیں۔

نماز مغرب ادا کی گئی۔ بارش طوفانی انداز میں برسنے لگی تھی۔ ہر آدمی کی کوشش یہی تھی کہ وہ جلد از جلد اپنے گھر..... کی راہ لے۔ لیکن مولوی عبدالرحمٰن صاحب کی ہدایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ خاموشی کے ساتھ مسجد کے مختصر کمرے میں بیٹھے رہے۔ اندھیرا بڑھتا چلا جارہا تھا۔ لالٹین کی زرد روشنی اندھیرے کو دور کرنے میں ناکام ثابت ہورہی تھی۔ مولوی صاحب نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ پھر لہجے کو گمبھیر بناتے ہوئے بولے۔ "......لڑکی اپنا نام چاند بی بی بتاتی ہے۔ آگے پیچھے کوئی سرپرست نہیں ہے۔ جوان لڑکی کو کسی بھی گھر میں رکھنا مناسب نہیں ہوگا۔ اگر آپ لوگوں میں سے کوئی اسے سہارا دینا چاہے تو میرے خیال میں نیکی کے اس عمل کی بدولت جہاں اس کی دنیا منور ہوسکتی ہے وہاں آخرت میں بھی اعلیٰ مقام میسر آسکتا ہے۔ کوئی ہے اللہ کا بندہ جو اسے قبول کرنے

کے بعد دنیا و آخرت کی کامیابی کا خواستگار ہو۔"

تمام افراد نگاہیں نیچی کرکے زمین کی جانب دیکھنے لگے۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد مولوی عبدالرحمٰن صاحب طویل سانس لیتے ہوئے بولے۔ "میری نگاہ میں ایک شخص ہے۔" انہوں نے اچانک ہی میرا سیدھا ہاتھ تھام لیا۔ "منور علی تمہارا اس مسئلے کے متعلق کیا خیال ہے؟"

میں نے ہڑبڑا کر مولوی صاحب کی جانب دیکھا۔ تب وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ "تمہارے آگے پیچھے بھی خدا کی ذات کے علاوہ اور کوئی نہیں جبکہ وہ بھی بے سہارا ہے۔ تمہیں گھر کے کام کاج کے علاوہ غمی خوشی کا اظہار کرنے والے ایک ساتھی کی ضرورت ہے جو تمہارے گھر کو مکمل کرسکے اور چاند بی بی کو ایک ایسے گھر کی چار دیواری کی ضرورت ہے جہاں وہ اپنے بے آسرا وجود کو چھپا سکے۔ میرے خیال کے مطابق رشتے آسمانوں پر ترتیب دیئے جاتے ہیں اور ذریعہ کوئی نہ کوئی انسان بن جاتا ہے۔ شاید اس رشتے کے دوران خدا نے ذریعہ بننے کا فریضہ میرے نام لکھ دیا ہے۔ اگر سامنے موجود چک چونیاں کے کسی فرد کو کسی بھی قسم کا کوئی اعتراض ہو تو کھل کر اظہار کرسکتا ہے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔" مولوی صاحب خاموش ہوگئے۔

مجمع میں موجود افراد بے چینی کے ساتھ تیز سے مزید تیز ہوتی ہوئی بارش کی جانب سے پریشان تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے کے علاوہ مزید بات چیت کرنے سے احتراز کیا۔ لیکن پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے کھڑے ہوتے ہوئے لقمہ دیا۔

"میرے خیال کے مطابق شاید چک کے افراد کو اعتراض نہیں ہے اور میرے مشورے کے مطابق اگر آپ منور علی کے علاوہ لڑکی کی رضامندی بھی حاصل کرلیں۔"

مولوی صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولے۔ "کیوں میاں...... تم کیا کہتے ہو۔ شرمانے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر سوچنے کے لیے وقت درکار ہے تو ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ آرام کے ساتھ سوچ سمجھ کر ہاں یا ناں میں جواب دے دینا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یوں بات چیت کا اختتام ہوا اور لوگوں نے عجلت میں طوفانی انداز میں برستی ہوئی بارش کے درمیان اپنے گھروں کا رخ کیا۔

میں تحریر کے شروع میں لکھ چکا ہوں کہ ان دنوں تنہائی مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ شدت کے ساتھ کسی ایسے

مہر

عرب میں قبل اسلام شادی کے موقع پر شوہر دلہن کے والد کو رقم دیا کرتا تھا۔ اس کے بغیر شادی ممکن نہ تھی۔ اس کا کچھ حصہ دلہن کو بھی ملتا تھا۔ آگے چل کر اس نے مہر کی شکل اختیار کی اور اسلام میں یہ لازمی قرار پایا۔ اس کے بغیر نکاح ممکن نہیں۔ اسلام نے مہر کی کم از کم رقم دس درہم مقرر کی۔ زیادہ پر قید نہیں۔ بخاری شریف میں آیا ہے کہ مہر لوہے کی انگوٹھی پر بھی جائز ہے۔ ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ حضرت ابوطلحہؓ نے ام سلیم کو پیغام نکاح بھیجا۔ ام سلیم نے انہیں اسلام لانے کو کہا اور کہا کہ یہ اسلام ہی میرا مہر ہوگا۔ حضرت ثابت کہتے ہیں کہ میں نے اس سے بہتر مہر نہیں دیکھا۔ مہر کی ادائیگی لازمی ہے۔ نہ دینے والا سزاوار ہوگا۔ حدیث پاکؐ میں اس کا ذکر یوں آیا ہے کہ جو شخص کسی سے مہر پر نکاح کرے اور دل میں اس کی ادائیگی کا ارادہ نہ رکھتا ہو۔ وہ یوم الحشر اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک زانی کی حیثیت سے پیش ہوگا۔ تاہم سورۃ النساء میں ہدایت آئی ہے کہ مہر میں باہمی رضامندی سے کمی بیشی جائز ہے۔ اسی سورہ میں مہر کے بارے میں وسیع ہدایات ملتی ہیں۔ یعنی یہ خوشی سے دینا چاہیے اور ضرور دینا چاہیے۔ اس طرح سورۂ بقرہ کی آیت 236 میں آیا ہے کہ اگر "تم عورتوں کو ان کے پاس جانے سے قبل طلاق دے دو۔ لیکن مہر مقرر کرچکے ہو تو آدھا مہر دینا ہوگا۔ ہاں اگر عورتیں مہر بخش دیں یا مرد جن کے ہاتھ میں عقد نکاح ہے (اپنا حق) چھوڑ دیں اور پورا مہر دیں تو ان کو اختیار ہے۔ مہر کی دو قسمیں ہیں، ایک مہر مسمّٰی اور دوسرا مہر مثل، مہر مسمّٰی کی رقم متعین ہوتی ہے۔ مہر مثل کی رقم حیثیت کے مطابق کی جاتی ہے۔ اس میں کوئی بھی چیز مثلاً مکان، زمین وغیرہ دی جاسکتی ہے جو بیوی کی ملکیت میں چلی جاتی ہے۔ یہ مہر بسا اوقات شادی کے وقت ہی دے دیا جاتا ہے اور بسا اوقات شادی کے بعد وقتِ طلاق پر، جیسا کہ مشرق کی روایات میں شامل ہے۔ اسے دو حصوں میں بھی بانٹا جاسکتا ہے۔ مہر معجّل............ کی ادائیگی وقتِ نکاح پر ہوتی ہے اور غیر معجّل میں وقت کی مہلت دے دی جاتی ہے۔ اسے موجل بھی کہتے ہیں۔ اسلام کی رُو سے بیوی کا شوہر پر قرضہ ہوتا ہے اور اس کے وصال کے وقت جنازے کے اخراجات نکالنے کے بعد سب سے پہلے مہر نکالا جاتا ہے اور پھر از روئے قانونِ وراثت اس کی تقسیم ہوتی ہے۔

مرسلہ: نعیم اختر عطاری، لاہور

ساتھی کی طلب محسوس ہوتی تھی جس کے سامنے اپنے تمام دن کی کارگزاری بیان کرسکوں اور جب میں تھکا ہارا شام کو گھر آؤں، تب ہانڈی روٹی بنا کر کوئی میری منتظر ہو۔ سوچنے سمجھنے کی مجھے ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں نے دوسرے دن ہی مولوی صاحب کے حجرے میں جا کر انہیں اپنی رضامندی سے آگاہ کردیا۔ میرے اقرار کے فوراً بعد گاؤں کے چند سرکردہ افراد کو مسجد میں بلایا گیا۔ لڑکی سے اس کی مرضی دریافت کی گئی اور جٹ منگنی پٹ بیاہ کے مترادف میری شادی چاندنی بی کے ساتھ کردی گئی۔

میں نے اس کی صورت پہلی دفعہ سہاگ رات میں دیکھی۔ وہ خوبصورت نہیں تھی لیکن سانولی سلونی اور پُرکشش ضرور تھی۔ بال کمر سے نیچے تک لمبے اور سیاہ تھے۔ چلتے ہوئے ایسے گمان ہوتا تھا جیسے اس کی کمر پر سیاہ ناگن رقص کرتی ہوئی اوپر جانے کی کوشش میں مصروف ہو۔ علاوہ ازیں نہایت کم گو اور سوچ میں ڈوبی رہنے والی پُراسرار شخصیت کی حامل تھی۔ ان باتوں کے علاوہ گھر کے کاموں میں.... نہایت ہی سلیقہ شعار اور محنتی لڑکی تھی۔ عمر بمشکل سولہ سترہ سال تھی۔

شادی کا پہلا سال کیسے چٹکی بجاتے ہوئے گزرا میں جان ہی نہیں سکا۔ انکشافات کا سلسلہ پہلے بچے کی ولادت کے بعد ہوا۔

ہوا کچھ یوں کہ اس دن میں کسی کام کی وجہ سے کچھ پہلے گھر چلا آیا۔ گھر کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور بچے کے رونے کی آواز سے کمرا گونج رہا تھا۔ میں نے ہڑبڑا کر گھر میں قدم رکھ دیا۔ تب چاندنی بی کو غیر حاضر پایا۔ بچہ بھوک سے بلک رہا تھا۔ ابھی میں مزید کچھ سوچنے بھی نہیں پایا تھا کہ گھر کے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا۔ وہ ایک ہاتھ میں کاسنی رنگ کی گٹھڑی اور دوسرے میں دودھ کا برتن تھامے دروازے سے داخل ہورہی تھی۔ مجھے کمرے کے دروازے کے پاس کھڑے دیکھ کر اس کے ہاتھوں سے گٹھڑی نیچے گرتے گرتے بچی۔ اس نے حواس باختہ نگاہوں کے ساتھ میری جانب دیکھتے ہوئے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”گھر میں دودھ ختم ہوگیا تھا میں وہی لینے دینو چاچا کے ڈیرے پر گئی تھی۔“

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے اس کے دوسرے ہاتھ کی جانب دیکھا۔ وہ دودھ کا برتن تھامے ہوئے تھی۔

میں نے کاسنی گٹھڑی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اس میں کیا ہے؟“

وہ پریشان لہجے میں بولی۔ ”معلوم نہیں...... چاچا دینو کے ڈیرے کے پاس کھیتوں والے راستے پر پڑی ہوئی تھی۔ میں اٹھا کر لے آئی۔ اس نے گٹھڑی کو چارپائی پر رکھا اور خود باورچی خانے میں جا کر دودھ گرم کرنے لگی۔ بچہ ہلکان ہو کر سوگیا تھا۔ میں نے کچھ دیر کاسنی گٹھڑی کو دیکھتے رہنے کے بعد آگے بڑھ کر اسے کھول دیا۔ گٹھڑی میں سرخ رنگ کے کپڑوں کے جوڑے کے علاوہ سیندور اور منگل سوتر دھرا ہوا تھا۔ میں نے بوکھلا کر گٹھڑی کو دوبارہ باندھ دیا۔ پھر باورچی خانے میں موجود چاندنی بی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہ گٹھڑی کسی ہندو عورت کی دکھائی دیتی ہے۔ تم اسے دوبارہ کھیتوں کے پاس رکھ آنا۔ گھر میں رکھنا بہتر نہیں ہے۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور میں کھیتوں میں کام آنے والے اوزار تھامے گھر سے باہر نکل آیا۔

وہ گٹھڑی اگلے دو تین دنوں تک ہمارے مکان میں ہی رہی۔۔ اور میں لاعلم رہا۔ حالانکہ وہ ہماری چارپائی کے نیچے موجود لوہے کے ٹرنک میں تھی۔ یہ میرے مشکوک ہونے کی ابتدا تھی۔ لیکن حقیقت کھل کر اس دن سامنے آئی، جب کھاد کی خریداری کے لیے میں نے بارڈر کی جانب جانے کا پروگرام بنایا۔ بارڈر پر کھاد گاؤں کی نسبت سستے داموں دستیاب ہوجاتی تھی۔ بارڈر چک چونیاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے کرمو تانگے والے کو ہمراہ چلنے کے لیے پیشگی کرایہ دے دیا تھا۔ ہم دوپہر کو ڈیڑھ بجے کے قریب چک چونیاں سے باہر نکلے۔ چک سے کچھ دور سڑک سے ہٹ کر میں نے سرخ کپڑوں میں ملبوس ایک عورت کو کچھ فاصلے پر واقع درختوں کے جھنڈ کی جانب جاتے ہوئے دیکھا۔ میری یادداشت کے مطابق صبح چاندنی بی نے بھی سرخ جوڑا زیب تن کیا ہوا تھا۔ عورت کے نقوش غیر واضح تھے۔ اس لیے میں حتمی طور پر کچھ بھی سوچنے کے قابل نہیں تھا۔ لیکن عورت کے ہاتھوں میں موجود کاسنی رنگ کی گٹھڑی مجھے بہت کچھ سمجھانے کے لیے کافی تھی۔ میں نے کرمو کو تانگا روکنے کے لیے کہا اور اسے کچھ بھی بتائے بغیر تانگے سے نیچے اتر کر درختوں کے جھنڈ کی جانب چل پڑا۔ لڑکی جھنڈ میں داخل ہونے کے بعد نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ درختوں کا یہ جھنڈ سرحد کے قریب ہی واقع تھا۔ میں جب

جھنڈ کے قریب پہنچا تب مجھے چاندنی بی کی آواز سنائی دی۔ میں نے خود کو درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان پوشیدہ رکھتے ہوئے جھنڈ کے اندر جھانکا۔ جھنڈ میں چاندنی بی کے ہمراہ بیس پچیس سال کا..... لمبے قد کا ایک لڑکا بھی موجود تھا۔ وہ چاندنی بی کے دونوں ہاتھوں کو تھامے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کا سمندر موجزن تھا۔ چاندنی بی کی پیٹھ میری جانب تھی اس لیے وہ مجھے دیکھ نہیں پائی لیکن لڑکے نے شاید میری جھلک دیکھ لی۔ اس کی آنکھوں میں شدید حیرت کے آثار دکھائی دیے۔ میرے ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچنے لگیں اور میں پاؤں پٹختا چک کی جانب واپس چلا آیا۔ چک پہنچ کر میں نے گھر جانے کے بجائے مسجد کا رخ کیا۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب حجرے میں موجود تھے۔ وہ مجھے غصے میں دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ میں پھٹ پڑنے والے لہجے میں بولا۔ ”چاندنی بی سرحد کے پاس واقع جھنڈ میں کسی غیر لڑکے کے ہمراہ موجود ہے۔ میں اس ملاقات کا چشم دید گواہ ہوں۔ مجھے اسے گولی ماردینی چاہیے تھی لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں ایسا نہیں کرسکا۔“ میرے ہاتھ کی مٹھیاں دوبارہ بھنچ گئیں۔

مولوی صاحب کے چہرے پر حیرت کے تاثرات پھیلنے لگے پھر وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ”نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ میں چاندنی بی کو جانتا ہوں۔ وہ نہایت شریف اور پاک دامن لڑکی ہے۔“

میں نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو میرے ساتھ چلیے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ابھی تک واپس نہیں آئی ہوگی اور میرا بچہ بھوک سے بلک بلک کر رو رہا ہوگا۔“

مولوی صاحب نے عجلت میں اپنی چادر درست کی پھر جوتیاں پہن کر میرے ہمراہ چل دیے۔ گھر کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور بچے کے رونے کی آواز باہر تک سنائی دے رہی تھی۔ میں نے گھر میں داخل ہو کر روتے ہوئے بچے کو گود میں اٹھایا تو وہ یکلخت خاموش ہوگیا۔ میں نے مولوی صاحب کی جانب دیکھتے ہوئے انہیں بتایا۔ ”ایسا پہلے بھی ایک دفعہ ہوچکا ہے اور شاید ہر روز ہوتا رہتا ہوگا۔ وہ دودھ پیتے بچے کو اکیلا چھوڑ کر اپنے آشنا سے ملنے سرحد کے پاس واقع جھنڈ کی جانب جاتی ہے۔ گزشتہ ملاقاتوں کے متعلق میں یقینی طور پر نہیں بتا سکتا لیکن آج کی ملاقات میری نگاہوں کے سامنے ہوئی تھی۔“

تبھی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے کمرے سے باہر کی جانب دیکھا۔ وہ پریشان صورت لیے صحن میں داخل ہورہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں کاسنی گٹھڑی موجود نہیں تھی۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی میرا خون کھولنے لگا اور میں نے آگے بڑھ کر اسے چٹیا سے پکڑنے کی کوشش کی لیکن مولوی صاحب نے درمیان میں آ کر بیچ بچاؤ کروادیا پھر انہوں نے چاندنی بی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ سب کیا ہے، تم بارڈر کے پاس کس سے ملنے گئی تھیں۔“

چاندنی بی پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ مولوی صاحب نے اسے بازو سے تھامتے ہوئے چارپائی پر بٹھادیا پھر ایک جانب رکھے ہوئے گھڑے میں سے پانی نکال کر گلاس اس کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے ٹھنڈے لہجے میں بولے۔ ”پانی پیو اور پھر ہمیں بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟“

چاندنی بی نے پانی ایک ہی گھونٹ میں پی لیا۔ اس کے حواس کچھ بحال ہوئے تب وہ ہکلاتے لہجے میں بولی۔ ”وہ میرا پہلا شوہر رامو ہے۔“ میرے سر پر بم کا دھماکا ہوا اور مجھے کمرے کی چاروں دیواریں ہوا میں اڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ مولوی صاحب کا حال بھی مجھ سے مختلف نہیں تھا۔ وہ ہماری کیفیت سے لاعلم کہتی چلی جارہی تھی۔ ”میرا تعلق ہندو گھرانے سے ہے۔ چودہ اگست کی رات میری شادی رامو کے ساتھ ہوئی اور میں بیاہ کر لاہور کے قریب دیال پور آگئی۔ وہ میری سہاگ رات تھی۔ میں کمرے میں بیٹھی رامو کا انتظار کررہی تھی کہ پاک و ہند کی علیحدگی کا اعلان ہوگیا۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارا گاؤں پاکستان کی سرزمین میں شامل کردیا گیا ہے۔ اس لیے ہم لوگ مزید ڈر گئے کہ اب مسلمان ہمیں چھوڑیں گے نہیں۔ ہندو مسلم کشیدگی پہلے سے تھی کہ افواہ اڑی، مسلمان اس

شمارہ نومبر 2013ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش...... آپ کا انتخاب

☆ اول: سیلاب کا سانپ...... شمس الدین (ڈسکہ)

☆ دوم: انتظار...... روبی (لاہور)

☆ سوم: محبت زندہ باد...... افشاں (کراچی)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

گاؤں پر حملہ کرنے آرہے ہیں۔ یہ سنتے ہی گاؤں میں بھگدڑ مچ گئی۔ افراتفری کے عالم میں جو سامان ہاتھ لگا وہ اٹھا کر میری سسرال والے ہندوستان کی طرف بھاگ اٹھے، انہیں میرا خیال بھی نہ رہا۔ میں دلہن بنی کمرے میں بیٹھی رہ گئی۔ صبح مجھے خبر ہوئی کہ گاؤں میں اب ایک بھی بندہ بشر نہیں رہا۔ میرا وہاں رکنا اب کچھ معنی نہیں رکھتا تھا۔ میں نے دلہن کا سرخ جوڑا اتارا... اور عام کپڑے پہننے کے بعد سرخ جوڑا، منگل سوتر اور سیندور کی ڈبی کو کاسنی گٹھڑی میں باندھا اور گھر سے باہر نکل پڑی۔ مجھے بتایا گیا کہ بھارت میں شامل ہونے والے علاقے وہاں سے زیادہ دور نہیں ہیں سو میں پیدل چلتی رہی۔ تھکن دور کرنے کے لیے میں ایک پیڑ کے نیچے بیٹھی اور بیٹھے بیٹھے سوگئی۔ جب آنکھ کھلی تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ مطلع ابر آلود تھا۔ میں جھنڈ سے باہر نکل کر پریشان نگاہوں سے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی کہ میں نے چند عورتوں کو اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ ہاتھوں میں موجود گٹھڑی میری اصلیت کا پول کھول سکتی تھی۔ اس لیے میں نے اسے ایک گہرے کھڈے میں چھپا دیا۔" چاندنی بی اچانک ہی خاموش ہوگئی۔

میں اور مولوی صاحب اس کی کہانی مکمل انہماک کے ساتھ سننے میں مصروف تھے۔ اس کے خاموش ہونے پر چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگے۔ مولوی صاحب نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے پوچھا۔ "تمہاری دل گرفتہ کہانی اپنی جگہ پر...... لیکن جب تم سے شادی کے متعلق دریافت کیا گیا تھا تب تم نے پہلے سے شادی شدہ ہونے کے باوجود بھی اقرار کرلیا۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

چاندنی بی نے دوبارہ ہچکیاں لے کر رونا شروع کردیا۔

"میں مجبور تھی۔ ہمت ہار گئی تھی۔ میرے خیال کے مطابق ان حالات میں اکیلے سرحد کے پار جانا ممکن نہیں تھا۔ مجھے اردگرد کوئی نہ کوئی سہارا تلاش کرنا تھا۔ اگر میری اصلیت کا راز افشاں ہوجاتا، تب شاید اگلا لمحہ میں زندگی کا سانس بھی نہیں لے پاتی۔ ہندو ہونے کی وجہ سے ماردی جاتی۔ چک کی عورتوں نے مجھ سے کھیتوں میں تنہا کھڑے ہونے کی وجہ دریافت کی۔ تب میں خاموش رہی۔ وہ مجھے بھارت سے لٹ کر آنے والی مہاجر سمجھ کر چک میں لے آئیں۔ منور علی سے شادی کرنا میری مجبوری تھی۔ میں مانتی ہوں کہ ایسا کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ لیکن آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ ان حالات کا سامنا اگر آپ کو کرنا پڑتا تب آپ کیا کرتے؟"

کمرے میں ایک دفعہ پھر خاموشی طاری ہوگئی۔ مجھے اپنی زندگی تباہ ہوتی دکھائی دینے لگی۔ میری اور اس کی شادی صرف ایک مجبوری پر مشتمل تھی۔ اگر وہ ہندو شوہر کے ساتھ فرار ہوجاتی تب میرے دودھ پیتے بچے کا کیا ہوتا؟ مولوی صاحب الجھے ہوئے لہجے میں بولے۔ "تمہارا ہندو شوہر اس وقت کہاں ہے؟"

چاندنی بی ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ "اینٹوں کے متروک شدہ بھٹے میں......"

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد مولوی صاحب ہچکچاتے ہوئے بولے۔ "چاندنی بی مجھے معلوم ہے کہ مجھے ایسا سوال نہیں پوچھنا چاہیے لیکن موجودہ مسئلے کے لحاظ سے سوال نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ مجھے معاف کرنا لیکن اس کے بنا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ مجھے بتاؤ کہ منور علی سے شادی اور ایک بچے کی ماں بننے کے بعد اب تم دماغی طور پر اپنے آپ کو ہندو محسوس کرتی ہو یا پھر مسلمان...... بہت سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ یہ نہایت ضروری ہے۔"

چاندنی بی بولی۔ "مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔ میں اپنے آپ کو ایسے گرداب میں پھنسا ہوا محسوس کررہی ہوں جس سے نکلنا ممکن نہیں ہے۔ گزشتہ ایک مہینے کے دوران میں سکون کی نیند سو نہیں پائی ہوں۔ پچھلے مہینے وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا چک چونیاں چلا آیا۔ مجھے تلاش کرنے میں اسے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے اندازے کے مطابق مجھے سرحد کے اردگرد کسی دیہات یا قصبے میں موجود ہونا چاہیے تھا۔ میری اور اس کی پہلی ملاقات دینو چاچا کے ڈیرے کے پاس موجود کھیتوں میں ہوئی۔ اس نے مجھے بھاگ چلنے کا مشورہ دیا۔ تب میں نے اسے اپنی مجبوریوں سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ میں اب ایک دودھ پیتے بچے کی ماں بن چکی ہوں اور میرا شوہر مسلمان ہے۔ اس نے میری مجبوریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے نا صرف مجھے زدوکوب کیا بلکہ لعنت ملامت بھی کی۔ پھر مجھے سمجھانے لگا کہ ہندو اور مسلمان کی شادی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان دونوں میں سے کوئی ایک اپنے دھرم کو بدل لینے پر راضی نہ ہو۔ وہ مسلمان ہے اور تم ہندو۔ شادی کوئی معنی نہیں رکھتی اور تمہارا بچہ بھی ناجائز ہے۔ مجھے اس کی باتیں اچھی محسوس نہیں ہوئیں۔ میں اپنے بچے سے محبت کرتی ہوں اور مجھے یہ بات گوارا نہیں ہے کہ کوئی بھی میرے بچے کو ناجائز کہے۔ پھر بھی میں نے اس سے ایک دو دن سوچنے کی مہلت طلب کی اور چک چونیاں واپس چلی آئی۔ بچے کو چھوڑنا میرے لیے مشکل ہے اور رامو بچے کو اپنے ہمراہ سرحد پار لے جانے کے لیے آمادہ نہیں۔ سرحد پار رامو کے علاوہ میرے ماں باپ بھی میرے منتظر ہیں۔ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں لیکن اپنے بچے کے ساتھ...... اس کی جدائی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا کہ میں کیا کروں۔" آخری الفاظ کی ادائیگی کے دوران اس کی آنکھوں سے دوبارہ آنسو بہنے لگے۔

مولوی صاحب بولے۔ "تمہارے شوہر کا کہنا درست ہے۔ تمہاری اور منور علی کی شادی جائز نہیں ہے۔ وہ تمہارے مجبورانہ فعل کی مرہونِ منت تھی۔ میرے مشورے کے مطابق تمہیں اپنے ہندو شوہر کو اس بات پر راضی کرنا چاہیے کہ وہ تمہیں بچہ اپنے ہمراہ ہندوستان لے جانے کی اجازت دے دے۔ علاوہ ازیں اگر تم منور علی کے ساتھ اپنے میاں بیوی کے رشتے کو مستحکم کرنا چاہتی ہو تب تمہیں اپنے سابقہ شوہر سے طلاق لینے کے بعد موجودہ شوہر منور علی سے مسلمان ہونے کے بعد دوبارہ شادی کرنی ہوگی۔ میں اس مسئلے کے متعلق تمہارے ہندو شوہر کے موقف کو بھی سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے کہنے کے مطابق وہ سرحد کے پاس درختوں کے جھنڈ کے قریب متروک شدہ بھٹے میں رہتا ہے۔ تم اسے کل رات یہاں آنے کی دعوت دے دو۔ اس کے جان و امان کی ذمے داری مجھ پر ہے۔ لیکن میرے خیال میں حتمی فیصلے کے لیے اس کا یہاں آنا اور ہمیں اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا نہایت ضروری ہے۔"

چاندنی بی نے اثبات میں سر ہلایا اور مولوی صاحب اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

وہ رات میرے لیے نہایت اذیت ناک ثابت ہوئی۔ میں تمام رات سکون کی نیند نہیں سو پایا۔ سوچوں کی نہ ختم ہونے والی یلغار تھی جو میرے دماغ کا محاصرہ کیے ہوئے تھی۔ چاندنی بی نا صرف ہندو تھی بلکہ پہلے سے شادی شدہ بھی تھی۔ رات کی باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں اس بات کا اندازہ بخوبی لگا سکتا تھا کہ اس کا ذہنی جھکاؤ میرے مقابلے میں اپنے سابقہ شوہر کی جانب زیادہ تھا اور اس کے کہنے کے مطابق میری اور اس کی شادی صرف مجبورانہ حکمتِ عملی تھی...... اس کے علاوہ مزید کوئی حقیقت ... ہمارے رشتے کے درمیان نہیں پائی جاتی تھی۔

وہ سامنے والی چارپائی پر خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی۔ کمرے کا ماحول اس کے خفیف خراٹوں کی آواز سے گونج رہا تھا۔ اسے اپنے ظالمانہ رویے پر رتی برابر بھی افسوس نہیں تھا۔ دودھ پیتا بچہ اس کی بغل میں سر دیے آنے والے حالات سے بے پروا میٹھی نیند سویا ہوا تھا۔ مجھے دونوں ماں بیٹے کی بے حسی پر شدید غصہ آنے لگا۔ میری طرح انہیں بھی پریشان ہونا چاہیے تھا۔ اگر نہیں تو پھر انہیں مطمئن ہونے کا بھی حق حاصل نہیں تھا۔ فساد کی جڑ رامو تھا۔ آنے والے دن اگر چاندنی بی نے رامو کی جانب بڑھنے کی کوشش کی تب میں رامو کو قتل کرکے چک چونیاں سے فرار

مینار خاموش

پارسی اور زرتشتی مذہب کے ماننے والے اپنے مُردوں کو دفن نہیں کرتے، بلکہ ایک اونچے مینار پر رکھ دیتے ہیں۔ تاکہ گدھ وغیرہ کی خوراک بن جائیں۔ یہ مینار "مینار خاموش" Tower of silence کہلاتے ہیں۔

میور

27 اپریل 1819ء۔ 11 اپریل 1905ء

مشہور ماہرِ تعلیم اور مستشرق۔ پورا نام سر ولیم میور تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سول سروس سے منسلک تھا۔ 1837ء سے 1876ء تک ہندوستان میں قیام رہا۔ ہندوستان میں قیام کے آخری دنوں میں یوپی کا لیفٹیننٹ گورنر بھی مقرر ہوا۔ عربی کا ذوق اور تاریخ اسلام کے مطالعے کی طرف میلان ہندوستان کے قیام اور مسلمانوں سے قربت کا نتیجہ تھا۔ سرسید احمد خان اور مولوی نذیر احمد سے خصوصی روابط تھے۔ جامعہ الہٰ آباد کے قیام کے لیے اس کی کوششیں کامیاب ہوئیں۔ وطن واپس جانے کے بعد ایڈنبرا یونیورسٹی سے منسلک ہوگیا۔ ایڈنبرا میں ہی وفات پائی۔ تصانیف میں حیاتِ محمدؐ، خلافت کا عروج و زوال، تاریخِ اسلام (چار جلدیں) قرآن اور اس کی تعلیمات شامل ہیں۔

مرسلہ: زاہد سہیل، جھنگ

ہو جاؤں گا۔ یہ سوچ میرے لیے اطمینان بخش ثابت ہوئی اور میں صحن میں بیٹھ کر چھری کو پتھر پر تیز کرنے لگا۔

صبح چاندنی بی کے اٹھنے سے پہلے ہی میں ناشتا کیے بغیر گھر سے باہر نکل گیا۔ ہوٹل سے چائے پینے کے بعد میں نے بے دلی کے ساتھ زمینوں کا رخ کیا۔ کام کرنے کا موڈ نہیں تھا۔ اس لیے کاہلی کے ساتھ شہتوت کے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں لیٹا آنے والے وقت کی منصوبہ بندی کے تانے بانے بُنتا رہا۔ دوپہر کا کھانا بھی میں نے ہوٹل میں کھایا اور مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد مولوی صاحب کے ہمراہ گھر چلا آیا۔ چاندنی بی گھر میں اکیلی تھی۔ بچہ سویا ہوا تھا اور چاندنی بی کے کہنے کے مطابق رامو مغرب کے بعد اندھیرا ہوتے ہی چاچا دینو کے ڈیرے کے پاس آجاتا۔ اب یہ فریضہ بھی مجھے ہی ادا کرنا تھا کہ اپنے رقیب روسیاہ کو دینو چاچا کے ڈیرے سے گھر تک میں ہی لاؤں۔ سو مرتا کیا نہ کرتا کے مترادف ڈیرے کی جانب چل دیا۔ چاندنی بی میرے ہمراہ تھی۔ ہمارے درمیان خاموشی کی سرد دیوار حائل ہونے کے علاوہ اجنبیت کی دوری بھی قائم تھی۔ وہ مجھ سے پانچ چھ قدم کے فاصلے پر جھجکتے ہوئے آہستہ آہستہ چلتی آرہی تھی۔ مغرب کے بعد گاؤں کی زندگی یکدم مردہ ہونے لگتی ہے۔ پھر دینو چاچا کا ڈیرا تو ویسے بھی گاؤں سے کچھ ہٹ کر واقع تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ڈیرے کی جانب جاتے ہوئے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ وہ کھیتوں کے پاس بنی منڈیر کے پاس کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ سیاہ رنگ کے کپڑے میں لپٹا تھا۔ لیکن غیر معمولی قد کاٹھ کی بدولت وہ ایک صحت مند اور بھرپور نوجوان دکھائی دیتا تھا۔ چاندنی بی نے دبے لہجے میں ہمارا تعارف کروایا۔ میں نے سرد مہری کے ساتھ منہ مخالف جانب پھیرلیا اور غصیلے قدموں کے ساتھ کوئی بھی بات چیت کیے بغیر واپس گھر کی جانب چل دیا۔ دونوں سرگوشیانہ لہجے میں بات چیت کرتے ہوئے میرے پیچھے چلنے لگے۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد میں خاموشی کے ساتھ دری پر مولوی صاحب کے ہمراہ بیٹھ گیا۔ بچہ مولوی صاحب کی گود میں موجود تھا۔ چاندنی بی نے آگے بڑھ کر بچے کو گود میں اٹھایا اور چادر لپیٹ کر اسے دودھ پلانے لگی۔ رامو دروازے کے پاس کھڑا ہچکچاتی نگاہوں کے ساتھ کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ مولوی صاحب نے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد اسے اپنے قریب دری پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ رامو خاموشی کے ساتھ مولوی صاحب کے ہمراہ دری پر بیٹھ گیا۔ اس نے چہرے پر موجود کپڑے کو اتار دیا۔ میں نے کن انکھیوں کے ساتھ اس کے سراپے کا جائزہ لیا۔ سیاہ بال تیل سے بھرے چہرے پر بے ترتیب بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں چھوٹی اور سرمے سے بھری ہوئی تھیں۔ چہرے پر عیاری اور مکاری جیسے ثبت تھی۔ سینہ چوڑا چکلا، ہاتھ پاؤں مضبوط تھے۔ سفید کرتے اور دھوتی میں ملبوس ہونے کے باوجود مجھے ایک آنکھ نہیں بھایا۔ کمرے میں چار بندوں کے موجود ہونے کے باوجود بھی گمبھیر خاموشی طاری تھی۔ اس خاموشی کو مولوی صاحب نے توڑا اور رامو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ”رامو، چاندنی بی تمہیں موجودہ مسئلے کے متعلق آگاہ کر چکی ہوگی اور میرے خیال کے مطابق مسئلے کو مزید طول دینے کے بجائے اگر حل طلب باتوں کے متعلق گفت وشنید کی جائے تب شاید ہمارے علاوہ تمہارے لیے بھی بہتر ہوگا۔“ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ دوبارہ ہم کلام ہوئے۔ ”سب سے پہلے میں موجودہ مسئلے کے لحاظ سے تمہارے موقف سے آگاہی حاصل کرنا چاہوں گا۔ یہ ضروری ہے۔ تم کھل کر بات کرسکتے ہو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری جان ومال کی حفاظت اب ہمارے ذمے ہے۔“ مولوی صاحب خاموش ہوگئے۔

رامو دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے انکسارانہ لہجے میں بولا۔ ”حضور! میرا موقف اس سے زیادہ بھلا اور کیا ہوگا کہ میری پتنی کو میرے ہمراہ بھارت جانے دیا جائے۔ میں سرحد پار کر کے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر یہاں صرف اسی لیے آیا ہوں کہ مجھ سے اپنی بیوی کی جدائی برداشت نہیں۔“

مولوی صاحب ہنکارا بھرتے ہوئے بولے۔ ”میاں میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں لیکن تمہارے دل میں بیوی کی محبت کافی دنوں کے بعد بیدار ہوئی اگر پہلے ہوجاتی تب مسئلہ اتنا گمبھیر نہ ہوتا۔“

”جناب آزادی کے بعد جب میں نے اپنے گھر والوں کے ہمراہ سرحد کے پار قدم رکھے تو مسائل کا شکار ہوگیا۔ گھر کے حصول اور ذریعۂ معاش کی دستیابی کے دوران چھ سات مہینے کا عرصہ کیسے گزر گیا پتا ہی نہیں چلا۔ فرصت ملنے پر میں نے یہاں کا رخ کیا پھر بھی بیوی کو تلاش کرنے میں کافی وقت لگ گیا۔ اس لحاظ سے میری جانب سے کوئی بھی کوتاہی نہیں ہوئی۔ وقت کی ستم ظریفی کہہ لیجیے یا پھر تقدیر کا لکھا جو بھی تھا اور جیسے بھی تھا آپ کے سامنے

ہے۔“

مولوی صاحب نے تنقیدبھری نگاہوں کے ساتھ رامو کے سراپے کا جائزہ لیا پھر تعریفی لہجے میں بولے۔ ”تمہاری اردو نہایت خوبصورت اور شستہ ہے۔ پڑھے لکھے دکھائی دیتے ہو۔“

رامو نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ”میٹرک پاس کر چکا ہوں اور میونسپل کارپوریشن میں کلرک کی آسامی کے لیے نامزد ہوگیا ہوں۔ آگے پڑھنے کا شوق ہے۔ لیکن وقت کی کمی اور محدود وسائل کی بدولت شوق کی تکمیل ممکن دکھائی نہیں دیتی۔ پھر بھی شوق برقرار ہے۔“

مولوی صاحب بولے۔ ”اللہ شوق کو قائم و برقرار رکھے۔ دیکھو برخوردار محبت کی شدت سے شوق پیدا ہوتا ہے اور شوق کے لیے انسان کچھ بھی کرنے کے لیے آمادہ ہوجاتا ہے۔ اگر محبت میں شدت نہ ہو تب بےپروائی غالب آجاتی ہے۔ بےپروائی محبت سے انحراف کرتی ہے۔ تمہارے کہنے کے مطابق سرحد کے پار قدم رکھنے کے بعد گردشِ ایام کی بدولت تمہیں سوچنے سمجھنے کی فرصت ہی نصیب نہ ہوپائی۔ نہ جانے ایسا گردشِ ایام کی بدولت ہوا یا پھر بےپروائی محبت پر غالب آگئی، جو بھی تھا۔ لیکن یہاں تمہاری بیوی کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ لیکن اس کی زندگی دوراہے کی صورت میں بٹ گئی۔ دو کشتیوں کی سوار چاندنی بی سابقہ مدھوتی کے لیے کسی ایک کا انتخاب کرنا ممکن دکھائی نہیں دیتا اور میرے محدود دماغ کے مطابق مسئلے کے حل کے لیے اسے ایک کا انتخاب تو بہرحال کرنا ہی ہوگا۔“ انہوں نے چاندنی بی کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”مسئلے کے متعلق تمہاری رائے کیا ہے۔ یقیناً ایک مہینے کے دوران تم کسی نہ کسی مثبت نتیجے تک پہنچ چکی ہوگی۔ بچے کو ایک جانب لٹا دو اور ہمیں بتاؤ۔“

چاندنی بی بچے کو دودھ پلا کر سلا چکی تھی۔ اس نے بچے کو ایک سائیڈ پر بچھی ہوئی گدیلی پر لٹایا۔ پھر بولی۔ ”میں پہلے بتا چکی ہوں کہ میری اور رامو کی ملاقات آج سے ایک ڈیڑھ مہینے پہلے ہوئی تھی اور یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ میں مسئلے کے متعلق ایک ڈیڑھ مہینے سے سوچنے میں مصروف تھی۔ مجھے دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ یہ کوئی آسان بات نہیں تھی۔ لیکن میرے دونوں شوہروں کے برتاؤ نے مجھے مسئلے کو حل کرنے میں بہت مدد دی۔ اگر میں اپنے ہندو شوہر رامو کی بات کروں تو وہ عین سہاگ رات والی رات مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ اس نے پھیروں کے دوران کھائی ہوئی قسموں کا پاس بھی نہیں رکھا۔ جو شخص اپنی نوبیاہتا بیوی کو چھوڑ کر فرار ہوجائے تب بیوی اس سے کیا توقع رکھ سکتی ہے کہ وہ آیندہ زندگی کی مشکلات میں بھی اس کا ساتھ دے پائے گا یا نہیں...... رامو کے برخلاف منور علی نے اس مختصر وقت کے دوران جو ہم دونوں کا ساتھ گزرا، ہمیشہ اور ہر مشکل و آسان گھڑی میں میرا ساتھ دیا۔ حتیٰ کہ یہ جاننے کے

قادری میاں میر

وفات 1045ھ/1635-36ء

اصل نام میر محمد تھا۔ سندھ کے قدیمی شہر سہوان میں پیدا ہوئے۔ قاضیوں کے خاندان سے تھے جس میں علم وفضل کا بڑا چرچا تھا۔ سات سال کی عمر میں والد کا انتقال ہوگیا۔ علوم دینیہ کے حصول کے ساتھ ساتھ اپنی والدہ سے سلسلہ قادریہ کی تعلیم پائی۔ اس کے بعد علائقِ دینوی سے منہ موڑ کر شیخ خضر سیوستانی کے مرید ہوئے۔ 25 سال کی عمر میں لاہور آئے اور یہاں تلقین وہدایت شروع کی۔ آپ قدیم طرز کے صوفی بزرگوں میں سے تھے جو فنافی اللہ ہوتے ہیں۔ آپ عبادات وریاضت میں اس قدر منہمک رہتے کہ چالیس سال تک اہلِ لاہور کو بھی آپ کے لاہور میں قیام کا پتا تک نہ چلا۔ آپ حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم کے ہم عصر تھے۔ آپ کے ذریعے ہندوستان میں قادریہ سلسلہ کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ شہزادہ دارا شکوہ جس نے آپ کے اور آپ کے ممتاز خلفاء کے تفصیلی حالات سفینۃ الاولیا میں لکھے ہیں، آپ کا بڑا معتقد تھا۔ شہنشاہ جہانگیر نے بھی آپ کا ذکر تزک جہانگیری میں کیا ہے۔ شہنشاہ شاہجہان بھی حضرت میاں میر سے کافی عقیدت رکھتا تھا۔ آپ کا مزار لاہور سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں ہے جو اس گاؤں کی وجہ سے میاں میر کہلاتا ہے۔ دارا شکوہ نے آپ کا مزار تعمیر کرانا چاہا لیکن اسے مہلت نہ ملی۔ بعد میں اورنگ زیب نے مزار کی تعمیر وتکمیل کا حکم دیا۔ مزار کے قریب بارہ دری ہے جس میں دارا شکوہ کی رفیق حیات نادرہ کی قبر ہے۔

مرسلہ: سلطانہ، کامل پور

باوجود بھی کہ میں ایک مختلف دھرم سے تعلق رکھتی ہوں، اس نے میرے ساتھ لڑنا جھگڑنا تو دور کی بات زور زبردستی کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ اس لحاظ سے میری نگاہوں میں منور علی کے وجود و احساسات کی حیثیت زیادہ ہے۔"

میرے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرنے لگے۔ چاندنی بی بولے چلے جارہی تھی۔ "ان سب باتوں سے بھی قطع نظر مجھے اپنے دودھ پیتے بچے کے ساتھ محبت ہے۔ جو شوہر اپنی بیوی کا پاس نہیں رکھ پایا۔ اس سے کیا توقع کہ وہ سرحد کے پار جانے کے بعد میرے بچے کو قتل نہیں کردے گا۔ مجھے دھرم پنتھ کے علاوہ اپنے بچے کی زندگی بھی عزیز ہے۔ جو محبت اور عزت مجھے سرحد کے اس جانب میسر آئی ہے، میرے خیال کے مطابق دوسری جانب موجودہ حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے میسر نہیں آسکتی۔ اس لیے اپنے حتمی فیصلے کو مدِنظر رکھتے ہوئے منور علی کا انتخاب کرتی ہوں۔"

رامو کا چہرہ لٹکتا چلا گیا۔ جبکہ مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے مرنے کے بعد مجھے دوبارہ زندہ ہونے کی نوید سنادی گئی ہو۔ چاندنی بی کہہ رہی تھی۔ "معاملے کو طول دینے اور منور علی کے ہمراہ رامو کو یہاں بلانے کا مقصد صرف یہی تھا کہ رامو سے طلاق لینے کے بعد منور علی سے دوبارہ اور باقاعدہ نکاح کرسکوں۔ میرے خیال میں رشتے کے استحکام کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔" چاندنی بی خاموش ہوگئی۔

مولوی صاحب نے رامو کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "رامو! چاندنی بی کے فیصلے کو مدِنظر رکھتے ہوئے کیا تم کچھ کہنا چاہو گے۔ تمہیں احتجاج کا حق حاصل ہے۔"

رامو نے جھکے ہوئے سر کو اوپر اٹھایا پھر افسردہ لہجے میں بولا۔ "کچھ کہنے کے لیے اب باقی ہی کیا بچا ہے۔ سب کچھ تو مدھومتی نے کہہ دیا۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ سہاگ رات والی رات اسے بے یارومددگار چھوڑ کر فرار ہونے کو بزدلی سے تشبیہ نہ دی جائے۔ وہ حکمتِ عملی پر منحصر ایک اقدام تھا۔ آپ خود سوچ سکتے ہیں اگر میں اپنی ماں کے ہمراہ سمندر کے درمیان میں گر جاؤں، تب میری کوشش یہی ہوگی کہ میں اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہوئے پہلے ساحل تک پہنچنے کی کوشش کروں۔ ساحل پر پہنچنے کے بعد میں اپنی ماں کی زندگی کے لیے بہت کچھ کرسکتا ہوں لیکن بیچ منجدھار میں اسے بچانے کی کوشش کے دوران میں اپنے علاوہ اس کے لیے بھی کچھ نہ کرنے کے قابل ہونے کے بعد دونوں کی زندگیوں کو داؤ پر لگانے کی حماقت بھلا کیوں کروں۔"

چاندنی بی بات درمیان میں کاٹتے ہوئے بولی۔ "اور اگر تمہارے ساحل تک جاکر واپس آنے کے دوران تمہاری ماں بیچ منجدھار میں ڈوب چکی ہو تب تم خود بتاؤ کہ تمہارا عمل عقلمندی پر مشتمل ہوگا یا پھر بے وقوفی پر...... ماں یا پھر بیوی کی زندگی بچانے کے لیے حکمتِ عملی کو مدِنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کرنا عقلمندی کے خلاف ہوتا ہے۔ میری جگہ اگر تمہاری ماں ہوتی تو کیا تب بھی تم یہی کرتے۔ جھوٹ مت کہنا، تم سرحد کے پار سے یہاں آنے کے بعد مجھے بتا چکے ہو کہ تم اپنی ماں اور بہنوں کو چودہ اگست والی رات سرحد کے پار لے جانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ یعنی تمہاری نگاہوں میں ان کی حیثیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ لیکن بیوی کی نہیں...... تو پھر میری نگاہوں میں بھی تمہارے برخلاف اپنے اس شوہر کی حیثیت زیادہ ہونی چاہیے جس نے مجھے اپنا نام دے کر میری عزت و ناموس کے لیے اپنے آپ کو وقف کردیا۔ جو میرے ایک غلط فیصلے کو نظر انداز کرتے ہوئے آج بھی مجھے قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔"

رامو کا چہرہ دوبارہ جھک گیا۔ مولوی صاحب نے طویل سانس لیتے ہوئے رامو سے پوچھا۔

"کیا تمہیں چاندنی بی کا فیصلہ قبول ہے۔ اگر کوئی قابلِ اعتراض بات تمہارے دماغ میں موجود ہے تب تم بیان کرسکتے ہو۔"

رامو نے جواب دینے کے بجائے انکار میں سر ہلادیا۔ تب مولوی صاحب گمبھیر لہجے میں بولے۔ "چاندنی بی اور منور علی کی شادی اس وقت تک ممکن نہیں ہوسکتی جب تک تم چاندنی بی کو طلاق نہ دے دو۔ طلاق کے بعد چاندنی بی سابقہ مدھومتی کو اسلام قبول کرنے کے بعد منور علی کے ساتھ دوبارہ بیاہ کرنا ہوگا۔ رامو کیا تم چاندنی بی کو طلاق دینے کے لیے رضامند ہو۔"

رامو نے اس دفعہ بھی جواب دینے کے بجائے سر کو اثبات میں ہلایا اور مولوی صاحب نے مجھے اشارہ کیا کہ میں رامو کو بحفاظت سرحد کے پاس موجود متروک شدہ بنجے تک چھوڑ آؤں۔ میں نے جیب میں موجود چاقو کو دری کے داہنے کونے کے پاس زمین پر رکھا اور رامو کو پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے فاتحانہ قدموں کے ساتھ مکان سے باہر کی جانب چل دیا۔

جال

مکرمی مدیرِ اعلیٰ
السلام علیکم!
یہ واقعہ اپنے اسی شہر کراچی کے تناظر میں ہے جو فکر کے در کھولتا ہے۔ اسے نہ صرف پڑھیں بلکہ غور و فکر بھی کریں۔

ظہیر مرزا
(کراچی)

◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆

فائرنگ کی آواز سنتے ہی بازار میں ایک دم بھگدڑ سی مچ گئی۔ ہر شخص جان بچانے کے لیے تیزی سے دوڑنے لگا۔ خریدار تیزی سے دکانوں کے اندر گھس گئے۔ حماد بھی سب لوگوں کے ساتھ ایک دکان میں گھس گیا۔ دکاندار نے دکان کا شٹر گرادیا۔ فائرنگ کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ سہمے ہوئے سب لوگ بے حس و حرکت کھڑے تھے۔

حماد کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ خون کی روانی تیز ہوگئی تھی۔ اسے محسوس ہورہا تھا کہ شاید اس کی کنپٹیوں کی

نسیں پھٹ جائیں گی۔ اس نے اپنے حواس کو مجتمع کرنے کے لیے دو تین گہرے سانس لیے اور اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

اس کا ذہن ابھی تک کل کے ہولناک واقعے کے اثر سے باہر نہیں آسکا تھا۔ سڑک پر کسی اندھی گولی کا نشانہ بننے والے جاں بلب نوجوان نے اس کے سامنے دم توڑا تھا۔ اُن کرب ناک لمحوں کے خیال نے حماد کے ذہن کو پھر سے جکڑ لیا۔ اُس نوجوان کا سنسناتا جسم۔ اُس کی اکھڑتی سانسیں اور ہچکیاں۔ اس کے ایڑیاں رگڑنے سے زمین پر بننے والے نشانات۔ اس سب کو اپنے ذہن سے محو کردینا حماد کے لیے ممکن نہ تھا۔

ایک اور احساس اس کے دکھ کو بڑھا رہا تھا کہ یہ سب دیکھتے ہوئے بھی کوئی اُس نوجوان کی مدد کے لیے اس کے قریب تک نہیں آیا تھا جب تک فائر کرنے والے لڑکوں کی موٹر سائیکل نظروں سے دور نہیں چلی گئی۔ پھر کسی نے ایمبولینس کا نمبر ڈائل کیا۔ کسی نے اس کی شناخت کرنے کے لیے اس کی جیب کو ٹٹول کر کاغذات نکالے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس وقت کچھ نہیں کرسکا۔ شاید اس نوجوان کی جگہ وہاں وہ خود بھی ہوسکتا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔

لوگوں کے باتیں کرنے کی بھنبھناہٹ اس کے کانوں سے ٹکرانے لگی۔

”شاید پیچھے کی مارکیٹ میں کوئی ڈکیتی ہوئی ہے؟“ قریب کھڑے ہوئے شخص نے اندیشہ ظاہر کیا۔

”نہیں یار...... ڈکیتی وکیتی نہیں ہے۔ وہی بھتا لینے والے کررہے ہیں۔ جنہوں نے دو ہفتے پہلے کیبل والے لڑکے فہیم کو گولی ماری تھی۔“ دوسرے شخص نے وثوق سے بتایا۔

کچھ دیر میں سارا شور تھم سا گیا۔ دکاندار نے باہر جھانک کر دیکھا۔ سڑک سنسان ہوگئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد لوگ واپس دکانوں کے پاس آگئے۔ دکانداروں نے اپنے سامان کو ترتیب دینا شروع کردیا۔ حالات پرکڑھتے ہوئے خریدار اور دکاندار بھاؤ تاؤ میں مصروف ہوگئے۔

حماد بوجھل قدموں سے واپس اسی دکان کی طرف بڑھا جہاں وہ خریداری کررہا تھا۔ دکان کی دیوار کے سہارے وہ ٹِک کر کھڑا ہوگیا۔

”یہاں تو اب یہ ہر روج (روز) کی بات ہے۔“ مرغی بیچنے والے نے حماد کی کیفیت دیکھ کر تمسخرانہ انداز میں کہا۔

اس کے نزدیک کھڑے خریداروں نے دکاندار کی حمایت میں تبصرے شروع کردیئے۔ حماد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نظریں چراتے ہوئے وہ..... اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

دکاندار کی زبان بھی اس کے ہاتھوں کی طرح مسلسل چل رہی تھی اور وہ گوشت کی بوٹیاں بناتے ہوئے لوگوں کے تبصروں پر رائے بھی دیتا رہا۔ حماد کو سب کچھ بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔

خون کی ایک پچکاری حماد کے ہاتھ پر آگئی۔ وہ اسے بغور دیکھنے لگا۔ اور اس کا دھیان پھر اسی نوجوان کی لاش کی طرف چلا گیا۔

”شاید اس لڑکے کے شناختی کارڈ پر اس کا نام ریاض لکھا ہوا تھا۔“ وہ ذہن پر زور دینے لگا۔

”یہ چلے گی یا اور کم وجن (وزن) کی دوں؟“ دکاندار نے اسے ایک مرغی دکھا کر مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

حماد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”دیکھا تو نے۔ وہ پرلی سائیڈ پر جو دکان تھی ناں، اب اس نے بھی چھوٹے کے گوس (گوشت) کی دکان ختم کرکے مرگی (مرغی) کا ہی کاروبار کرلیا ہے۔“ مرغی والے نے اپنے برابر والی دکان پر بیٹھے شخص کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

بوٹیاں بناتے ہوئے دکاندار کے موٹے موٹے ہاتھ اپنی مخصوص رفتار سے چل رہے تھے۔

”پیسا لوگوں کی جیب میں چھوڑا ہی کہاں ہے اس حکومت نے۔ اب تو جانیں سلامت ہیں تو غنیمت ہے۔ ہر روز کتنے کتنے لوگ مررہے ہیں۔ پتا نہیں یہ حالات کب بدلیں گے۔“ دکان پر کھڑی بوڑھی عورت نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

”ارے اماں کچھ نہیں بدلنے والا ہے یہاں۔ کوئی بھی آجائے۔ سارے ہی کرپٹ ہیں یہ حکمران۔ غریبوں کے لیے کوئی نہیں سوچے گا۔“ ایک دبلے پتلے لڑکے نے کمزور لہجے میں کہا۔

”حالات جہاں بھی بدلے ہیں، وہاں کے لوگوں کی حمیت اور جرأت کی وجہ سے بدلے ہیں۔“ نزدیک کھڑے ہوئے ایک بھاری بھرکم جسم کے شخص نے اپنی کار کی چابی سے کان کھجاتے ہوئے رعب دار آواز میں کہا ”لیکن..... جہاں نوجوانوں کی ہی سوچ یہ ہو وہاں کیا بدلے گا؟“

”یہ..... یہ سب جو ہورہا ہے..... سازشیں ہیں ان

کی..... خوف زدہ جو ہیں مسلمانوں سے۔ کیونکہ اگر مسلمانوں نے غلبہ حاصل کرلیا تو انہیں محکوم بن کر رہنا پڑے گا۔“ کسی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ایک سفید باریش بزرگ نے جذباتی انداز میں کہا۔

”کیسا ظلم ہے، کوئی پوچھنے والا نہیں۔“ ”پتا نہیں کس جبر میں زندہ ہیں ہم لوگ۔“ پاس ہی ایک نحیف شخص نے دکھی لہجے میں کہا۔

”ہاں...... تو اپنے اندر کے جبر سے بھی کب آزاد ہوسکا۔“ فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے ایک ملنگ نے بلند آواز میں کہا۔

لوگوں نے مڑ کر اس ملنگ کی طرف دیکھا۔ ملگجے کپڑوں میں ملنگ کے کشکول میں سکوں کے ساتھ گلاب کے چند پھول بھی رکھے تھے۔ اُس کی بات سن کر لمحے بھر کو حماد گہری سوچ میں پڑگیا۔

اُسی بوڑھی عورت نے ملنگ کی جانب حقارت سے دیکھا اور اپنے دوپٹے کے آنچل سے باچھیں صاف کرتے ہوئے کہا ”اس دیوانے کی باتوں پر کیا دھیان دینا۔ رات دن یہیں پڑا رہتا ہے۔ نہ کوئی منزل ہے نہ کوئی ٹھکانا۔ اسے کسی بات کی کیا خبر۔“

”اور تجھے اپنی خبر ہے کہ تیرا اپنا آپ کس حال میں ہے؟“ ملنگ نے گرجدار آواز میں اس بڑھیا کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

حماد اُس ملنگ کی بات کو توجہ سے سننے لگا۔

”نمازاں پڑھنا کم زنانہ، روزہ صرف روٹی، کعبے دے وچ او جاندے جھنجھوڑیں ہووے کم وے ٹوٹی، وے بھلیا! جے رب نوں مناناایں تے کھول اندر دی کوٹھی۔“ ملنگ نے داہنا ہاتھ آسمان کی طرف بلند کرکے گہری نظروں سے لوگوں کو دیکھتے ہوئے بھلے شاہ کی کافی پڑھنا شروع کی۔

بڑھیا نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر دکاندار نے اسے کچھ کہنے سننے سے باز رکھنے کے لیے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

”یہ لو باجی! بوٹی میں نے چھوٹی ہی بنائی ہے۔“ دکاندار نے شاپنگ بیگ ایک نوعمر لڑکی کو دیتے ہوئے کہا۔

حماد نے ایک اُچٹتی سی نگاہ اس لڑکی پر ڈالی۔ اُس لڑکی نے اپنا آدھا چہرہ نقاب سے ڈھانپا ہوا تھا۔ لباس میں ٹکے ہوئے رنگین نگ چمک رہے تھے۔ ان نگوں سے نکلتی چھوٹی چھوٹی شعاعیں اسے اپنی طرف متوجہ کررہی تھیں۔ اس لڑکی کے مرمریں حنائی ہاتھ دیکھ کر حماد کو اپنی نوعمر بیوی سعدیہ کا خیال آیا۔

مہمان

مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ جو کوئی کسی کے گھر آئے تو میزبان اس کو خوش رکھے، تواضع کرے۔ ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ بیزار مہمان سے بھی مہمان نوازی کرو۔ اسلام میں مہمان نوازی کی ایسی ایسی مثالیں ملتی ہیں جنہیں نظر انداز کرنا کسی کے بس میں نہیں جب میزبان نے خود اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر مہمان نوازی کی۔ ایک حدیث میں ہے، جس کا اللہ اور آخرت پر ایمان ہو وہ ایک دن اور ایک رات مہمان کی تواضع کرے۔ مہمانی تین دن کی ہوتی ہے اس کے بعد جو بھی تواضع ہوگی وہ صدقہ ہوگی۔ جہاں اسلام میں مہمان کو برا بھلا کہنا منع ہے وہاں مہمان پر بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ زائد عرصہ کسی کے گھر نہ رہے۔

میر ابراھیم سیالکوٹی

1874ء 12 جنوری 1956ء

اہلِ حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے خلاف مناظروں میں حصہ لیتے رہے۔ وعظ بہت پُرتاثیر ہوتا تھا اور تحریر بھی بڑی پختہ اور فاضلانہ تھی۔ انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں انہیں بطور خاص تقریر کے لیے بلایا جاتا تھا۔ متعدد تصانیف یادگار ہیں۔ خصوصاً تفسیر سورۂ فاتحہ، تفسیر سورۂ کہف، نیز بعض دوسری سورتوں کی تفسیر۔

میراث

قانونِ وراثت علم المیراث کہلاتا ہے۔ قرآن کریم کی وہ آیات جن پر اس کی بنیاد کھڑی کی گئی ہے آیات الوارث کہلاتی ہیں۔ وراثت کے لیے کسی قانونی اور مخصوص رشتے کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ غلام میراث کا وارث قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اسلامی فقہ کی رُو سے مسلمان کسی منکر کو بھی وارث مقرر نہیں کرسکتا۔ اس کے علاوہ میراث میں سے پہلے جنازے کے اخراجات، پھر قرضے منہا کرلیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ بچے، اس کے ایک تہائی میراث بمطابق وصیت تقسیم کردی جائے۔ کوئی وصیت نہ ہونے کی صورت میں اصحاب الفرائض کو مال کی تقسیم میں فوقیت دی جائے گی۔ اور اگر یہ نہ ہوں تو عصبات میں تقسیم ہوگی۔ اور اگر یہ بھی نہ ہوں تو ذی الورحام میں تقسیم ہوگی۔

مرسلہ: نعمان بشیر لاہور

'اس شہر میں آنے سے پہلے سعدیہ بھی ہر وقت کتنا چہچہ کے رہا کرتی تھی۔' حماد کے دل میں خیال آیا۔

حماد کی شادی کو بمشکل ڈیڑھ سال ہوا تھا۔ وہ اپنے گاؤں میں آسودہ زندگی گزار رہا تھا۔ ملازمت میں ترقی ملنے کے بعد وہ اِس بڑے شہر میں آ کر آباد ہوا تھا۔ اس شہر میں آئے ہوئے اسے تقریباً دو ماہ ہوئے تھے لیکن جب سے یہاں آیا تھا ہر روز اسے زندگی اور موت کے درمیان ایک جنگ سی محسوس ہوتی تھی۔

"میرے بعد...... سعدیہ......" اس کا ذہن اس سے آگے کچھ سوچ نہ سکا۔ اس کا ذہن منتشر ہونے لگا

"ارے ہم اخلاقی پستی کی جس نہج پر آ گئے ہیں وہاں اب کسی بہتری کی کوئی امید بھی نہیں رہی۔" ایک شخص نے تُرش لہجے میں کہا۔ لوگوں کی تو تکار کی آوازیں حماد کو اس کے خیالوں سے واپس کھینچ لائیں۔

"یہاں بس میں کنڈیکٹر کسی شخص کے ساتھ زیادتی کرے تو کوئی دوسرا بولنے والا نہیں ہوتا، حالانکہ سب مل کر اس کا بھرتا بنا سکتے ہیں لیکن تماشا دیکھتے رہتے ہیں۔" وہی دبلا پتلا لڑکا اپنی بات درست ثابت کرنے کے لیے پھر بولا۔

"چار دن چین سے نہیں گزرتے کہ پھر حالات ویسے ہی ہو جاتے ہیں۔ خدا جانے اور کیا دیکھنا لکھا ہے مقدر میں۔" بڑھیا نے ذرا دھیمے لہجے میں کہا۔

"جو کچھ ہو رہا ہے ہم نے اسے اپنا مقدر سمجھ لیا ہے۔ کیا یہ ہماری تقدیر میں تھا؟" سفید باریش بزرگ نے تلخی سے کہا۔

"نہ بھیا...... کھلا نہیں ہے...... بڑا نوٹ نہ دینا...... دکنداری (دکانداری) ہوئی کہاں پا رہی ہے، جو میں کھلے کو لاؤں گا۔" مرغی والے نے ایک شخص کو ہزار کا نوٹ واپس کر کے چڑتے ہوئے کہا۔

حماد کا ذہن اب بھی بہت سے بے ربط خیالوں میں الجھا ہوا تھا۔ اپنے ذہن کو گنجلک خیالوں سے آزاد کرنے کے لیے اس نے سگریٹ سلگا کر ایک لمبا کش لیا۔ دکاندار اب بھی خریداروں سے پیسوں پر بحث و تکرار کر رہا تھا۔

حماد نے والٹ نکال کر اس میں سے پیسے دکاندار کو دیئے۔ اس کی نگاہ ایک بار والٹ میں لگی اس کی بیٹی پری وش کی تصویر پر پڑی۔ ہمیشہ وہ اس تصویر کو دیکھ کر سارے غم سارے مسائل بھول جایا کرتا تھا۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ بہت سی خوشیاں بانہیں پھیلائے اسے اپنی طرف بلا رہی ہیں۔ مگر آج اسے یہ تصویر دیکھ کر آنے والے دنوں کے بہت سارے خوف اور اندیشوں نے آ گھیرا تھا۔

دھیرے سے سر جھٹک کر اس نے ان سب خیالوں سے جان چھڑانا چاہی۔ اس نے بے دلی سے ارد گرد دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی نگاہ مرغیوں کے اس جال پر ٹِک سی گئی جہاں سے مرغی والا ذبح کرنے کے لیے مرغیاں نکال رہا تھا۔

وہ مرغیوں کے اس جال کو دیکھنے لگا۔ مرغیاں دانہ چگ رہی تھیں۔ مسلسل قیں قیں کر کے شور کر رہی تھیں۔ مرغی والے کا ہاتھ بڑھا۔ مرغیوں کے جال میں ایک ہلچل سی ہوئی۔ مرغیاں اس کی گرفت سے بچنے کے لیے جال میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگیں۔ مرغی والے نے ایک مرغی پکڑی اور جال سے باہر نکال کر تکبیر کی آواز کے ساتھ اسے ذبح کیا۔ ذبح ہونے والی مرغی تڑپنے لگی اور اس کے نرخرے سے جو آواز سی نکلی اسے سنتے ہی ساری مرغیوں نے یکدم دانہ چگنا چھوڑ دیا...... جال میں سب مرغیاں یک دم خاموش ہو گئیں۔ سب وہیں اپنی جگہ بیٹھ گئیں۔ وہ بے بس مرغیاں شاید اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھیں۔ نہ ان میں دانے پانی پر کوئی جھگڑا ہو رہا تھا نہ بات بے بات وہ اپنی گردنیں جال سے باہر نکالے قیں قیں کا شور کر رہی تھیں۔ مرغی والے نے بے دم ہوئی اس مرغی کے جسم سے بے دردی سے کھال الگ کی۔

دکان میں اس کے بغدے کی کھٹ کھٹ کی آواز نے سکوت توڑا۔ دکاندار اس سب صورتِ حال سے بے نیاز گوشت کے ٹکڑے کرتا رہا۔ کچھ دیر دکان میں صرف اس کے بغدے کی کھٹ کھٹ کی آواز رہی۔ خریدار آتے رہے بھاؤ تاؤ کرتے رہے۔ حماد نے محسوس کیا کہ چند لمحوں بعد ہی مرغیاں اسی طرح دانہ چگ رہی تھیں اور جال میں وہی قیں قیں کا شور تھا۔

یکا یک بازار میں پھر گولیوں کی گونج سنائی دی۔ بازار میں پھر بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ اپنی...... جانیں بچانے کے لیے اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ دکانداروں نے اپنی دکانوں کے آدھے آدھے شٹرز گرا دیئے۔ لوگوں کی آوازوں کی وہی بھنبھناہٹ سنائی دینے لگی۔ لوگ ان حالات کی وجہ سے حکومت اور سیاستدانوں کو...... لعن طعن کرنے لگے۔

پولیس کی وین گزرنے کے بعد لوگوں نے دوبارہ اپنی دکانوں کے شٹرز کھول دیئے۔ لوگ اسی طرح دوبارہ خرید و فروخت میں مصروف ہو گئے...... بازار میں پھر لوگوں اور دکانداروں کا وہی بے ہنگم شور بلند ہونے لگا۔

✠

محبت کی خاطر

جناب معراج رسول
السلام علیکم!
میں نے پہلی بار کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے، یہ میری اپنی آپ بیتی ہے۔ امید کرتا ہوں آپ اسے منفرد پائیں گے۔ میری زندگی ایسے ہی حالات سے گزری ہے کہ میں پوری طرح لکھوں تو ناول بن جائے صرف اہم اہم باتیں لکھ رہا ہوں کہ کس طرح ایک لڑکی نے میرے ساتھ ایک عجب کھیل کھیلا۔

نعمان نومی
(لاہور)

صائمہ نے پہلی نظر میں میرے دل پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ تھی بھی ایسی، سر سے پاؤں تک مجسمۂ حسن۔ دودھ جیسی گلابی رنگت، دلکش ترین نقوش، اِس کی بلوری آنکھوں میں ایسا سحر تھا کہ ایک بار ان میں ڈوب جانے والا ابھی نہ ابھرتا۔ لائٹ براؤن سلکی بال اور بدن جیسے سانچے میں ڈھلا ہوا۔ اوپر سے چال اور حسن کی ادائیں ایسی کہ آدمی اپنا دل خود قدموں میں رکھ دے۔ اس کی عمر بائیس سے زیادہ نہیں تھی لیکن مجھے تعجب ہوا کہ اب تک اسے کوئی بیاہ کر کیوں نہیں

لے گیا۔ ایسے حسن کی مالک لڑکیاں تو بیس سال سے بھی پہلے بیاہ دی جاتی ہیں۔ دل والے انہیں کہاں چھوڑتے ہیں اور وہ اب تک اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھی تھی۔ اس کا گھرانا اچھا کھاتا پیتا اور خوشحال تھا۔ صائمہ کی بس ایک بہن امیمہ تھی۔ صائمہ کے ابو فیڈرل گورنمنٹ میں اچھے عہدے پر تھے۔ ایک بڑے خاندان سے تعلق تھا۔ گورنمنٹ ہاؤسنگ ایمپلائیز سوسائٹی میں ان کا اپنا گھر تھا۔ اس کے علاوہ بھی جائداد تھی جس کا کرایہ آتا تھا۔ گھر میں دو گاڑیاں تھیں۔

والد صاحب نے ریٹائرمنٹ سے ملنے والی رقم سے اس سوسائٹی میں بنا ہوا مکان خریدا تھا۔ وہ بینک میں اچھے عہدے پر تھے اور ریٹائرمنٹ پر اچھی خاصی رقم ملی تھی۔ مکان اکیلے والد صاحب نے نہیں خریدا تھا بلکہ اس میں میرے دو بڑے بھائی بھی شامل تھے۔ اتفاق سے وہ بھی بینک میں جاب کرتے تھے۔ سب سے بڑے احسان بھائی ایم بی اے کے بعد ایک غیر ملکی بینک میں منیجر تھے۔ ان سے چھوٹے محسن بھائی نے سی اے کیا تھا اور وہ بینک آڈیٹر تھے۔ دونوں کی آمدنی اچھی تھی اور انہوں نے مکان میں شیئر کیا تھا۔ کیونکہ والد صاحب خود بینک میں تھے اس لیے انہوں نے ہم بھائیوں کو بھی شروع سے بینکنگ لائن کا مشورہ دیا اور اتفاق سے ہم سب کا رجحان بھی اسی طرف تھا۔ میں نے یونیورسٹی سے ایم کام کیا اور ان دنوں ایک بینک کی زرمبادلہ برانچ میں بہ طور اپرنٹس کام کر رہا تھا۔ مجھ سے چھوٹی بہن نغمہ نے بی اے کیا تھا مگر اسے جاب کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اس کا رشتہ ہو گیا تھا۔ اس سے چھوٹی رمشا انٹر میں تھی۔

احسان اور محسن بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ احسان بھائی کی دو بیٹیاں تھیں اور محسن بھائی کا ایک بیٹا تھا۔ وہ دونوں مکان کے اوپر والے پورشن میں رہتے تھے۔ وہاں ان کے حصے الگ الگ تھے۔ نیچے کا پورشن ہمارا تھا۔ یعنی امی ابو، میں اور بہنیں اس میں رہتے تھے۔ اس مکان سے پہلے ہم نے سارا وقت کرائے کے مکانوں میں گزارا تھا لیکن ہمیشہ اچھی آبادی میں رہے جہاں ماحول اچھا تھا اور آس پاس کے لوگ بھی اچھے تھے۔ مگر یہ سوسائٹی سب سے اچھی لگی تھی۔ پرسکون رہائشی علاقہ تھا یہاں زیادہ تر بڑے بنگلے تھے۔ کھلی اور صاف گلیاں جن میں سڑکیں تھیں۔ سوسائٹی کا اپنا پارک تھا۔ باؤنڈری وال تھی جس کی وجہ سے رہنے والے محفوظ تھے۔ رات گئے لوگ گلیوں میں گھومتے پھرتے تھے خاص طور سے خواتین چہل قدمی کے لیے نکلتی

تھیں۔ یہاں آتے ہی امی، بہنوں اور بھابیوں کی آس پاس کی خواتین سے دوستی اور میل ملاقات ہو گئی تھی۔ البتہ ہم مردوں کا حساب الگ تھا۔ میرے سارے دوست پرانے محلے کے تھے، یہاں کسی سے جان پہچان نہیں ہوئی تھی۔

میں دوپہر میں بینک جاتا تھا جو کلفٹن میں تھا اور وہاں سے رات آٹھ نو بجے سے پہلے واپسی نہیں ہوتی تھی۔ اپرنٹس ہونے کی وجہ سے بینک والے کام دبا کر لیتے تھے۔ مگر اس میں بھی میرا فائدہ تھا۔ مجھے زرمبادلہ کے کام کے اسرار و رموز سیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ بینک سے بس اتنا ملتا تھا کہ آنے جانے اور لنچ کا خرچا نکل آتا تھا مگر ابو کا کہنا تھا کہ میں اس کی پروا نہ کروں۔ میں ایک سال میں یہاں جو سیکھوں گا وہ آنے والے کیریئر میں میرے بہت کام آئے گا۔ جب میں آتا تو عام طور سے گھر کی خواتین رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی کرنے نکل جاتی تھیں کیونکہ اسی وقت دوسری خواتین بھی نکلتی تھیں اور ان میں گپ شپ چلتی تھی۔ اس روز میں واپس آیا اور گھر کے سامنے بائیک روکی تھی کہ رمشا نے دور سے مجھے آواز دی۔ وہ دو تین لڑکیوں کے ساتھ تھی اور گلی میں کوئی نہیں تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا۔

”کیا ہوا؟“

”بھائی یہ صائمہ باجی ہیں، ان کے پاؤں میں چوٹ آ گئی ہے۔“

صائمہ سڑک کے کنارے کیاری کی منڈیر سے ٹک کر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا کبوتر جیسا گلابی پاؤں تھام رکھا تھا اور کراہ رہی تھی۔ رمشا کے ساتھ تیسری لڑکی صائمہ کی بہن امیمہ تھی۔ میں نے موبائل کی روشنی میں دیکھا۔ ٹخنہ سوج رہا تھا۔ شاید موچ آئی تھی۔ میں نے کہا۔ ”موچ آئی ہے، ڈاکٹر کو دکھانا ہوگا۔“

”ہمارا گھر سامنے والا ہے۔“ امیمہ نے ہمارے گھر کے سامنے والے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ اگرچہ یہ چھوٹا اور ذرا پرانا تھا مگر پلاٹ اتنا ہی بڑا تھا اور پھر گھنے درختوں، پھولدار بیلوں اور بے تحاشہ سبزے کی وجہ سے خوب صورت نظر آتا تھا۔ میں نے پہلی بار نظر اٹھا کر صائمہ کو دیکھا اور پھر دیکھتا رہ گیا۔ وہ میری نظروں سے گھبرانے لگی۔ جلدی سے دوپٹا ٹھیک کیا تو میں چونکا اور خفیف ہو گیا۔

”میں آپ کو سہارا دیتا ہوں۔“ میں نے کہا اور ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے ہچکچاتے ہوئے ہاتھ تھام لیا اور پھر رمشا نے بھی سہارا دیا تو وہ کھڑی ہو گئی مگر پاؤں پر ذرا سا

زور آتے ہی وہ کراہی اور گرنے لگی تھی کہ میں نے بے اختیار تھام لیا۔ میں اس کے بہت قریب آ گیا تھا۔ اس کے وجود کی نرمی گرمی اور اس کی خوشبو نے ایک بار پھر مجھے سب بھول جانے پر مجبور کر دیا۔ میں رمشا کی آواز سے چونکا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”ایسے تو لے جانا مشکل ہے۔“

میں نے صائمہ کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ ”آئی ایم سوری۔“ میں نے کہتے ہوئے اس کی نازک کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے سہارا دیا اور اس کے گھر کی طرف لے کر چلا۔ عملاً میں نے اس کا سارا بوجھ سنبھال لیا تھا۔ دوسری طرف سے رمشا نے سنبھال رکھا تھا مگر اسے کچھ نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ صائمہ کا بایاں پاؤں مضروب تھا جب وہ اس طرف آتی تو میں اسے سنبھال لیتا اور سارا بوجھ مجھ پر آ جاتا۔ لیکن یہ ایک خوشگوار ترین بوجھ تھا۔ اسے گیٹ تک لا کر میں نے چھوڑ دیا کیونکہ اس نے کہا۔ ”آپ کا شکریہ، یہاں سے میں چلی جاؤں گی۔“

”ہاں ہم لے جائیں گے۔“ امیمہ نے تائید کی۔ شاید وہ ڈر رہی تھیں کہ ان کے امی ابو صائمہ کو اس طرح میری بانہوں میں نہ دیکھ لیں۔ اتفاق سے گلی میں سناٹا تھا اور کسی نے یہ منظر نہیں دیکھا تھا۔ صائمہ کی امی خواتین کے گروپ کے ساتھ چہل قدمی کر رہی تھیں۔ گلی میں بس یہی تین لڑکیاں تھیں۔ گیٹ سے رمشا اور امیمہ اسے سہارا دے کر اندر لے گئی تھیں مگر وہ ٹھیک سے اٹھا نہیں پا رہی تھیں اور صائمہ کے کراہنے کی آواز باہر تک آ رہی تھی بلکہ اب اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔ میں بے چین ہو رہا تھا مگر مجبور تھا اندر نہیں جا سکتا تھا۔ دل مسوس کر کے میں واپس آیا اور بائیک اندر لے گیا۔ جب میں دیر سے آتا تو امی پہلے ہی میرا کھانا نکال کر میز پر ڈھک دیتیں۔ میں منہ ہاتھ دھو کر کھا لیتا۔ اس کے بعد کچھ دیر تفریح کر کے مثلاً ٹی وی یا انٹرنیٹ استعمال کر کے سو جاتا تھا۔ دو دن چھٹی ہوتی تھی اور یہ دوستوں سے ملنے اور دوسرے کاموں میں گزر جاتی تھی۔

امی کی خواہش تھی کہ نغمہ کے ساتھ ساتھ میری شادی بھی کر دی جائے تاکہ گھر سے ایک بیٹی جائے تو ایک بہو آ جائے۔ مگر میں فی الحال تیار نہیں تھا۔ ابھی میری اپرنٹس شپ چل رہی تھی اور جب تک میری مناسب جاب نہ ہو جاتی میں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ شادی اپنے بل بوتے پر کروں۔ بے شک امی ابو یا بھائی بھی خرچ کرتے لیکن میں سارا بوجھ ان پر نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس لیے شادی

کا خیال ذہن سے نکالا ہوا تھا۔ میں نے امی سے کہا کہ نغمہ کو ایم بی اے یا ماسٹر کرا دیں تب تک میں بھی کہیں نہ کہیں جاب حاصل کر لوں گا۔ مگر امی اس کے لیے تیار نہیں تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ سرمد کے گھر والے اتنا انتظار کرنے کے لیے تیار نہیں، بڑی مشکل سے انہوں نے ایک سال کی مہلت دی تھی۔ امی کے تقاضوں سے تنگ آ کر میں نے ان سے کہہ دیا کہ تب وہ نغمہ کی شادی کر دیں ابھی میں نہیں کر سکتا۔

مگر اس رات صائمہ کو دیکھا تو مجھے لگا جیسے میں اب تک بے سمت، بے رنگ اور ویران زندگی بسر کرتا رہا تھا جس میں چاہت کا کوئی پھول نہیں تھا۔ محبت کی خوشبو نہیں تھی اور میری تصویر کائنات میں رنگ نہیں تھے۔ صائمہ کے بغیر میں ادھورا تھا اور اگر وہ میری زندگی میں نہ آتی تو میں ادھورا ہی رہ جاتا۔ اس روز گھر آ کر بھی مجھے کھانے کا ہوش نہیں تھا۔ میں صائمہ کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔ مجھے رمشا کا انتظار تھا کہ وہ آئے تو میں اس سے صائمہ کے بارے میں معلوم کروں۔ رمشا تو نہیں آئی امی آ گئیں۔ انہوں نے کھانا ایسے ہی دیکھ کر مجھ سے پوچھا۔ ”نعمان تم نے کھانا نہیں کھایا؟“

”جی امی اصل میں آفس میں پزا لے لیا تھا۔“ میں نے بہانہ کیا۔ ”بھوک نہیں ہے۔“

”اچھا رکھ رہی ہوں، رات کو بھوک لگے تو گرم کر کے لے لینا۔“ امی نے کھانا اٹھاتے ہوئے کہا۔

میں لاؤنج میں ٹی وی کے آگے بیٹھا بہ ظاہر ایک مووی دیکھ رہا تھا لیکن میری آنکھوں کے سامنے صائمہ کا سراپا تھا۔ جیسے ہی رمشا آئی میں نے ٹی وی بند کر دیا اور مضطرب لہجے میں اس سے پوچھا۔ ”رمشا اب وہ کیسی ہے؟“

”کون....؟“ اس نے کسی قدر تعجب سے پوچھا پھر اسے خیال آیا۔ ”اوہ آپ صائمہ باجی کی بات کر رہے ہیں؟“

”ہاں۔“ میں نے جھینپ کر کہا۔ ”وہ بہت تکلیف میں تھی۔“

”تکلیف تو بہت تھی، آپ کے سامنے بے چاری صبر کر رہی تھیں مگر اندر جاتے ہی رونے لگی تھیں۔ انکل انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے ابھی آئی ہیں، ڈاکٹر نے بینڈیج کر دی ہے اور تین دن آرام کا کہا ہے موچ بہت زیادہ تھی، پورا ٹخنہ سوج گیا تھا۔“

”ان کے گھر میں کوئی بھائی نہیں ہے؟“

”نہیں، بس دو بہنیں ہیں۔“

”صائمہ خاصی بڑی لگتی ہے اس کی کہیں شادی یا بات

نہیں ہوئی۔" میں نے بے تکے پن سے پوچھا تو رمشا معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔

"کیا بات ہے نومی بھائی، کوئی چکر تو نہیں ہے؟"

میں مزید جھینپ گیا۔ "کوئی چکر نہیں ہے چڑیل، ایسے ہی پوچھ رہا ہوں۔"

"تو آپ کو ایسے ہی بتا دیتی ہوں، صائمہ باجی بائیس سال کی ہیں۔ ایک سال پہلے ہی گریجویٹ کیا ہے، اس کے بعد ماسٹرز کرنا چاہتی تھیں لیکن ان کی امی نے اجازت نہیں دی۔ وہ ان کی شادی کرنا چاہتی ہیں لیکن اب تک کوئی مناسب رشتہ نہیں آیا ہے اس لیے بات بھی نہیں ہوئی۔ صائمہ باجی کو گھر کے کاموں کا شوق ہے کوکنگ بہت اچھی کرتی ہیں، صفائی ستھرائی کی شوقین ہیں دوسرے کاموں کے لیے ان کے ہاں ماسی آتی ہے لیکن گھر کی صفائی خود کرتی ہیں، گارڈننگ بھی کرتی ہیں۔ یہ جو ان کے گھر میں ڈھیر سارے پھول پودے نظر آرہے ہیں یہ ان ہی کا کام ہے۔ شاعری اور کسی قدر ڈرائنگ سے بھی شغف ہے۔ اپنی اسکیچ بک دکھائی ہے۔ اچھے اسکیچ بنا لیتی ہیں۔ میرا بھی بنانے کا وعدہ کیا ہے۔ فیس بک، اسکائپ، موبائل چیٹ جیسی چیزوں سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ یوں سمجھ لیں اس معاملے میں خاصی پرانی روح ہیں۔ کہیے معلومات کافی ہیں یا مزید بندوبست کیا جائے؟"

"کافی ہیں چڑیل۔" میں نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔ "تجھے تو کسی جاسوس ایجنسی میں ہونا چاہیے تھا۔"

"آپ کے لیے خدمات فری ہیں کیونکہ آپ بس وعدے کرتے ہیں۔" رمشا نے چالاکی سے یاد دلایا کہ اس نے مجھ سے کئی دن سے ایک فرمائش کر رکھی تھی۔ اسے کلفٹن سے ملنے والا پزا بہت پسند تھا اور اس نے لانے کی فرمائش کر رکھی تھی۔ یہ سن کر میں اندر سے خوش ہو گیا تھا کہ صائمہ کا ابھی تک رشتہ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی کہیں بات کی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی مجھے ایک بار پھر تعجب ہوا تھا، لڑکے تو ایک طرف رہے لڑکوں کی مائیں بہنیں ایسی حسین لڑکیوں کی تلاش میں رہتی تھیں پھر دوسروں کو صائمہ کیوں نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے چپکے سے رمشا کا موبائل چیک کیا اور حسب توقع اس میں صائمہ کا نمبر محفوظ تھا۔ میں نے وہ نوٹ کر لیا اور اگلے دن دفتر میں لنچ ٹائم کے وقت اسے کال کی۔ اس وقت میں اکیلا ہوتا تھا کیونکہ تقریباً سارا اسٹاف لنچ کرنے باہر جاتا تھا۔ یہ زرِ مبادلہ برانچ تھی اس لیے یہاں عام رش نہیں ہوتا تھا اور لوگ بھی زیادہ تر سیکنڈ ہاف میں آتے تھے۔

میرا خیال تھا کہ شاید اجنبی نمبر دیکھ کر صائمہ کال ریسیو نہ کرے لیکن اس نے کال ریسیو کر لی۔ "ہیلو۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔ "آپ صائمہ ہیں؟"

"جی۔" اس نے کنفیوز انداز میں کہا۔ "آپ کون ہیں؟"

"میں نعمان ہوں رمشا کا بھائی، کل آپ کو چوٹ لگنے کے بعد گھر تک لے گیا تھا۔"

"اوہ..... آپ..... جی کہیے۔" اس نے نروس انداز میں کہا۔

"وہ آپ کی طبیعت پوچھنی تھی اب کیسی ہیں، رمشا بتا رہی تھی کہ کل آپ بہت تکلیف میں تھیں؟"

"ہاں زمین پر پاؤں نہیں رکھا جا رہا تھا، اب بھی نہیں رکھ سکتی لیکن تکلیف کم ہے۔" اس بار اس نے نارمل انداز میں کہا۔ "آپ کے پوچھنے کا شکریہ۔"

"نہیں، گزشتہ رات کی مدد کے بعد یہ میرا فرض تھا۔"

"آپ کا بھی شکریہ اگر آپ نہ لے جاتے تو میں بہت مشکل سے گھر جاتی۔"

"شکریے کی ضرورت نہیں ہے، آپ پڑوسی ہیں اور آپ کا حق تھا۔" میں نے شائستگی سے کہا اور خدا حافظ کہہ کر کال بند کر دی۔ کچھ دیر بعد اس کی طرف سے ایک ایس ایم ایس آیا۔

"آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا؟"

میں نے ایس ایم ایس پر ہی جواب دیا۔ "رمشا کے سیل سے دیکھا..... لیکن اسے بتایا نہیں..... آپ بھی ذکر مت کیجیے گا۔ میں صرف آپ کی طبیعت معلوم کرنا چاہتا تھا۔"

"اوکے۔"

اس کے اس ایس ایم ایس سے میری ہمت بڑھی اور میں نے پوچھا۔ "کیا میں آپ کو کال یا ایس ایم ایس کر سکتا ہوں؟"

"کیوں؟" اس نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"اس کیوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔"

اس نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے بھی دوبارہ ایس ایم ایس نہیں کیا۔ لیکن جب رات کو گھر پہنچا تو صائمہ کی طرف سے دو فارورڈ ایس ایم ایس تھے۔ میں خوش ہو گیا یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ میں اسے ایس ایم ایس کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی بات بلاواسطہ کہہ دی تھی۔ میں نے اسے تھینکس

کہا تو اس کا جواب ویلکم کی صورت میں آیا۔ اب میں کبھی کبھی اسے فارورڈ ایس ایم ایس کر دیتا تھا اور کبھی اس سے بات کر لیتا۔ وہ ایک حد میں رہ کر جواب دیتی تھی۔ نہ بے تکلف ہوتی تھی اور نہ ہونے دیتی تھی۔ ایک دو بار میں نے ذرا بے تکلف ہونے کی کوشش کی تو اس نے یوں نظر انداز کر دیا جیسے میں نے کچھ کہا ہی نہ ہو۔ اس کے نظر انداز کرنے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بے تکلفی پسند نہیں کر رہی ہے۔ اس لیے میں بھی محتاط ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری کسی بات یا حرکت سے اس کے دل میں ذرا بھی بدگمانی پیدا ہو۔ میرے لیے اس سے ایس ایم ایس پر بات کرنا بھی بہت تھا۔ میری خواہش تھی کہ کسی طرح اس کے دل میں جگہ بنا لوں۔

اس کا پاؤں تین دن میں ٹھیک ہو گیا اور اس نے تھوڑا بہت چلنا پھرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک ہفتے بعد کی بات ہے میں دفتر سے آیا تو امی نے کہا۔ "نومی، رمشا اور نغمہ شاپنگ کرنے گئی تھیں لیکن سی این جی بند ہونے کی وجہ سے سواری نہیں مل رہی ہے تم جا کر انہیں لے آؤ۔"

شاپنگ مال زیادہ دور نہیں تھا لیکن اس علاقے میں بس اور ویگن نہیں چلتی تھی اس لیے آمد و رفت کے لیے اپنی ٹرانسپورٹ یا رکشے ٹیکسی پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ میں ابو کی گاڑی لے کر شاپنگ مال پہنچا۔ وہاں رمشا اور نغمہ کے ساتھ صائمہ کو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ وہ تینوں آنے والی عید کے حوالے سے سوٹ اور چیزیں لینے آئی تھیں۔ صائمہ نے ٹراؤزر کے ساتھ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور یہ لباس اس کے وجود پر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے اسے دو تین بار دیکھا تو روایتی لباس میں دیکھا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسے یوں غیر روایتی لباس میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے دوپٹے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ میرے اندازے سے زیادہ ماڈرن تھی۔ حالانکہ اس کے چہرے سے معصومیت عیاں تھی۔ اس پر آج کے دور کی لڑکیوں والی چالاکی نظر نہیں آتی تھی یا پھر میں اسے محبت کی نظر سے دیکھتا تھا اس لیے وہ مجھے معصوم نظر آتی تھی۔

لیکن اس وقت اس نے جو ڈریسنگ کر رکھی تھی یہ مجھے اچھی نہیں لگی تھی اگرچہ وہ اچھی لگ رہی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں موجود ہر مرد اسے ہی گھور رہا تھا۔ وہ ان کی نگاہوں سے بے نیاز لگ رہی تھی۔ اتفاق سے رمشا نے کچھ شاپنگ کی تھی اور اس کا تھیلا کہیں بھول آئی تھی۔ وہ نغمہ کے ساتھ تلاش کرنے چلی گئی اور صائمہ نے جانے سے انکار کر دیا کہ چل چل کر اس کے مضروب پاؤں میں تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ مجھے اس سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ "اب آپ کیسی ہیں؟"

"آپ کے سامنے ہوں۔" خلافِ توقع اس نے بے تکلفی سے کہا۔ "کیسی لگ رہی ہوں؟"

"بہت اچھی لگ رہی ہو۔" میں نے جوابی بے تکلفی دکھائی۔ "لیکن یہ لباس اچھا نہیں ہے۔"

"کیوں؟" اس نے اپنی فسوں خیز آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"کیونکہ یہاں ہر فرد تمہیں آنکھیں پھاڑ کر گھور رہا تھا۔"

"لوگ تو ایسے ہی ہیں۔" اس کا منہ بن گیا۔ "پتا نہیں ہمارے ہاں لوگوں کو کب مینرز آئیں گے؟"

"لوگوں کا قصور نہیں ہے، تم اتنی اچھی لگ رہی ہو کہ سب بے اختیار دیکھ رہے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ اس نے میرے بدلے ہوئے لہجے اور طرزِ تخاطب پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا اسے اعتراض نہیں تھا۔ ہمیں زیادہ موقع نہیں ملا کیونکہ رمشا اور نغمہ سامان لے کر لوٹ آئی تھیں اور میں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اس روز اتنا ہوا کہ صائمہ سے بے تکلفی ہو گئی۔ میں نے اس سے کال کرنے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ اب میں دفتر سے موقع پا کر اسے کال کر لیتا تھا۔ مختصر بات ہو جاتی تھی۔ ہمارے درمیان ایک تعلق پروان چڑھ رہا تھا اور ہم دونوں ہی اس تعلق کی نوعیت محسوس کر رہے تھے۔ وہ شاید منتظر تھی کہ میں اس سے کچھ کہوں، کوئی اقرار کروں اور میں ہچکچا رہا تھا کہ میری ابھی اتنی حیثیت نہیں تھی کہ میں اس سے اقرارِ محبت کر سکتا اور کوئی وعدہ کر سکتا۔ ابھی تو مجھے اپنا کیریئر بنانا تھا۔ اس کے بعد ہی میں صائمہ سے بات کر سکتا تھا۔

دوسری طرف مجھے ڈر تھا کہ کہیں مجھے دیر نہ ہو جائے اور اس کے ماں باپ اس کی بات پکی کر دیں۔ اتنے دنوں میں مجھے اتنا تو پتا چل گیا تھا کہ صائمہ کا گھر روایتی تھا۔ یہاں لڑکیوں کی قسمت کے فیصلے ماں باپ کرتے تھے۔ لڑکیوں سے پوچھا جاتا تھا لیکن حتمی فیصلہ بڑوں کا ہوتا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں، صائمہ سے بات کروں کہ نہ کروں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایک رات اس نے مجھے ایس ایم ایس کیا۔ "نعمان کیا کر رہے ہیں، مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے؟"

"کچھ نہیں، تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "بات کرو۔"

''نعمان' میں جاننا چاہتی ہوں کہ آپ میری طرف کیوں آئے؟''

''تمہیں اندازہ تو ہوگا۔''

''ہاں لیکن میں آپ کے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔''

میں نے گہری سانس لی اور کھل کر کہا۔ ''صائمہ' میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور اگر تم راضی ہو تو میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ چپ ہوگئی پھر چند لمحے بعد اس کا ایس ایم ایس آیا۔ ''کال می۔''

میں نے اس کا نمبر ملایا، اس نے کال ریسیو کی اور بولی۔ ''نعمان آپ سنجیدہ ہیں؟''

''سو فیصد سے بھی زیادہ۔'' میں نے کہا۔ ''سنجیدہ ہوں تب ہی تو یہ بات کہنے میں اتنی دیر لگی ورنہ آج کل کی دل پھینک محبت ہوتی تو کب کا لفظوں کا جال بچھا چکا ہوتا۔''

''پھر بھی اتنی دیر کیوں کی؟'' اس کے لہجے میں شکوہ آ گیا۔

''صائمہ تم جانتی ہو میں ابھی بے روزگار ہوں۔ یہ اپرنٹس شپ ہے جو کسی وقت بھی ختم ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد ہی میں باقاعدہ جاب تلاش کروں گا اور جب کسی قدر اسٹیبل ہو جاؤں گا تبھی تمہارے گھر اپنے گھر والوں کو بھیج سکتا ہوں۔''

''وہ بعد کی بات ہے آپ مجھ سے تو کہہ سکتے تھے۔''

''میں بات برائے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب بھی تم نے اکسایا تو کہہ دیا۔ ویسے خیریت ہے نا؟''

''نہیں ہے۔'' وہ پریشانی سے بولی۔ ''ایک رشتہ آیا ہے، امی ابو دونوں کو اچھا لگ رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ اس پر راضی نہ ہو جائیں۔''

''وہ تم سے پوچھے بغیر تو ہاں نہیں کر سکتے۔ میرا نہیں خیال کہ تمہارا گھرانا اتنا دقیانوسی ہے۔''

''ہاں لیکن جب وہ مجھ سے پوچھیں گے تو میرے پاس انکار کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے۔ لڑکا کسی سرکاری محکمے میں انجینئر ہے۔ شکل صورت کا اچھا ہے اور فیملی بیک گراؤنڈ بھی اچھا ہے اس لیے امی ابو راضی نظر آ رہے ہیں۔''

''یعنی وہ اسٹیبلش ہے۔'' میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔ ''صائمہ اس صورت میں اگر میں نے تمہارے گھر رشتہ بھیجا تو کیا وہ قبول ہوگا؟''

''میں نہیں جانتی لیکن آپ بھیجیں تو تبھی کچھ ہوگا ورنہ اس طرح تو امی ابو یہاں ہاں کر دیں گے۔''

''اوکے' میں امی سے بات کرتا ہوں تم مجھے دو دن کی مہلت دو۔''

''نہیں نعمان.... میں مہلت نہیں دے سکتی۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''آپ مجھے ابھی بتا دیں آپ اپنے گھر والوں کو بھیج سکتے ہیں یا نہیں.... میں اسی صورت میں آپ کے لیے اسٹینڈ لے سکتی ہوں۔''

میں فکر مند ہو گیا، میں نے کہا۔ ''صائمہ' میں نے تم سے محبت کی ہے اور میں اس سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا لیکن تم سے شادی اسی صورت میں ہوگی جب میرے ماں باپ راضی ہوں گے۔ یہ بتاؤ کہ تم اپنے ماں باپ کی رضامندی کے بغیر مجھ سے شادی کر سکتی ہو؟''

''بالکل نہیں۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔

''تب میں کیسے کر سکتا ہوں، اسی لیے کہہ رہا ہوں مجھے دو دن کی مہلت دو، میں امی ابو سے بات کر لوں۔''

''ٹھیک ہے لیکن دو دن سے زیادہ نہ ہوں۔'' اس نے بے دلی سے کہا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں اس سے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔''

اچانک وہ رونے لگی۔ ''نعمان' میں کچھ نہیں جانتی لیکن میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی.... میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ آپ مجھے جانتے ہیں۔ میں بہت مجبور ہو کر اقرار کر رہی ہوں کہ میں نے بس آپ سے محبت کی ہے' آپ کے سوا کسی کا تصور بھی محال ہے۔''

میں خوش ہو گیا تھا۔ ہر وہ مرد خوش ہوتا ہے جس سے اس کی من پسند لڑکی یہ بات کہے۔ میں نے جذباتی ہو کر کہا۔ ''صائمہ میں تم سے یہ وعدہ تو نہیں کر سکتا کہ تم ہی میری شریک حیات بنو گی لیکن یہ وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ اگر تم نہیں تو کوئی بھی نہیں۔''

''سچ؟'' وہ خوش ہو گئی۔ ''آپ مجھے اتنا چاہتے ہیں؟''

''اس سے بھی زیادہ' صائمہ تم نہیں جانتیں تم پہلی نظر میں میرے دل کی ان گہرائیوں میں اتر گئی تھیں جہاں صرف ایک ہی ہستی جا سکتی ہے۔''

''نعمان آپ بھی میرے دل میں ایسے ہی بس گئے ہیں۔'' اس نے اقرار کیا۔ ''اب آپ کے سوا کوئی اس جگہ نہیں آ سکتا....''

''میں آج ہی امی سے بات کرتا ہوں۔'' میں نے بیتاب ہو کر کہا۔ ''تم فکر مت کرو اللہ نے چاہا تو ہمارا ملن

ضرور ہوگا۔''

میں نے امی ابو کے کمرے میں جھانکا' اتفاق سے امی جاگ رہی تھیں البتہ ابو سو گئے تھے۔ وہ جلدی سونے کے عادی تھے۔ میں نے اندر امی سے کہا۔ ''امی' میرے کمرے میں چلیں' مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔''

''تم چلو میں آتی ہوں۔''

امی کے آنے تک میں بیتابی سے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ الفاظ موزوں کرتا رہا جن سے امی کے سامنے اپنی خواہش بیان کر سکتا مگر جب امی آئیں اور انہوں نے پوچھا ''کہو نومی کیا بات ہے خیر تو ہے۔''

''میں صائمہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے بوکھلا کر کہا۔

امی ہنسیں۔ ''میرا بیٹا بالکل اناڑی ہے۔ ماں سے شادی کی بات بھی ٹھیک سے نہیں کر سکتا۔''

خلاف توقع امی کا موڈ اچھا دیکھ کر میری ہمت ہوئی۔ ''سوری امی' آپ جانتی ہیں میں نے کبھی ایسی بات کی نہیں بلکہ میں تو شادی کو تیار نہیں تھا لیکن....''

مجھے بتاتے ہوئے جھجک آ رہی تھی کہ میں صائمہ کو پسند کرنے لگا ہوں۔ امی نے کہا۔ ''میں جانتی ہوں نومی، رمشا اور نغمہ نے بتایا ہے لیکن میں انتظار کر رہی تھی کہ تم بات کرو۔ کیا تم سنجیدہ ہو؟''

''سو فیصد امی....'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''صرف اس لیے چپ تھا کہ ابھی میری کوئی جاب نہیں ہے اور میں شادی کی بات کرتا اچھا نہیں لگوں گا۔''

''تب ابھی بات کیوں کی؟''

میں نے جھجک کر امی کو بتایا کہ صائمہ کا ایک رشتہ آیا ہے اور اسے خوف ہے کہ اس کے گھر والے ہاں نہ کر دیں۔ ''امی، اگر انہوں نے ہاں کر دی تو پھر بات خراب ہو جائے گی۔'' میں نے التجا کی۔ ''پلیز آپ ان سے بات کر لیں۔ کچھ وقت لے لیں جب تک میں جاب بھی حاصل کر لوں گا۔''

''جاب کا مسئلہ نہیں ہے میرے بچے' ماشاءاللہ تم اتنے تعلیم یافتہ اور باصلاحیت ہو۔ پھر تمہارے ابو اور بھائی اچھی پوسٹوں پر رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ مجھے تمہارے ابو سے بات کرنی ہوگی۔''

''جی امی ضرور کریں.... سب آپ لوگوں کی مرضی سے ہوگا۔ لیکن امی ایک بات کا خیال رکھیے گا' مجھے شادی یا تو صائمہ سے کرنی ہے یا پھر نہیں کرنی ہے۔''

''اوہ تو بات یہاں تک پہنچ گئی ہے۔'' امی نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''نومی تم جانتے ہو ہم تمہارے رشتے کے لیے کہاں سوچ رہے تھے؟''

میں جانتا تھا' ندا میرے تایا کی بیٹی تھی۔ صائمہ کی طرح حسین تو نہیں تھی لیکن پرکشش تھی۔ وہ ماسٹر کر رہی تھی اور مجھ سے پانچ سال چھوٹی تھی۔ تایا جان کی وہی ایک بیٹی رہ گئی تھی۔ باقی تین بیٹیاں وہ بیاہ چکے تھے۔ امی اور ابو دونوں کو ندا بہت پسند تھی لیکن میں نے کبھی اسے اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ کزن کی حیثیت سے بھی ہماری اتنی بے تکلفی نہیں تھی کہ میں جان سکتا کہ وہ میرے لیے کیا خیال رکھتی ہے؟ امی نے مجھے تسلی دی کہ وہ ابو سے بات کریں گی اور وہ ایک دو دن میں اس پر غور کر کے فیصلہ کریں گے۔ اگلے چوبیس گھنٹے کا وقت میرے لیے سولی پر لٹکنے جیسا گزرا تھا، نہ جان نکلتی تھی اور نہ سولی سے اترتا تھا۔ میں نے اسی وقت صائمہ کو کال کر کے امی سے گفتگو اور ایک دن کی مہلت کا بتا دیا تھا۔ وہ پرامید ہو گئی۔ ''نومی جب آپ کی امی کا رویہ ایسا ہے تو شاید وہ مان جائیں۔''

''امید تو مجھے بھی پوری ہے۔ امی ابو کھلے ذہن کے لوگ ہیں' اولاد کے فیصلے کرتے ہیں لیکن ان کی مرضی دیکھ کر محسن بھائی کی شادی بھی اسی طرح پسند سے ہوئی ہے۔ نغمہ کا رشتہ جہاں ہوا ہے اس میں بھی اس کی پسند شامل ہے۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ تمہارے معاملے میں میری پسند کو مدنظر رکھا جائے گا لیکن ایک مسئلہ ہے۔''

''وہ کیا؟''

''ابھی میری جاب نہیں ہے مجھے جاب حاصل کر کے اس قابل ہونا ہے کہ شادی کے اخراجات برداشت کر سکوں اور اپنی بیوی کو سپورٹ کر سکوں کم سے کم ڈیڑھ سے دو سال لگ سکتے ہیں' کیا تمہارے گھر والے اور تم اتنا انتظار کر سکو گی؟''

''ہاں' یہ کون سی خاص بات ہے، شادیوں میں سال دو سال کا انتظار تو عام سی بات ہے۔'' اس نے بلا تردد کہا۔ ''آپ اس بارے میں فکر نہ کریں اگر میرے گھر والوں نے جلدی بھی چاہی تو میں انہیں سمجھا لوں گی۔''

مجھے پھر ہلکا سا تعجب ہوا۔ میں نے سنا تھا کہ محبت کرنے والوں سے ہی انتظار نہیں ہوتا۔ سچی بات ہے جب میں اس سے یہ سب کہہ رہا تھا تو میرے اندر خواہش تھی کہ وہ

جلد از جلد میری ہو جائے۔ ہماری شادی ہو جائے اور ہم ساتھ رہیں۔ مجھ سے ابھی سے دوری برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھ جتنی بیتاب ہو گی لیکن اس کے لہجے میں شادی کے حوالے سے کوئی بیتابی نہیں تھی۔ اس کے برعکس وہ رشتہ ہونے کے خیال سے خوش لگ رہی تھی۔

اگلے دن میں دفتر سے آیا تو آتے ہی سوالیہ نظروں سے امی کو دیکھا اور انہوں نے آنکھوں سے صبر کا اشارہ کیا۔ مجبوراً میں رات تک صبر کرتا رہا جب سب اپنے کمروں اور پورشن میں چلے گئے تو امی میرے کمرے میں آئیں۔ انہوں نے کہا۔ ''نومی میں نے تمہارے ابو سے بات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس رشتے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ صائمہ بہت اچھی اور خوب صورت لڑکی ہے اور فیملی بھی اچھی ہے لیکن ایک مسئلہ ہے؟''

میرا دل دھڑک اٹھا۔ ''کیسا مسئلہ امی؟''

''صائمہ کا ایک رشتہ پہلے بھی ہو کر ٹوٹ چکا ہے کیا اس نے تمہیں اس بارے میں بتایا؟''

میں ہکا بکا رہ گیا۔ ''نہیں امی۔''

''دو سال پہلے یہ رشتہ ہوا تھا پھر لڑکا ملائیشیا چلا گیا وہاں نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہوا کہ اسے سزا ہو گئی اور وہ جیل چلا گیا اس کے بعد ان لوگوں نے یہ رشتہ توڑ دیا۔''

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ''امی یہ کوئی اہم بات نہیں ہے مجھے نہیں معلوم لیکن آپ کو تو پتا ہے یعنی ان لوگوں نے یہ بات چھپائی نہیں ہے دوسرے صائمہ سے میری بہت کم بات ہوئی ہے یوں سمجھ لیں کہ نہ ہونے کے برابر، مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔''

''ٹھیک ہے بیٹا اگر تمہیں اعتراض نہیں ہے تو ہمارے نزدیک تو یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''تب امی پلیز آپ جلد از جلد بات کر لیں، کم سے کم ان کی امی کے کان میں ڈال دیں کہ آپ رشتہ لانا چاہتی ہیں تاکہ وہ آئے رشتے پر کوئی فیصلہ نہ کر لیں۔''

''فکر مت کرو میں کل ہی جا کر بات ڈال دیتی ہوں پھر اتوار کو گھر والے جا کر بات کر لیں گے۔''

''تھینک یو امی۔'' میں نے خوش ہو کر کہا تو امی نے میرا سر چوما۔

''میرے بچے ماں باپ کا شکریہ ادا نہیں کرتے۔''

امی کے جاتے ہی میں نے صائمہ کا نمبر ملایا وہ شاید موبائل ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔ اس نے بیل جانے سے پہلے کال ریسیو کی اور بیتابی سے بولی۔ ''نومی کیا ہوا....؟''

''صائمہ امی ابو مان گئے ہیں۔'' میں نے خوشی اور سرشاری کے عالم میں کہا۔ ''کل امی تمہاری امی کے کان میں بات ڈال دیں گی اور آنے والے سنڈے کو گھر والے تمہارے گھر آئیں گے۔''

وہ کھل اٹھی تھی۔ ''سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں صائمہ تمہاری قسم .... اب تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔''

وہ ایک لمحے کے چپ ہوئی پھر کسی قدر بدلے انداز میں بولی۔ ''ابھی تو رشتے کی بات بھی نہیں ہوئی ہے اور آپ نے مجھے اپنی ملکیت سمجھنا شروع کر دیا ہے۔''

''نہیں میں نے صرف تم کو اپنا نہیں سمجھنا شروع کیا ہے میں بھی تمہارا ہوں اب۔'' میں نے جذباتی انداز میں کہا۔ ''میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو عورت کو اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ میں اس رشتے کو برابر کا سمجھتا ہوں۔''

وہ ہنسی۔ ''آپ کے دل پر لگ گئی میں تو چھیڑ رہی تھی۔''

مجھے خیال آیا۔ ''صائمہ تم نے بتایا نہیں کہ تمہارا ایک بار رشتہ طے ہوا تھا؟''

''رمشا اور نغمہ کو پتا ہے میں نے اس لیے نہیں بتایا کہ جب آپ اپنے گھر والوں سے کہیں گے تو لازمی آپ کو بھی پتا چل جائے گا۔''

''تم بتا دیتیں تو اچھا تھا۔''

''بس مجھے عجیب سا لگ رہا تھا۔''

''سامی یہ رشتہ کیسے ہوا؟''

وہ چپ ہو گئی پھر اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''نعمان پلیز مجھے سامی مت کہیں؟''

''کیوں یہ تو پیار کا نک نیم ہے اور خوب صورت بھی ہے تم پر بجتا ہے۔''

''بس میں نے کہہ دیا نا مجھے پسند نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ بالکل بدل گیا۔ اس میں ایک اجنبیت سی آگئی تھی میں نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے کہا۔

''او کے جی آپ صائمہ ہی ٹھیک ہو۔''

اس کا لہجہ کسی قدر بہتر ہوا۔ ''ہاں آپ مجھے صائمہ ہی کہیں۔''

''لو سامی اور صائمہ کے چکر میں رشتے والی بات تو رہ گئی۔''

''بس ساحر کا رشتہ آیا تھا اور امی ابو نے ہاں کر دی۔ وہ ملائیشیا میں کام کرتا تھا۔ رشتے کے بعد وہ واپس گیا تو نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہوا اسے پولیس نے گرفتار کر لیا اور پھر اسے سزا ہو گئی۔'' صائمہ نے جان چھڑانے والے انداز میں بتایا۔

''تمہاری اس سے بات ہوئی کبھی؟''

''نہیں نہ جانے کیوں میں نے کبھی اس سے بات نہیں کی بلکہ اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔'' صائمہ نے بتایا تو مجھے سن کر خوشی ہوئی تھی۔

''صائمہ آج میری زندگی کا سب سے یادگار دن ہے۔''

''ابھی تو اور یادگار دن آنے والے ہیں۔''

''وہ جب آئیں گے تب آئیں گے ابھی تو یہی ہے۔''

''نعمان میں ماسٹرز کرنا چاہتی ہوں لیکن امی اجازت نہیں دے رہی ہیں۔ اگر آپ لوگ بات کریں اور رشتہ دیر سے کرنے کی بات کریں تو شاید اجازت مل جائے۔''

''پہلے رشتہ ہو جانے دو اس کے بعد میں امی ابو سے کہلوا دوں گا ابو ویسے بھی لڑکیوں کی تعلیم کے حامی ہیں امی تو نغمہ کو آگے پڑھنے کی اجازت نہیں دے رہی ہیں اس کی شادی کرنا چاہتی ہیں۔''

''پلیز کسی طرح اجازت ضرور دلوا دیں نا۔'' اس نے التجا کی۔ ''آپ کو سیٹ ہونے میں ٹائم لگے گا میں گھر بیٹھے بور ہوں گی۔''

سچی بات ہے میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ماسٹرز کرے کیونکہ اب میرا ارادہ تھا کہ ایک سال کے اندر سیٹ ہو کر اسے بیاہ کر لے آؤں گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صائمہ کے لیے میری بیتابی بڑھ رہی تھی۔ اس لیے میں نے ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ میں امی سے کہوں گا۔ اگلے روز امی نے صائمہ کی امی سے بات کر لی اور ان کا رد عمل حوصلہ افزا تھا۔ ابو کو بتایا تو ابو نے صائمہ کے ابو انکل ادریس سے فون پر بات کر کے اتوار کو آنے کا کہہ دیا۔ ہمارے ہاں شادی بیاہ کے فیصلے اور معاملات مرد طے کرتے ہیں اور بات کرنے کے لیے عورتوں کو آگے رکھتے ہیں۔ اتوار کو امی ابو، حرا اور حمیرہ بھابی میرا رشتہ لے کر گئے۔ نغمہ نے جانا تھا لیکن اسے وائرل انفیکشن ہو گیا اور وہ نہیں جا سکی۔ رمشا اگلے دن ہونے والے پیپر کی تیاری کر رہی تھی۔ اس بار بھی صائمہ کے گھر والوں کا رد عمل حوصلہ افزا تھا۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے آٹھ مہینے ہو گئے تھے اور دونوں گھرانے ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔ ہم آمنے سامنے کے پڑوسی تھے۔ امی، بہنوں اور بھابیوں کا روز کا ملنا جلنا تھا۔ ایک دوسرے کے گھر چیزیں بھیجی جاتی تھیں۔ اب موسم سرد ہو گیا تھا اس لیے رات کی چہل قدمی اب گھروں کی محفل میں بدل گئی تھی۔

دوسرے اتوار کو صائمہ کے گھر والوں نے ہمارے سارے گھر کی دعوت کی اور سوائے میرے سب گئے تھے کیونکہ اشارتاً بتا دیا گیا تھا کہ میرا رشتہ منظور کر لیا گیا ہے اور ان کی طرف سے ان کا خاندان بھی شامل ہو گا۔ کیونکہ ہمارے ہاں سارے خاندان سے مشورے کا رواج نہیں تھا اس لیے بس گھر والے گئے اور امی نے صائمہ کو روایتی انداز میں دوپٹا اوڑھا کر رشتہ پکا کر لیا۔ منگنی کا رواج بھی نہیں تھا۔ صائمہ کے ہاں بھی نہیں تھا۔ انکل ادریس نکاح چاہتے تھے لیکن امی ابو نے معذرت کر لی کہ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ نکاح کا مطلب ہے لڑکے اور لڑکی کو کشمکش میں ڈال دینا۔ امی ابو نے ایک سال کی مہلت لی تھی کہ میں جاب کر لوں اور سیٹ ہو جاؤں اس کے بعد صائمہ کو بیاہ کر لے جاؤں۔ ساتھ ہی اشارتاً کہہ دیا کہ شاید اس سے زیادہ وقت بھی لگ سکتا ہے۔ ہمارے گھر والوں کے برعکس صائمہ کے گھر والے جلدی چاہ رہے تھے۔ انکل ادریس نے کہا۔ ''بھائی صاحب میں بیٹیوں کو جلد ان کے گھر کا کر دینے کا قائل ہوں پہلا رشتہ بھی صرف انیس برس کی عمر میں کر دیا تھا اس وقت صائمہ گریجویشن کر رہی تھی۔''

''جی ادریس بھائی۔'' ابو نے کہا۔ ''مگر ابھی نعمان اپرنٹس شپ کر رہا ہے۔ اسے جاب کر کے سیٹ ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ جب صائمہ بیٹی ہمارے گھر آئے تو اسے کوئی کمی نہ ہو۔ دوسری بہوؤں کے مقابلے میں کم تری نہ ہو۔''

ابو نے طریقے سے سمجھا دیا کہ میرے سیٹ ہونے سے پہلے یہ شادی ممکن نہیں ہے البتہ انہوں نے گھر آ کر امی سے کہا۔ ''ادریس صاحب اور ان کی بیگم بہت عجلت میں لگ رہے ہیں اگر ہم ایک مہینے بعد برات لانے کا کہتے تو وہ مان جاتے۔''

''اب ایسا بھی کیا... لڑکی والے جلدی تو کرتے ہیں۔'' امی بولیں۔

''بس مجھے عجیب لگا۔''

میرے علم میں بھی یہ بات آئی اور میں نے صائمہ سے کہا۔ ”تم ماسٹرز کرنے کی بات کر رہی ہو اور تمہارے گھر والے جلدی شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔“

”ہاں وہ تو ہے لیکن میں آپ کے لحاظ سے کہہ رہی تھی۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے آپ کے ابو کے بات پسند آئی کہ مجھے کوئی کمی نہ ہو خاص طور سے بھابیوں کے مقابلے میں۔“

”نہیں ہو گی۔“ میں نے اسے اطمینان دلایا۔ ”پچیس تیس ہزار کی نوکری تو مجھے آسانی سے مل جائے گی لیکن میں اس سے زیادہ تنخواہ چاہتا ہوں تاکہ تمہیں دھوم دھام سے بیاہ کر لے جاؤں اور آرام سے رکھوں۔“

”پلیز، تب آپ مجھے ماسٹرز کرنے کی اجازت دلوا دیں نا..... مجھے معلوم ہے آپ کہیں گے تو ابو منع نہیں کریں گے۔“

”بھئی ابھی تو رشتہ طے ہوا ہے میں ایسے کیسے بات کر سکتا ہوں۔“

”اگلے اتوار کو امی ابو آپ کی دعوت کریں گے، اس موقع پر آپ بات کر سکتے ہیں۔“

”مجھے اس بارے میں نہیں معلوم ہے۔“

”میں بتا رہی ہوں نا۔ ہمارے ہاں روایت ہے ہونے والے داماد کی دعوت کی جاتی ہے۔“

دو دن بعد ادریس انکل نے مجھے کال کر کے دعوت دی۔ ”بیٹا ہم نے آپ کے گھر آنا ہے لیکن ہمارے ہاں روایت ہے کہ داماد کے گھر جانے سے پہلے اس کی دعوت کی جاتی ہے۔“

”میں آجاؤں گا انکل۔“

دعوت اکیلے میری تھی اس لیے میں ہی گیا۔ اس بار صائمہ کے گھر والے تھے اور انہوں نے کسی خاندان والے کو نہیں بلایا تھا۔ صائمہ سامنے نہیں آئی۔ ہاں، جب کھانا لگا تب وہ آئی تھی مگر زیادہ تر نظریں جھکا کر بیٹھی رہی۔ کھانے کے بعد میں نے گپ شپ کے دوران صائمہ کی فرمائش کے مطابق انکل اور آنٹی سے بات کی کہ اسے ماسٹرز کی اجازت دے دیں۔ اس پر انکل ادریس نے ذرا بے چینی سے پہلو بدلا۔ آنٹی نے صائمہ کو گھورا تو وہ اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد انکل نے کہا۔ ”بیٹا بات یہ ہے کہ ہم صائمہ کی شادی جلد چاہتے ہیں۔ تم جانتے ہو اس کا ایک رشتہ ہو کر ٹوٹ گیا ہے۔ اسی وجہ سے کئی اچھے رشتے واپس چلے گئے۔“

”جی انکل، ہم یہ بات جانتے ہیں اور ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا یہ تو نصیب کی بات ہوتی ہے۔“

”یہ تو ہے بیٹا لیکن بہکانے والوں اور پھوٹ ڈلوانے والوں کی کمی نہیں ہوتی ہے۔ اس ایک تجربے کے بعد ہم ڈر گئے ہیں بس یہ بات ہے۔“

”اس سلسلے میں آپ بے فکر رہیں، آپ جانتے ہیں میری جاب نہیں ہے، میں مزید چند مہینے یہاں ٹریننگ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ چیز فیوچر میں میرے بہت کام آئے گی۔ اس کے بعد میں جاب تلاش کروں گا۔ کم سے کم ایک سال لگے گا مجھے سیٹ ہونے میں، اس کے بعد ہی میں برات لاسکتا ہوں۔ یوں سمجھ لیں کہ اس میں ڈیڑھ سے دو سال لگ سکتے ہیں۔ آپ صائمہ کو اجازت دے دیں اگر اس سے پہلے شادی کا وقت آگیا تو وہ شادی کے بعد بھی کمپلیٹ کر سکتی ہے۔ میری طرف سے مکمل سپورٹ ہو گی۔“

میرے اصرار پر وہ سوچ میں پڑ گئے پھر انہوں نے کہا کہ وہ ابھی نہیں بعد میں جواب دیں گے۔ واپسی پر میں نے صائمہ سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اسے بہت ڈانٹ پڑی ہے اور امی نے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ ماسٹرز کے بجائے شادی کی تیاری کرے۔ میں نے کہا۔ ”تم نے سنا ہو گا میں نے پوری کوشش کی لیکن لگ رہا ہے تم جلد میرے نصیب میں آنے والی ہو۔“

میرا لہجہ شوخ تھا جواب میں اسے چپ لگ گئی جسے میں شرم سمجھا تھا۔ اس کے بعد اس نے زیادہ بات نہیں کی اور کچھ دیر بعد کال بند کر دی۔ جب تک رشتہ نہیں ہوا تھا اس کے انداز میں میرے لیے بیتابی ہوتی تھی۔ وہ کئی بار روئی تھی لیکن جیسے ہی رشتہ ہوا اس کا انداز نارمل ہو گیا۔ کال میں اسے کرتا تھا، وہ ایس ایم ایس کرتی تھی۔ اب اس نے ایس ایم ایس کرنا کم کر دیے۔ کال پر بھی زیادہ بات نہیں کرتی تھی۔ ایک بار میں نے شکوہ کیا تو اس نے کہا۔ ”نومی پہلے بات اور تھی اب امی نظر رکھتی ہیں ان کا کہنا ہے میں آپ سے زیادہ بات نہ کروں کیونکہ شادی سے پہلے لڑکی لڑکے کا بات کرنا اچھی بات نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے زیادہ بات نہیں کرنی چاہیے لیکن جتنی بھی ہو اس میں کم سے کم محبت اور جذبات تو نظر آئیں۔“

”میں اپنے جذبات اور محبت شادی کے بعد کے لیے سنبھال کر رکھ رہی ہوں۔“ اس کے پاس یہ جواب تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔ ان دنوں میری اپرنٹس شپ کا آخری مرحلہ

چل رہا تھا اور مصروفیت بہت زیادہ تھی۔ اکثر واپس آتے آتے گیارہ بج جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی سی وی مختلف اداروں اور کمپنیوں کو بھیجنا شروع کر دی تھی۔ ان میں سے کئی کی طرف سے جواب آیا تھا۔ اس کے انٹرویوز کی تیاری بھی کر رہا تھا۔ اس لیے میں صائمہ اور اس کے رویے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکا تھا۔ چند مہینے بعد انٹرن شپ ختم ہوئی اور میں نے ایک جاب آفر قبول کر لی۔ یہ ایک کو ایڈونچر کمپنی تھی جو ملک میں صنعتوں کے قائم کرنے میں مدد دیتی تھی۔ تنخواہ اچھی تھی۔ ترقی کا چانس تھا اور ملک سے باہر بھی نکل سکتا تھا۔

اس وقت تک رشتے کو چار مہینے گزر گئے تھے۔ میری دوسرے تیسرے دن فون پر صائمہ سے بات ہوتی تھی اور اس کے انداز سے ذرا بھی نہیں لگتا تھا کہ اس نے مجھ سے محبت کی ہے یا مجھ سے شادی کی خاطر وہ روئی تھی۔ اب وہ نارمل سے انداز میں حال احوال لیتی تھی۔ جب میں اس سے بے رخی اور رویے کا شکوہ کرتا تو وہ کہتی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اسے مجھ سے محبت ہے بس اسے جتانا نہیں آتا۔ اسے عام لڑکیوں کی طرح ادائیں دکھانا نہیں آتا ہے۔ میں اس سے کہتا کہ میں ادائیں بعد میں دیکھوں گا ابھی تو میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے محبت بھری چند باتیں کر لیا کرے۔ وہ تنگ آکر کہتی۔ ”آپ کر لیا کریں میں سن لوں گی یہ کافی ہے۔ مجھ سے ایسی باتیں نہیں ہوتی ہیں۔“

اس کے جواب پر میں آزردہ ہو جاتا تھا لیکن میرے دل میں اس کی محبت کم نہیں ہوتی تھی۔ دونوں گھرانوں میں بہت اچھے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ ملنا جلنا پہلے سے بڑھ گیا تھا۔ مگر میرے اور صائمہ کے درمیان سرد مہری سی آگئی تھی اور یہ سرد مہری اس کی طرف سے آئی تھی کیونکہ میں اس کے لیے اپنی محبت میں کوئی کمی نہیں پاتا تھا۔ مجھے پہلی تنخواہ ملی تو میں بہت چاہت سے اس کے لیے سوٹ اور میچنگ کی چیزیں لے کر آیا۔ میری خواہش تھی کہ وہ یہ سوٹ اور چیزیں استعمال کرے۔ میں نے نغمہ اور رمشا سے یہ چیزیں بھجوائی تھیں۔ پھر نغمہ کی شادی کا وقت آیا تب بھی میں نے اسے شادی کا سوٹ اور گولڈ لاکٹ گفٹ کیا مگر اس نے شادی کے موقع پر کوئی اور جوڑا پہنا تھا جو پہلے بھیجا تھا اس کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ میں جب پوچھتا وہ یہی بتاتی کہ ابھی اس نے بنایا نہیں ہے۔ میں دل مسوس کر رہ جاتا۔ صائمہ کی یہ سرد مہری اب رمشا اور نغمہ بھی محسوس کرنے لگی تھیں۔ ایک دن نغمہ نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ”بھائی، آپ کی صائمہ سے کوئی کھٹ پٹ ہے؟“

”نہیں تو کیا اس نے کچھ کہا ہے؟“

”نہیں بھائی وہ کچھ نہیں کہتی ہے لیکن وہ آپ کا ذکر نہیں کرتی ہے اور جب میں یا رمشا اس سے ذکر کریں تو یوں انجان بن جاتی ہے جیسے آپ سے اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔“

”ممکن ہے وہ شرماتی ہو۔“

”بھائی شرماتی تو ہمیں پتا نہیں چلتا، ہم بھی لڑکیاں ہیں اور ہمیں پتا ہے کہ شرماتے ہیں تو کیسے لگتے ہیں۔“

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی خود نغمہ کے سامنے اس کے ہونے والے شوہر کا نام لو تو وہ گلنار ہو جاتی تھی۔ رمشا نے بھی مجھ سے ایسی ہی بات کی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ صائمہ نارمل ردعمل کیوں نہیں دیتی تھی۔ مجھے شک ہونے لگا کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی ہے لیکن ایک بار جب میں بیمار ہوا، مجھے ڈینگی ہو گیا تھا تب اس کی حالت دیکھنے والی تھی، وہ رو رو کر آدھی رہ گئی تھی۔ رمشا اور نغمہ جب جاتیں اسے دست بہ دعا دیکھتیں۔ ان دنوں وہ باقاعدگی سے نماز پڑھ رہی تھی اور ہر نماز کے بعد گڑگڑا کر دعا کرتی تھی۔ البتہ مجھ سے اس کا رویہ ایسا ہی تھا، کال پر عام سے انداز میں بات کرتی اور ایس ایم ایس بھی زیادہ نہیں کرتی تھی البتہ دن میں کئی بار ایس ایم ایس پر میری خیریت پوچھ لیتی تھی۔ خوش قسمتی سے ڈینگی خطرناک ثابت نہیں ہوا اور میں ایک ہفتے میں ٹھیک ہو گیا تھا۔ مگر صائمہ اس کے بعد بھی کئی دن پریشان رہی جب میں نے دفتر جانا شروع کیا تو اسے اطمینان ہوا تھا اور بہ قول رمشا کے صائمہ باجی نے مصلے کی جان چھوڑی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی بس اظہار نہیں کرتی تھی۔

مجھے اسٹارٹنگ میں تیس ہزار تنخواہ مل رہی تھی۔ تین مہینے بعد تنخواہ چالیس ہزار ہو گئی اور مجھے مستقل کر دیا گیا۔ ایک سال پورا ہونے پر گاڑی دینے کا وعدہ کیا گیا اور سال میں تین بونس ملتے۔ یوں میرا خواب پورا ہو گیا کہ مجھے جلد اتنی آمدنی ہو کہ میں صائمہ کو لا کر اسی طرح سے رکھ سکوں جیسے میری دو بھابیاں رہ رہی تھیں حالانکہ احسان بھائی کی تنخواہ ڈیڑھ لاکھ روپے سے زیادہ تھی۔ جب کہ محسن بھائی بھی لاکھ روپے لے رہے تھے۔ مگر وہ کمائی کے لحاظ سے خرچ نہیں کرتے تھے بلکہ مستقبل کا سوچ کر خاصی بچت بھی کرتے تھے اس لیے ان کا خرچ اتنا کھلا بھی نہیں تھا۔ میں ابھی سے

بچت کر رہا تھا کہ شادی کے لیے جلد از جلد رقم جمع کر لوں سوائے چند ہزار خرچ کے ساری تنخواہ امی کو دیتا تھا جو جمع ہو جاتی تھی۔ وہ اس میں سے گھر کے خرچ کے لیے بھی کچھ نہیں لیتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جب میری شادی ہو جائے گی اس کے بعد وہ گھر کا خرچ بھی لیتیں۔

سال پورا ہونے تک میں اتنا جمع کر چکا تھا کہ شادی کے اصل اخراجات خود برداشت کر سکوں۔ امی نے صائمہ کے لیے گولڈ کے دو سیٹ بنوا لیے تھے، چھ چوڑیاں بنوائی تھیں۔ شادی کے اور دینے والے کپڑے لینا شروع کر دیئے تھے کیونکہ عین موقع پر سب مشکل ہوتا۔ میں نے امی سے کہا۔ ''اب آپ صائمہ کے امی ابو سے بات کر لیں اور کوشش کریں کہ قریبی تاریخ مل جائے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔'' امی نے کہا۔ ''تمہارے ابو سے بات کرتی ہوں۔''

امی نے ابو سے بات کی اور وہ مان گئے۔ پھر گھر والوں سے مشورے کے بعد طے ہوا کہ آنے والے مارچ کی کوئی تاریخ طلب کی جائے، ابھی دسمبر چل رہا تھا۔ ابو نے پہلے فون پر ادریس انکل سے بات کی اور وہ خوش ہو گئے انہوں نے کہا۔ ''کیوں نہیں کامران صاحب میں تو خود سوچ رہا تھا کہ آپ سے بات کروں۔''

''بس تو ہم جلد چکر لگاتے ہیں تاریخ کا بیگم بتا دیں گی۔''

''ہم منتظر ہیں کامران بھائی۔''

آنے والی چھٹی کے دن ہمارے گھر والے گئے تھے امی اور صائمہ کی امی نے پہلے ہی تاریخ کا بھی سوچ لیا تھا اور دونوں گھروں میں تبادلۂ خیال بھی ہو گیا تھا۔ جس دن میرے گھر والوں کو... جانا تھا اس سے ایک دن پہلے رات کے وقت صائمہ کی غیر متوقع کال آئی۔ میں حیران ہوا تھا کہ جب سے اس تعلق ہوا تھا یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کال کی تھی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو کیسی ہو تم؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' صائمہ کی مرجھائی آواز آئی۔ ''نومی میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

''کہو میں سن رہا ہوں۔''

''کیا یہ شادی کچھ دن بعد نہیں ہو سکتی؟''

مجھے دھچکا لگا تھا۔ ''کیا مطلب کچھ دن بعد.....؟''

''مطلب.... اس سال کے اینڈ تک۔''

''مگر کیوں صائمہ..... تم جانتی نہیں ہو کہ میں تمہیں پانے کے لیے کتنا بے تاب ہوں؟''

''جانتی ہوں۔'' اس نے اقرار کیا۔

''پھر تم نے ایسی بات کیوں کی۔''

''پتا نہیں نومی مجھے شادی کا سوچ کر گھبراہٹ ہو رہی ہے۔''

''یہ کوئی خاص بات نہیں ہے تمام لڑکیاں گھبراتی ہیں نغمہ تو شادی سے پہلے والے تین دن تک مسلسل روتی رہی تھی۔ اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑنا آسان نہیں ہوتا ہے۔''

''پلیز..... پلیز..... نومی میری بات مان لیں، صرف اس سال کے اینڈ تک رک جائیں..... میں آپ کی منت کرتی ہوں۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو صائمہ، کیا تم میرے جذبات سے بے خبر ہو، میرے لیے ایک ایک پل کاٹنا دشوار ہو رہا ہے اور تم چاہ رہی ہو معاملہ مہینوں آگے چلا جائے۔''

''تو آپ نہیں مانیں گے؟'' وہ چپ ہو گئی۔

مجھے غصہ آ گیا ''ہاں، میں تمہاری کوئی احمقانہ بات نہیں مانوں گا نہ شادی سے پہلے اور نہ شادی کے بعد۔''

''ٹھیک ہے پھر بعد میں مجھ سے کوئی شکایت مت کیجئے گا۔'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا اور کال کاٹ دی۔ میں نے پریشان ہو کر اسے کال تو اس نے ریسیو نہیں کی اور جب میں نے پھر کوشش کی تو اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ میں فکر مند ہو گیا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ بہت سی لڑکیاں شادی سے ڈرتی ہیں یا ماں باپ کا گھر چھوڑ کر جانا نہیں چاہتیں لیکن وہ اپنے ہونے والے شوہروں کو کال کر کے منع نہیں کرتی ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ میں امی سے اس سلسلے میں بات کروں لیکن مجھے عجیب سا لگا اس لیے یہ خیال ترک کر دیا اسی طرح رمشا یا نغمہ سے بات کرتا بھی ایسا لگا جیسے میں اپنی اور صائمہ کی نجی بات ان سے کرنے جا رہا ہوں۔ اسی کشمکش میں اگلا دن آ گیا اور گھر والوں نے جا کر میری اور صائمہ کی شادی کی تاریخ طے کر دی۔ صائمہ کے ہاں رواج تھا کہ جس دن لڑکے والے تاریخ لینے آتے تھے اسی دن تاریخ دے دی جاتی تھی۔ مارچ کے آخری ہفتے کی تاریخ طے ہوئی تھی۔ میں نے صائمہ کو پھر کال کرنے کی کوشش کی تو اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ میں نے ایس ایم ایس کر کے مبارک باد دے دی۔

وقت کم تھا اس لیے دونوں طرف سے تیاری شروع ہو گئی۔ صائمہ کی طرف سے بے چاری امیمہ اکیلی تھی، اس

لیے رمشا نے اعلان کیا کہ وہ اس کے ساتھ تیاری کرائے گی۔ نغمہ اور بھابیاں میری طرف سے کرتیں۔ ویسے بھی امی نے بہت کچھ کر لیا تھا اور اب زیادہ باقی نہیں رہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میری بیتابی کے ساتھ فکر بھی بڑھ رہی تھی کیونکہ صائمہ نے جو اس رات کال کی تھی اس کے بعد سے اس کی طرف سے..... کوئی رابطہ ہوا تھا اور نہ ہی اس کا موبائل آن ہوا تھا اور نہ ہی اس نے میرے کسی ایس ایم ایس کا جواب دیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جب مجھ سے شادی میں اس کی پوری رضامندی تھی تو وہ اس طرح کا سلوک کیوں کر رہی تھی۔ آخر وہ شادی کو لیٹ کیوں کرنا چاہ رہی تھی۔ مجھے اس کا شروع کا رویہ یاد آیا جب اس نے مجھ پر زور دیا کہ میں اس کے ماں باپ سے بات کر کے اسے ماسٹرز کی اجازت دلواؤں۔ میں ناکام رہا تھا کیونکہ اس کے گھر والوں کا رویہ سخت تھا، خاص طور سے آنٹی کسی صورت اسے آگے پڑھنے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

پھر بہت طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد وہ دن آیا جب صائمہ میری ہو جاتی۔ بہت دھوم دھام سے برات گئی اور اسے لے کر آئی۔ ہم ایک ہی گلی میں رہتے تھے لیکن برات خاصی دور ایک اعلیٰ درجے کے لان گئی تھی۔ واپسی میں حسب معمول دیر ہو گئی تھی اور ہم رات دو بجے گھر پہنچے تھے۔ وقت کم تھا اس لیے صائمہ کو جلدی سے رسومات کے مرحلے سے گزار کر کمرے میں پہنچایا گیا۔ امی نے سختی سے کہہ دیا تھا کہ کوئی فضول وقت ضائع نہیں کیا جائے گا جس کو جاگنے کا شوق تھا وہ ہمارے کمرے میں جانے کے بعد جاگ سکتا تھا۔ جب مجھے کمرے میں جانے کا اشارہ ملا تو میں دھڑکتے دل، شوق اور خوف کے ملے جلے جذبات لیے اندر داخل ہوا۔ خوف مجھے صائمہ کے رویے سے ہوا تھا جو اس نے تین مہینے پہلے اختیار کیا تھا اور میں نہیں جانتا تھا کہ آگے کیا رویہ ہوتا۔ اسی کا خوف دل میں بسا ہوا تھا۔ لیکن اندر داخل ہوتے ہی مجھے دھچکا لگا تھا۔ صائمہ بیڈ پر نہیں تھی۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنا میک اپ صاف کر رہی تھی۔ زیور اور دوسرا سنگھار وہ پہلے ہی اتار چکی تھی۔ میری آمد کا نوٹس لیے بغیر اس نے اپنا کام جاری رکھا۔

''صائمہ، یہ کیا کر رہی ہو؟''

''میک اپ صاف کر رہی ہوں۔''

''مگر کیوں؟'' میں نے دکھ سے کہا۔ ''آج ہماری شادی کی رات ہے اور تم نے یہ بناؤ سنگھار کس لیے کیا تھا۔''

''ایک فوٹو سیشن کے لیے۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا اور اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں سے خاصی دیر بعد نکلی تو وہ نہ صرف منہ ہاتھ دھو چکی تھی بلکہ اس نے عروسی لباس بھی بدل کر ایک سادہ سوٹ پہن لیا تھا۔ میں ہکا بکا اسے دیکھ رہا تھا، اس نے میری طرف دیکھا۔ ''مجھے روشنی میں نیند نہیں آتی ہے۔''

مجھے یقین نہیں آیا۔ ''صائمہ تم سونے جا رہی ہو؟''

''ہاں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''مجھے جلد سونے کی عادت ہے اور اس وقت تین بج چکے ہیں۔''

''آج ہماری شادی کی رات ہے۔''

''یہ بات آپ کتنی بار ٹھہرائیں گے۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا اور بستر پر میری طرف پشت کر کے لیٹ گئی۔ اس کا حسین سراپا اس سادہ سے سوٹ میں بھی نہایت پرکشش اور بلا وا دیتا ہوا لگ رہا تھا مگر اس کا رویہ نہایت عجیب اور حوصلہ شکن تھا۔ مجھے شدت سے اپنی توہین محسوس ہوئی تھی۔ پہلی رات بیوی شوہر سے ایسا رویہ اختیار کرے تو اسے توہین ہی محسوس ہو گی۔ میں نے اپنا نائٹ سوٹ لیا اور واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ میں واپس آیا تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ اس سے اس کے رویے پر جواب طلب کروں گا مگر بستر کے پاس پہنچا تو میری ہمت نہیں ہو سکی تھی۔ میں اس کے برابر میں لیٹا اور ساری رات جیسے کانٹوں پر لیٹا رہا۔ نیند کیا آتی، دماغ جیسے اڑا ہوا تھا فجر کی ساعت آ گئی۔ تنگ آ کر بستر سے اترا اور اذانوں تک ٹہلتا رہا جب کہ وہ مزے سے سوتی رہی۔ اس کا اندازہ اس کی مستقل اور مدہم سانسوں سے ہو رہا تھا۔ اذانیں ہوئیں تو میں نے نماز پڑھی اور پھر اللہ کے حضور رو دیا تھا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا، میں نے صائمہ سے محبت کی تھی۔ اور بہت باوقار محبت کی تھی، کبھی کوئی اخلاق یا تہذیب سے گری حرکت تو کیا بات بھی نہیں کی تھی۔ پھر وہ مجھے کس بات کی سزا دے رہی تھی۔ اس نے میری زندگی کی سب سے حسین رات کو میرے لیے سزا بنا دیا تھا۔ میں جب تک زندہ رہوں گا، اس رات کو نہیں بھول سکوں گا۔

دس بجے تک ہمیں ''سونے'' دیا گیا اور پھر نغمہ نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو نغمہ اور دوسری لڑکیاں اندر گھس آئیں۔ رمشا نے شوخی سے کہا۔ ''بھائی جان اب اٹھ جائیں، بھابی صاحبہ کو بھی اٹھا دیں..... ان کے گھر والے آئے ہوئے ہیں۔''

اس کا اندازہ مجھے ڈرائنگ روم کی طرف سے آتے

اور لیس انکل کے قہقہوں سے ہوگیا تھا۔ میں نے صائمہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”ان کو خود ہی اٹھاؤ۔“

”جی سلائیں آپ اور اٹھائیں ہم۔“ حمیرہ بھابی نے جملہ کسا جسے نظر انداز کر کے میں جلدی سے واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں میرے چہرے کے تاثرات پول نہ کھول دیں کہ گزشتہ رات میں نے کیسے گزاری تھی۔ میں نہا دھو کر واپس آیا تو صائمہ کو لڑکیوں کے درمیان شرماتے لجاتے دیکھا۔ میں حیران ہوا کہ وہ کس بات پر شرما لجا رہی تھی جب کہ رات کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

میں تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آیا جہاں انکل اور آنٹی بھی تھے۔ میں نے دل پر جبر کر کے مسکرا کر ان سے سلام دعا کی۔ میں نے محسوس کیا کہ آنٹی مجھے غور سے دیکھ رہی تھیں لیکن جب میں مسکرانے لگا تو وہ مطمئن دکھائی دینے لگیں۔

ناشتے کے بعد وہ صائمہ کو لے گئے تھے اور اب وہ اپنے گھر سے تیار ہو کر ولیمے کے لیے جاتی، وہاں سے پھر میرے ساتھ آتی۔ اس کے جانے کے بعد سب نے مجھے چھیڑنا چاہا لیکن میں تھکن اور نیند کی کمی کا بہانہ بنا کر کمرے میں آ گیا۔ میں تنہائی میں سوچنا چاہتا تھا کہ یہ سب کیا تھا؟

شام کو میرا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن میں تیار ہوا، مجھ پر جو گزر رہی تھی وہ میں نے خود تک رکھی۔ میں اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو دکھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید میرے دل میں کہیں امید تھی کہ میں صائمہ سے بات کر کے اسے نارمل رویے پر راضی کر لوں گا۔ اس طرح جو ہوا وہ بس ہم دونوں کے درمیان رہے گا۔ ولیمے کی تقریب جلد نمٹ گئی اور ہم بارہ بجے اپنے کمرے میں پہنچ گئے تھے۔ اس روز صائمہ سے پہلے میں نے لباس تبدیل کر لیا اور ٹی وی لگا کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ صائمہ کو جہیز میں ہر چیز ملی تھی مکمل بیڈ روم سیٹ کے ساتھ بڑا ایل ای ڈی ٹی وی، اے سی اور روم فریج بھی جہیز میں آیا تھا۔ صائمہ کے ایک سو ایک جوڑے، کئی سونے کے سیٹ اور ایک سچے موتیوں کا بھی تھا۔ اس کے ذاتی استعمال کی ہر چیز اعلیٰ درجے کی تھی۔ مجھے سلامی میں ایک لاکھ روپے، ڈائمنڈ واچ اور آئی فون دیا تھا یعنی انکل اور آنٹی نے اپنی بیٹی کی شادی میں دل کھول کر ارمان نکالے تھے۔ یہ مارے باندھے کی شادی نہیں تھی وہ تو گاڑی بھی دینا چاہ رہے تھے لیکن اتفاق سے ان ہی دنوں مجھے آفس سے زیرو میٹر کار ملی تھی اس لیے میں نے منع کر دیا۔

صائمہ لباس تبدیل کر کے اور میک اپ صاف کر کے آئی اور حسب معمول دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹنے لگی تو میں نے ریموٹ سے ٹی وی آف کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

وہ لیٹتے ہوئے رک گئی۔ بیڈ کے کنارے پیر لٹکائے بیٹھی رہی لیکن میری طرف نہیں دیکھا۔ ”جی کہیے؟“

”صائمہ یہ سب کیا ہے؟“

”کیا؟“

”یہی تمہارا رویہ.... ایسا لگ رہا ہے میں نے تم سے شادی نہیں کی ہے زبردستی تمہیں اٹھا کر لے آیا ہوں۔“

”آپ جو چاہیں سمجھتے رہیں۔“

”میں وجہ جاننا چاہتا ہوں اور اس مسئلے کو حل کرنا چاہتا ہوں اپنی اور تمہاری حد تک لیکن اگر تم نہیں چاہتیں تو مجھے وجہ بتاؤ تاکہ جب میں بڑوں سے بات کروں تو ان کے سامنے یہ وجہ رکھ سکوں۔“

اس بار اس کے پتھر کی طرح ساکت وجود میں ارتعاش پیدا ہوا اور اس نے بے چینی سے کہا۔ ”بڑوں سے بات کیوں....“

”تمہارا کیا خیال ہے میں نے شادی اس لیے کی تھی کہ میری بیوی پہلی رات سے میری طرف کروٹ لے کر لیٹ جائے نہ میری طرف دیکھے اور نہ مجھے ہاتھ لگانے دے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”میں نے.... آپ کو روکا تو نہیں ہے۔“ وہ کسی قدر نرم انداز میں بولی۔

”تو روکنا اور کیا ہوتا ہے؟“ میرا لہجہ مزید تلخ ہو گیا۔ ”تم وضاحت کرنا چاہو گی۔“

”میرے پاس کوئی وضاحت نہیں ہے۔“

”تب میں پہلے امی ابو سے اور پھر تمہارے ماں باپ سے بات کروں گا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”میں نے شادی خوشی کے لیے کی تھی، بیوی کے ہوتے ہوئے جلتے رہنے کے لیے نہیں۔“

میں نے لائٹ بجھا دی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس رات مجھے نیند آ گئی لیکن بہت دیر سے۔ کئی بار میرا دل چاہا کہ اپنے مرد اور شوہر ہونے کا فائدہ اٹھاؤں۔ صائمہ پر میرا حق تھا اور وہ مجھے نہیں روک سکتی تھی۔ ممکن ہے میں نے اس سے محبت نہ کی ہوتی تو میں ایسا ہی کرتا لیکن اس کی محبت نے میرے ہاتھ روک لیے۔ میں زبردستی کر کے

اپنی نظر میں گرنا نہیں چاہتا تھا۔ اگلی صبح صائمہ کا رویہ کسی حد تک بدلا ہوا تھا۔ وہ خود سے بات کر رہی تھی اور کسی قدر شوخ بھی ہو رہی تھی۔ ناشتے کے بعد جب ہم کمرے میں آئے تو اس نے کہا۔ ”تومی میری ایک بات مانیں گے؟“

”تم میری بیوی ہو اور میری محبت ہو اس لیے تمہاری بات کیوں نہیں مانوں گا بشرطیکہ وہ معقول ہو۔“

”پلیز تومی.... مجھے کچھ وقت دیں.... ابھی کسی سے بات نہ کریں.... حالات کو جوں کا توں رہنے دیں۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ جیسا ہمارے درمیان چل رہا ہے اسے چلنے دیں۔ نہ مجھ سے وضاحت مانگیں اور نہ میرے پاس آئیں۔“

”مگر کیوں؟ کیا تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے آئی مین خواتین والا....“

اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔ ”نہیں یہ بات نہیں ہے بس ابھی مجھ سے کچھ مت پوچھیں....“

”ٹھیک ہے لیکن یہ صورت حال کتنے عرصے چلے گی۔“

”میں وقت نہیں دے سکتی لیکن زیادہ دن نہیں چلے گی۔ اگر.... اگر میں آپ کی توقعات پر پورا نہ اتر سکی تو پھر آپ جو مرضی چاہے کریں۔“

اس بار بھی صائمہ سے محبت نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے لیکن اتنا تو تم بھی سمجھ رہی ہو کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے اور میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”جی سمجھ رہی ہوں۔“

یہاں سے ہماری زندگی کا عجیب دور شروع ہوا۔ دوسروں کے سامنے ہم پیار کرنے والے اور ایک دوسرے کا خیال رکھنے والے میاں بیوی ہوتے تھے لیکن کمرے کی تنہائی میں آتے ہی ایک دوسرے سے بیگانہ ہو جاتے تھے۔ صائمہ نے مجھے وقت نہیں دیا تھا لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ ایک مہینا اور دیکھوں گا پھر اس سے حتمی جواب طلب کروں گا۔ دوسری صورت میں یہ معاملہ بڑوں تک جائے گا۔ میں صائمہ سے محبت کرتا تھا لیکن دوسروں کے سامنے وہ بھی مجھ سے ایسے پیش آتی کہ وہ سمجھتے صائمہ مجھ سے والہانہ محبت کرتی ہے۔ یہ تو میں ہی جانتا تھا کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی ہے کوئی بھی محبت کرنے والی چاہے اس کی محبت کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو ایسا رویہ نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ نفسیاتی مریض بھی نہیں تھی پھر اس کے پیچھے کیا بات تھی؟ کئی بار میں نے سوچا کہ اس سے پوچھوں لیکن پھر وعدہ یاد آ گیا جو میں نے اس سے کیا تھا۔

وقت گزرتا رہا، گھر والوں نے ہنی مون کے لیے کہیں جانے کو کہا لیکن میں ٹال گیا۔ دفتر کی طرف سے چھٹی نہ ملنے

گروپ آٹھ

یہ آٹھ بڑے صنعتی ممالک اٹلی، برطانیہ، جاپان، جرمنی، روس، فرانس، کینیڈا، اور ریاست ہائے متحدہ امریکا پر مشتمل ہے۔ دراصل یہ ابتدا میں پانچ ممالک (اٹلی اور کینیڈا کو چھوڑ کر) کا مجموعہ تھا۔ روس کی شمولیت سے یہ گروپ آٹھ بن گیا۔ اس کے قیام کا مقصد عالمی اقتصادیات، مالیات اور سیاسی مسائل پر غور کرنا ہے۔ اس کے رکن ممالک کے سربراہوں کا اجلاس ہر سال منعقد ہوتا ہے۔

گروپ پندرہ (Group 15)

اس تنظیم کا قیام پیرو کے سابق صدر ایلن گارشیا اور بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی کی کوششوں سے 1989ء میں عمل میں آیا۔ اس کے قیام کا مقصد گروپ سات کے بڑے صنعتی ممالک کا مقابلہ کرنا ہے۔ اراکین میں 1۔ ارجنٹائن۔ 2۔ الجزائر۔ 3۔ انڈونیشیا۔ 4۔ برازیل۔ 5۔ بھارت۔ 6۔ پیرو۔ 7۔ جمیکا۔ 8۔ چلی۔ 9۔ زمبابوے۔ 10۔ سینی گال۔ 11۔ مصر۔ 12۔ ملائیشیا۔ 13۔ میکسیکو۔ 14۔ نائیجیریا اور 15 وینزویلا شامل ہیں۔

گروپ دس Group 10

اگرچہ اس تنظیم کا نام گروپ دس ہے، تاہم یہ گیارہ صنعتی ممالک پر مشتمل ہے۔ ان میں 1۔ اٹلی۔ 2۔ برطانیہ۔ 3۔ بلجیم۔ 4۔ جاپان۔ 5۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا۔ 6۔ سوئٹزرلینڈ۔ 7۔ سویڈن۔ 8۔ فرانس۔ 9۔ کینیڈا۔ 10۔ نیدرلینڈز۔ 11.... جرمنی شامل ہیں۔

مرسلہ: ثنا احمد قائم خانی، حیدرآباد

کا بہانہ کیا۔ ان حالات میں جب شادی میرے لیے خوشی و راحت کے بجائے عذاب بن گئی تھی ہنی مون پر جانا خود سے مذاق کے مترادف ہی ہوتا۔ گھر میں سب سے صائمہ کا رویہ بہت اچھا تھا۔ سب سے گھلتی ملتی تھی۔ شادی کے تیسرے دن سے اس نے چھوٹے موٹے کام شروع کر دیے تھے اور امی کے منع کرنے کے باوجود کچن کے کاموں میں بھی حصہ لیتی تھی۔ امی نے کہا کہ وہ ایک مہینے بعد اس کی باقاعدہ ذمے داری لگائیں گی تب تک وہ آرام کرے۔ شادی کے بعد دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا تقریباً روز ہی کہیں نہ کہیں جانا پڑتا تھا۔ میرا دل نہیں چاہتا تھا مگر تیار ہو کر جانا پڑتا تھا۔

صائمہ پوری طرح تیار ہوتی تھی۔ ہر دعوت میں اس نے نیا سوٹ پہنا، اسے جیولری اور میک اپ کا شوق بھی تھا۔ رمشا سے ہیر اسٹائل بنواتی تھی۔ تیار ہو کر میرے ساتھ تصویر بنواتی۔ اس کا ذوق و شوق دیکھ کر میری عقل خبط ہونے لگتی تھی کہ آخر وہ چاہ کیا رہی ہے؟ اگر وہ اس شادی سے خوش نہیں تھی تو یوں خوش فعلیاں کرنے اور تیار ہونے کی کیا تک تھی؟ اکثر میں دفتر سے آتا تو اسے گھر والوں سے گپ شپ کرتے اور قہقہے لگاتے دیکھتا تھا۔ اس شادی سے سب خوش تھے سوائے میرے۔ میں گن گن کر دن گزار رہا تھا۔ ایک مہینا پورا ہوا اس دن صائمہ کی چچی کے ہاں دعوت تھی۔ وہ بھگتا کر واپس آئے تو صائمہ گنگناتے ہوئے میک اپ صاف کر رہی تھی۔ میں منتظر تھا کہ وہ فارغ ہو کر آئے تو میں اس سے بات کروں۔ اس نے شاید میرے موڈ سے بھانپ لیا تھا۔ وہ آئی اور انگڑائی لیتے ہوئے بولی۔ ”اف آج تو بہت تھکن ہو رہی ہے۔“

”میں بھی تھک گیا ہوں صائمہ۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ ڈراما اب میری برداشت سے باہر ہو رہا ہے۔“

”کیسا ڈراما....؟“ اس نے انجان بن کر کہنا چاہا۔

میں نے ایک جھٹکے سے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔ ”جو تم شادی کی رات سے میرے ساتھ کر رہی ہو۔ صائمہ مجھے واضح جواب چاہیے۔“

جواب میں اس نے جو کیا وہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا وہ اچانک چیخی اور پھر اتنی بلند آواز سے رونے لگی کہ ایک منٹ سے بھی پہلے سارا گھر میرے کمرے کے آگے جمع ہو گیا تھا۔ احسان بھائی نے دروازہ بجایا۔ ”نومی کیا ہوا ہے؟“

صائمہ بدستور چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو امی اور رمشا اندر آئے۔ صائمہ دوڑ کر امی سے لپٹ گئی۔ امی نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں بوکھلایا ہوا تھا میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایسی حرکت کرے گی۔ ابو نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا اور نشست گاہ میں لے جا کر کسی قدر سخت لہجے میں پوچھا۔ ”نومی یہ کیا ہے؟“

”میں نہیں جانتا ابو میں صرف اس سے بات کر رہا تھا۔“

”تم نے اسے مارا ہے؟“

”بالکل بھی نہیں۔“

”پھر وہ کیوں چیخ چلا رہی ہے؟“

اس وقت میں چاہتے ہوئے بھی نہیں بتا سکا کہ مجھ پر کیا گزر رہی تھی۔ شرم اور ذلت کے خوف سے میری زبان بند ہو گئی۔ صائمہ امی کے ساتھ چلی گئی اور اس نے کمرے میں آنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ رات وہ رمشا کے کمرے میں رہی اور اس نے امی یا کسی کو بھی کچھ بتانے سے گریز کیا البتہ اس کے بازو پر میری انگلیوں کی گرفت کے نشان امی نے دیکھ لیے تھے۔ اگلے دن امی نے سمجھا بجھا کر اسے کمرے میں بھیج دیا۔ وہ سہمی ہوئی تھی یا اداکاری کر رہی تھی لیکن اس نے میرے گھر والوں کو یہ باور ضرور کرا دیا تھا کہ وہ مجھ سے ڈرتی ہے۔ میں اس سے سختی یا تشدد سے پیش آتا ہوں۔ جب ہم تنہا ہوئے تو میں نے اس سے کہا۔ ”تم نے کل اچھا چکر چلایا لیکن تم نے سوچا تم کب تک اس طرح جواب دینے سے بچی رہو گی؟“

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یعنی ان سنی کر دی۔ پہلے وہ کمرے میں مجھ سے بیگانہ ہوتی تھی، اب کمرے کے باہر بھی نظر انداز کرنے لگی۔ اس کے ہاتھ معقول وجہ جو آ گئی تھی۔ سب کے ساتھ ٹھیک تھی۔ ہنستی بولتی بھی تھی لیکن مجھ پر نظر پڑتی تو یوں چپ ہو جاتی جیسے اس نے کوئی عفریت دیکھ لیا ہو۔ یہ بات وہ دوسروں کو محسوس کراتی تھی، گھر والے سمجھنے لگے تھے کہ میں نہ جانے اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں جو وہ مجھ سے اتنی ڈری سہمی رہتی ہے۔ اس نے الٹا مجھے سب کی نظروں میں مجرم بنا دیا تھا۔ گھر والے مجھے کچھ کہتے تو نہیں تھے لیکن ان کا انداز ایسا ہوتا تھا جیسے میں کچھ اچھا نہیں کر رہا ہوں۔ میں دل میں کڑھتا اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ صائمہ سے کیا کہوں۔ وہ اتنی چالاک تھی کہ اس واقعے کے بعد میرے ساتھ کہیں باہر نہیں گئی اسے معلوم تھا کہ میں باہر اس سے پوچھوں گا اور وہاں

وہ ڈراما نہیں کر سکے گی۔

تین مہینے گزر گئے۔ ان ہی دنوں مجھے ٹریننگ کے لیے سنگاپور جانے کا موقع ملا۔ کورس تین مہینے کا تھا اور مجھے پیشکش ہوئی کہ میں بیوی کو بھی ساتھ لے جا سکتا تھا۔ میں نے صائمہ سے پوچھا تو اس نے انکار کر دیا۔ ”میں نہیں جا رہی۔“

”یہی بہتر ہے۔“ میں نے تلخی سے کہا۔

جس رات میری فلائٹ تھی میں نے جانے سے پہلے صائمہ سے کہا۔ ”یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے..... میں واپس آکر سارا معاملہ تمہارے اور اپنے ماں باپ کے سامنے رکھوں گا۔“

”میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ اس نے ہراساں ہوئے بغیر کہا۔

سنگاپور آکر میرا ذہن کچھ بٹا تھا۔ جو کورس میں کر رہا تھا اس کے بعد مجھے ترقی ملنے کا پورا امکان تھا۔ تنخواہ اور دوسری سہولیات بڑھ جاتیں۔ اس لیے میں بہت دل لگا کر سیکھ رہا تھا۔ مگر جیسے جیسے واپسی کا وقت آرہا تھا مجھے پھر سے ٹینشن ہونے لگی تھی۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ آنے والا وقت میرے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ ان تین مہینوں میں گھر والوں سے بہت بار بات ہوئی تھی لیکن صائمہ سے مشکل سے تین چار بار چند منٹ کی بات ہوئی تھی۔ میں نے گھر والوں کے لیے تحفے لیے تو اس کے لیے بھی گلابی موتیوں کا ایک ہار لیا۔ واپسی کے بعد ایک دن تو ملنے ملانے اور تھکن اتارنے میں گزر گیا، صائمہ سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ خود مجھ سے جس طرح گریز کر رہی تھی صاف لگ رہا تھا کہ اس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ البتہ جب میں نے اسے گلابی موتیوں کا ہار دیا تو اس نے خوشی سے لے لیا۔ مجھے بات کرنے کا موقع اگلی رات کو ملا۔ اس بار وہ بھی تیار تھی۔ میں نے اس سے پوچھا نہیں اپنا فیصلہ سنایا۔

”صائمہ، کل میں تمہارے امی ابو کو بلا رہا ہوں اور یہاں اپنے ماں باپ کے ساتھ ان کے سامنے ساری صورت حال رکھوں گا۔“

”کیا کہیں گے آپ؟“ اس نے کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔

”جو تم نے میرے ساتھ کیا ہے وہ سب بتاؤں گا۔“

”اس میں آپ کی بدنامی ہوگی۔“

”میری بدنامی کیسے؟“

”جب دوسروں کو پتا چلے گا کہ میں ابھی تک کنواری ہوں تو اسے آپ کی نااہلی سمجھا جائے گا۔ اگر آپ کے گھر والے آپ کی بات پر اعتبار کریں گے تو میرے گھر والے میری بات مانیں گے۔ اس کے بعد میں یہاں نہیں رہوں گی۔ جب میں یہاں نہیں ہوں گی تو آپ کس طرح سے ثابت کریں گے کہ آپ شادی کے اہل ہیں۔“

میں حیران تھا وہ کتنی شاطر تھی، اس نے میری بات مجھ پر الٹ دی تھی۔ واقعی میں پھنس جاتا۔ اس کے ماں باپ اس کی بات مانتے۔ وہ چلی جاتی اور پھر واپس نہ آتی تو اس کا الزام درست سمجھا جاتا۔ میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”صائمہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ میں نے کون سا جرم کیا ہے تم سے محبت کے سوا جس کی مجھے اتنی بڑی سزا مل رہی ہے اور اب تم مجھے ساری عمر کے لیے بدنام کرنا چاہ رہی ہو۔“

اس نے بے نیازی سے کہا۔ ”میں آپ کو خبردار کر رہی ہوں اگر آپ نے ایسا کیا تو اس کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔“

”لیکن میں اس طرح نہیں رہ سکتا۔“

”مجھے معلوم ہے آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا بس کچھ دن مجھے اور برداشت کر لیں۔“

”اس کے بعد.....؟“

”اس کے بعد میں اپنے گھر چلی جاؤں گی، آپ سے طلاق کا مطالبہ کروں گی اور آپ طلاق بھیج دیجیے گا یوں یہ معاملہ خاموشی سے بغیر کسی شور شرابے اور زیادہ بدنامی کے بغیر ختم ہو جائے گا۔ میں اپنی زبان بند رکھوں گی، آپ چاہیں تو دوسروں کو بتا سکتے ہیں لیکن بات وہی ہوگی کچھ یقین کریں گے اور کچھ نہیں کریں گے اس سے سوائے زیادہ بدنامی کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“

”اچھا میرے ایک سوال کا جواب تو دے سکتی ہو؟“

”پوچھیں۔“

”تم کس کے لیے یہ سب کر رہی ہو؟“

”اس کا میں جواب نہیں دے سکتی۔“ اس نے صاف انکار کر دیا۔ یہ بھی اس کی چالاکی تھی، اگر وہ اس وقت نام بتا دیتی تو میرے ہاتھ میں ایک پوائنٹ آجاتا۔ میں نے زچ ہو کر کہا۔

”فرض کرو میں تمہیں طلاق دینے سے انکار کر دوں؟“

”اس صورت میں، میں اپنے گھر چلی جاؤں گی اور پھر

عدالت سے اپنا کنوارہ پن ثابت کر کے خلع لے لوں گی، اس صورت میں آپ کے ہاتھ کیا آئے گا یہ آپ خود سوچ سکتے ہیں۔“

میں جیسے جیسے سوچ رہا تھا مجھے لگ رہا تھا میں بری طرح اس کے جال میں پھنس گیا تھا۔ ”صائمہ تم نے مجھے نشانہ بنایا تھا؟“

”ہاں۔“ اس بار اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ”ورنہ امی ابو میرا رشتہ طے کرنے والے تھے اور میں پھنس جاتی۔“

”تمہیں میں کاٹھ کا الو ملا۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ ”صائمہ تم نے مجھے تباہ کر دیا ہے۔“

وہ بے پروائی سے بولی۔ ”آپ مرد ہیں ایک آدھ سال بعد آپ دوسری شادی کر لیں گے اور سب بھول جائیں گے۔ تباہ تو عورت ہوتی ہے۔“

”لیکن اس کیس میں نہیں۔“

”ہاں کچھ الگ سے مثالیں بھی ہوتی ہیں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”نومی، آپ شریف آدمی ہیں۔ سچ کہوں تو بہت زیادہ شریف ہیں ممکن ہے آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو زبردستی کر جاتا۔“

”فرض کر لو میں ایسا ہی کرتا تب.....؟“

”تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا میں بہرصورت یہاں سے چلی جاتی۔ آج کے دور میں آپ کسی کو زبردستی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔“

”میں زبردستی کا قائل بھی نہیں ہوں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اگر تم کو جانا ہے تو ابھی چلی جاؤ اور جب تم کہو گی میں طلاق بھیج دوں گا۔“

”ابھی نہیں۔“ اس نے انکار کیا۔ ”میں نے کہا نا بس کچھ عرصے اور برداشت کر لیں نومی، میں سچ مچ آپ سے شرمندہ ہوں.....کاش.....کاش.....“ وہ کہتے کہتے رک کر اپنے نازک لب دانتوں سے کچلنے لگی تھی۔ اب واضح تھا کہ اس کے رویے کے پیچھے کوئی دوسرا مرد تھا۔ مجھے کچھ باتیں یاد آنے لگیں، میں نے پوچھا۔

”صائمہ ایک بار مجھے ڈینگی ہوا تھا تب تم نے رو رو کر دعا کی تھی۔“

”میں نے آپ کے لیے نہیں کی تھیں۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ”لیکن سب سمجھتے تھے کہ میں آپ کے دعا کر رہی ہوں۔“

”میں نے ایک بار تمہیں سامی کہا تھا تب تم نے سختی سے منع کر دیا تھا۔“

”ہاں، اس نام سے پکارنے کا حق آپ کو نہیں ہے۔“ اس بار بھی اس نے صاف گوئی سے کہا۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے سب سوچ رکھا تھا، اس وقت وہ ماں باپ کے گھر چلی جاتی تو بات کھل جاتی اور اس کے بعد مصالحت کی کوششیں شروع ہو جاتیں جب کہ وہ اپنے اوپر کوئی بات نہیں لینا چاہتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے مہلت کی بات کیوں کی اور شاید اسی لیے اس نے مجھ سے شادی بھی کی تھی کہ اسے مہلت مل جائے۔ دو مہینے بعد وہ اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی اور واپس آنے سے انکار کر دیا۔ ہمارے گھر والے تو حالات سے واقف تھے بس وہ غلط فریق کو قصوروار سمجھ رہے تھے مگر صائمہ کے ماں باپ ہکا بکا رہ گئے۔ وہ ہمارے گھر دوڑے آئے۔ سب کے درمیان مجھے مجرموں کی طرح بٹھا کر عدالت لگائی گئی اور جب میں ہر سوال کے جواب میں خاموش رہا تو مجھ پر فرد جرم بھی عائد کر دی گئی۔ آنٹی نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کیا تو میرا دل چاہا کہ سچ بتا دوں لیکن اب بہت دیر ہو گئی تھی، اب میرا سچ بھی میرے خلاف جاتا اس لیے خاموشی بہتر تھی میں نے صرف اتنا کہا۔ ”اگر صائمہ مجھ سے طلاق مانگتی ہے تو میں دینے کے لیے تیار ہوں۔“

صائمہ یہی تو چاہتی تھی لیکن جب ہمارے گھر میں اس سے پوچھا گیا تو وہ یوں دھاڑیں مار کر رونے لگی جیسے اس پر اس سے بڑا ظلم کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ روتی رہی اور کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس کے ماں باپ اسے ساتھ لے گئے اور رفتہ رفتہ معاملات اسی طرف جانے لگے جس کی وہ خواہش رکھتی تھی۔ ایک ہفتے بعد انکل اور آنٹی طلاق کا مطالبہ لے کر آگئے اور دو دن بعد میں نے طلاق نامہ بھجوا دیا اور ساتھ ہی کال کر کے زبان سے بھی صائمہ کو تین بار طلاق دے دی۔ یوں یہ قصہ ختم ہوا۔ طلاق دینے کے بعد بھی میں نے اپنے گھر والوں کو نہیں بتایا تھا کہ اصل قصہ کیا ہے، کچھ دن وہ مجھ سے کھنچے رہے تھے صرف امی سائڈ لے رہی تھیں وہ بھی اس حد تک کہ میں کچھ غلط نہیں کر سکتا۔ معاملہ ختم ہوا، سامان واپس چلا گیا۔ ہم نے صائمہ اور اس کے گھر والوں کی طرف سے دی ہوئی ایک ایک چیز واپس کر دی تھی لیکن اس سے کچھ لینے سے انکار کر دیا تھا اس کے باوجود وہ کپڑے اور

زیور ایک سوٹ کیس میں ڈال کر چھوڑ گئے تھے۔

میں نے خود کو کام میں مصروف کر لیا۔ صبح آٹھ بجے کا نکلتا تو رات تو دس بجے واپس آتا تھا۔ تھکن کے باوجود رات مشکل سے نیند آتی تھی۔ گھر میں میری دوبارہ شادی کی باتیں شروع ہو گئی تھیں لیکن میں نے امی سے کہہ دیا کہ ابھی کوئی اس بارے میں بات نہ کرے۔ اس کے باوجود ابو اور بھائیوں کا خیال تھا کہ میری جلد دوسری شادی ہی میری افسردگی اور مایوسی کا درست علاج تھی۔ طلاق کے بعد دونوں گھروں کا رابطہ ختم ہو گیا تھا۔ آمنا سامنا ہوتا تو سلام دعا بھی نہیں کرتے تھے۔ امی، رمشا اور بھابیوں نے رات کو باہر جانا بند کر دیا تھا۔ محلے کی خواتین اب تک تجسس میں تھیں کہ ہوا کیا تھا اور ان کے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ جیسے ہی عدت ختم ہوئی، رمشا نے دفتر سے آتے ہی مجھے اطلاع دی۔

''بھائی آج صائمہ کا نکاح ہوا ہے۔''

میں چونکا۔ ''کس نے بتایا؟''

''اسمہ کی ایک سہیلی میری دوست بھی ہے اس نے بتایا ہے۔ انہی مولانا نے پڑھایا ہے، جنہوں نے آپ کا نکاح پڑھایا تھا۔''

یہ مقامی مسجد کے مولانا تھے۔ میں اسی وقت گھر سے روانہ ہوا اور مسجد پہنچ گیا۔ مولانا کی رہائش مسجد کے ساتھ ہی تھی۔ میں نے ان سے صائمہ کے نکاح نامے کا پوچھا ''مولانا صاحب آپ غلط مت سمجھیے گا میں صرف یہ جاننے آیا ہوں کہ صائمہ کا نکاح کس سے ہوا ہے؟''

وہ تیار نہیں تھے لیکن جب میں نے بہت اصرار سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ آدمی کا نام ساحر رضی ہے۔ میں دنگ رہ گیا تھا، یہ وہی ساحر تھا جس سے صائمہ کا رشتہ ہوا تھا اور وہ ملائیشیا میں قید تھا۔ میں نے گھر آ کر صائمہ کا موبائل نمبر ملایا اتفاق سے وہ آن تھا اور اس نے کال بھی ریسیو کر لی۔ رمشا کی اطلاع کے مطابق ابھی صرف نکاح ہوا تھا رخصتی بعد میں ہوتی میں نے آہستہ سے کہا۔ ''مبارک ہو.... بالآخر تم اپنی محبت پانے میں کامیاب رہیں۔''

''آپ کو پتا چل گیا۔'' اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

''ہاں شبہ تو مجھے پہلے ہی تھا لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ خوش قسمت ساحر ہے۔ تم نے اسی لیے میرا انتخاب کیا تھا نا کہ تمہیں ساحر کے واپس آنے تک مہلت مل جائے۔''

''ہاں میں نے اسی لیے یہ سب کیا....''

''تم اس سے محبت کرتی ہو؟''

''کیا آپ کو اب بھی اندازہ نہیں ہوا؟'' اس نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''کوئی عورت کسی مرد کے لیے بنا محبت اتنا کچھ کر سکتی ہے۔''

''شاید نہیں۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''بہر حال ایک بار پھر مبارک ہو میں دعا گو ہوں اللہ تم کو وہ خوشیاں دے جن کی تم متلاشی تھیں۔''

''نعمان آئی ایم سوری۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے، یہ میری تقدیر میں تھا۔'' میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ کچھ عرصے بعد امی ابو کے دباؤ پر میں نے ندا کے لیے ہاں کر دی تھی۔ مزاحمت کی وجہ ندا کے لیے ناپسندیدگی نہیں تھی بلکہ میرے خیال میں وہ مستحق نہیں تھی کہ کسی شخص کی دوسری بیوی بنتی۔ اگرچہ عملی اعتبار سے دیکھا جائے تو وہی میری پہلی بیوی ہے کہ میں اسی کے پاس گیا تھا۔ آج ہماری شادی کو دو سال گزر چکے ہیں۔ ہماری ایک پیاری سی بیٹی دعا ہے۔ اس میں ہم دونوں کی جان ہے۔ ندا میری بیوی ہی نہیں میری محبت بھی ہے، میں اس کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ گزشتہ دنوں میں اسے اور دعا کو شاپنگ کرانے لے گیا تھا جب ہم شاپنگ سینٹر سے نکل رہے تھے تو میں نے بس اسٹاپ پر صائمہ کو ایک آدمی کے ساتھ دیکھا۔ وہ یقیناً بس کا انتظار کر رہے تھے کیونکہ رکشا ٹیکسی تو وہاں بہت کھڑے تھے۔ ان دو سالوں میں صائمہ کا رنگ و روپ مرجھا گیا تھا۔ شاید اس نے کچھ سخت وقت گزارا تھا۔ معمولی سوٹ اور بس اسٹاپ پر موجودگی سے ظاہر تھا کہ اس کے اور ساحر کے مالی معاملات اچھے نہیں تھے۔ صائمہ کی شادی کے کچھ مہینے بعد ہی اس کے ماں باپ یہ گھر بیچ کر چلے گئے تھے اور پھر ان کی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ شاید انہوں نے بھی صائمہ سے قطع تعلق کر لیا تھا کیونکہ وہ اس کے ماں باپ تھے، وہ انہیں بے وقوف نہیں بنا سکتی تھی جیسے اس نے میرے گھر والوں کو بنا لیا تھا۔ اس کے باوجود مجھے صائمہ کو اس حال میں دیکھ کر دکھ ہوا تھا اور میں نے پھر دعا کی کہ اللہ اسے خوش رکھے اور مجھے امید ہے وہ خوش بھی ہوگی کیونکہ غربت اور امارت تو خوشی کا پیمانہ نہیں ہیں۔ جب میں نے گاڑی اس کے پاس سے گزاری تو اس نے مجھے دیکھا اور اس کی آنکھیں جھک گئی تھیں تب میں نے دیکھا اس کے گلے میں وہی گلابی موتیوں والا ہار تھا۔